

نوبھورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2018

نگارِ ملی
معراجِ رسول

Pakibooks.Site

صفحات 290
قیمت 100 روپے

7/12

انشائیہ

جون ایلیا

براخسارہ

راستی ہر انسانی اور راستی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک پُر آشوب زمانہ ہے۔ دلوں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ دلیلوں پر درہمی کی افتاد پڑی ہے اور دانش پر دیوانگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی اس طرح کبھی خلط ملط نہ ہوئی تھیں۔ ادھر یا ادھر، جدھر بھی دیکھو، ایک ہی سا حال ہے۔ تیرہ دروئی نے اپنی دستاویز درست کی ہے اور کجی، کج رائی اور کج روی کا دستور جاری کیا گیا ہے۔ جو سمجھانے والے تھے، وہ اپنے افادات کی مجلسوں میں برائی بھمارہے ہیں۔ برائی سوچنی جارہی ہے اور برا چاہا جا رہا ہے۔ خیال اور مثال کی فضا اس قدر ہرناک کبھی نہ ہوئی تھی۔ انسانی رشتے اتنے کمزور کبھی نہ پڑے تھے۔

ایک اور قندہ برپا ہوا ہے، وہ احموری سچائیوں کا قندہ ہے۔ اس نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کی انسانیت زندگی کے حسن و تاب کا نادر نمونہ ٹھہری ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے جس کے باعث اس دور میں ہماری تاریخ کے سب سے بدترین واقعات ظہور میں آئے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ یہ انسانوں کی نہیں، انسانوں کی دنیا ہے اور ہم سب انسان ہیں۔ جسے دیکھو وہ غیر انسانی لکھ میں پوتا ہوا انسانی دیتا ہے۔ سہاتوں پر شیطانی شطیائت نے قندہ جمایا ہے۔ یہاں جو بھی کان دھر کر سن رہا ہے، وہ کانوں کے گناہوں کا مرکب ہو رہا ہے۔ سوچا ہے کہ ایسے میں نیک سہاتیں اعتراض اختیار کریں۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر سختی سے قائم رہو اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرو کہ تمہارے پاس یہی ایک ستارہ باقی رہ گئی ہے اور یہی تمہاری سب سے قیمتی متاع بھی ہے۔ فقر توں کی گرم بازاری اور محبتوں کی اس قحط سالی میں دیکھی انسانیت کے دکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس بیمار کے تیار داروں اور غم گساروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اچھائی اور برائی میں ایک عجیب معاملت ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ماموں کا آپس میں تبادلہ کر لیا ہے۔ اب ہر چیز اپنی ضد نظر آتی ہے۔ علم، جنم پرستہ گیا تھا اور جنم، علم کے خطاب پر بڑی طرح لوٹ پوٹ تھا۔ سودوئوں ہی نے ایمان سے کام لیا۔

انسان کو اس دور میں وہ وہ منفعتیں حاصل ہوئی ہیں جن پر ہر دور کا انسان رشک کرے۔ پر اس کا خسارہ بھی اسی قدر شدید ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان ناپید ہو گیا ہے۔ جس مزاج اور جس قماش کی دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کا حال تو یہی ہے اور یہی ہونا بھی تھا۔ کونسلے کی کمانی کا لک کے سوال اور کیا ہے؟ اندر ان کے پیڑ سے کیا بھی اگور کے خوشے بھی توڑے گئے ہیں؟

Poora Pakistan
Raha Hai Bol
Hashmi Ispaghool



روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raho

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1794

Benchmark.pk



عزیزانِ مین
السلام علیکم!

اکتوبر 2018ء کا سسٹنس باذوق قارئین کی نذر ہے۔ لیجئے جناب تمام حجاج کرام بھی حج کا فریضہ ادا کر چکے ہیں اور عید الضحیٰ بھی گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا حج قبول فرمائے۔ (الہی آئین) محرم الحرام کی آمد ہے، اہلکار و باغی اور عہدہ کی وفاداری کی عظیم مثال جانے ہوئے زمینوں اور سوسے ہوئے ضمیروں پر آگاہی اور سنجیدگی کی دستک دیتی ہے جو قیامت ہم سے لیے سوچنے کے لیے درکار کرتی رہے گی۔ زندگی کی بے ثباتی ہمیں اپنے ارد گرد سے باخبر رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ صحیح اور غلط کا فرق سمجھاتی ہے مگر مژدہ ضمیروں پر شاید اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ملک بھر میں اچانک بچوں کے اغوا کی جانے والی کن ایک یا پھر خود کردیا ہے۔ نئی حکومت کے حوالے سے اطمینان کی جو لہر آئی تھی اس میں اچانک ان تپاک متاثرہ ایک بے یقینی ہی پیدا کر دی ہے۔ قوائین کے بنانے والے اور رعایا کے لیے بے جرم کوئی پہلی بار سرزد نہیں ہوا۔ ماضی سے تاحال اس کا تسلسل جاری ہے مگر فاسوس کہ ان بجرمانہ کارروائیوں کے ستر باب کے لیے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ باغی اور افسروں کی یا ناسی کی کینا آخر کب تک.....؟ سوالیہ نشان جواب طلب ہے اور ہم سب منتظر ہیں۔ اقتصاد تو ہمارے قارئین بھی کر رہے ہیں اپنی پیاری محفل میں اپنے دوستوں کی تہنوں کا۔ تو چلیے جناب پھر دیکر س بات کی۔

خالد شیخ طاہری، جاسٹر سندھ سے تحریف لائے ہیں۔ ”تجربہ کا سسٹنس خوب صورت سرواتی اور میدہ الہی کی مبارک کے ساتھ ملا۔ فہرست پر لگاؤ والی تو تقریباً سبھی جانے پہچانے نام نظر آئے لیکن اس وقت دل خوش اور گلاب آواز، یادگار اور خفی صفحات پر براجمان پایا۔ (بہت خوب) جن صاحب کا انٹرویو پڑھا شاعر اور رہا۔ انٹرویو پڑھ کر جب ہم پہلے اپنی محفل میں قیامت سے پرانے مسائل حل کرنے کی امید کے ساتھ قویک دیکھو ان کا سبھی پڑھی۔ دوائے کے بارے میں بس یہی کہوں گا کہ حیثیت سے قاری ہیں ادارے کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنا چاہیے چاہے وہ جیت کا اضافہ ہی کیوں نہ ہو۔ میری اپنی بھی سبھی دوائے ہے کہ صفات میں کسی کی جانے مشکل وقت ہے مگر رچا جائے۔ قیامت میں اضافہ ہی بہترین آپشن ہے۔ چلیں میر صاحبہ کو کڑی صداقت بہت بہت مبارک۔ ہم اس میں بھی نے بہترین تجربے کیے۔ سسٹنس میں اپنا پہلا تجربہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفات، آپ اپنا تجربہ پڑھا۔ آپا نے سسٹنس کے قاری کو جنگ آزادی کے ان کرداروں سے ملوایا جن پر بہت کم لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ماضی کا سب سے سبب دوست اچھی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی پرانی قلمی اسٹیج آموذ کہانی تھی۔ اس کا دوری صاحب نے خود غرض میں کئے وقتوں کی بے نی پڑ دوست تحریر لکھی۔ منظر امام صاحب نے تماشا میں تو کمال کر دیا ایک اور دوست تحریر پڑھنے کوئی۔ محمد طاہر میر کی آسان نگار پڑھتے ہوئے ذہن ہالی ڈی ڈی دتین فلموں میں اچھ کر دہ گیا۔ کہانی دلچسپ تھی پوری پڑھی۔ شاہ زین صاحب کی جیل گوئی کے اعلان نام نے ہر نگار۔ بدقت پڑھنا شروع کی اور آخر تک پڑھتا چلا گیا۔ کہانی بہت ہی مست چل رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہیرو ہر قسط میں ایک قدم میں چلا ہو۔ راجپوت صاحب رنگبہ آسمان میں بہتر جارہے ہیں۔ یہ قسط سسٹنی فیڈ رہی۔ سسٹنس گلاسک میں الیاس جیتا پوری صاحب کا نام دیکھ کر ماضی میں پیچھے جہاں بھلائی سازشوں کے درمیان ہم کو گئے۔ معتب بدقت دوائی گلاسک رہی۔ تویر ریاض کی، ہم سفر شروع ہوئی اور ہم کوئی ہائی ٹیکس چلا کیا تھا کہانی میں۔ مرزا احمد بیگ صاحب نے اپنی ڈائری میں اس واقعہ جو ہے دان میں خبر دوست پیشہ و ان مہارت کا ثبوت دیا۔ عبرت اثر درود جو آفریکہ دجی سے پڑھی۔ اہلکار رضا کی اداکارہ بہتر رہی۔ رضوانہ ساجد کی تحریر حضرت موسیٰ علیہ السلام صلوات سے ہم پور رہی۔ محفل شعرو سخن میں تمام شعر بہترین انتخاب تھے اور کٹر میں دلچسپ رہیں۔ آخر میں ادارے کے لیے ایک خواہشات اور دعا ہے۔ یہ مشکل وقت آسانی سے نکل جائے۔“ (آپ کی کہانی اپنایت ہمارا تعلق مزید مضبوط کرنے کا باعث بنی ہے۔ بہت شکر یہ آپ سب کا جو اس مشکل وقت میں ادارے کے ساتھ کھڑے ہیں)

عامر شیخ، ننگہ صاحب سے خط لکھ رہے ہیں ”تجربہ کا شمارہ مطالعے کے بعد زیرِ تجربہ ہے۔ سرورق خوبصورت اور جاندار ہے، حسین لڑکی قیامت ڈھار رہی ہے۔ انٹرویو ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ ایضاً غرض صاحب قیامت چاہے کتنی بھی بڑھ جائے رسالہ ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔ اس سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ خطوط میں چلیں میر، ذرین آفریدی، خالد شیخ سسٹنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2018ء

طاہری، رمضان پاشا، ایمانے زارا شاہ، محمد زبیر، ناہید یوسف، شاہانہ سلطان، سہاب احمد، نازش خان، بشری اقبال اور ریاض بٹ نے تجربہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ کہانیوں میں معتب بدقت، ہم سفر، دوست، چوہے دان، آسان نگار، خود غرض، تماشا، پرانی قلمی، اداکارہ، حضرت موسیٰ، جیل گوئی اور ایک کہانی بڑی پرانی بہترین ثابت ہوئیں۔ تمام رانگیز شخص الیاس جیتا پوری، ناصر ملک، اسحاق داری، ڈاکٹر شیر شاہ سید، اہلکار رضا، رضوانہ ساجد اور ذرا اعجاز نے منفرد اور اعلیٰ کوئی اسٹوریٹس۔ شعر و سخن میں مہوش، ظفر علی خان، ذرین خان، لکھی منصور، کبکھیاں فردوس، مدحت، وردہ ملک، نازش رحمان، بریرہ، انجم کمال، خورشید اعظم، ناصر علی، صاحبہ زینب خواجہ، عدوت ناصر، منیرین، شکیل، ناہید یوسف اور شیر ادھی نے بہترین شاعری تحقیق کی۔ نیز ریاض بٹ کی دل اور آئندہ اکثر تصدیق حسین کی جہالت کی تاریخی، صفی رشید کی ماڈرن دور، علیل احمد لودھی کی ماڈرن ڈکسٹری، وڈر محمد خان کی سگریٹ اور نوٹی غلام حسین کی خواہش وڈر محمد خان کی پہلی اور ذرا سوجھے، بہترین صلوات افزا اخبار پر ہیں۔ آخر میں دعائے خیر ہے۔ سسٹنس ڈائجسٹ دن دوئی رات چوٹی ترقی کرے۔ آمین۔“

ریاض بٹ، حسن ابدال سے ہم پور تجربے کے ساتھ ”ماہ تجربہ کا شمارہ اس بار خلاف معمول 16 اگست کو ہی مل گیا۔ ویدہ زیب سرورق اپنی بہادر نگار ہے۔ جون الیسا کا انٹرویو بہت خوب ہے۔ دل کی آنکھوں سے اسے پڑھا اور غور کیا۔ جو کچھ کہا گیا کچھ کہا گیا۔ اب اسے ہم نے مانا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے مانا ہے۔ ورنہ سارا سفر رانگاں چلا جائے گا۔ آگے بڑھے تو ادارہ اپنی مجبور یوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بھنگالی نے ہر چیز کو اپنی لپٹ میں لے لیا ہے۔ آپ نے اپنی مجبوری بتادی، اب ہماری مجبوری بھی من لیجئے۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ رسالے کی اشاعت معطل کر دی جائے۔ میرا مشورہ تو ہے کہ قیامت پڑ جائے۔ ہمیں رسالہ برصورت چاہیے۔ (بہت شکر یہ محرم آپ کی محبت اور ہماری مجبور یوں کو کھینچے گا) اب پڑھتے ہیں خطوط کی طرف چلیں میر آپ کا تجربہ بہت خوب ہے۔ لفظوں کا ترکا خوب لکھا ہے۔ سسٹنی ہم بھاگنے والے اگل نہیں ہیں، بیستین سال سے سسٹن سے چلنے ہوئے ہیں۔ خدا مرد اور زگرے۔ ذرین آفریدی اس بار تجربہ ذرا مختصر تھا۔ خالد شیخ طاہری کا تجربہ محفل کی جان ہے۔ اچھا لگا۔ آئندہ بھی ایسے جاندار تجربے کے ساتھ آتے رہے گا۔ رمضان پاشا بھائی کیسے ہوا ہر ماہ تجربے کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ محمد وقت صاحب بھی باقاعدگی سے آتے ہیں اور وڈر یا کوکڑ سے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔ میرا خط پند کرنے کا شکر یہ.... ایمانے زارا شاہ، محمد زبیر ساگر، ناہید یوسف، شاہانہ سلطان، سہاب احمد، نازش خان، بشری اقبال کے تجربے بھی پند آئے۔ اب پڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سسٹنس گلاسک کے سلسلے کی تاریخی کہانی معتب بدقت الیاس جیتا پوری کے جاوادی قلم کی مہارت کا کام بولتا ہے۔ مسٹر سطرول میں انگریزی۔ دوائی ماضی میں حکومتوں کے تختہ الٹانے میں تھکڑوں اور غلاموں کا بڑا ہاتھ تھا۔ بہر حال اپنی تحریروں میں زندہ (مروم) مصنفین کی تحریروں کو حجاج عقیدت یا تحسین جیل کرنے کا یہ ایک اچھا اور قابلِ تعریف سلسلہ ہے (اس سلسلے کو سرائے کا شکر یہ) رنگبہ آسمان میں اب کافی تیزی آگئی ہے۔ یہ قسط پڑھ کر مزہ آگیا۔ ناصر ملک کی دوست کے کیا کہنے۔ ایسی تحریریں سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ دوائی جب بے رحم وقت اپنی چال چلتا ہے تو دل کے مازک آگیتوں کو کڑی کر پئی کر دیتا ہے تو دل کے ساحل پر گزرے لہجے کھو گئے، سپہاں بن کر پڑے رہ جاتے ہیں۔ سبکی حال رضی الدین کا ہوا۔ پھر پیچھے مرزا احمد بیگ صاحب کی دعا کی بھیجیوں میں ابھی کہانی جو ہے دان تک۔ اس جرم کی بنیاد ایک دہائیات شک پر گئی تھی جسے بیگ صاحب نے بڑی پابندی کی اور اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے اس کا ذکر کر کے اپنے موکل سکندر کو باعزت بری کروایا۔ سکندر دوائی قسمت کا مدنی نکلا۔ کراسے مرزا احمد بیگ صاحب جیسا وکیل میر آگیا۔ اسے کہتے ہیں خود اپنے جال میں میاؤ آگیا۔ پرانی قلمی، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی رلا دینے والے موضوع پر لکھی ایک صاس تحریر ہے۔ دوائی انسان کو اپنی قلمی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہی حالات اس کے سامنے آتے ہیں اور جب اونٹ پیاز کے نیچے آتے تو اسے اپنی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ بانی کہانیوں میں اداکارہ (اہلکار رضا) جیل گوئی (شاہ زین

سانچہ ارتحال

کتاہوں اور رسالے کے سرورق کے معور، کہنہ مشق فکار، ذاکر حسین جنہوں نے تقریباً نصف صدی کا عرصہ ادارے کی قرحی رفاقت میں گزارا طویل علالت کے بعد 13 اگست 2018ء کی رات اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اناللہ واپلہ راجحون۔ قاری مرحوم کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا فرمائی۔

سنہ سنی الیاس شاکر طویل علالت کے بعد کراچی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی صحافت میں خدمات قابلِ فراموش ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں۔



رضوان) اور ذوی اعجاز کی ایک کہانی بڑی پرانی بہت اچھی لگیں۔ خاص کر ذوی اعجاز نے بڑے اچھے اعزاز سے کہانی کے تانے بانے اور آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ ویل ڈن اور سب سے بڑھ کر یہ اعلیٰ صاحبِ داد کی سختی ہیں جنہوں نے اپنی اچھی کہانیاں منتخب کیں۔ (آپ کی پسندیدگی ہمارا حوصلہ بڑھا رہی ہے)

عید مبارک کہتی نظر آئی اور ساتھ میں کدو بھی تھی کہ بھیجی دیکھ کر حیران کیوں اور ہے۔ بارہا تو ان کوں نے مجھے جاسوسی غافل پر دیکھا ہے۔ اب سسٹمز پر بھی آگئی ہوں۔ عید کا موقع ہے نا۔ لیکن اس خوشی کے موقع پر جون اکل کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے خود کو مارنے پر تے ہوئے ہیں۔ ان کو اچھا بھلا پتا بھی ہے کہ ان کے مرنے سے ستر ادا ہو گا۔ غارانی، طوطی، رومی اور ہزار ہا شامیت اک پوری بستی مرجائے گی لیکن پھر بھی..... تمہارا شکر یہ اکل کرتے ہیں کہ وہ ایک مہرِ زندہ ہے..... چوٹی حکومت آگئی اور اچھی امیدیں بھی دلا رہی ہے جو خوش کن ہیں۔ دندنہ بار بار اپنے دلوں سے گزرتی ہوئی تھی کہ یہ بستی کی فضا کی ہوتی تھی۔ بہر حال بھان زمین آفریدی کی کج سعادت کے لیے گئی ہیں اللہ قبول فرمائے۔ (آمین) بہت مبارک ہو یہ سعادت، خالد شیخ ظاہری کی اسپینہ زبردست ہے۔ رمضان پاشا نے بھی مختصر اچھا تبصرہ کیا لیکن عید کی بھاک و دندنہ میں اللہ یا محمد رفاقت اور محمد زبیر ساگر نے بھی عمدہ لکھا۔ اسے ریاض بٹ بھائی جانے کیوں دیں؟ اس دفعہ بار بار اپنے دل سے تھرتھرتا رہا کہ آئی ہے نہ جانے دیں۔ بھیجی تھرتھرتا آئی ہے بس خود ہشتات نیک رہیں۔ ایمانے زار شاہ کی شہنشاہی اس دفعہ ماند پڑی، دھاتی دیں۔ کیا اس آئی لینڈ کی ضبط کتنی زیادہ محسوس کر لی کہ مجھے ہی ہو گئیں؟ خیر تبصرہ اچھا ہوا۔ ناہید یوسف سسٹمز کو، محمد زبیر ساگر کو، جانی ہیں کہ مگر کے کاموں کی بستی فہرست؟ پتا نہیں پھر کیسے تاہم نکال لیتی ہیں؟ پھر بھی محمد و تبصرہ دیکھنا؟ وہ عید صاف شاہنشاہ تھرو اچھا لگا۔ مہتاب احمد نے بھی بہت اچھا لکھا۔ تبصرہ یادگار بنانے کے لیے نازش خان کے لکھا کا اخبار بھی مودہ ہا، خزانہ خزانہ جتنی بھری اقبال کا تبصرہ بھی دکھائی تھا لیکن ساتھ ساتھ چلتے سسٹمز نے بھی ان کے وہ اکل و دلدل و دلدل و دلدل کے لیے بڑے عمدہ تبصرہ نگار جن میں دوست محمد، رانا بشیر احمد، ایاز محمد، صفدر مہادیو، بابر عباس، اسد مہاس، علی، انیس خان، و شاد احمد، بشری افضل، ذاکر شاہ، نادر، کہاں خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ پلیز اپنی مٹھل میں تشریف لائیں۔ (کہاں کسی سلسلے پر نازی)؟ اگر کسی نے تو آئے میں کیا حرج دیکھ کر خوش ہو جاؤ اور تاریخی واقعات پر دل اور بھی مجھ جاتا کہ دلالت اسے خوب صورت ہے اسے میں بیان کیے جاتے کہ بیان سے باہر ہے۔ سب سے پہلے مہتاب وقت ہی پڑھی اور بہت اچھی لگی۔ ایک لکھنا اقبال وادور برابر اقتدار اور تیسرے کا دینا قدم قدم جیکہ ابراہیم کبر با سے ملنے لگے اور کیا اور مہتاب وقت ٹھہرا۔ رنگ آؤں میں بھائی بند کی پراسراریت عملی تو اس کی اینٹ سے اینٹ بن گئی۔ شکر ہے دینا نے اپنے محبوب اور مومن کو اس کے لیے دلی اور بے دوش دوست دیکھ لیا تھا۔ اب صفدر مہادیو کا جانے کیا اسرار ہے، امید ہے اچھی قطع میں ظاہر ہو جائے گا۔ شاہ زمان کی بہادری میں بھی وہ بھائی ہیں وہ پریشان نہ ہو، اریہ کا کیا کہنا بھی اس کی چال ہی ہوگی۔ عمدہ کہانی۔ اپنی پارٹی چھوڑ کر تم میری پارٹی چوائی کرو۔ سب اور پھر سب سے عجیب لڑکی ناز نے انکار کی صورت میں اپنی راہیں ہی جدا کر لیں اور فاروق ہاتھ ملاتی رہ گئیں۔ دوست بھی اچھی کہانی تھی۔ شعلی کے شوہر سکندر کو بیگ صاحب نے راکھ دیا اور سکرانے سکرانے کام لے کر مسدود رہی بندے کو کل کے کلام میں پڑ گیا۔ ساتھ میں اطلاع کا شوہر انیس علی بھی چرے دان میں قابو آ گیا۔ عمدہ۔ وقت میں علی کو غلط سے گزیرے پر کا پا کا ساتھ میرا کیا۔ بھوکا یا علی تو علی کی بھی کچھ نہ کچھ کا پا پلٹ جائے گی۔ بانی اس نے اپنے باپ کے قاتل چنگیز خان کو بھی مصری کی بنا کر مہربان نہ کیا۔ موت سے دو چار کیا۔ اب کا یا کی سسٹمی کیفیت پتا نہیں کوئی کہانی سامنے لا رہی ہے ہمیں اس وقت تک انتظار ہے گا۔ ایک کہانی بڑی ہی پرانی، ہزارے سے پہلے اور بعد کے حالات سے جڑی پراثر تحریر۔ مشرقی اقدا روں کی قد و منزلت سے جتنی آبیاری کو مل رہی اور بعد ہا اقداروں سے پامال ہوتے دیکھنا خون کے آنسو لانے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود فصل بہار لانے کی امید لیجئے۔ ستر کا آواز گونج رہی بات ہے۔ ایک کہانی بڑی پرانی زبردست رہی۔ خود غرض بھائی تو اپنی آپا کی زندگی خراب کرنے پر تھکا ہوا تھا مگر نے رشتہ جوڑ کر اور چھان بین کر کے شیم کی ساری خود غرضی دور کر دی اور مرقع نے دفعہ سے اپنے ابا کی شادی کر کے موت کا گھنٹہ بول دیا۔ یہی مزاح اور تنقید کی سہمرا ہو کہانی اچھی لگی۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی



واہ! ابدات و بصیرت کے مابین تماشے نے کمال کر دیا۔ ذاکر شہر شاہ سید کی کہانی بہت اچھی لگی۔ جو بویا ہو وہی سامنے آتا ہے۔ ستائیس سال پرانی کی ہوئی غلطی اپنی بچی کے نہ رکھنے پر یاد آئی تو دل کی بے چینی تھی تھی۔ رشتے جاتوں میں ادب دلچاہ اور قلم خرم کا بھی برا مقام ہے۔ پرانی غلطی ابھی کہانی تھی مگر ایسی غلطیاں ابھی نہیں ہوتیں۔ نیا اسرار نکل نے جب اللہ کی بات نہیں مانی تو چالیس سال کے لیے عیاں میں بھگتا مقدر ٹھہرا۔ اب حضرت موسیٰ انیس قریات داری کا احساس دلا رہے ہیں تو اسرار علی لوت مار کرنے پر تے ہیں۔ ایسی عجیب قوم کہ شہر دہائی بچوں کی ہی حریف کرتی پھر بھی حضرت موسیٰ انیس معافی دلا دیتے ہیں اور وہ پھر شرف ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت محمد کا واقعہ بھی سبق آموز تھا۔ محفل شعر و سخن سے زرین خان آفریدی، مختار انصاری اور قدرت اللہ نیاز کی شہر اچھے لگے۔ (آپ کے تفصیلی اور با معنی تبصرے نے دل خوش کر دیا، ویلڈن)

محمد رفاقت بھولوں کا گلدستہ لیے واہ کینٹ سے حاضر ہیں۔ "ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ ستمبر 2018ء بھولوں کا گلدستہ..... میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ہر ایک کہانی ایک بھول کی طرح ہے اور اس طرح یہ بھولوں کا گلدستہ بن گیا ہے۔ جناب اس کی پہلی کہانی تو میں سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ بھی ایلاس بیتا پوری کی مستحب وقت، بہت ہی اچھی اور شاندار کہانی تھی۔ یہ سازشیں ابھی تک چل رہی ہیں اور ازل سے اب تک یہ کھیل چلتا رہے گا۔ کہانی ہم سفر میں گہری نیند سونے والے بھی مل جاتے ہیں۔ ناصر ملک کی دوست بھی اچھی کہانی ہے۔ مرزا احمد بیگ صاحب کی چوہے دان ایک تفتیشی کہانی ہے جس میں دوسروں کو پھنسانے والے خود ہی اس میں پھنس گئے ہیں۔ آسان شکار خود غرض، تماشا، وقت، اداکار، پیش گوئی، ایک کہانی بڑی پرانی اور پرانی غلطی بھی خوب اچھی لگی تھی۔ سب کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ ادارے نے اس دفعہ بھی محفل شعر و سخن بہت خوب صورت انداز میں سجائی ہے اور ہر شعر اچھا ہونے کے ساتھ ساتھ معیاری بھی ہے جس کے لیے ادارہ مبارک باد کا حق ہے۔ کتر نہیں بھی اس رسالے کی جان ہیں، ان سے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آتے ہیں اس رسالے کے سب سے زیادہ شہول شعلے آپ کے قلم کی جانب۔ تو جناب سب لکھنے والے بہت اچھے انداز میں کہانیوں کے بارے میں تحریر کر رہے ہیں اور ان کے خیالات سے رسالے کی پسند کا بھی پتا چلتا ہے۔ خط جو شامل ہوئے ہیں، ان میں ایمانے زار شاہ، زرین آفریدی، خالد شیخ ظاہری، رمضان پاشا، ریاض بٹ، محمد زبیر ساگر، مہتاب احمد، ناہید یوسف، شاہنشاہ سلطان، نازش خان اور بشری اقبال کے تبصرے بڑے جان دار تھے۔ سب کو اتنا اچھا لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ اس رسالے کے لیے وقت نکالیں اور خوب لکھیں۔ ایک بات اور..... ذمہ کے لیے بھی دل کھول کر اپنا حصہ ڈالیں یہ صبر و جاریہ ہے۔ اب نئی حکومت بھی بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پاکستانی عوام کی خدمت کرنے کا موقع دے اب سے عزم، پوری لگن اور ایک جان ہو کر پاکستان کی خدمت کرنی ہے تاکہ آنے والے نکل کو ہم اپنے بچوں کو ایک محفوظ پاکستان دے سکیں۔ انشا ہی میں جون ایلیا نے جو بیان دیا ہے "تمہارا شکر ہے" میں گزارش کروں گا کہ وہ اس سے پاکستان کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ ان کی باتیں بہت اثر انگیز ہوتی ہیں۔ (آپ کو شاید علم نہیں کہ جون ایلیا صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ سب ان کی نادر تحریریں ہیں جو شائع ہو رہی ہیں)

محمد رمضان پاشا کا مشورہ گوشہ اقبال، کراچی سے "آدی کے لباس سے اس کی حیثیت اور وقار کا اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ لباس ہی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اسی طرح کسی رسالے کا سرورق دیکھ کر یا لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ اندر کے مندرجات کتنے شاندار اور جاندار ہوں گے۔ اس معاملے میں ادارہ سسٹمز صاف اول میں شمار ہوتا ہے۔ (بہت شکر یہ جناب) کاغذ کا بحران اور مہنگائی کے سلسلے میں اپنے قارئین سے مشورہ طلب کیا ہے جو حقیر فقیر کا مشورہ حاضر ہے۔ مگر قبول اقتداز سے عز و شرف..... صفحات کم کرنے کے حق میں نہیں ہوں، اشاعت کا قفل سسٹمز کے شیدائیں پر قلم ہوگا۔ ہاں البتہ دامن میں تموز اسراف اضافہ کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔ سسٹمز جو بہ حال میں خریدنا ہی خریدتا ہے..... آدے ہی آدے۔ (آپ سب قارئین کی اس محبت کو دیکھتے ہوئے ادارے نے آپ کے لیے ایک درمیانہ راستہ نکالا ہے۔ امید ہے آپ سب مطمئن ہوں گے)۔ دوست اس کہانی کا عنوان عجیب لڑکی ہونا چاہیے تھا۔ دوست بہت ہی پرانا اور گھسا ہوا عنوان ہے۔ آسان شکار ایک چٹنگ اور دماغ ٹکڑا دینے والی کہانی تھی، پھر بھی لطف تو آئی گیا۔ ہم سفر کہانی بہت دلچسپ تھی، لیکن اختتام اچھا نہیں تھا۔ رنگ آسان کہانی زبردست چل رہی ہے، گوشت بہت پرانا ہے۔ آخر کار کالی کے مندر کا تپا اچھا ہو گیا اور اب مہارانی اور اس کے دوغیر عاشق کا حشر خیراتی ہے۔ چوہے دان احمد بیگ کی کہانی حسب معمول اس بار بھی بہت دنگ تھی۔ تماشا منظر امام نے تو اس بار کمال لکھ دیا، کہانی بہت ہی پراثر تھی۔ طبع زار کہانیوں میں خود غرض بہت کہانی تھی، بہت مزہ آیا۔ وقت و چنگیز خان سے خوب اختتام لیا۔ ایسا اختتام پہلے بھی سب نے پڑھا اور اب علی کی نئی محبوبہ کا یا اپنی رام کہانی سامنے کی۔ اداکارہ غامسی دلچسپ کہانی تھی، اختتام پر بھی بھی آئی۔ شہر شاہ صاحب نے پہلے ہمیں اچھی اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں مگر اس بار انہوں نے بہت مایوس کیا۔ پرانی غلطی کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی۔ غیر ملکی کہانیوں میں جوش کوئی کافی متاثر نہیں کی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود قاتل پکڑ میں نہیں آیا۔ وہی ذمہ دار کے تین پات۔ ساتھ تبصرہ



لکھنا اور دیکھنا کبھی نے بہت ترپا یا، آنکھیں بھی نہ کھلیں۔ ان کو مبارکباد دوں یا؟..... اشعار کی محفل میں ایسے سجادہ زریں آفریدی، ناصر علی اور مہر نام کے اشعار قابلِ داد تھے۔ کنز میں بھی لا جواب تھیں۔ خطوط کی محفل میں جن دوستوں نے اس عاجز کا ذکر فرمایا، ان سب کا شکریہ۔“

انجم فاروق ساحلی، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ ”مہر کا سسپنس 113 گیت کو بک اسٹال پر دیکھ کر خوش ہوئی۔ خوش رنگ مائل منظر اور پرکشش لکھنے والے خطوط کی محفل خوب بری بھری تھی۔ عرض ہے کہ بڑھتی ہوئی برہانگی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ لکھنے والے بھی مسائل کا شکار ہیں لیکن بہادر قارئین جیسے دوسری اشیاء لکھنے والوں کو خریدتے ہیں، نو سسپنس کی قیمت میں مزید اضافہ بھی قبول کر لیں گے۔ اسے بند کرنے والی بات ہر حال قارئین کو بلا دینے والی ہے۔ صفحات تو پہلے ہی کم رہ گئے ہیں، مزید کی تو ممکن ہی نہیں معلوم ہوئی۔ مہر کا ”حاشائی زندگی کو بھروسہ کر رہی ہے لیکن بہر حال زندگی کے لوازمات جاری رہیں گے۔ سنی دستور زندگی ہے۔ میرے خیال میں قیمت بڑھا کر صفحات بھی بڑھا دیے جائیں اور اس کے رنگ روپ میں بھی اضافہ کیا جائے۔“ (آپ سب کی رائے اور تبصروں کے پیش نظر کیا جائے والا فیصلہ کیا گیا) چلتی پھرتی باغیچہ اور تاج پور ہسٹ کے خط خاصے پھر پورا در اہم تھے۔ بٹ صاحب باذوق قاری ہیں۔ بقول قارئین قسط دار کہانیاں اگر ایک ہی دائرے میں جھومتی ہیں تو رانگیز حضرات سے گزارش ہے کہ تھوڑی تو جد فرمادیں۔ ویسے حسام بٹ صاحب اچھا لکھنے والے ہیں۔ مرزا امجد بیگ کے کارنامے بھی خوب قلم بند کرتے ہیں۔ اداکارہ سے مطالعہ شروع کیا لیکن وہ حاشا نہ کر سکی۔ چوہہ دان، پیش گوئی، کشا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی تحریریں ہیں۔ حاشائی تحریریں خوب خوش، پرانی فطرتی دوست اور ہم سفر بھی خوب ہیں۔ الیاس سیتا پوری کا تو جواب ہی نہیں۔ ان کی کاوش بہت اچھی تھی۔ ایک کہانی بڑی پرانی ابھی زیر مطالعہ ہے لیکن باقی انگلش میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ سسپنس کی مزید کامیابی و کامرانی کے لیے دعا گو ہوں۔“

غفر احمد کا خط اسلام آباد سے ”وقت اپنی اڑان بھرتا رہا۔ ماہ و سال گزرتے رہے اور ہم سسپنس کو یونہی بک اسٹال کی زینت بنے دیکھتے رہے۔ ابتدائی صفحات کی تاریخی کہانی، دیوتا کا عہد، مختصر حاشائی اور جاسوسی کہانیاں، حسام بٹ کے تحریر کردہ ملک منور حیات اور مرزا امجد بیگ کے کنیز اور آخری صفحات کی طویل خوب صورت کہانی۔ سسپنس نے ہمیں ہمیشہ ایک اچھی تفریح دیا کی اور پھر وقت بد لے لگا۔ لوگ کتابوں سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ یہ وقت آ گیا کہ ادارے کے لیے ڈائجسٹ کو مین ٹین کرنا مشکل ہو گیا اور آپ قارئین سے صفحات کی کمی، قیمت میں اضافہ یا اشاعت میں قفل کا مشورہ کرنے لگے۔“ (سسپنس اور قارئین کا تعلق ہی اتنا مضبوط اور خوب صورت ہے کہ قارئین سے مشاورت ضروری تھی) ظاہر ممبر باغی کے بعد لمبے وقفے کے بعد بلو وگر ہوئے اور اس بار بھی چھانگے۔ ظاہر ممبر یونہی لکھتے رہے۔ نر یا لکھنا کی کہانی آخری صفحات کی زینت تھی۔ ذویا کے لیے مشورہ ہے کہ کہانی میں الفاظ سے خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کی تحریریں، بکاشی کی تھی ہوئی ہے۔ ایمل رضا کو سسپنس کا حصہ دیکھ کر اچھا لگا۔“

محمد حمایوں خولی، اسلام آباد سے شائع محفل ہیں ”مہر کا شمار، مدیہ الہی کے اچھے دن مل گیا۔ اس بار سورتی کافی مگرین تھا۔ لکھا ہے کہ سسپنس میں بھی تبدیلی آگئی ہے کیونکہ سرورق کا نیا پیرا ہے۔ راجہ راجن کی طرح پھولوں کی دیوار بنادی ہے۔ اب جاتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے مرزا امجد بیگ کی چوہہ دان پڑھی۔ مرزا امجد بیگ جیسے وکیل ہوں تو کوئی بے گناہ جیل میں نہ رہے۔ مرزا صاحب کو تو پولیس میں ہونا چاہیے۔ 90 فیصد کا تو پولیس کا کرتے ہیں۔ آئی او کو تو اتنی تو تین بھی نہیں ہوتی کہ اپنی تو نہ کم کرنے کے لیے آڈٹ ورک بھی کریں۔ اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ علی کے ساتھ اخبار لکھا گئے اور وہاں چیکنیز خان کو مورا کر..... پرانی فطرتی پڑھی۔ اداکارہ بھی اچھی کہانی ہے پھر تو عرض سے لے اور حاشا بھی دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات پڑھ کر دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ رنگ آسماں اب کچھ میں آئی شروع ہوئی ہے۔ ویسے کہانی بہت اچھی ہے۔ مگر ذرا گہرائی میں جانا پڑتا ہے پھر کچھ میں آئی ہے۔ ہم سفر بھی اچھی کہانی ہے۔ لکھنا بھی دلچسپ تھے۔ پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں سندھ علی خان کو نیک کا قصدا اچھا تھا۔ ایسے سجادہ دار کا شعر بھی اچھا تھا۔ کنکٹس کا شعر بھی بہت اچھا تھا۔ خطوط میں چلتی پھرتی جہنگ شعی، خالد شیخ ظاہری کا مشورہ، ریاض بٹ حسن ابدال اور شاہانہ سلطان کے خطوط بہت لمبے تھے۔ گلتا ہے چاروں ویسے ہیں۔ مجھے تو گلتا ہے کتاب پڑھنے بغیر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ کئی لوگ لفظوں کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ خط اتنا ہو کہ باقی لوگ بھی محفل میں شامل ہو سکیں۔“ (نیک خیال ہے)

فیصل مشتاق، قبو، لکھنؤ شریف سے شریک محفل ہیں ”ماہ مہر کا سسپنس تھوڑا الٹ موصول ہوا مگر خوبصورت سرورق اور

قابل نگار یوں کی کہانیوں سے حیرین تھا۔ ادارہ بہت خوب رہا۔ جون ایلیا کا انٹرویو پڑھا، بہت بروست لگا۔ واقعی نگار یوں کا شاعری موت نہیں ہوتی بلکہ اکثر واقعات دنیا کے حالات و واقعات سے تنگ آ جاتا ہے۔ وہ ظاہری موت مر جاتا ہے مگر اس کے الفاظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ آپ کے خط سسپنس کا بہت دلچسپ سلسلہ ہے جس میں کچھ شکوت، تبصرے، کچھ بھی باتیں سب شامل ہوتا ہے۔ میں نے تمام دوستوں کے خطوط پڑھے۔ چلتی پھرتی آپ کا تبصرہ بہت عمدہ اور جامع رہا۔ اس کے بعد خالد شیخ ظاہری اور ایمانہ نے ذرا ارشاد کا تبصرہ بھی لایا جواب تھا۔ تاج پور ہسٹ اور ریاض بٹ کا تبصرہ بھی جامع اور بروست تھا۔ انہوں نے ہر کہانی پر تبصرہ کیا۔ اس کے بعد کہانیوں کے تبصرے پڑائیں تو مجھے منظر امام کی قماش نے بے حد حاشا کر لیا۔ نور آنکھیں نہ ہونے کے باوجود بھی سب دیکھ سکتا تھا اور واقعی کسی نے صحیح کہا ہے..... ظاہر کی آنکھ سے نہ قماش کرے کوئی۔ خود دیکھنا تو دیدہ و دل واکرے کوئی۔ نور دو دیکھ سکتا تھا جو شاید ظاہری طور پر کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بہت ہی زبردست اور لا جواب کہانی تھی۔ ناصر ملک کی دوست بھی اچھی رہی۔ ڈاکٹر شہر شاہ سید کی تحقیقی موضوع پر بھی کہانی اپنے اندر باغیچہ کے رشتے کی تصویر بھی پیش کرتی تھی۔ بے شک باپ اور بیٹی کی محبت کا رشتہ ہی کچھ آتا ہے جب خود باپ کا رتبہ حاصل ہو۔ بد قسمتی کہ پرانی فطرتی کی معافی نہ مل گئی تھی۔ ان محبت بھرے رشتوں کو ہم تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم خود ان کا رتبہ اختیار نہیں کر لیتے۔ ایمل رضا کی اداکارہ بھی خوب ہٹ رہی۔ مہر مرین دراصل اپنے ہی شو پر سینٹ کے ساتھ اداکاری کر رہی تھی اور بے قصور سینٹ اس کے دھوکے کا شکار جانے کتنے سال سے ہو رہا تھا۔ ہم سفر مرین کی کہانی کہانی تھی۔ چونکہ میں نے آخر میں پڑھی اور بلاشبہ بہت متاثر ہوا۔ کیا عجیب سفر تھا۔ بیک نے ماں باپ کی بات نہ مان کر فطرت کی تھی۔ جری اور ڈیڑی جیسے لوگوں سے اس کا واسطہ خطر نہ رہا۔ اس کے ساتھ سفر میں جو واقعات پیش آئے وہ ضرور دیکھتا ہوا ہوگا۔ کہانی اپنے اندر بہت کم چھوڑا اور اس کا برا وقت شروع ہو گیا۔ اسی طرح برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ ویل ڈن جناب حوریر ریاض۔ اس کے بعد ”مہر“ کی محفل میں تمام شعر بہت خوب رہے۔ اس کے علاوہ تمام کہانیاں ہٹ رہیں۔ سسپنس میں میری پہلی انگری ہے، آئندہ بھی آتا رہوں گا۔“ (کی بی بی اللہ، ہم اللہ..... خوش آمدید)

محمد اشرف کی مداح سرائی محفل پورہ، لاہور سے ”میں آپ کا اور سسپنس ڈائجسٹ کا پڑا ہوا ہوں اور بہت پرانا قاری ہوں۔ ہر ماہ کے ڈائجسٹ میرے پاس محفوظ پڑے ہیں۔ ماہ ستمبر 2018ء کا اس وقت پڑھا ہوں۔ بہت عمدہ کہانیاں ہیں، خاص طور پر چوہہ دان اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور نبوت کی سیر پر اچھی چارہ ہے..... غدار رسول صاحبہ ایک مرتبہ پھر سیر یا دور کی کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے بھی میں نے آپ کو خط لکھا تھا۔ جون 2016ء کا شمارہ جو مجھ تک پہنچا، اس میں ایک کہانی ہے، ملک منور حیات کی۔ کہانی کا نام ہے درحقیقت۔ وہ مکمل تھی۔ صفحہ نمبر 98 کے بعد صفحہ 131 شروع ہو گیا۔ تمام سسپنس ختم ہو گیا اور میں آج بھی بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ کیا یہ صرف میرے شمارے میں ہوا تھا یا کسی اور قاری نے بھی محسوس کیا؟“ (جناب! اتنی پرانی بات آپ دبائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں آپ کی طرف سے کوئی خط نہیں ملا۔ بہر حال آپ کے مسئلے کا حل بتا دیتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کے پرستے میں ایسا ہو جائے تو براہ مہربانی آپ نے جس بک اسٹال سے پرچہ خریدا ہو وہاں دوبارہ رابطہ کر کے پرچہ بدلوالیں۔ اکثر بک اسٹالز محفل کی فطرتی سے صفحات آگے پیچھے ہوجاتے ہیں)

رضوانہ قریشی، راء، لکھنؤ سے ”مہر“ لائی ہیں۔ ”اس دفعہ سسپنس میں خانا نسل دیکھنے کو ملا۔ مدیہ اعلیٰ صاحبہ نے کاغذ کی مہر کی کی وجہ سے 3 خواب ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ ہم سب کا مشورہ یہی ہے کہ بے شک رسالوں کی قیمت بڑھادی جائے۔ JDP کا کچھ عرصے کے لیے نہیں، ایک مہینے کے لیے بھی معطل کرنے کا سوچیں بھی نہ۔ ہمارے مگر ان اعلیٰ نے اسے دن رات انٹک کوکشوں سے یہاں تک پہنچا ہے۔ سب کے خطوط پڑھتی ہوں۔ بہت معلوماتی تبصرہ ہوتا ہے۔ جو قاری مجھے جانتے ہیں ان کے تبصروں میں اپنا نام ضرور تلاش کرتی ہوں جیسے اشفاق شاہین، محمد خواجہ، مرن آفریدی، سر حاکم، عبدالجبار روی اور محمد منور معاویہ..... آپ کو بیٹے کی بہت مبارکباد“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
 ریحانہ خالد، پشاور۔ سلیم اختر، کراچی۔ راشد محمود، حیدر آباد۔ غلام فرید، سکھر۔ رانا احسان، کراچی۔ فرخندہ نسیم، سرگودھا۔
 ریاض فیروز، میرپور خاص۔ محمد انور، کوئٹہ۔ امتیاز احمد، حیدر آباد۔ رحیم ابراہیم، نواب شاہ۔ کاغذ قبول، ملتان۔ غلام رسول، پٹیوٹ۔
 محمد اسلم، پشاور۔ اختر اظفر، پورہ۔ سامیہ خان، نوشہرہ۔ بھکر۔ رانا ارشد، چکواڑی (منڈی بہاؤ اللہ)۔
 سسپنس ڈائجسٹ 123 اکتوبر 2018ء

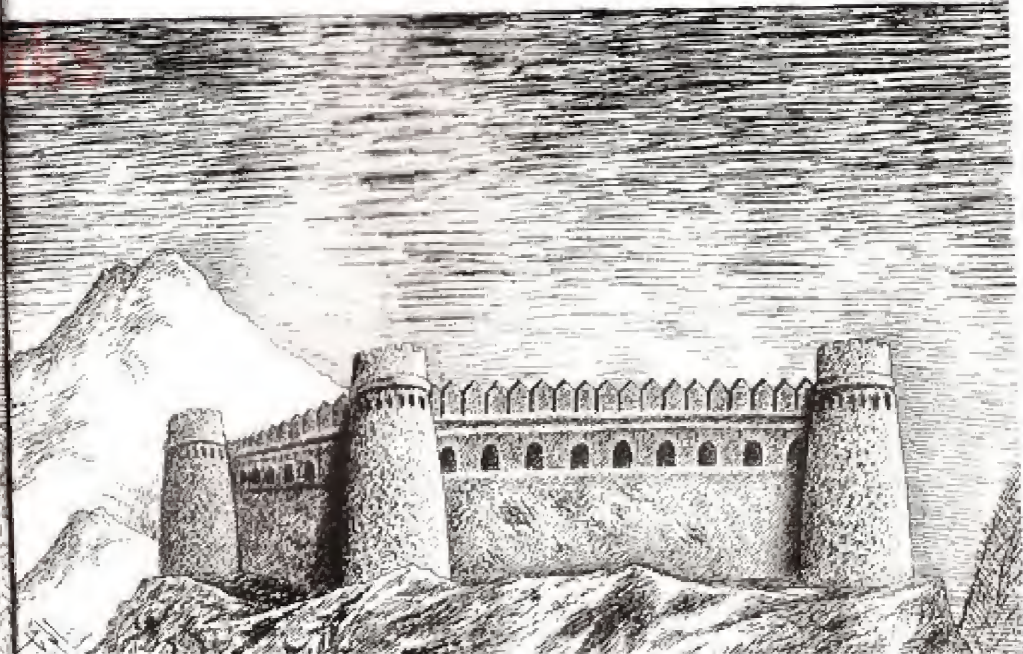


مکافات

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا سحر بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ جانے والوں کی زندگی کے نشیب و فراز... غم، خوشی... فتح، شکست جیسے واقعات آنے والوں کے لیے کسی دلچسپ داستان سے کم نہیں ہوتے... سسپنس کے تاریخی صفحات کا یہی جاودہ کہ پڑھنے والوں کو اپنے سحر سے آزاد نہیں ہونے دیتا... بلین کا دور بھی تخت اور طاقت کے گرد اپنا دائرہ مکمل کرتا ہوا آگے بڑھتا۔ بد جہاں طاقت، دولت اور حکمرانی یکجا ہو جاتیں وہاں سازشیوں کا گروہ بہت فعال کردار ادا کرتے ہوئے اس طاقت کے منبع کو تاراج کر دے کی مذموم کاوشوں میں مصروف رہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اچھے کرداروں کے ساتھ ان منفی رویہ اختیار کرنے والوں کا ذکر کیسے تاریخی حوالوں میں ملتا... بہر حال چاہے بادشاہوں کی داستان ہو یا فقیروں کی زندگی، اعمال کو پرکھنے اور ان کے لیے مکافات کا فارمولا بالکل یکساں ہے اور اس کے شکنجے سے کوئی آزاد نہیں ہو پاتا۔

لکھنؤ کی کوئی یہاں رکھا تھا۔ دارالحکومت دہلی سے جان جو کھوں کا کام تھا لہذا جب سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے ایک ترک غلام "طغرل" کو وہاں کا حاکم مقرر کیا تو اس نے غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار کر سکرانی کے علاوہ بریں ایسے دشوار گزار راستے تھے کہ وہاں تک پہنچنا



خواب دیکھے لیکن نیا نیا دہلی سے آیا تھا۔ بلین کے دربار کی شان و شوکت ابھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ بلین کے بھترین انتظامات، اس کے بیٹوں کی بہادری اور خود بلین کی تلوار کی کاٹ اس کے حوصلوں کو بہت کیے دے رہی تھی حالانکہ خود اس کی بہادری ضرب المثل تھی۔ وہ عرصے تک اپنے ارمان دل میں دبائے بیٹھا رہا۔ اپنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ علم بغاوت بلند کرے۔ یہ کہہ کہہ کر حوصلہ بڑھاتا تھا کہ اس کا آقا بلین بھی تو ایک غلام تھا۔ جب وہ بادشاہ بن سکتا ہے تو میں کیوں نہیں۔ قطب الدین ایبک کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ اس سب کے باوجود وہ ارادے باندھتا تھا اور تڑپتا تھا۔ سرکشی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس نے کسی ذراؤنے خواب کی طرح اس خیال کو بیک پشت ڈالا اور صوبے کے انتظام و انصرام میں دھمکی سے مشغول ہو گیا۔ تنک خرا می شاید اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی کہ اس کو اس علاقے کی چند مہموں میں زبردست کامیابی ہوئی۔ ان کامیابیوں نے اس کے ارادوں کو جان کر متروک کر دیا۔ یہ علاقہ ہی ایسا تھا کہ ایک مدت سے بغاوت کرنا یہاں کے رہنے والوں کی عادت اور طبیعت بن گئی تھی۔ یہ شریپند ظفر کے ارادوں کو بھانپ گئے تھے لیکن وقت آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ موقع انہیں اس وقت مل گیا جب ظفر نے ایک مال دار علاقے "جاننگر" پر حملہ کر دیا۔ اس مصر کے میں بہت سامانی دولت اس کے ہاتھ لگا۔ لکھنؤ کی شریپندوں اور باغیوں نے اس تک رسائی حاصل کر لی اور اس کو طرح طرح سے درخلا شروع کر دیا۔ "سلطان بلین اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو مغلوں کے مقابلے کے لیے تعین کر دیا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ مغل ہندوستان میں نہ گھس آتے ہوں اور کوئی نہ کوئی قصبہ نہ اٹھ کھڑا ہوتا ہو۔ مغلوں کے خلاف دفاع کا انتظام شاہان دہلی کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے۔ سلطان بلین اور اس کے لڑکوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ مغلوں کو نظر انداز کر کے لکھنؤ کی کارخ کریں اور نہ ہی اس کے امراء میں کوئی سردار ایسا ہے کہ آپ کے مقابلے پر آئے۔ لہذا آپ چر شاہی سر پر تمہیں اور اپنی بادشاہت کا اعلان فرمادیں۔"

ظفر ان باتوں پر فریفتہ ضرور ہوا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا اور سر درد کا بہانہ کر کے محفل سے اٹھ گیا۔ شریپندوں پر مایوسی چھا گئی۔ وہ آپس میں اس کے خلاف باتیں کرنے لگے۔

"ظفر! ایسی بڑی کامظاہرہ کرے گا، یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ نہ ہوتا تو ہمارے خلاف قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا کیونکہ ہمارے ارادے اس پر ظاہر ہو گئے ہیں۔"

"پھر کیا..... اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچے، ہم اس کے قتل کا بندوبست کرتے ہیں۔ شاید نیا آنے والا ہمارے مطلب کا ہو۔"

"کہہ تو تم جھک رہے ہو لیکن کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟" "اس میں مشکل کیا ہے۔ یہ باتیں چل ہی رہی ہیں۔ ان باتوں کے بہانے اس سے ملاقات کریں گے اور موقع دیکھ کر کام تمام کر دیں گے۔"

"سرسے خیال میں تو ابھی جلدی مت کرو۔ اس کی طرف سے کوئی جواب آنے دو۔ ہو سکتا ہے اسے سوچنے کے لیے وقت درکار ہو۔"

"ٹھیک ہے، دو چار دن اور دیکھے لیتے ہیں۔"

ظفر ان لوگوں کے پاس سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تھا۔ اس وقت ایک ہی موضوع اس کے پاس پہنچنے کے لیے تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ رات کا ایک بڑا حصہ اسی چیز میں گزرا اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے بلین کے غیظ و غضب کو بالائے طاق رکھا اور جو مال قیمت وہ جان بوجھ کر لے لیا تھا، سب اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک ہاتھی تک دہلی کی طرف روانہ نہیں کیا۔ کسی حاکم کے لیے اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کا حصہ برب کرے۔ یہ کھلی بغاوت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بادشاہ اس پر ٹھکر گئی ضرور کرے گا لیکن اسے بھی اپنی عسکری قوت پر ناز تھا لہذا ڈانٹ رہا۔

جب کئی دن گزر گئے اور بادشاہ کی جانب سے نہ تو کوئی قاصد آیا نہ لشکر کشی کی خبر ملی تو اسے تعجب ہوا۔ اسے بادشوق ذرا صبح سے اطلاع ملی کہ بلین سخت بیمار ہے اور ایک مہینہ ہو گیا ہے وہ اپنی راجس گاہ سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اس نے اس وقت کو ختمیت جانا اور لشکر تیار کرنے لگا کہ چاکر صحت یاب ہوئے کے بعد بلین اس طرف کا رخ کرے تو اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اس کے ساتھیوں کو جب اس کے اس اقدام کی اطلاع ہوئی تو ان کی کچھ ڈھارس بندھی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اس بغاوت کے ساتھ ہی اپنی بادشاہت کا اعلان بھی

مکافات

کر دے اور اپنے نام کا سکہ جاری کر کے دہلی سے اپنا رشتہ منقطع کر لے۔ ظفر نے ایک مرتبہ پھر ان کے اس مشورے کو ماننے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی۔

ان شریپندوں کو کوئی تاخیر گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے پھر آپس میں صلاح مشورے کیے اور اگلے ہی دن اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

"آپ کے پاس دہلی سے کوئی خبر آئی۔"

"کبھی خبر؟ بس یہی معلوم ہوا تھا کہ بلین علیل ہے۔"

"وہ انتقال کر چکا ہے۔ سلطنت میں انتشار نہ پھیل جائے اس لیے اس خبر کو چھپایا جا رہا ہے۔"

اس بے بنیاد خبر کو سنتے ہی اس نے تحقیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ چر شاہی سر پر سایہ لگن کیا اور سلطان معز الدین کا خطاب اختیار کیا اور اس کو فخر کے ساتھ خطبہ و سک میں شامل کر لیا۔ وہ چونکہ بہت فیاض تھا اور لوگوں پر کثرت سے بخشش کرتا تھا اس لیے اس شہر کے باشندے اور علاقے کے رہنے والے اس کے ساتھ ہو گئے۔

ظفر کو خودی ر حکومت قائم کرنے پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بلین کی صحت یابی کے فرمان لکھنؤ پہنچے لیکن پانچ دن بعد ہی اس کی کارخ کا حکم آیا اس نے اس کے بڑھ کر پیچھے ہٹنا مناسب نہ سمجھا۔ اپنی اس ناشائستہ حرکت پر تادم ہونے کے بجائے بغاوت پر آمادہ رہا۔ اس کے نادان دوست برابر اسے سمجھاتے رہے کہ بلین کو مغلوں ہی سے فرصت نہیں، وہ لکھنؤ کی کارخ کیا کرے گا۔

بلین کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اسے سخت رنج ہوا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ ایک غلام سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔ ظفر کی بخششوں کی خبریں برابر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا غصہ اور غضب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کا شعلہ غضب ایسا بڑھ گیا تھا کہ کسی کو اس کے سامنے آنے اور کچھ عرض کرنے کی مجال نہیں تھی۔ آخر کئی روز خلوت میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ایک سردار ملک اچھلکین کو جو اس خاں بھی کہلاتا تھا، طلب کیا۔

"تم نے کافریت ظفر کی تنک خرا می کی خبر سن لی ہوگی۔ وہی ظفر جو میرا غلام تھا اور میں نے اسے لکھنؤ کا حاکم بنایا۔ اس نے بغاوت کی ہے اور غلامی کو شاہی سے بدلے کے ور ہے ہے۔"

"جی ہاں یہ خبر میں نے اسی رنج کے ساتھ سنی ہے

جس دکھ کا اظہار آپ نے فرمایا۔"

"یہ نہیں بچو گے میں نے تمہیں کس لیے طلب کیا ہے؟"

"بادشاہوں کے معاملات بادشاہ ہی جانتے۔"

"میں ظفر کو معزول کر کے تمہیں صوبہ لکھنؤ کی حاکم مقرر کرتا ہوں۔ وہ چونکہ بغاوت پر کمر بستہ ہے اس لیے تمہیں اس بغاوت کو کچل کر اپنا غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔"

"مجھے صوبہ داری کا کام کچھ نہیں لیکن میں اس بغاوت کو کچلنے کے لیے آپ کے حکم کی پاسداری ضرور کروں گا۔"

امین خاں سلطان بلین کا غلام تھا۔ برسوں سے اودھ کے اقتدار اس کے پاس تھے۔ اس کا شمار لشکر کے سرداروں میں کیا جاتا تھا۔ سلطان نے چند نامی گرامی امراء کو اس کے ساتھ کیا۔

امین خاں ظفر کی بغاوت فرد کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ امین خاں ہندوستان کے لشکر کے ساتھ جنگ کے لیے مستعد ہو کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر سے ظفر بھی ایک زبردست لشکر کے ساتھ اپنے دارالحکومت سے باہر آیا۔ ایک وسیع میدان میں دونوں کا آسمان سامنا ہوا۔

ظفر کے پاس آدمیوں کی بہت بڑی جماعت اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی کثرت بخشش کی وجہ سے اس علاقے کے باشندے اور خود دہلی سے آئے ہوئے لوگ دل و جان سے اس کے دوست بن گئے تھے۔ یہاں بھی اس نے سبکی کیا۔ نیزے اور تلوار سے کام لینے کے بجائے روئے اور چاندی سے کام لیا۔ امین خاں تو اس کے سپاہیوں کی تعداد دیکھ کر ہی حیران ہو رہا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے اپنے سپاہی بھی رشوت لے کر منحرف ہو چکے ہیں۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا اور امین خاں کا آدھا لشکر ظفر لے جا کر مل گیا۔ جو باقی بچ گئے تھے ایسی بے دلی سے لڑے کہ جلد ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستانی سپاہی ایک سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے کے دوران ہندوؤں نے انہیں خوب لوٹا کیونکہ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔

امین خاں کی شکست کی خبر جو بھی سلطان تک پہنچی، وہ آپے سے باہر ہو گیا اور وہ ایسی حرکت کر چڑھا جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے امین خاں کو قتل کرا کے اس کا سر اودھ کے دروازے پر لٹکوا دیا۔ جنگوں میں فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی۔ شکست کا مطلب ہرگز فدا ر نہیں ہوتا

قلندر کا لقب دیا تھا۔ تین من سونا اسے دیا تھا جس سے اس نے یہ زنجیریں اور دوسرا سامان بنوایا تھا۔ بلہن نے یہ تین من سونا اس سے حاصل کیا اور اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

کھنکھوتی میں موت بھی رخص کر رہی تھی اور موت کا سنا بھی ناچ رہا تھا۔ جنگل کی زمین لاشوں سے پٹ پٹ مٹی تھی۔ جو سزا یاب ہوئے تھے، وہ تو موت کی نیند سو ہی گئے تھے لیکن جو بچ گئے تھے وہ ان سزاؤں کو کچھ کمر گئے۔

سزا میں دینے کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کھنکھوتی کی حکومت اپنے بیٹے بغرا خاں کے سپرد کی اور تنہائی میں اس سے سوال جواب کیے۔

”تو نے دیکھا؟“

اس سوال پر بغرا خاں حیران رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بلہن نے پھر پوچھا۔ ”تو نے دیکھا؟“ وہ پھر حیرت زدہ رہ گیا کہ کیا جواب دے۔ تیسری مرتبہ بلہن نے خود ہی جواب دے دیا۔

”بازار میں تو نے میری سزا دینی دیکھی؟“

”جی، میں نے دیکھا۔“

”اگر کوئی باقی حرام خوردگی تھی تو میری سزاؤں کو یاد کر لیتا اور اچھی طرح سمجھ لیتا کہ جو بھی بادشاہ دہلی سے باقی ہوگا اور اس کے خلاف کھوار اٹھائے گا تو اس کے بوی بچوں اور اس کے ساتھیوں کو بھی یہی سزا دی جائے گی جو غفلت، اس کے بیٹوں اور اس کے آدمیوں کو دی گئی۔“

بلہن نے اس یاد دہانی کے بعد خزانے کے علاوہ جو کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا تھا، وہ سب اسے بخش دیا اور کھنکھوتی میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہو گیا۔

بلہن نے واپسی سے قبل ایک مرتبہ پھر بغرا خاں کو چند مقررین کے ساتھ مجلس خلوت میں طلب کیا اور ان لوگوں کی موجودگی میں اس سے کہا۔

”میں نے تیرے اندر حکومت کرنے کی اہلیت دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو مگر شفقت پداری اور مصلحت مٹکی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھنکھوتی کی اقلیم اور ہنگال کا علاقہ جس تھکے کوڑے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کھنکھوتی سے پانچ چھ منزل ہی دور دہلی کی طرف پہنچوں گا کہ تو بیش و طرب میں مشغول ہو جائے گا مگر کیا کروں میری مصلحت یہی تھی کہ کھنکھوتی کا حاکم تجھے بناؤں۔ اب یہ تیری مرضی کہ تو مجھے سرخرو کرتا ہے

یا عذاب سے دو چار۔“

ان باتوں کے بعد اس نے کوچ کا نشانہ بجایا اور دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

شہر دہلی میں جہاں سلطان تین سال بعد واپس آیا تھا لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد اپنے باپ سے ملاقات کے لیے ملتان سے دہلی آیا اور اعلیٰ درجے کے تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ بلہن اپنے بیٹے کی آمد اور اس کی سعادت مندی سے بہت خوش ہوا اور اسے پدرانہ شفقت سے سرور کیا۔

سلطان محمد دہلی میں رہ کر باپ کی شفقت سے محفوظ ہو رہا تھا کہ مغلوں کی ہنگامہ آرائیوں کی خبریں پہنچنے لگیں۔

بلہن نے مجبور ہو کر سلطان محمد کو رخصت کر دیا۔

شہزادہ سلطان محمد نے ملتان پہنچ کر بے شمار منزل ڈاکوؤں کو جو سرحدی مقامات پر لوٹ مار کا بازار گرم کیا کرتے تھے، تہ تیغ کر کے ان کے قبضے سے اپنا ملک نکال لیا لیکن یہ فتوحات اسے منہنگی پڑ گئیں۔ نانی گرامی چنگیزی امیر تیمور خاں جو ہرات، قندھار اور غزنی وغیرہ کا حاکم تھا، اپنے ہم قوموں کا بدلہ لینے میں ہزار مغلوں کا لشکر لے کر لاہور اور بہاولپور کے درمیانی علاقے میں آیا۔ تیمور خاں ملتان کی طرف بڑھا اور قلعہ دست کر کے سلطان محمد پر حملہ آور ہو گیا۔ سلطان محمد کے لشکر نے نہایت پامردی سے تیمور خاں کے حملوں کا مقابلہ کیا لیکن سلطان محمد کا اقبال بالکل پرفروب تھا۔ اسے فتح مل چکی تھی لیکن موت اس کی ناک میں تھی۔ مغل سپاہی میدان جنگ سے فرار ہوئے تو شہزادے کے لشکر نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ شہزادے نے ہر طرف سے ملہم ہونے کے بعد روایکے کنارے جا بے نماز بھاگی اور ظہر کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مغل سپاہیوں کا ایک دستہ جو کہیں گا ہوں میں چھپا ہوا تھا، باہر نکلا اور سلطان محمد پر حملہ کر دیا۔ شہزادے نے اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر مغلوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ ان سپاہیوں کے ٹھوڑے ٹھکنے سے چور تھے لیکن معرکہ آرا ہونا پڑا۔ کل اس کے کہ مغل شکست کھا کر میدان جنگ سے فرار ہوئے، ایک تیر شہزادے کے آکر لگا اور اس کی روح نفسِ معصی سے پرواز کر گئی۔

☆ ☆ ☆

محل کی دیوار میں کئی روز سے سوگ کا لباس پہنے کھڑی تھیں۔ قہقہہ دہی دہی سسکیوں میں ڈھل گئے تھے۔ گنیزیں،

باندیاں ہنسنے سے پہلے ادھر ادھر کچھ لیتی تھیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ سلطان بلہن پر خان شہید کی موت کا ایسا اثر ہوا تھا کہ کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ کتنا وہ یہی تھا کہ میں راضی پر رضا ہوں لیکن راتوں کو گھبراہٹ کر اپنے بیٹے کو یاد کرتا تھا اور زار و قطار روتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خان شہید کا غم اسے بھی نہیں دے گا تو اس نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خاں کو کھنکھوتی سے بلایا۔

بغرا خاں وہاں سے چل پڑا لیکن وہ ابھی راستے میں تھا کہ بلہن کی کمزوری نے بیماری کی صورت اختیار کر لی اور وہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ بغرا خاں نے باپ کی بیماری کا حال سنا تو ساتھیوں کو چھوڑا اور اکیلا ہی خیر رفتاری سے سفر طے کرتا ہوا دہلی کی طرف دوڑا۔ دیکھا تو بلہن کے چہرے پر موت کے آثار دکھائی دیے۔ دیر تک دلاسا دیتا رہا۔ بلہن نے خفیف آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”تمہارے بھائی کی وفات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں موت کے قریب آ پہنچا ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ خان شہید کے سوا میرا کوئی وارث نہیں۔ ایسی حالت میں تمہارا مجھ سے دور رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ تمہارا بیٹا کیتا اور خان شہید کا لڑکا کچھ دو دنوں ہی ابھی نو جوان ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کے ہاتھ حکومت آگئی تو خدا جانے وہ اپنی تاجرہ کاری اور جوشِ جوانی کے باعث کیا کچھ کریں۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔“

بغرا خاں نے باپ کے حکم پر تسلیم فرم کیا اور دہلی میں قیام کی ضمان لی۔ بادشاہت خود بخود اس کی طرف چل کر آ رہی تھی۔ وہاں امید میں دہلی میں بیٹھارہا کہ بلہن کا انتقال ہوا اور کب وہ تخت پر بیٹھے۔ اس نے دو تین نام ایسے بھی سوچ لیے تھے جنہیں وہ اپنی جگہ کھنکھوتی کا حاکم بنا سکتا تھا۔

کچھ دنوں بعد بلہن کی طبیعت سنبھلنے لگی اور اس کے پیروں سے صحت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ طبیعوں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا۔ اب بغرا خاں کا یہاں رہنا بے کار تھا۔ اس نے شکار کا بھانڈا کیا اور باپ کو بتائے بغیر ہی کھنکھوتی چلا گیا۔

جب بلہن کو یہ معلوم ہوا کہ بغرا خاں نے شکار کا بھانڈا لیا تھا اور اس نے راستے ہی سے شکار کے لیے ساتھ جانے والوں کا ساتھ چھوڑا اور کھنکھوتی چلا گیا۔ یہ سنتے ہی بلہن کی حالت خیر ہو گئی۔ اسے خان شہید کی موت سے بھی زیادہ بغرا

خاں کی نافرمانی کا صدمہ ہوا۔ اسی صدمے نے اسے ایک مرتبہ پھر بستر پر ڈال دیا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ اس نے بڑے بیٹے خان شہید کے لڑکے کچھ کو بلایا۔ اس کے ساتھ ہی کوتوال دہلی، حضرت خواجہ حسین اور اپنے چند مقررین کو جو حکومت کے معاملات کو خوب سمجھتے تھے، اپنے پاس بلایا اور ان کے سامنے اپنی وصیت کا اظہار کیا۔

”اب میرا وہ وقت آ گیا ہے جس کا سامنا ہر بادشاہ کو کرنا پڑتا ہے، یعنی میری موت نزدیک ہے اور میرے بعد کسی کو میرا جانشین بھی ہونا ہے۔ تم کو چاہیے کہ میرے بعد کچھ کو جو میرے بڑے بیٹے خان شہید کا لڑکا ہے، اسے میں نے ولی عہد بنا دیا ہے۔ وہ حکومت کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس کو میرے تخت پر بٹھلاؤ۔ اگرچہ وہ کم سن اور جوان البصر ہے اور حکمرانی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن میں کیا کروں بغرا خاں جس سے کچھ کام چل جاتا اور لوگوں کو اس سے کچھ امید بھی تھی، کھنکھوتی چلا گیا۔ لہذا میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ کچھ دن کے حق میں بادشاہی کی وصیت کروں۔ میرے بعد تم لوگ کچھ کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیتا اور کیتا کو اس کے باپ کے پاس کھنکھوتی بھیج دیتا۔“

جب بلہن یہ وصیت کر رہا تھا کوتوال ملک خرم الدین بھی موجود تھا۔ اسے خان شہید سے کسی وجہ سے پر خاش تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بادشاہ بنے۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا لیکن دل میں منصوبے بھی بناتا رہا کہ کس طرح کچھ کو کے بجائے کیتا کو بادشاہ بنا جائے۔

اس وصیت کے بعد تیسرے دن بلہن کا انتقال ہو گیا۔

جس وقت سلطان بلہن کا جنازہ ”کوٹک لعل“ سے باہر لایا گیا اور ”دارالامان“ میں اتارا گیا تو ملک خرم الدین کوتوال نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور اتنی بلنے آواز میں بین کرنے لگا کہ تمام حاضرین سن لیں۔

”اس بادشاہ کے مرنے پر جس نے دو قرن تک بادشاہی کی اور جو ملک کے عوام و خواص کے نیک و بد سے واقف ہو گیا تھا اور لوگوں کے اس پر اور اس کے لوگوں پر بہت سے حقوق تھے، آج کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کے مرنے کے بعد پانی بھی اطمینان سے پیا ہو۔ ایسے خدا ترس بادشاہ کے مرنے کے بعد وہ وقت آ گیا ہے کہ جب ہر شاکستہ اور ناشاکستہ شخص کے دل میں بادشاہی کی ہوس اور سرداری کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جو جماعتیں اس پلٹے کار

بادشاہ کی حکومت کی وجہ سے متحد ہو گئی تھیں، منتشر ہو جائیں گی اور قدیم خاندان تخریب ہو جائیں گے۔ اسی لیے اس شخص کو تخت نشین کیا جائے گا جو اس کا سچا جانشین ہوگا۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کریں گے لیکن میں کیونکہ سلطنت کا وسیع تجربہ رکھتا ہوں اور سلطان بلبن نے مجھ سے بہت سی ایسی باتیں کہی تھیں جن کی روشنی میں قرعہ قائل میں اسی کے نام نکالوں گا جس کی خواہش سلطان مرحوم کیا کرتے تھے۔

ملک فخر الدین نے جان بوجھ کر اس وصیت کا ذکر نہیں کیا جو بلبن نے آخری وقت کی تھی۔ وہ قریب ہی وہاں موجود تھے جن کے سامنے یہ وصیت بیان ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی کوئی خیال نہیں کیا کہ وصیت کا ذکر کیوں نہیں آیا۔ ملک فخر الدین کو تو ال اور اس کے عملے کے لوگ شہر میں بہت دلبر تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا۔ امراء کبار بھی اس سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کو تو ال کو خان شہید کے بیٹے بکھر دے پر خاص ہے اور وہ بھی اسے تخت نشین نہیں ہونے دے گا۔

جب بادشاہ کی تدفین ہو چکی تو ملک فخر الدین اپنے عملے کے چند ارکان کے ساتھ بکھر دے کے سامنے حاضر ہوا۔ کچھ دیر تک خان شہید اور بلبن کی تعزیت کرتا رہا پھر اپنے مطلب پر آ گیا۔

خان شہید کے انتقال کے بعد لاہور، ملتان اور گرد و نواح کا انتظام آپ نے سنبھال لیا تھا۔ مغلوں کا زور آپ نے نس خوبصورتی سے توڑا تھا لیکن سلطان مرحوم کے انتقال کے بعد اور آپ کی غیر حاضری انہیں بھرپور حوصلہ دے گی کہ وہ حملہ آور ہوں۔ اس وقت آپ کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

بکھر دے کو تو ال کے ارادوں سے بے خبر تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ سلطان بلبن نے کیا وصیت کی ہے، حیران ہوا کہ آخر اتنی رات گئے کو تو ال کو کیا ضرورت پیش آ گئی جو یہ اطلاع دینے آ پہنچا۔

”عم محترم! میں سازش نہیں ہوں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں کہ دیکھوں گے دہلی کا بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی میں اس کا خواہش مند ہوں۔ مجھے ملتان پہنچنے میں عار نہیں لیکن ایسی جلدی بھی نہیں۔ دادا جان کا آج ہی تو انتقال ہوا ہے۔ کم از کم سوئم تک تو مجھے دہلی ہی میں رہنا ہوگا۔“

”میری یہ مجال نہیں کہ آپ کو مجبور کروں لیکن سلطنت کا خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو

آج رات ہی ملتان کی طرف کوچ کرنا چاہیے۔“

”میں بھی یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں کہ مجھے اتنی جلدی میں یہاں سے جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”جوابات میں کہنا نہیں چاہتا تھا آپ نے وہ کہنے پر مجبور کر ہی دیا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ مغل لشکر سلطان بلبن کی وفات کی خبر سننے ہی لاہور اور دہلی پور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا ہدف یقیناً ملتان ہوگا۔ آپ دہلی کی طرف سے مطمئن رہیں۔ یہاں میں موجود ہوں۔ آپ ملتان کی فکر فرمایاں۔“

”عم محترم! صورت حال یہاں کی بھی قابلِ رشک نہیں۔ دن بھرے ہی سخت ٹھنڈی کے چھڑے اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ان چھڑوں میں پڑ کر ملتان سے غافل نہ ہو جائیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دہلی میں موجود ہوں۔ یہاں اجرتی نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب سلطان معظم مغول کی سرکوبی کے لیے نکلتی تھی تحریف لے گئے تھے تو اس فقیر ہی نے سلطنت کے انتظامی امور سنبھالے تھے۔ وہی تجربہ اب کام آئے گا اور کسی مفید کو یہ خیال نہیں آئے دوں گا کہ اب سلطان بلبن اس دنیا میں موجود نہیں۔ آپ کے والد محترم خان شہید کی روح خوش ہوگی کہ آپ ان دشمنوں سے بدلہ لیں گے۔ دہلی کے تخت پر کوئی بچہ بھی بیٹھ جائے گا تو مغلوں کی ہمت نہیں ہونے دوں گا کہ اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں۔“

ملک فخر الدین کو تو ال نے یہ باتیں کچھ اس طرح کہیں کہ بکھر دے اسی وقت سفر کی تیاری کی اور دہلی سے نکل کھڑا ہوا۔

بکھر دے روانہ ہوتے ہی فخر الدین کو تو ال نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ طاری کی اور خواجہ حسین۔۔۔۔ وزیر کی ذیوضی پر پہنچ گیا۔ رات اتنی گزر چکی تھی کہ دروازے بند تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد اس نے پہرے والوں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ وزیر محترم تک اس کی آمد کی اطلاع پہنچا دیں۔ وہ کوئی دیر نہیں فخر الدین کو تو ال تھا۔ شہر کا نظم و ضبط اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے عملے کے افراد سے سبکی ڈرتے تھے اور پھر یہ تو جانتی ہی رہا تھا۔ تخت خالی پڑا تھا۔ کوئی بھی مخالف طاقت سراٹھا سکتی تھی۔ کو تو ال کی ایسے ناوقت آمد نے وزیر کو بھلا دیا اور اسے فوراً طلب کر لیا۔

”فخر الدین! خیر تو ہے۔ اس وقت ا۔۔۔“

”خیر ہی تو نہیں۔“

”یا اللہ خیر۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔“

”میں ابھی شیخ زادہ بکھر دے کی طرف گیا تھا تاکہ اسے سلطان کی وصیت سے آگاہ کروں۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ اس کے محل میں کیا تو معلوم ہوا وہ ملتان روانہ ہو گیا ہے۔“

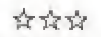
”ملتان۔۔۔ کیا آپ نے اسے سلطان کی وصیت سے آگاہ نہیں کیا تھا؟“

”اس کا وہاں گزرنے سے آگاہ کر دیا تھا لیکن نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی۔ اسے شاید بادشاہ سے زیادہ اپنے باپ خان شہید کی جاگیر کی فکر تھی۔“

”کیا وہ باقی ہو گیا؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔ اگر میں اس کے قہاقب کے لیے فوج روانہ کرتا تو اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ ان بکھروں میں پڑنے کا وقت بھی نہیں کیونکہ تخت خالی پڑا ہے۔ میں آپ کے پاس یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ بکھر دے کے بیٹے کیتبا کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ کیتبا، بکھر دے کے برعکس نیک نفس اور سیدھی سادی طبیعت کا مالک ہے۔ اس نے غیاث الدین بلبن کی آغوشِ محبت میں تربیت حاصل کی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم کیتبا کو بادشاہ کا جانشین منتخب کریں۔“

وزیر نے ملک فخر الدین کی رائے سے اتفاق کیا لیکن دوسرے امیروں کی رائے کو بھی ہموار کرنا تھا لہذا اسی رات دربار منعقد کر لیا۔ ملک فخر الدین نے وہاں بھی وہی باتیں کہیں جو وہ وزیر سے کر چکا تھا۔ ان سب نے بھی فخر الدین کی بات میں ہاں ملائی۔ اس لیے بھی کہ یہ باتیں بظاہر مناسب نظر آ رہی تھیں اور آپس میں مشورہ کر کے کیتبا کو ”ممتاز الدین“ کا خطاب دے کر بلبن کا جانشین بنادیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال تھی، گویا منتی جوانی اور اتنی بڑی سلطنت۔



سلطان معز الدین ایک خوش اخلاق اور حسین شیخ زادہ تھا۔ اس کی طبیعت صاف اور عادات پاکیزہ تھیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بلبن کی زیر نگرانی پر دربار پانے کی وجہ سے نہایت پابندیوں میں اس عہد تک پہنچا تھا۔ نہایت سخت نگراں اس کی دلچسپی بھال کے لیے رکھے گئے تھے جبکہ جوانی کے نشانات اسے بے قرار رکھتے تھے۔ جوانی کی خواہشات پوری کرنے کی تمنا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا شوق اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ اسے جیسے ہی

بادشاہت ملی، وہ بے مبری سے ساری بندشیں توڑ کر اپنے مقاصد اور خواہشات پوری کرنے میں بے لگام ہو گیا۔ اس نے جو کچھ لکھا پڑھا تھا، سب بکسر بھلا دیا۔ ادب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا اور عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ جوانی کی خواہشات کی تکمیل کو اس پر جہاں بانی اور مہمات جہاں داری پر ترجیح دینے لگا۔ سلطان بلبن کی بادشاہی اور سزاؤں کے خوف نے لوگوں کے دلوں سے لہو و لہجہ کی آرزو اور شراب نوشی کی تمنا تک دلوں سے نکال دی تھی۔ اب جوئے بادشاہ کو رنگ رلیاں مٹاتے ہوئے دیکھا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے کار لوگوں کی بن آئی۔ عیش و عشرت کے جتنے دلداد وہ تھے اور اب تک گوشہ گیر تھے، سب کام سے لگ گئے۔ بالا خانوں پر حسین عورتیں جلوہ نمائی کرنے لگیں۔ عیاش اور ادبائوں کے دن پھر گئے۔ مسخروں کی قسمت جاگ اٹھی۔ رنہ رنہ ارکانِ دولت بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔

سلطان معز الدین شہر کی سکونت ترک کر کے باہر چلا گیا اور ایک مقام کیلکھری میں دریائے جتنا کے کنارے محل بنوایا اور اپنے خاص مصاحبین کو لے کر وہاں چلا گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ کیلکھری میں سکونت کی طرف مائل ہے تو انہوں نے بھی اپنے محلوں میں مکانات اور قصر بنوا لیے۔ جب کیلکھری کی شہرت دور و نزدیک پھیلی تو ہر علاقے سے مطرب، خوش الحان گویے اور بھانڈے دربار میں آ گئے۔ فسق و فجور عام ہو گیا۔ مسجدین نمازیوں سے خالی ہو گئیں۔ شراب خانے آباد ہو گئے۔

ملک فخر الدین نے نہایت چالاکی سے سلطنت کے تمام امور اپنے داماد ملک نظام الدین کے حوالے کر دیے۔ کیتبا کی پیش گوئی اور بے خبری کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کے سر میں حکومت کرنے کا سوا سامان نہ تھا۔ اس کے خیال میں ایسے بادشاہ کو حکومت سے علیحدہ کرنا نہایت آسان تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سازشی عمل شروع کر دیا۔ اس نے جب اوپر دھڑ نظر دوڑائی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بغرا خاں کھنڈی کی حکومت پر انکسار کے بیگلے میں خاموشی سے بیٹھا ہوا ہے۔ لے دے کہ بکھر دے ایسا ہے جو رکاوٹ کا باعث بن سکتا ہے لہذا اس نے بکھر دے کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس کی تباہی کے منصوبے باندھنے لگے۔ چند برس امراء کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک دن سو بھگت دیکھ کر کیتبا کے حضور پہنچ گیا۔ اس وقت بھی کیتبا کے ارد گرد جام و صراحی رکھے ہوئے تھے اور پری رہ

حسینا بھی مغل سمجھائے ہوئے تھیں۔ نظام الدین کی دخل اندازی اسے بری معلوم ہوئی تھی لیکن وہ اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے مجلس متوقف کی اور ملک نظام الدین کو یاریابی کی اجازت دے دی لیکن اپنی ناگواری کو چھپا نہیں سکا۔

”نظام الدین! جو کہنا ہے جلدی کہو۔“
”حضور! جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس میں جلدی نقصان دہ ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نہایت اطمینان سے میری گزارشیں۔“

”کسی جمہور کی ضرورت نہیں۔ جو کہنا ہے براور است کہو۔“
”حضور! امراء و ملوک مختلف گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں جس سے مملکت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔“
”اس انتشار کو ختم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ میرے پاس کیوں چلے آئے ہو؟“

”اس لیے کہ جو قدم میں اٹھانے والا ہوں اس میں مجھے آپ کی اجازت اور مدد کی ضرورت ہے۔“
”میری طرف سے اجازت ہے اور مدد بھی ملے گی۔“
”تو ہم کرم تر کر کے اور کچھ دیکھا طلب فرمائیے۔“
”کچھ دیکھ کر وہ درمیان میں کہاں سے آگیا؟“
”یہ انتشار اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر وہ سخت شاہی پر قبضہ کرنے کا عزم کر چکا ہے۔“

”یہ کونسا ممکن ہے؟“
”کچھ دیکھ کر وہ شاہی پر قبضہ کرنے کا عزم کر چکا ہے۔“
”کچھ دیکھ کر وہ شاہی پر قبضہ کرنے کا عزم کر چکا ہے۔“
”کچھ دیکھ کر وہ شاہی پر قبضہ کرنے کا عزم کر چکا ہے۔“

”کیا یہ اتنا ہی آسان ہوگا جتنا تم کہہ رہے ہو؟“
”یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کو تو میں طلبی کا حکم نامہ تر کر رہا ہوں۔“
”کاتب سے کہو وہ فرمان تحریر کر دے، ہم اس پر دستخط کر دیں گے۔“

”میں نے تحریر لکھوائی ہے۔“
”ملک نظام الدین نے تحریری فرمان اس کے سامنے رکھ دیا۔ قیقاو نے دستخط کر دیے اور ملک نظام الدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ آیا۔“

اس سے پہلے کہ یہ فرمان کچھ دیکھ پہنچتا، اسے معلوم ہو گیا کہ طلبی کے احکام پہنچنے والے ہیں۔ ملک نظام الدین کی

سازشوں کی خبریں بھی اس تک پہنچ رہی تھیں لہذا وہ چونکا ہو گیا۔ وہ اس سازش کا اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خفیہ طور پر غزنی پہنچا اور وہاں کے حاکم تیمور خاں سے مدد کا طالب ہوا۔ تیمور خاں نے اس سے ہمدردی کا اظہار تو ضرور کیا لیکن اس کی امداد سے معذرت کر لی۔ کچھ دیر کی دن تک وہاں مقیم رہا اور پھر رنجیدہ و ملول غزنی سے ملتان واپس آگیا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی قیقاو کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کرے۔ اس نے ملتان پہنچنے ہی قیقاو کے پاس یہ پیغام بھجوایا۔

”میرا یہ فرض ہے کہ میں ہر حال میں تمہاری اطاعت اور فرمان برداری کروں اور مجھے یہ یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے برادرانہ محبت اور خلوص ہے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دربار کے کچھ عاقبت نامہ نش لوگ تمہارے اور میرے درمیان فساد کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔ یہ اہل فرض لوگ تمہیں میرے خلاف اکسائے رہتے ہیں اور میری طرف سے تمہارے کان بھرتے رہتے ہیں لیکن اگر تم مجھے اپنا بھی خواہ اور سچا ہمدرد سمجھ کر میرے باپ کی جگہ میرے حوالے کر دو تو یہ فعل برادرانہ شفقت کے عین مطابق ہوگا۔“

چند روز کے وقفے کے بعد اسے قیقاو کا جواب موصول ہوا۔

”میں دنیا میں تجھ سے بڑھ کر کسی اور سے محبت نہیں کرتا ہوں۔ جو کچھ گزر چکا اسے تم اپنے دل سے نکال دو اور بغیر کسی خوف و خطر میرے پاس آ جاؤ تاکہ بد زبانوں کی زبانیں بند ہو جائیں اور میں تمہیں عزت و حریم کے ساتھ ملتان کا حاکم مقرر کر دوں۔“

ملک نظام الدین کی نظروں سے یہ پیغام چھپا نہ رہ سکا۔ وہ قیقاو کو درگ نہیں سکتا تھا لیکن اس کے فیصلے کو تبدیل ضرور کر سکتا تھا۔ اس نے متوجہ دیکھا اور ایک ایسے وقت قیقاو کی خلوت میں پہنچ گیا جب وہ نشے کی آخری حدوں پر تھا۔ حسین کنیز نے اس کے ہوش و حواس پر غالب آچکی تھیں۔ اس مدہوشی کے باوجود ملک نظام الدین کا خوف اس پر ایسا غالب تھا کہ وہ باریابی کی اجازت دے بغیر نہ رہ سکا۔

”میں نے یہ سنا ہے کہ آپ نے کچھ کو برادرانہ شفقت کے ساتھ طلب کیا ہے اور ملتان کی حکمرانی دینے کا وعدہ بھی کر لیا ہے؟“
”آپ نے بالکل درست سنا ہے۔“
”یہ پیغام بھیجے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔“
”آپ کا بھی مشورہ یہی تھا۔“

”لیکن یہ مشورہ نہیں تھا کہ آپ اسے ملتان کا حاکم بناویں۔“
”وہ میرا بھائی ہے۔“

”مگر وہ آپ کو انار حریف سمجھتا ہے بھائی نہیں۔ اس نے کئی امراء سے خفیہ مراسلت کر رکھی ہے۔ وہ ملتان کا حاکم نہیں، دہلی کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ آپ کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر آپ کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتا ہے۔“

قیقاو کو ملک نظام الدین کی دخل اندازی نامحسوس معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ نشے میں بھی تھا۔ چاہتا تھا کہ ملک نظام الدین قصہ مختصر کرے اور یہاں سے روانہ ہو جائے۔

”تم اگر کچھ دیکھو کہ اسے سے ہٹانا چاہتے ہو تو ہٹا دو مگر اس وقت میری جان چھوڑ دو۔“
”کچھ دیکھو کہ اسے سے ہٹانا چاہتے ہو تو ہٹا دو مگر اس وقت میری جان چھوڑ دو۔“

نشے کے عالم میں غفلت کی اس کیفیت میں اس نے ملک نظام الدین کی باتوں کا یقین کر لیا اور کچھ دیکھ کر اس نے زبان لکھ کر نظام الدین کے حوالے کر دیا۔ اس فرمان کے پہلے ہی ملک نظام نے اپنے چند خاص امیروں کو کچھ دیکھ کر دہلی پر مقرر کر دیا۔

بے خبر کچھ قیقاو کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی وہ درجہ تک پہنچا تھا کہ ملک نظام کے پیچھے ہوئے آدھوں نے اسے گھیر لیا اور معمولی سے مقابلے کے بعد اسے قتل کر دیا۔

کچھ دیکھ کر ملک نظام نے دوسرے امراء پر نگاہ ڈالی اور اس نے ملتان کے حاکم ملک نظام بیگ اور لاہور کے حاکم ملک ترکی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور بالآخر وہ ان مقاصد میں بھی کامیاب ہو گیا۔
ان امراء کی تباہی و بربادی کے بعد قیقاو پوری طرح ملک نظام کے قبضے میں آ گیا۔ اگر کوئی امیر خود قیقاو کی ہمدردی میں اس سے ملک نظام الدین کے بارے میں کچھ کہتا تو قیقاو فوراً نظام الدین کو اطلاع کر دیتا اور گرفتار کر کے ملک نظام کے سپرد کر دیتا۔
یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ملک نظام کی بیوی نے شاہی محلات کی طرف توجہ کی۔ وہ بادشاہ کی منہ بولی ماں بن کر شاہی محلات پر چھائی اور ہر طرف اس کا حکم چلنے لگا۔ جو امراء کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے، وہ نظام الدین کی طرف ملک نظام کی طاقت کا سکہ پیش کیا۔ سب دیکھ رہے

تھے قیقاو کے پردے میں وہی حکومت کر رہا ہے لہذا سب اس سے ڈرنے لگے۔
ابھی یہ قصہ چل ہی رہا تھا کہ مغلوں کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ مغلوں کی فوج لاہور کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک برلاس۔۔۔۔۔ اور خان جہاں کو روانہ کیا گیا۔ لاہور کے نواح میں فریقین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ اس لڑائی میں مغلوں کے بہت سے سردار مارے گئے اور جو بچ گئے تھے انہیں گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔

اس کے بعد ملک نظام نے عیاری اور چالاکی کا ایک اور چال بچھایا۔ ایک روز تہذیبی میں اس نے قیقاو سے کہا، جو مغل سردار سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے دہلی میں مقیم ہیں، ایک ہی قوم کے ہیں اور نہایت با اقتدار ہیں۔ اگر سب نے مل کر آپ سے غداری اور مکاری کی تو انہیں سنبھلانا مشکل ہو جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ ہم مغل حملہ آوروں سے مقابلہ کرتے ہیں اور انہی کے ہم قوموں کو اقتدار میں رکھے ہوئے ہیں۔

قیقاو ان تو ہم آئینہ باتوں میں آ گیا اور اس نے دہلی کے تمام مغل امیروں کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ ملک نظام نے ان امراء کو ایک ہی دن میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ دہلی کدہ امراء جو مغل امیروں کے رشتے دار تھے انہیں گرفتار کر کے دوردراز علاقوں میں بھجوا دیا گیا اور مختلف قلعوں میں نظر بند کر دیا گیا۔

قدیم امراء کو خوب اچھی طرح تباہ کرنے کے بعد ملک نظام الدین نے دوسرے امراء پر نگاہ ڈالی اور اس نے ملتان کے حاکم ملک نظام بیگ اور لاہور کے حاکم ملک ترکی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور بالآخر وہ ان مقاصد میں بھی کامیاب ہو گیا۔
ان امراء کی تباہی و بربادی کے بعد قیقاو پوری طرح ملک نظام کے قبضے میں آ گیا۔ اگر کوئی امیر خود قیقاو کی ہمدردی میں اس سے ملک نظام الدین کے بارے میں کچھ کہتا تو قیقاو فوراً نظام الدین کو اطلاع کر دیتا اور گرفتار کر کے ملک نظام کے سپرد کر دیتا۔
یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ملک نظام کی بیوی نے شاہی محلات کی طرف توجہ کی۔ وہ بادشاہ کی منہ بولی ماں بن کر شاہی محلات پر چھائی اور ہر طرف اس کا حکم چلنے لگا۔ جو امراء کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے، وہ نظام الدین کی طرف ملک نظام کی طاقت کا سکہ پیش کیا۔ سب دیکھ رہے

درباردار کر کے لگے اور اپنے آپ کو اس چالاک و عیار امیری دست برد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی بارگاہ ہر وقت اور بے نور ہو کر رہ گئی۔ دربار شاہی کی تمام شان و شوکت اب نظام الدین کے دروازے پر نظر آنے لگی۔

یہ خبریں اتنی گرم ہوئیں کہ ملک فخر الدین کو تو اس تک بھی پہنچیں۔ ملک نظام الدین اس کا بھتیجا اور داماد تھا لہذا اس نے اسے طلب کیا اور اس کے فاسق ارادوں سے اسے روکنے کے لیے گفتگو کی اور عقلی دلائل سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ سلطنت کے خواب دیکھنا چھوڑ دے لیکن ملک نظام پر اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس قول پر قائم رہا کہ جو چھوہ کر رہا ہے وہی درست ہے۔

”آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے اور آپ کے کہنے کے خلاف عمل کرنا نادانی اور حماقت ہے لیکن میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس سے تمام خلق خدا میری مدد میں ہوئی ہے۔ اب اگر میں اپنے ارادے سے منحرف ہو گیا تو لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔“ ملک نظام نے کہا۔

ملک فخر الدین نے یہ جواب سن کر اسے بہت سخت ست کہا اور لعنت طاعت کر کے اپنے سامنے سے دور کر دیا۔

کیتباد کا باپ بغرا خاں گھنٹوں کی محنت میں تھا لیکن ملک نظام کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی خبریں اس تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اس نے ایک نصیحت آمیز خط کیتباد کو لکھا۔ اس خط میں ملک نظام الدین کی عیاری و چالاک اور اس کے ارادوں سے کیتباد کو آگاہ کیا گیا تھا لیکن کیتباد کو جوانی اور بادشاہی کے نشے اور شراب کی مسقت نے ایسا مدھوش کر دیا تھا کہ اس نے باپ کی نصیحتوں پر کان تک نہیں دھرا اور ملک نظام کے غدارانہ خیالات کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

سلطان معز الدین کیتباد کی غفلت اور بے پروائی کی خبریں سن کر اس کا باپ گھنٹوں کی محنت میں دل ہی دل میں غم کھاتا رہتا۔ تجربے کے آئینے میں کیتباد کی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ میری عدم موجودگی میں میرے پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوگا لہذا اس نے طے کیا کہ بیٹے سے ملاقات کرے اور جو کچھ اس سے کہنا ہے وہ اس کی موجودگی میں کہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کیتباد کو خط لکھا۔

”اے فرزند! تو بادشاہ سے اور عیش و طرب تجھ سے جا نہیں سکتا لیکن میرے دیدار کو تو غنیمت سمجھ لے کہ اب مجھ میں تجھ سے ملنے کے اشتیاق کو برداشت کرنے کی طاقت

بانی نہیں رہی۔“

جب کیتباد نے باپ کا یہ محبت آمیز خط پڑھا تو اسے بھی ملاقات کا شوق ہوا۔ اس نے بھی اظہار اشتیاق کیا اور اپنی محبت آمیز عرضی مقررین کے ذریعے باپ کے پاس روانہ کی۔ خطوط کے تبادلے کے بعد یہ طے ہوا کہ کیتباد دہلی سے اودھ آجائے گا اور بغرا خاں گھنٹوں کی محنت سے روانہ ہو کر دریائے سرسوتک آئے گا اور وہیں باپ بیٹے کی ملاقات ہوگی۔

کیتباد کسی دشمن سے نہیں اپنے باپ سے ملاقات کے لیے نکل رہا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ تنہا جائے لیکن ملک نظام اس ملاقات کو جنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کیتباد کو اس ارادے سے روکا۔

”آپ کے لیے تنہا اتنی طویل مسافت طے کرنا خلاف مصلحت ہے۔“ ملک نظام نے کہا۔

”میں کسی دشمن سے نہیں، اپنے باپ سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔“ کیتباد نے کہا۔

”امور مملکت میں باپ بیٹے کے رشتے کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مصلحت یہ ہے کہ آپ سلطنت کے ساز و سامان اور آراء و افکار کے ساتھ سفر کریں۔“

کیتباد نے اس نصیحت کو تسلیم کیا۔ اس نے حکم دیا کہ لشکر اور شاہی کارخانوں کو مرتب کیا جائے۔ چند روز میں ان کو مرتب کر لیا گیا اور کیتباد بادشاہی شان و شوکت کے ساتھ اودھ کی طرف کوچ کر گیا۔ ملک نظام تو ایک لمحے کے لیے اسے اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ اس سفر میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا اور مختلف جیلے بہانوں سے یہ کوشش جاری رکھے ہوئے تھا کہ کسی طرح دونوں باپ بیٹے کی یہ ملاقات جنگ میں تبدیل ہو جائے۔

معز الدین کیتباد کا لشکر زمین کو دھاتا، بگل بجاتا، شان و شوکت کی جلوہ بازی کرتا اودھ کے علاقے میں پہنچا۔ بادشاہ کے خیمے دریائے سرسوت کے کنارے لگا دیے گئے۔

بغرا خاں نے جب سنا کہ اس کا بیٹا لاؤ لشکر کے ساتھ آیا ہے تو ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ ملک نظام الدین کی سازشوں سے وہ واقف تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ملک نظام اسے ملاقات کے لیے نہیں جنگ کے لیے لایا ہے۔ اس نے بھی مقابلے کی نیت سے لشکر تیار کیا اور لا تعداد جنگی ہاتھیوں کے ساتھ گھنٹوں سے باہر آیا اور متواتر کوچ کرتا ہوا۔ دریائے سرسوت کے کنارے قیام کیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دریا کے ایک کنارے پر

مکافات

بیٹے کا اودھ دست بوسی کی شرائط بھالائے گا۔“

بغرا خاں نے اس شرط کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ملک نظام کو خط تحریر کیا۔

”مجھے بیٹے کی خدمت میں حاضر ہونے سے عار نہیں۔ اگرچہ وہ میری اولاد ہے لیکن میرے باپ کی جگہ دہلی کے تخت پر بیٹھا ہے۔ دہلی کا تخت بہت عظیم الشان تخت ہے۔ دوسری تمام اقامت کے بادشاہوں پر دہلی کے بادشاہ کی تعظیم و تکریم واجب ہے۔ میں اگرچہ سلطان ملین کا لڑکا ہوں اور اس تخت پر میرا ہی حق تھا لیکن چونکہ وہ میرے بیٹے کو مل گیا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں وہ خود مجھے ہی مل گیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد بھی وہ اسی کو پہنچتا۔ اب میری زندگی میں اس کو مل گیا تو مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہے کہ دہلی کی حکومت میرے ہی گھرانے میں رہی۔ اس صورت میں اگر میں بادشاہ دہلی کی عزت و حرمت کا پورا احترام نہ کر دوں گا اور اپنے بیٹے کی خدمت میں حاضر نہ ہوں گا، اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا اور اس کے سامنے کھڑا نہ ہوں گا تو بادشاہ دہلی کا دبدبہ قسم ہو جائے گا۔ اس سے مجھے اور میرے بیٹے دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ نیز مجھ کو میرے باپ نے وصیت کی تھی کہ میں بادشاہ دہلی کا خلیفہ اور فرماں بردار رہوں اور اس کا احترام کروں۔“

ملک نظام یہ سمجھ رہا تھا کہ بغرا خاں اس شرط کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا اور بات ملاقات سے جنگ کی طرف لوٹ جائے گی لیکن اس خط کے پہنچنے کے بعد ملاقات کو ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شاہی منہج کو طلب کیا۔ اس نے زانچہ دیکھ کر دونوں کی ملاقات کے لیے ایک مبارک دین مقرر کر دیا۔ اس روز دربار کا راستہ کیا اور تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

بغرا خاں، دربار کے دالان میں آیا اور تین جگہ زمین بوسی کی شرط پوری کی۔ جب وہ تخت کے سامنے پہنچا تو کیتباد اپنے باپ کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ شاہی غوث کو خیر باد کہہ کر تخت سے اتر آیا اور باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ بادشاہی دبدبہ ایک طرف رہ گیا شفیقت پدیر نے دامن کھینچ لیا۔

باپ بیٹے پر رقت طاری ہو گئی اور دونوں رونے لگے۔ کیتباد کا حال تو یہ تھا کہ روتا تھا اور باپ کے قدموں پر آنکھیں رکھ کر ملتا تھا۔ جب اس کی حالت میں قدرے سکون ہوا تو باپ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور تخت پر بٹھلایا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ دیر تخت کے سامنے مودبانہ کھڑا رہے لیکن کیتباد تخت سے اتر آیا اور باپ کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گیا اور اپنی دائیں طرف بٹھایا۔ سونے اور چاندی کے ننگے چھاور

کیتباد کا لشکر تھا، دوسرے کنارے پر اس کا باپ بغرا خاں لشکر انداز تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے عینوں کو بے آسانی دیکھ سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر باپ کے لیے ایک مرتبہ بھر ہوش مارا۔ وہ جنگ کے ارادے سے نکلا تھا لیکن دوسری طرف لگے بیٹے کے خیمے کو دیکھ کر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور بیٹے سے ملاقات کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں جانب سے سربراہان و دروہ لوگ باپ اور بیٹے کے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف سے پیغام لاتے اور لے جاتے تھے۔

ملک نظام، کیتباد پر چھلپا ہوا تھا۔ اس کے ارادے اسی صورت میں پورے ہو سکتے تھے کہ باپ بیٹے میں صفی رہے لہذا وہ برابر کوشش کرتا رہا کہ باپ بیٹے میں صلح نہ ہونے پائے۔ کیتباد بھی ملک نظام کے بیکارے میں آکر باپ سے معرکہ آرائی کے لیے تیار ہو گیا۔

بغرا خاں نے جب دیکھا کہ جنگ کی نوبت قریب آگئی ہے تو اس نے پدرانہ جذبات سے کام لیا اور کیتباد کے نام ایک محبت آمیز خط لکھا اور اس کے پاس روانہ کر دیا۔

”اے بیٹے! میں تیری جدائی کی وجہ سے بہت پریشان و دلور ہوں اور تجھ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ اگر تو کوئی ایسا انتظام کر سکے کہ میں تجھے ایک لمحے کے لیے دیکھ سکوں تو اس سے مجھے بڑا سکون پہنچے گا اور میرے عیش و آرام میں کسی طرح کا خلل بھی نہ پڑے گا۔“

اس خط کو پڑھ کر کیتباد زار و قطار رونے لگا اور چاہتا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر باپ سے ملاقات کرے لیکن ملک نظام پھر حاکم ہو گیا۔

”سرکار عالی! بادشاہت میں باپ بیٹے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ آپ بادشاہ ہیں، عام آدمی نہیں۔ اگر آپ خود چل کر گئے تو بادشاہی رعب جاتا رہے گا۔ اول تو ملاقات کی پیشکش آپ کو قبول ہی نہیں کرنی چاہیے اور اگر ملاقات اتنی ہی ضروری ہے تو آپ کے والد گرامی کو آنا چاہیے نہ کہ آپ جا لیں۔“

”اس میں بھی مضائقہ نہیں۔“

”صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ملاقات کے وقت وہ بادشاہ کی تکریم و تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔“

ملک نظام نے خط تحریر کر دیا جس میں یہ شرائط رکھی گئی تھیں۔

”بغرا خاں، بادشاہ دہلی کی تعظیم و تکریم ملحوظ رکھے گا اور دریائے سرسوت کے بیٹے کو دیکھنے آئے گا۔ پناہ تخت پر

سلطان سے کہا کہ ہم کتنے بہت سے حسین سلطان کے جمال جہاں آرا کی آرزو میں کہاں کہاں سے آئے ہیں اور بادشاہ اس طرح ہم سے دور چلا جا رہا ہے۔ کیا ہم اس قافلہ بھی نہیں کر تو ہماری طرف ایک وفد دیکھ لے۔

سلطان اس کے تباہ کن حسن اور کثرت ساز باتوں سے ایسا دھوش ہوا کہ بے اختیار اس تو بہ شکن لڑکے کو بغل میں ڈال لیا اور یہ شعر پڑھا۔

(معتوقوں کے ناز و انداز کے خوف سے رات کو میں شراب سے تو بہ کر لیتا ہوں، صبح کو سوائی کا چہرہ پھر کام جاری کر دیتا ہے)

اس شوخ نے بھی اس شعر کے جواب میں شعر پڑھ دیا۔ (میرا عابد فریب غزوہ زاید صد سالہ کو بھی پیشانی کے بال پکڑ کر شراب فروش کے پاس بھیجتا لاتا ہے)

وہ شعر پڑھتا جاتا تھا اور ہزار طرح کے ناز و انداز اور کثرت اور جنتی و چالاکی دکھاتا جاتا تھا۔ سلطان کیقاہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جبرہ شامی میں لے آیا جو اسی وقت اس جنگل میں لگا دیا گیا تھا۔

”آج سے تو ہماری مجلس کا ساتھی ہے۔“ اس مابے ناز نے شعر پڑھا اور اپنا دایاں جانب کر دیا۔

”اگرچہ ہم چاند سے زیادہ حسین ہیں مگر بادشاہ کے غلاموں کے غلام ہیں۔“

یہ شعر پڑھا اور شراب کا جام بھر کر سلطان کے ہاتھ میں دے دیا۔

کیقاہ بھی تو انہی محفلوں کا کھلاڑی تھا۔ اسے بھی ان مواقع سے نسبت رکھنے والے اشعار ادا کرتے تھے۔ اس نے بھی جواب میں شعر پڑھا۔

(جب پیالہ دینے کی باری آئے تو جو لوگ مجلس میں نزدیک بیٹھے ہیں، ان کو دے دے اور مجھے چھوڑ دے کہ میں ساتھی کی آنکھوں کو دیکھنے میں مست ہو جاؤں)

وہ معتوق بھی کہاں چوکے والا تھا۔ اس نے اپنا سر زمین پر رکھا اور شوشی دنار سے ابرو میں خم ڈال کر غرہ کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ جہاں بوش فرمائیے۔ شاہ جہاں بوش فرمائیے۔“

ادوارح کہا ہے۔ میں جانتا ہوں اور میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جلد ہی نہ یہ لڑکار بگڑے گا اور نہ سلطنت دہلی۔“

بغرا خاں کی دہائی کے چند روز بعد کیقاہ نے بھی اور دہلی کی طرف کوچ کیا۔ باپ کی نصیحتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ان نصیحتوں کے پیش نظر اس نے پیش و عشرت سے پرہیز کیا باوجود یہ کہ شاید شراب کا شوق اس کی طبیعت میں داخل ہو چکا تھا۔ مصاحبین اشاروں کنایوں میں اس کو ترغیب دیتے تھے لیکن باپ کی نصیحتوں کے پیش نظر وہ ان کو منع کر دیتا تھا۔ اس کے پیش و عشرت کی داستانیں ہر زبان پر تھیں اس لیے ہر طرف سے حسین ملائیں اور شیریں گفتار گوئے اس کے دربار کا رخ کرتے۔ وہ اس سفر میں جس راہ سے گزرتا، اس کی صحبت میں شرکت کے ارادے سے اس کے گرد پکڑ کاٹنے اور اس کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کرتے۔ وہ اب تک خود پر ظاہری زہد طاری کرتا رہا تھا۔ باپ کی نصیحتیں اسے روک رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ باپ کی نصیحتوں پر عمل کرے لیکن آہستہ آہستہ وہ ان پر فریفتہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی آتش شوق بھڑکنے لگی۔ بے اختیار ہو کر ان نازنیوں کے چہروں کی طرف دیکھتا۔

اس روز صبح کی سپیدی نے اپنی کرنوں کو پھیلانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ ایک پری زاد نے جیسے بلاشبہ زنیوں کا سردار کہا جاسکتا تھا، زنگار قبا کے ساتھ عربی اُٹھل گھوڑے پر سوار نیلیوں عجیب ہنر اور دلچسپ کرجب دکھاتا ہوا بادشاہی ہنر کے سامنے آیا اور ایسے عجیب ہنر اور دلچسپ کرجب دکھائے کہ کیقاہ باپ کی نصیحتیں یکبارگی بھول گیا اور راستے میں بے اختیار غمیر گیا اور اس سے گفتگو کرنے لگا۔ اس کے حسن و جمال پر کچھ ایسا رہنما کہ باپ کی نصیحتیں دھری رہ گئیں۔ شوق اشتیاق میں گھوڑے سے اتار پڑا اور شراب طلب کی۔ اسی جگہ منزل کر دی۔ جشن شروع ہو گیا۔ اس پری زاد نے شراب کا پیالہ بھرا اور سلطان کے ہاتھ میں دے دیا اور یہ شعر پڑھا۔

سردینینا یہ صحرا ی روی
نیک بدعہدی کہ بے مائی روی
(او چاندی جیسے جسم والے سرو، تو جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ تو بہت بے مروت ہے کہ بغیر ہمارے جا رہا ہے)

یہ مطلع پڑھ کر ہزار ناز و انداز کے ساتھ اس نے

مند دولت خدا ہوں میں سے میرے دربار میں کوئی بزرگ باقی نہ رہا جو مجھے ہندو نصائح کر سکے۔ اگر آپ ازراہ شفقت پوری مجھے چند ایسی نصیحتیں کریں جن میں میرے دین و ملک کی فلاح ہو تو آپ کی عنایت ہوگی۔“

”میں خود تو دیکھ چاہتا ہوں کہ چند نصیحتیں تیرے گوش گزار کروں اور تیرے پیش کوئی میں بدل دوں تاکہ تو تخت و حکومت کی حفاظت کر سکے۔ پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور جان کا خیال رکھو۔ تم نے اپنی غلط کاریوں سے اپنی صحت تباہ کر لی ہے۔ تمہارا گلاب چہرہ زردی میں بدل گیا۔ عیاشی نے تمہیں ضعیف کر دیا ہے۔ ان عادات کو بالکل ترک کر دو۔“

”دوسری نصیحت یہ ہے کہ اپنے امیروں اور حاکموں کی خون ریزی سے اجتناب کرو تاکہ وہ تجھ پر بھروسہ کریں اور خوف کے مارے سچ باتیں نہ چھپائیں۔ ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین کے علاوہ دو اور پختہ کار امیروں کو منتخب کر کے اپنا شریک کار بناؤ۔ یہ چار امیر تمہاری سلطنت کے چار ستون ہوں گے۔ یہ نصیحت بھی یاد رکھنا کہ اگر کسی راز کو فاش کرنا مقصود ہو تو ان چاروں کے ہی گوش گزار کرنا۔ نماز اور روزے کی پوری پوری پابندی کرنا۔ دینی مسائل کو ایسے عالموں سے نہ پوچھنا جنہوں نے لالچ اور ہوس پرستی میں مبتلا ہو کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔“

ان نصیحتوں کے بعد بغرا خاں نے زار زار دو بار شروع کر دیا اور جوش محبت میں کیقاہ کو آغوش میں لے لیا اور اس کے کان میں بڑی آہستگی سے عجیب بات کہہ دی۔

”مجھے لازم ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ملک نظام کو موت کے گھاٹ اتار دے ورنہ اگر اسے کوئی موقع مل گیا تو وہ فوراً تیری جان لے لے گا۔“

کیقاہ نے یہ نصیحت سنی ضرور لیکن اس کے دل میں نہ اتر سکی۔ وہ ملک نظام الدین پر پوری طرح بھروسہ کرنے لگا تھا اور اس کے خلاف کوئی بات سننے کا رد و ادرا نہ تھا۔

بغرا خاں کے تجربے نے یہ بات اس پر ظاہر کر دی کہ کیقاہ کو یہ بات ناگوار گزری ہے لیکن اس نے کیقاہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ اس قدر افسردہ تھا کہ اس نے اس دن کھانا تک نہ کھایا۔ نہ میوں نے اصرار کیا تو اس کی آنکھوں کے کنارے ایک مرتبہ پھر پھٹک اٹھے۔

”میں نے اپنے بیٹے اور سلطنت دہلی دونوں کو

ہونے لگے۔ شعرانے تصدیق سے پڑھے۔ مطریوں نے گانے شروع کیے۔ آخر کار دربار برخاست ہوا۔ اب باپ بیٹے کچھ دیر مجلس خلوت میں گئے۔ کچھ دیر بعد بغرا خاں اٹھا اور دربار پارک کے اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کو تحفے ارسال کیے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو قیمتی اشیاء، لذیذ کھانے اور مختلف شربت روانہ کیے۔ دونوں لشکروں کے سپاہیوں کو تحفہ دیا گیا کہ بے گامگی کی غلطیوں کو پات کر ایک دوسرے سے ہمدردانہ و دوستانہ ملاقات کریں۔

کیقاہ اور بغرا خاں کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بغرا خاں بیٹے سے ملنے کے لیے آتا اور بیٹائی کھول کر باپ کی خاطر توجہ کرتا۔

جب رخصت کا دن آیا اور دونوں ایک دوسرے سے بچھڑنے لگے تو بغرا خاں کو اپنے باپ بلبن کی یاد آگئی۔ وہ باپ کو یاد کر کے بہت دیر تک دستار ہا پھر بیٹے سے مخاطب ہوا۔

”معز الدین! میں نے بچپن میں ایک کتاب ”آداب السلاطین“ پڑھی تھی۔ اس میں بادشاہ جیشید کا قصہ تھا، وہ تم جیسی نہ ہو۔“

”جی ہاں ضرور سنائیے۔“

”جیشید اپنے لڑکوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جس سردار کے پاس دس منتخب اور اچھے سردار نہ ہوں، اسے سردار نہ کہیں اور اس سپہ سالار کو جس کے پاس دس سردار ایسے نہ ہوں جو اس کی بیرونی میں بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیں، اس کو سپہ سالار نہیں کہنا چاہیے۔ اسی طرح جس امیر کے زیرِ اہتمام دس سپہ سالار نہ ہوں، اس کو امیر نہیں کہہ سکتے۔ جس ملک کے تحت دس امیر نہ ہوں، اس کو ملک کہنا ہے۔ ہودی شاد کی جاتی ہے اور جس خان کے لشکر میں دس ملک نہ ہوں اس کو خان نہیں کہا جاسکتا اور ہر وہ بادشاہ جس کے

اعوان و انصار میں دس خان نہ ہوں، اس بادشاہ کے لیے جہاں بانی اور جہاں گیری کا نام تک زبان پر نہ لانا چاہیے۔ جیشید کا یہ بھی قول ہے کہ اس بادشاہ کو جہاں دار اور جہاں بان نہیں سمجھا جاتا جس کے خزانے میں اتنی مقدار میں مال و دولت نہ ہو کہ مقابلے پر آنے والے دشمنوں کے حملے اور غلبے کی صورت میں کام آسکے۔“

یہ اور اسی قسم کی دوسری نصیحتیں کرنے کے بعد بغرا خاں چاہتا تھا کہ وہ اس سے رخصت ہو کہ کیقاہ نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

”آپ کو علم ہے کہ میرے دادا کے تجربہ کار اور دانش

اس نے تین بار جھک کر سلطان کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے عرض کیا۔

”یہ پختادور ان لوگوں کا حق ہے جنہوں نے مجھے جیسے چاند کو تجھ جیسے بادشاہ کے لیے تربیت دی ہے اور دربار میں حاضری کی ثمن لے لیے بیٹھے ہیں۔“

”کیا ان میں تجھ جیسا اور بھی کوئی ہے؟“ کیتباد نے کہا۔

”مجھ جیسے کو کوئی ماں پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ ہاں، میرے گرد وہ سب پر دین محنت ہیں۔ وہ انیا گاتے ہیں کہ زہرہ کو قرض میں لے آتے ہیں۔ ایسا کہ ان کا گانا سن کر اڑتے ہوئے پرندے بیچنے آتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو اس طائفے کو پیش کیا جائے۔“

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ جیسنوں کا جھرمٹ سامنے میں دھوپ اندھیرے میں چاندنی بن کر داخل ہوا۔ سلطان کی چشم حیرت نے ان کی طرف دیکھا۔ دیکھا کہ ایک سے ایک زیادہ حسین، خوب رو اور خوبصورت ہے۔ جب انہوں نے گانا اور ناچنا شروع کیا، کیتباد ان مغل غزلروں کے ناز و ادا کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

کیتباد نے باپ کے چند نصائح کو بھلا دیا اور دن رات ان توپے ٹخنوں کے ساتھ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔

وہ تمام روپیہ جو ملک نظام الدین نے اقتدار ہندوستان کی فاضل آمدنی سے، مال غنیمت، اطراف کے راجاؤں کے نذرانوں وغیرہ سے حاصل کیا تھا اور لشکر کے خزانے میں جمع کر دیا تھا، کیتباد نے وہ سب اہل طرب کے طاقتوں پر خرچ کر دیا۔ اودھ سے دہلی تک تمام راستے وہ عیش و تفریح کرتا رہا اور شراب پیتا رہا اور انعامات تقسیم کرتا رہا۔

دہلی میں سلطان کی آمد کی خوشی میں لوگوں نے آرائش کی انتہا کر دی تھی۔ نئی اور پرانی گانے والیوں اور ناچنے والوں نے عجیب سماں باندھا تھا۔ کیتباد شہر میں داخل ہوا اور پھر شاہی محل میں نزول اجلال فرمایا۔ اس کی توبہ تو ٹوٹ ہی گئی تھی۔ باپ کی نصیحتوں کو ایک کونے میں رکھ کر وہ عیش و طرب کی غفلتیں سجانے کیلئے مہر کی چلا گیا جو اسی مقصد کے لیے آباد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اہل طرب کے طاقتے بھی گئے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ مہنگی کوچوں میں اعلانیہ شراب پی جاتی تھی۔

اودھ سے دہلی آئے اور رنگ ریلیوں میں جھٹلا رہے ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ بے راہ روی نے رنگ

دکھایا۔ وہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری کیا تھی، کمزوری تھی۔ رنگ زرد پڑ گیا اور ضعف غالب آ گیا۔ جب موت سر پر ناچنے لگی تو اسے باپ کی نصیحتیں یاد آئیں۔ اس کے باپ نے ایک نصیحت یہ بھی کی تھی کہ ملک نظام الدین کو راستے سے ہٹا دینا۔ بیماری کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھا۔ اس معاملے میں وہ کوئی معقول رائے قائم نہ کر سکا۔ اسے یہی سمجھی کہ وہ ملک نظام کو دہلی سے دور ملتان بھیج دے۔ اس نے نظام کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ملتان جا کر وہاں کا کام سنبھالے۔ ملک نظام سمجھ گیا کہ سلطان نے اس کو ہٹانے کا ارادہ کر لیا ہے لہذا وہ مختلف بہانوں سے معذوری کا اظہار کرتا رہا۔ درباری امراء بادشاہ کے مقصد کو تاڑ گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ کیتباد ملک نظام سے اب خوش نہیں اور اسے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ ان امراء میں سے اکثر ملک نظام سے غرض نہیں تھے لہذا انہیں موقع مل گیا۔ انہوں نے کیتباد سے اجازت لی اور ملک نظام کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

ملک نظام مراٹے سے ہٹ گیا تو کیتباد نے ملک جلال الدین فیروز کو جو ساہنہ کا نائب تھا، ساہنہ سے بلوایا اور شاہنشاہ خاں کا خطاب دے کر عارض ممالک کے عہدے پر فائز کیا۔ برلی کا صوبہ اسے جاگیر میں عطا کیا گیا۔

کیتباد کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس بیماری نے فارغ کی صورت اختیار کر لی اور وہ بالکل ہی صاحب فراش ہو گیا۔ سلطنت کے کاموں میں برائے نام حصہ لینے کے قابل نہ رہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر امراء بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے۔ یعنی امراء اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ ان امراء نے باہمی مشورے کے بعد طے کیا کہ کیتباد کے لڑکے کو موت کو جو اگرچہ خرد سال ہے، حرم سے باہر لا کر تخت پر بٹھلا دیں تاکہ حکومت بلبن ہی کے خاندان میں رہے اور ترکوں کی نسل سے باہر نہ لگے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد سلطان مسخر الدین کیتباد کے لڑکے کو حرم سے باہر لائے اور سلطان مسخر الدین کا خطاب دے کر تخت پر بٹھلا دیا اور ہنگامہ لگایا اس کے اعوان و انصار ہو گئے۔

کیتباد کا علاج ہوتا رہا۔

جلال الدین فیروز غلجی جس کو عارض ممالک مقرر کیا گیا تھا اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بہار پور میں قیام پذیر تھا۔ وہ ترک نہیں تھا اس لیے ترکوں سے اس کے تعلقات استوار نہیں تھے اور نہ ترک امراء اس کو اپنے گرد

میں رکھتے تھے چنانچہ شاہی امراء و دروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گرد غلجی امراء کا تھا جو جلال الدین غلجی کا دم بھرتا تھا۔ دوسرا گرد ترک سرداروں کا تھا۔ جب حالات یہ ہوئے تو اتحاد و اتفاق خواب بن کر رہ جاتا ہے لہذا جھگڑے مچا دیے گئے۔ ترک امراء کو یہ ناز تھا کہ بادشاہ ترک کی نسل سے ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر غیر ترک یعنی غلجی گرد وہ طاقتور ہو گیا تو بادشاہت ترک خاندان سے چلی جائے گی۔ ان امراء نے یہ منصوبہ بندی کی کہ غلجی گرد کو ہلاک کر دیا جائے۔ ایک فہرست تیار کی گئی جس میں سرفہرست جلال الدین غلجی کا نام تھا۔ جب جلال الدین کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا۔ غلجی امراء اور ملوک کو اکٹھا کیا اور بعض دوسرے امراء کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔

اب سوال یہ تھا کہ جلال الدین پر کیسے قابو پایا جائے؟ اسے کیسے قتل کیا جائے؟ اس کام کے لیے وکیل مملکت ملک اختر بجن آئے آ یا کہ ملک جلال الدین کو صبح کے سے بلا لائے اور اس کا کام تمام کر دے۔ جلال الدین کو معلوم ہو گیا تھا کہ ملک اختر اس فعل بد کے لیے سوار ہوئے لہذا وہ اور اس کے ساتھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ اختر بہت ہی جلال الدین کو بلانے کے لیے اس کے دروازے پر پہنچا تو لوگوں نے اسے گھوڑے سے اتار لیا اور ملوک اس کے کپڑے چاڑ دیے۔ جلال الدین کے بیٹے پچاس سواروں کے ساتھ بارگاہ سلطانی میں داخل ہوئے اور کیتباد کے بیٹے کو تخت سے اتار کر لے گئے اور کیتباد کے پاس پہنچا دیا۔

شہر میں ایک جنگمہ برپا ہو گیا۔ خواص و عوام اور پھر نے بڑے سب سلطان کے بیٹے کی مدد کو پہنچے۔ شہر کے لوگوں کو غلجیوں کا اقتدار سخت ناپسند تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ جنگمہ زور پکڑتا ہو تو اس نے اس بچے کو زور کر دیا اور لوگوں کو واپس کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ غلجیوں کی طاقت دیکھتے ہوئے بہت سے ملوک و امراء ترک کی نسل تھے، جلال الدین کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح غلجیوں کی جہیت بہت بڑھ گئی۔

کیتباد نے ملک نظام الدین کے بھڑکانے پر بہت سے ترک امراء اور ان کے رشتے داروں کو گن کر مار دیا تھا۔ اب جو انہیں جلال الدین کی حمایت حاصل ہوئی تو کیتباد کی ہاں کے دشمن ہو گئے اور جلال الدین سے تقاضا کرنے لگے کہ کیتباد کو راستے سے ہٹا دیا جائے چنانچہ ایک ملک کو جس کے باپ کو کیتباد نے قتل کر دیا تھا، کیلئے مہر کی بھیجا اور اشارہ کر دیا کہ کیتباد کو قتل کر دیا جائے۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ شخص جلال الدین کے ساتھ مل گیا ہے اور اسی کا بیٹھا ہوا ہے لہذا وہ آسانی سے محل کے اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ کیتباد کا آخری وقت ہے، چند سانس باقی ہیں۔ اس شخص نے اسے چند چادروں میں لپیٹا، دو چار لائیں ماریں اور پھر دو پائے جتنا میں بھاڑ دیا۔

جب جلال الدین نے دیکھا کہ یہ کتنا بھی نکل گیا اور تخت خالی پڑا ہے تو وہ ایک کثیر جماعت کے ساتھ کیلئے مہر کی آیا اور کیتباد کے خاں محل میں فروکش ہوا۔ بلبن کا ایک بیٹھا ملک جھجھو سلطنت کا واحد و یار رہ گیا تھا۔ جلال الدین نے اسے ”کڑہ“ کا حاکم مقرر کر کے اودھ روانہ کر دیا اور خود شاہی نجوی کے مشورے کے مطابق ایک مبارک گھڑی میں شاہی تخت پر بیٹھ گیا اور شاہی شان و شوکت کے انتظامات، عہدوں کی تقسیم اور درباب و اعزہ کے جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔

شہر کے عوام کو اس کی بادشاہی سخت ناپسند تھی لہذا وہ ایک عرصے تک شہر کے لوگوں کے خوف سے دہلی کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ اس دوران وہ ایسے عمدہ کام کرتا رہا جو خلق خدا کی بہتری کے لیے تھے۔ جب اس کے لطف و کرم کی عام شہرت ہوئی تو دہلی کے مشہور و معزز خاندانوں کے اراکین جو ترک نژاد بادشاہوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے اور غلجیوں کے سامنے تسلیم فرم کرنے کو اپنی توہین سمجھتے تھے، دہلی سے شہر میں آئے۔ ان سب نے بڑے خلوص کے ساتھ جلال الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے ہمدردوں میں شامل ہو گئے۔

جب جلال الدین غلجی نے یہ دیکھا کہ عام و خاص مطمئن ہیں، مخالفت کا زور ٹوٹ گیا ہے، ترک امراء اس کے ساتھ ہیں تو اس نے ہمت کی اور کیلئے مہر کی قتل چھوڑ کر قدیم دہلی میں آ گیا اور دہلی کے بادشاہوں کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ تخت شاہی پر بیٹھ کر اس نے بلند آواز میں ملوک و امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں خدا کا شکر کیونکر ادا کر سکتا ہوں کہ جس تخت کے سامنے برسوں میں نے سر زمین پر رکھا ہے، آج اسی تخت پر اپنا پاؤں رکھتے ہوئے ہوں اور بادشاہی کے لیے بیٹھا ہوں۔ میرے ساتھی اور ہمدرد جو ہر طرح سے مجھ سے بہتر ہیں، ہاتھ باندھے ہوئے میرے سامنے کھڑے ہیں۔“

اس مختصر خطاب کے بعد جلال الدین سوار ہوا اور ”کوٹک محل“ میں پہنچ گیا۔ (کوٹک محل غیاث الدین بلبن کا خاص محل تھا) بارگاہ سلطانی کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے

مفتی محمد رفیع الدین اور انہوں نے ملک مجبوعہ کے
مفتی محمد رفیع الدین اور انہوں نے ملک مجبوعہ کے

نہیں تھا لیکن شہر کے اکابر و علماء اور سربراہان و دروہ لوگوں نے جلال الدین کی انصاف پسندی اور آداب ملحوظ رکھنے سے متعلق گفتگو سنی تو اس کی تعریف کی اور اس کی بادشاہی کی طرف مائل ہو گئے اور اس کے مستند بھی خواہ بن گئے۔

اترا۔ اسے گھوڑے سے اترتے ہوئے دیکھ کر اس کے ہمراہیوں نے اسے یاد دلایا۔
 ”اب یہ محل آپ کی ملکیت ہے۔ حضور گھوڑے سے کیوں اتر گئے؟“

اس کی نرم ولی کے یہ قصے اس کے دشمنوں اور اقتدار
پسندوں تک بھی پہنچے اور وہ فائدہ اٹھانے کے لیے تیار یاں
کرنے لگے۔

جلال الدین نے نہایت عادلانہ جواب دیا۔
 ”جو کو شک میرے باپ دادا نے بنایا ہو اور ان کی
 ملک میں رہا ہو، وہی کو شک میری ملک اور جاگدو ہو سکتا
 ہے۔ یہ کو شک سلطان بلبن کا ہے جو اس نے اپنی خانی کے
 زمانے میں بنایا تھا، یہ اسی کے بیٹوں اور پوتوں کا ہے۔ میں
 تو صرف اسے غلہ کر کے تصرف میں لایا ہوں۔“

وہ دہلی سے ایک مرتبہ پھر کیوکھری چلا گیا اور اسے دارالحکومت بنا کر اس کے احکام میں مشغول ہو گیا۔ ابھی ایک سال ہی گزر رہا تھا کہ غیاث الدین بلبن کے نتیجے میں ملک چھوڑنے پر اس نے ”نزدہ“ کا حکم مقرر کر کے بھیج دیا تھا، شوق اقتدار نے بے تاب کیا۔ وہ شکار کے لیے نکلا اور اودھ کے حاکم میر علی جامدائے کے پاس پہنچ گیا۔

اس پر ایک امیر ملک احمد نے جواب دیا۔
 ”مصلحت ملکی کا تقاضا یہی ہے کہ گزشتہ بادشاہوں کی
 موروثی اور غیر موروثی ملکیت باقی نہیں چاہیے۔“
 جلال الدین نے جواب میں کہا۔

”تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ جلال الدین سلطان نہیں، قاتل ہے۔ اس نے معز الدین کی قیادت کو قتل کرایا، سخت پرتا ہوا ہے، ہو گیا اور مجھے ”کڑوا“ کا حاکم بنا کر خود سے دور کر دیا کیونکہ سلطان بلبن کا وارث میں تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اگر آپ میری مدد کریں تو میں اپنے چچا سلطان بلبن کا تختہ آراؤ کرالوں۔“

”جو کچھ کہتا ہے، میں بھی جانتا ہوں لیکن کیا تو یہ کہتا ہے کہ چند روزہ اور ناپائیدار مصلحت کے لیے میں دائرۂ اسلام سے باہر نکل جاؤں۔ تو خوب جانتا ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کوئی بھی بادشاہ نہیں ہوا کہ اس سے شاہی غوث اور غرور مجھے میراث میں پہنچا ہو۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطان بلبین اس کو تخت میں تخت پر بیٹھا ہے اور دربار کر رہا ہے اور میں اس کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ میں نے اس کو تخت میں اس بادشاہ کی خدمت میں بہت حاضری دی ہے۔ اس کی حیثیت کا رعب ابھی تک میرے دل سے دور نہیں ہوا۔“

اودھ کے حاکم امیر علی جاہدار نے ہمدرد کا وعدہ کر لیا۔ ملک جھجور نے ”کڑوا“ میں اپنے نام کا سکہ کر لیا اور سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے سارے اودھ کا خود مختار فرماں روا بن گیا۔ اس علاقے کے تمام امراء نے ملک جھجور کا ساتھ دیا اور وہ ایک زبردست لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان جلال الدین خلجی کی مجلس میں پیادہ چل کر جا رہا تھا اور ہزاروں کو سلطان بلبلن کے رعب و جلال کے قصے سناتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ "ملوک خانہ" کی طرف گیا اور اس کے چہوڑے پر پہنچ گیا اور وہاں منہ پر کھڑکڑا زار روئے لگا۔ بعض افراد کو اس کا یہ رونا سخت نا پسند ہوا۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑانے لگے۔

جلال الدین نے اطلاع ملنے ہی اپنے بیٹے ارغلی خاں کو ایک بڑے لشکر کا سردار بنا کر ملک چھوڑنے سے متا بلے کے لیے بھیجا اور خود بھی بارہ کوس کا فاصلہ دے کر روانہ ہوا۔ ارغلی خاں بلا کا لایہ تھا اور پھر ارغلی بڑا لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے تیزی سے سفر کیا اور جلد ہی ملک چھوڑنے کے سر پر جا پہنچا۔

”بادشاہت اس کے بس کی نہیں۔“
 ”روناخوڑوں کا کام ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔“
 ”سلطنت قہر و غضب سے چلتی ہے۔ قدم قدم پر
 خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہ شخص کس طرح سلطنت قائم رکھ
 سکے گا۔“
 ”ہمیں نہیں لگتا کہ جلال الدین کی حکومت زیادہ دن
 قائم رہ سکے گی۔“
 ”تو جوان امراء کے نزدیک اس کا یہ کردار قابل تعریف

ملک مچھو جس وقت اپنے چچا غیاث الدین بہمن کی سلطنت حاصل کرنے کی غرض سے دہلی کی طرف آ رہا تھا تو دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کے باشندوں میں سے وہ لوگ جو اپنے باپ داداؤں کے زمانے سے منافع اور وسائل حاصل کر رہے تھے، اس کی آمد کی خبر سن کر بہت بڑی تعداد میں اس کے معاون و مددگار ہو گئے تھے چنانچہ وہ اس عظیم لشکر کو لے کر آگے بڑھا۔

اس وقت تک کہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں اور
 اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے سامنے شریعت کے قواعد و ضوابط
 کے مطابق ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے سامنے شریعت کے
 قواعد و ضوابط کے مطابق ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے
 سامنے شریعت کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل
 و کرم سے میرے سامنے شریعت کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہوں۔

ملک باجمہ کے لشکر کی شکست کے بعد اس کے امراء قید
ہوئے۔ جمال الدین کے بیٹے اور کئی خاں نے ان کی گردنوں
پر دوشاٹے لٹکا دیئے اور انہیں اونٹوں پر سوار کر کے
طاعان چال الدین کی کئی کے پاس لایا۔ سلطان کی فخر جو فی
ضیہ علیہ السلام پر پڑی اس نے رومال آنکھوں پر رکھ کر بلند
آواز سے کہا: ”یہ کیا کھلم ہے۔ ان معزز امراء کی یہ حالت
کس نے بنائی ہے؟“ انہیں فوراً اونٹوں سے اتار لیا جائے اور
سب کی گردنوں سے دوشاٹے پیلہ کر لیے جائیں۔“

ان قیدیوں میں بعض ایسے امراء بھی تھے جو سلطان
ملکات الدین کے دربار میں بہت ہی معزز عہدوں پر فائز
تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر جلال الدین کی آنکھیں پھر
اٹکیں۔ اس نے ان امراء کو فوراً حاکم کی طرف بھیجا اور خلعت
خاص سے سرفراز کیا۔ جب یہ امراء ہواگوگر اور خلعتیں زیب
نن کر کے آئے تو سلطان نے انہیں اپنی خاص مجلس میں
شریک کیا اور عطریہاں وغیرہ سے عدارات کی۔ یہ معلوم ہی
نہیں ہوتا تھا کہ یہ جنگ میں قید کے ہوئے قیدی ہیں لیکن یہ
بھی عجیب بات تھی کہ اتنی خاطر عدارات کے باجوہ یہ امراء
یہ شرمندہ تھے کہ زمین سے آنکھیں نہیں اٹھا رہے تھے۔
ان کی یہ حالت دیکھ کر جلال الدین سے رہا نہ گیا۔

”آپ لوگ اس قدر شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ میرے ملازم تو تھے نہیں کہ جو میں آپ کی بھادوت کو ملک حرامی سے تعبیر کروں۔ میں تو آپ کی قدر کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے مالک کا حق نمک پوری طرح ادا کیا۔ میری نظر میں تو آپ سب لوگ قابل قدر ہیں۔ آپ لوگوں کی یہ کوشش ہر لحاظ سے مناسب تھی کہ بادشاہت کا منصب آپ کے اس سلطان غیاث الدین کے خاندان سے باہر نہ جائے۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی اور جاسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

لستان کے کسی بھی شہریاں کوں کے لیے 1200 روپے

مریکا کینیڈا اسٹریٹیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بیشہ مالک کے لیے 9,000 روپے

پ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے درج حال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر جنرل ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

لپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھیجی ہو سکتا ہے۔

سے قارئین صرف ویسٹرن یونیورسٹی گرام کے
 رہے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
 اداریہ جنک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

0301-2454188: فون نمبر: امرتا شرم

0333-3285269 سید منیر حسین

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

فون: 35804200-35804300

لیکن اس کا کیا علاج کہ خداوند تعالیٰ کی مرضی آپ کے ارادے کے خلاف تھی۔ آپ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے اور بادشاہت مجھ پر بڑھے کے ہاتھ میں آئی۔“

ملک احمد بھی اس مجلس میں شریک تھا۔ وہ صاحب رائے بھی تھا اور نائب امیر حاجب بھی اور سلطان سے قربت بھی رکھتا تھا، خاموش نہ رہ سکا۔ نہایت گستاخانہ انداز میں بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”بادشاہ کو یا تو حکومت کرنا چاہیے اور بادشاہوں کے طریقوں پر عمل کرنا چاہیے ورنہ پھر اسی محدود علاقے پر جہاں اتنے سال گزارے ہیں، قناعت کرنا چاہیے۔ خداوند عالم نے ان گردن زدنی ملوک پر اتنی نوازش فرمائی، ان کو شراب نوشی میں شریک کیا اور ان کی ہتھکڑیاں کھلوادیں۔“

دوسرے امراء نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
”حضور! ان واجب الفکس امراء پر جو مہربانیاں فرمائی ہیں وہ جہاں داری اور فرماں روائی کے دستور کے خلاف ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ ان باغیوں کو معاف نہ کیا جائے۔ اگر انہیں قتل نہ کیا جائے تو ان کی آنکھوں میں سلاخیاں ضرور پھر دادی جائیں تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔“

جلال الدین نے ان امراء کو جواب دیا۔

”تم لوگوں نے جو کچھ کہا، وہ بالکل درست ہے لیکن میں مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھ دھنا نہیں چاہتا۔ اس وقت میری عمر 70 سال ہے۔ آج تک میں نے کسی مسلمان کی جان نہیں لی تو بھلا اس عمر میں یہ کام کیسے کروں۔ اگر میں ان لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہوتا اور مجھے یہ لوگ قتل کر دیتے تو قیامت کے روز ان لوگوں کو جواب دینا پڑتا نہ کہ مجھے۔ میں نے کئی سال غیاث الدین بلبن کا کمک کھایا ہے، اب اس کے امراء کو قتل کرنا مجھے زیب نہیں دیتا اور یہ فعل میری کمک خرابی کی دلیل ہوگا۔“

یہ امیر بوڑھے اور رحم دل بادشاہ کی بے موقع تری سے رنجیدہ ہو کر اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

ملک جھجو اور کل خاں کے حملوں کی تاب نہ لا کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کھیتوں میں چھپا رہا اور پھر اس گاؤں کے زمیندار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھلا اسے صورت سے کیا پہچانتا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ ملک جھجو ہے اور جلال الدین کے لشکر سے شکست کھا کر بھاگ آیا ہے تو زمیندار کی باتیں سن گئیں۔

”جلال الدین کی فوجیں میری تلاش میں ہوں گی۔ مجھے کچھ دنوں اپنے پاس پناہ دے دو۔ معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی میں اپنی جاگیر پر چلا جاؤں گا۔“

”میرے پاس جو کچھ ہے، آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ آپ جب تک چاہیں گے میرے مہمان رہیں گے۔“ زمیندار نے کہا لیکن دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

دو چار دن ہی گزرے تھے کہ ایک رات زمیندار نے اپنے کچھ آدمیوں کو ساتھ لیا اور سوتے ہوئے ملک جھجو کو رسیوں سے جکڑ دیا۔ اسی رات اسے گھوڑے پر ڈالا اور دہلی پہنچ گیا۔ کسی نہ کسی طرح جلال الدین تک رسائی حاصل کی اور ملک جھجو کو اس کے حوالے کر دیا۔

جلال الدین نے اس وقت بھی نرم خوئی کا مظاہرہ کیا۔ ملک جھجو وہ تھا جس نے پرہیز بغاوت کی تھی۔ اس کے خلاف لشکر لے کر آیا تھا۔ سخت سزا کا مستحق تھا لیکن جلال الدین نے اسے ملتان روانہ کر دیا اور حکم دے دیا کہ وہاں اس کو ایک مکان میں عزت سے رکھا جائے اور نگہداشت کی جائے۔ شراب، میوہ، کھانے اور کپڑے جو وہ طلب کرے مہیا کیے جائیں۔

امراء اس وقت بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے ایک زبان ہو کر جلال الدین کو تنبیہ کی۔

”جب اتنے بڑے سیاسی جرم پر اسے سزا نہ دی تو آگے کیا امید ہے کہ دوسرے لوگ بغاوت نہیں کریں گے اور فتنہ برپا نہیں ہوگا۔ پھر بادشاہ کی طرف سے کون سی سزا ہوگی جس سے لوگ عبرت حاصل کریں گے۔ سلطان بلبن جس کی سختی اور ہیبت خداوند عالم کو ابھی یاد ہوگی اس قسم کی بغاوتوں پر سختی سزا دینا اور کئی خونریزی کرانا۔ اگر ہم ملک جھجو کے قبضے میں آج آتے تو وہ وہیلیوں کا نام و نشان تک باقی نہ چھوڑتا۔“

جلال الدین نے اپنی صفائی پیش کی۔

”آپ لوگوں نے جو کچھ کہا وہ میں بھی جانتا ہوں۔ بغاوتوں اور فسادات کے موقعوں پر بادشاہوں کی سزائیں میں نے تجھ سے زیادہ دیکھی ہیں مگر اس کو کیا کروں کہ میں اسلامی ماحول میں بوڑھا ہوا ہوں اور مجھے مسلمانوں کا خون بہانے کی عادت نہیں۔ چند روزہ حکومت قائم رکھنے کے لیے جو نہ دوسروں کے بعد رہی ہے اور نہ ہمارے بعد باقی رہے گی۔ اسلامی احکام اور شریعت کے قوانین کو پس پشت ڈال دوں اور حکم دے دوں کہ مسلمانوں کی گردنیں بے دریغ اڑا دی جائیں؟ آج تو جو کچھ بھی ہے گزر رہی جائے گا لیکن کل

جلال الدین نے اپنی جاگیر پر چلا جاؤں گا۔“

اس کے بعد جلال الدین نے اپنے امیر ملک احمد کو مخاطب کیا۔

”اے امیر! تو اپنا منہ کر بیان میں ڈال کر دیکھ اور لو کہ ہم ملوکوں کے کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم میں کون سا بادشاہ ہوا ہے۔ گزشتہ سالوں میں، میں اور میرا بڑا بھائی شاہاب الدین دہلی میں سلطان بلبن کی ملازمت کرتے تھے۔ اس کے احکامات کا حق ہماری گردنوں پر بہت زیادہ ہے۔ یہ کون سا انصاف ہے کہ ان کا (بلبن کے وارث) ملک ہم لے لیں اور انہیں سزا دیں۔ اگر بادشاہی مسلمانوں کا خون بہا ہے تو پھر لیکن نہیں تو مجھ میں ان کے خون بہانے کی طاقت کون۔“

امراء بخود ہو کر اس کی باتیں سن رہے تھے۔ کسی پر اثر و آہنی پر نہ ہوا۔ بس یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ ایسے شخص سے بادشاہی ہو چکی۔

امراء کا کہنا بھی کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ جلال الدین کی بہ جائزہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ اگر کوئی جرم پلا ابھی جاتا تو بادشاہ اسے سزا دینے کے بجائے توبہ کرانے کا اور آئندہ جرم نہ کرنے کا عہد لے کر چھوڑ دیتا۔

جلال الدین کی اس نرمی کی وجہ سے بھی امراء اس سے بہت رگشتہ ہو گئے اور کھیلے بندوں اسے ملامت کرنے لگے۔ اس کا بیٹا علاؤ الدین بھی ان حالات پر قابو پاسکتا تھا لیکن جلال الدین نے اسے کڑہ کا حاکم بنا کر ملک جھجو کی جگہ روانہ کر دیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ یہ امراء اس سماجی ابتری کا تقاضا دیکھتے رہیں یا جلال الدین کو معزول کر دیں۔ یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ٹھٹھوں کا ایک کردہ گرفتار کر کے جلال الدین کے روبرو پیش کیا گیا۔ اس وقت اس کردہ کا ایک ایک فرد مارے خوف کے تھر تھر کاہ رہا تھا لیکن اس نرم خواہ بادشاہ نے ایک کو بھی قتل نہ کیا بلکہ تسلیم کر دیا کہ کشتیوں میں سوار کر کے ان کو بنگال کی طرف لکھنؤ کی کے علاقے میں لے جا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ قتل جو در آنکھوں کی کے علاقے ہی میں پڑے رہیں اور پھر اس طرف نہ آسکیں۔

جرموں کے لیے ایسی انوکھی سزا دیکھ کر امراء کی

تجوروں پر طر پڑ گئے اور بادشاہ کے خلاف اٹھنے والے جذبات مزید بھڑک گئے۔ جلال الدین کی معزولی کے مشورے مزید شدت اختیار کر گئے۔ ان امراء نے طے کیا کہ اگرچہ جلال الدین کی بہادری اور جرأت میں کوئی شک نہیں اور اس نے اپنے عہد جوانی میں بارہا مغلوں کے مقابلے پر ہمت کے جوہر دکھائے ہیں لیکن اب چونکہ وہ ضعیف العمر ہو گیا ہے اور اس کو شعر کہنے اور شطرنج کھیلنے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہ گیا اس لیے اسے معزول کر کے ملک تاج الدین کو بھی کر بادشاہ بنا دیا جائے۔

اس منصوبے کو مزید پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے ان امراء نے ملک تاج الدین کو بھی کی قیام گاہ پر بادہ نوشی کی ایک محفل منعقد کی اور خوب پی کر عالم مستی میں اول فول کینے لگے۔

”جلال الدین غلی پرگز اس قابل نہیں کہ وہ عنایت حکومت اپنے ہاتھ میں لے۔“

”میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“

”میں اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کروں گا۔“

”وہ بوڑھا بوچکا ہے، کیا مقابلہ کرے گا۔ مارا جائے گا۔“

”کسی بہانے سے شکار پر لے جائیں گے۔ کہہ دیں گے شیر کھا گیا۔“

ایسی امیروں میں سے ایک نے تمام باتیں جلال الدین غلی تک پہنچا دیں۔ وہ پہلے بھی ایسی ہرزہ سرائیاں سن چکا تھا لیکن اس مرتبہ کچھ زیادہ باتیں اس تک پہنچی تھیں۔ سلطان ان باتوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک قاصد بھیج کر ان سب کو اپنے روبرو طلب کیا۔ جب وہ سب آچکے تو سلطان نے غلی تلوار ان کے سامنے رکھ دی اور کہا۔

”اے نامرد! تم نشے میں ہدمست ہو کر آئیں میں شیخیاں مارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم یوں تیر ماریں گے اور یوں تلوار چلائیں گے۔ تم میں کون مرد ہے جو یہ تلوار اٹھائے اور میرے سامنے آئے۔ میں اس وقت بالکل تنہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں۔ تم میں سے جس شخص کو بہادری کا دعویٰ ہے، وہ اٹھے اور میری تلوار سے میری گردن اڑا دے تاکہ میں یہ بیچہ سکوں کہ تم واقعی کسی مصرف کے ہو اور کوئی کام تمہارے ہاتھوں انجام پاسکتا ہے۔“

جب بادشاہ اچھی طرح دل کی بھوس نکال چکا اور اس کا غصہ کچھ کم ہوا تو ایک امیر ملک نصرت اپنی جگہ سے اٹھا اور بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”حضور کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ شرابی شراب

کے نفع میں ہرزہ سرائی کیا ہی کرتے ہیں۔ اگر ہم آپ جیسے آقا کو کوئی گزند پہنچائیں تو پھر ایسا شیش مالک ہمیں کہاں سے ملے گا اور اگر حضور ہمارے جیسے نیک خوار بیٹوں کو سزا دیں گے تو پھر ہم جیسے جاں نثار آپ کو کہاں سے ملیں گے۔“

ملک نصرت کے اس جہت آمیز جواب سے سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان امراء کا اتنا سنگین جرم جس کی سزا موت بھی معاف کر دیا۔ اپنے ہاتھ سے شراب کے پیالے بھر بھر کے ان امراء کو دینے لگا۔

”میری جگہ اگر کوئی اور بادشاہ ہوتا تو وہ جہیں بری طرح قتل کرتا لیکن میں اس بڑے بڑے میں غصے اور ظلم سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہوں۔ میں تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں کہ تمہیں شراب نوشی اور عیش کوشی سے بالکل فرصت نہیں کہ دوسرا کوئی کام کر سکو۔ تم لوگوں کو میں معاف کرتا ہوں اور رحم دیتا ہوں کہ سب اپنی اپنی جائیداد پر چلے جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں یہاں مت آنا اور وہیں قیام کرنا۔“

☆☆☆

جلال الدین کی نرم دلی نے لوگوں کی جتنی درواز کر دی تھیں۔ امراء عام طور پر یہ کہتے پھر رہے تھے کہ جب سلطان راہزنیوں تک کو سزا دینے کا دروازہ نہیں تو ہم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیسے ہوگی۔ یہ باتیں عام سنائی دے رہی تھیں کہ جلال الدین غلی نے حکومت کو حاصل کر لی ہے لیکن وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں۔ وہ اراکین سلطنت جو جلال الدین کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے، ایسے سہارے ڈھونڈنے لگے جن سے کام لے کر وہ بادشاہ کو معزول کر سکیں۔ جب امراء کی چیرہ دستیوں بہت بڑھ گئیں اور سلطنت کا نظام تتر بتر ہو گیا تو شاہی ملازمین اور عوام نے سیدی مولائی ایک بزرگ کی خانقاہ کا رخ کیا۔ سیدی مولیٰ ضرورت مندوں اور فقیروں کی روٹی پکڑے سے مدد کرتے تھے۔ مسافر اور غریب غریب روزانہ ان کی خانقاہ میں آتے اور اپنی اپنی ضروریات پوری کرتے۔ یہ خانقاہ سلطان بلبن کے زمانے سے موجود تھی لیکن جب جلال الدین تخت شاہی پر رونق افروز ہوا تو سیدی مولیٰ کی خانقاہ میں عوام کا ہجوم بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ جلال الدین کا بڑا بیٹا خان خانان ان کا بے حد متفق تھا۔ یہاں تک کہ اس نے سیدی مولیٰ کو اپنا من بولا باپ بتالیا اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ دوسرے معززین اور امراء بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے دسترخوان سے ایسی ایسی نعمتیں کھاتے جو

ان کو اپنے گھروں میں بھی نصیب نہیں تھیں۔ یہ گرم بازار دی جاری تھی کہ قاضی جلال الدین کا شانی کی قند پتہ طبیعت نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سیدی مولیٰ تک رسائی حاصل کر کے اپنے مقاصد پورے کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ یوں بھی ان کے دربار میں حاضر ہو سکتا تھا لیکن وہ خصوصی تعلق کی تمنا رکھتا تھا۔ کئی دن تک مسلسل سوچنے کے بعد وہ جلال الدین کے بیٹے خان خانان کی خدمت میں پہنچ گیا۔

”میں چاہتا ہوں آپ سیدی مولیٰ تک پہنچا دیں۔“

”ان کا مکان کھلا ہوا ہے جو چاہے جاسکتا ہے۔“

خان خانان نے جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں میرا ہاتھ حمام کر آپ لے جائیں۔“

”وہ کیوں؟“

”میں ان سے خصوصی تعلق کا محتاج ہوں۔ آپ کے ساتھ جاؤں گا تو میری وقعت ہوگی۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ جب کہیں۔“

جلال الدین کا شانی دوسرے دن کاٹنے کے اپنے گھر چلے گئے۔

خان خانان انہیں لے کر سیدی مولیٰ کے مکان پر پہنچ گیا اور ان کی تعریف ایسے الفاظ میں کی کہ سیدی مولیٰ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

☆☆☆

سیدی مولیٰ ملک جرجان سے فقیروں کے لباس میں دوسرے ملک میں آئے اور وہاں کے درویشوں اور صوفیوں سے ایک طویل عرصے تک فیضانِ قلبی حاصل کرتے رہے۔ یہاں سے فیض حاصل کرنے کے بعد وہ پھر اپنے وطن جرجان واپس پہلے گئے۔ کچھ دن یہاں گزارنے کے بعد انہیں حضرت فرید گنج شکر سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ آپ نے رخصت سفر باقاعدہ اور اوجڑھن پہنچے جہاں بابا فرید گنج قیام پذیر تھے۔ بابا فرید کی روشن ضمیری نے دیکھ لیا کہ آنے والا کس پائے کا ہے۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور مریدی کا اعزاز بخشا۔

سیدی مولیٰ بابا فرید کی سرپرستی میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ ایسی شدید محنت کی کہ خود بھر کو مرید پر رکھ آئے لگا۔ پھر اچانک سیدی مولیٰ کا دل اوجڑھن سے بھی اکھڑ گیا اور انہوں نے دہلی جانے کی اجازت طلب کی۔ ”تم شوق سے دہلی جاؤ، فقیروں اور درویشوں کی

مکافات

مکافات روائی کرو مگر ایک فصاحت یاد رکھنا۔ امیروں اور عاقلوں سے زیادہ میل جول پیدا نہ کرنا۔“

سیدی مولیٰ نے دہلی پہنچ کر عظیم الشان خانقاہ تعمیر دلی اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے لگے۔ کسی کو فتدی کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی اسی خانقاہ سے ملتی لیکن ان کے طور طریقے عجیب تھے۔ بھتے کو جامع مسجد میں نماز کے لیے نہیں آتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے لیکن نماز باجماعت ادا کرنے کے قائل نہیں تھے البتہ مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ صرف ایک کپڑا اور چادر استعمال کرتے تھے۔ بیوی، کنیز یا خدمت گار رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ کسی سے کوئی چیز نہ لیتے تھے لیکن خرچ اتنا زیادہ کرتے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ وہ ”سیہا“ کا علم جانتے ہیں یعنی علم ظلم جانتے ہیں۔ اگر وہ کسی تاجر سے کچھ خریدتے تو فروخت کرنے والے سے کہہ دیتے کہ جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے چاندی کے تنگے ہیں، وہ لے لو چنانچہ وہ ایسا کرتے اور چاندی کے تنگے یا سکہ ان کو مل جاتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر عتقران تھا۔ ہر چیز اپنے مقام پر تھی۔ امور ملکی استقامت پذیر تھے۔ ملوک و امراء سے میل جول رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ان امراء کو بھی ضرورت نہیں تھی کہ دعا کے لیے بزرگوں کی خانقاہوں میں جائیں یا سازشوں کے پاؤں دراز ہوں لیکن جب کیتھالی عسکرانی کا دور آیا تو یہ ایک طرح سے بے خبری اور غفلت کا دور تھا۔ سیدی مولیٰ نے حضرت فرید گنج شکر کی نصیحت کو فراموش کر دیا اور ملوک و امراء سے گہرے مراسم پیدا کر لیے۔ جب عنان حکومت غلیوں کے ہاتھ میں آئی تو سیدی مولیٰ کی خانقاہ میں عوام کا ہجوم بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ سازشوں کے دروازے بھی کھل گئے۔ یہی وہ دن تھے جب قاضی جلال الدین کا شانی سے ان کے مراسم بڑھے۔ یہ مراسم اتنے بڑھے کہ دوستی میں بدل گئے۔ یہ شخص کئی کئی دن ان کا مہمان رہتا اور انہیں بادشاہ بننے کی ترغیب دیتا رہتا۔ اکثر یہ فرمودات ان الفاظ پر مشتمل ہوتے۔

”خداوند تعالیٰ نے آپ کو یہ قدرت اس لیے دی ہے کہ آپ اس کے بندوں سے رحم اور مہربانی سے پیش آئیں اور حکومت کو جو خدا کی نایابت ہے، ظالموں کے ہاتھ سے ہٹائیں کہ اپنے قبضے میں کریں۔ اہل دنیا کو خدا اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اگر آپ اس عظیم الشان عہدے کو حاصل کرنے سے کنارہ

کشی اختیار کریں گے تو پھر کل قیامت کے روز آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔“

سیدی مولیٰ کچھ بھیجے تھے، تھے تو انسان۔ آہستہ آہستہ یہ باتیں ان پر اثر کرنے لگیں اور بالآخر قاضی کا شانی کی باتوں میں آکر سلطنت حاصل کرنے کے سامان فراموش کرنے لگے۔ سید صاحب نے پوشیدہ طور پر اپنے مرید کو خطابات اور مناصب سے نوازا نہ شروع کر دیا۔ کئی راتیں اس منصوبہ سازی میں مگڑ گئیں اور بالآخر یہ طے پایا کہ سید صاحب کے دو غمایاں مرید برجن کوتوال اور تھانی پہلوان جن پر سید صاحب کے بے شمار احسانات تھے، بھتے کے روز جب بادشاہ نماز کے لیے سوار ہو اس کی سواری تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیں اور سید صاحب کے دس ہزار مرید اسی وقت ان سے بیعت کر کے ان کی بادشاہت تسلیم کر لیں۔

جب یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا اسی وقت ایک مرید، مریدوں کے ہجوم سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ قاضی جلال الدین نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا اور سیدی مولیٰ کی توجہ اس طرف مبذول کرانی۔ انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اس مرید کو یہ باتیں ناگوار گزری تھیں۔ اس نے چاہا کہ جب تک اس منصوبے کو عملی جامہ پہننا جائے، سلطان تک اس خبر کو پہنچا دیا جائے۔ وہ رات کے اندھیرے میں اندھیرا بن کر رخصت ہوا اور ”کوٹھ گل“ تک پہنچ گیا۔ اتنی رات گئے پہرے داروں نے دروازہ کھولنے اور سلطان سے ملاقات کرانے سے انکار کر دیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ وہ سیدی مولیٰ کی خانقاہ سے آیا ہے اور ایک عجیب و غریب سازش سے سلطان کو آگاہ کرنا چاہتا ہے تو پہرے داروں نے نرمی اختیار کی۔

سلطان جلال الدین اس وقت ملکہ جہاں کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ اس نے جو ناقت دروازے پر دستک پائی تو ناگواری سے بستر سے اٹھا۔ اس کے محافظوں نے جب اسے خطرے کی اطلاع دی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔

سیدی مولیٰ کے مرید نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر سلطان کے ہوش و حواس پر پکلی سی گری۔ ”میری مملکت کے تختوں پر پہلے والے میرے خلاف ایسی سازش تیار کر رہے ہیں۔“

سیدی مولیٰ کی خانقاہ میں باتوں کا بازار لگا ہوا تھا کہ شاہی فوج خانقاہ کے دروازے پر پہنچی۔

سیدی مولہ، قاضی کا شانی اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔ بادشاہ نے ان قیدیوں سے سازش کی بابت دریافت کیا۔ ان لوگوں نے اس قسم کے کسی بھی معاملے کے وجود سے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس سے وہ ان لوگوں کو قائل گردیتا لہذا اس نے غم دیا کہ بہار پور کے جنگل میں ایک بہت بڑی آگ روشن کی جائے اور سیدی مولہ، قاضی کا شانی، برہمن کووال اور دھانی پھولان جیسے پاؤں اس پر سے گزریں۔ اگر سچے ہیں تو آگ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔

اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے سیدی مولہ آگے بڑھے۔ قرآن کی آیات پڑھتے جاتے تھے اور نہایت دلیری سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ جلال الدین بھی قریب کے خیمے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے یہ حال دیکھ کر رحم آگیا۔ اس نے چند علما کو اپنے پاس بلا دیا۔

”آپ لوگ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟“

علما نے کرام نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”جلانا آگ کی فطرت ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ جھوٹا ہو یا سچا..... اگر وہ آگ میں گرے گا تو آگ اس کو جلا دے گی۔ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اس ارادے سے باز رہیں۔“

یہ سن کر جلال الدین اپنے ارادے سے باز آگیا اور اس نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔

آگ بجھا دی گئی تھی لیکن سزا میں تو ابھی باقی تھیں۔ قاضی جلال کو جو اس قتلے کا بانی تھا، ہدایوں کا قاضی مقرر کر کے وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ خان زادوں اور ملک زادوں کو بھی جلا وطن کر کے اطراف کے علاقوں میں بھیج دیا اور ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ برہمن..... اور بتایا ایک کو جنہوں نے بادشاہ کو قتل کرنے کی ذمہ داری لی تھی، قتل کر دیا گیا اور سیدی مولہ کو اپنے ساتھ لے کر کوٹک محل لے جایا گیا۔ بادشاہ خود کو کوٹک میں قیام پذیر ہوا اور سیدی مولہ کو کوٹک کے پاس ہاتھ باندھے ہوئے ٹھہرے رہنے کا حکم دیا۔

جلال الدین نے سازش کے بارے میں سید صاحب سے سوالات کیے۔ سیدی مولہ نے ان سوالات کے جوابات بھی نہایت دلیری سے دیے۔ سازش کا جرم

ثابت نہ ہو سکا لیکن بادشاہ کے نزدیک سیدی مولہ کا وجود خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جلال الدین نے آخری جھٹ پوری کی کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ اس نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری اور ان کے ساتھ دوسرے درویشوں کو کوٹک کے قریب بلا دیا اور ان سے کہا۔

”ذرا دیکھو تو سہی کہ اس درویش سیدی مولہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا اور میرے ملک میں بد امنی اور فساد پھیلانے کے کیا منصوبے تیار کیے ہیں۔ میں انصاف تم لوگوں کے سپرد کرتا ہوں۔ تم جو مناسب سمجھو، فیصلہ کرو اور مجھے مطمئن کرو۔“

یہ سنتا تھا کہ ایک درویش نہایت بے باکی سے آگے بڑھا۔ اس کے پاس اسرار تھا جس سے اس نے سیدی مولہ کے جسم پر پکڑ لیا اور لگا دیا۔

”تو نے مجھے زخمی نہیں کیا جلال الدین کی سلطنت کو زخمی کر دیا ہے۔“ سیدی مولہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے بعد وہ بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن یاد رکھو کہ میرا لہو ایک نہ ایک دن رنگ لاکر رہے گا۔ اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور آئے گا۔“

یہ کلمات سن کر جلال الدین سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ چاہتا تھا کہ آگے بڑھے اور سیدی مولہ کو درویشوں سے چھڑا لے۔ اسی وقت اس کے بڑے بیٹے ارنگی خاں نے کوٹک کے اوپر سے ٹیل بان کو اشارہ کیا۔ یہ اشارہ پاتے ہی ٹیل بان نے اپنے مست ہاتھی کو سیدی مولہ پر چھوڑ دیا۔ بادشاہ ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس دیوبکر جالور نے آٹا فانا سیدی مولہ کو مکمل کر رکھا دیا۔

جلال الدین کا بڑا بیٹا خان خانان سیدی مولہ کا عقیدت مند تھا اور ان کی خانقاہ میں وقت گزارا کرتا تھا۔ ارنگی خاں کو یہ سخت ناگوار تھا۔ ارنگی خاں نے خان خانان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدی مولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

”ارنگی خاں! یہ تو نے کیا کر دیا۔“ جلال الدین زور سے گرجا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اس قہرے کو کسی دن تو ختم ہونا ہی تھا۔ میں نے آج ختم کر دیا۔ سیدی مولہ جب تک زندہ رہتا آپ کے دشمنوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتا رہتا۔ میں نے سازشوں کا دروازہ بند کر دیا۔“

”تو نے سازش کا نہیں، میری کامیابی کا دروازہ بند

کیا ہے۔ فقیروں کی بد دعاؤں کا تجھے ذرا بھی خیال نہ آیا۔“ ”یہ خیال آپ ہی فرمائیے۔ کوئی وجہ تو ہوگی جو آپ نے سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا۔“ ”بد بخت..... تو نے اس سبھی کو سنبھلے بھی نہیں دیا اور قدم اٹھا دیا۔“

جلال الدین نے اس وقت بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور محل میں چلا آیا۔ اس کی بڑی بیگم ملکہ جہاں اس وقت ایک کینز کے ساتھ بیٹھی تھی کہ جلال الدین کے چہرے پر نظر پڑی۔

”خیر تو ہے، آپ کا چہرہ بخیر دیکھ رہی ہوں۔“ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی تالائق اولاد کا باپ کہلاؤں گا۔“

”یا اللہ خیر..... کیا ہوا۔“

”کیا آپ نے ابھی تک نہیں سنا کہ میرے حکم دینے سے پہلے ہی ارنگی خاں نے سیدی مولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”ہم اگر سنتے بھی تو یہی سمجھتے کہ سب کچھ آپ کے حکم سے ہوا ہے۔“ ”اسموس تو یہی ہے۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ محل میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا ابھی ایسا کہ دن میں رات سے بڑھ کر رات ہوئی تھی۔ جو جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ لونڈیوں، باندیوں نے بڑی مشکل سے چراغ روشن کیے۔ یہ اندھیرا ہی کیا تھا کہ ایسی ہوا چلنے لگی کہ معلوم ہوتا تھا محل کی دیواریں گر چاں گی۔ جو چراغ جلے تھے، وہ بھی بجھ گئے۔

سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ یہ سب سیدی مولہ کی بد دعا کا نتیجہ ہے۔

جب ٹھنڈوں بعد تارکی اور آندھنی نے ہاتھ سمیٹا اور ارنگی خاں کے قاتل ہو گئے تو دیکھا گیا کہ سیدی مولہ کی لاش غائب ہے۔ پہلے تو اسے سیدی مولہ کی کرامت سمجھا گیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ لاش کو ان کے مرید اٹھا کر لے گئے ہیں اور ان کی خانقاہ میں دفن کر دیا ہے۔

جلال الدین نے اس قہرے کو مزید پیچھڑانا مناسب نہ سمجھا حالانکہ ارنگی خاں اس پر بھند تھا کہ سیدی مولہ کی لاش کو ان کے حجرے سے نکال کر کہیں اور دفن کر دیا جائے۔

ابھی اس واقعے کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جلال الدین کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خانان کی بیماری کی خبر

آگئی۔ سیدی مولہ کے قتل کی خبر سنتے ہی وہ بیمار پڑ گیا تھا اور اب یہ بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ طبیب اس بیماری کی نقشہ کشی سے عاری تھے۔ بس وہ بستر سے لگ گیا تھا اور اندر ہی اندر گھٹا جا رہا تھا۔ جلال الدین نے یہ خبر سن کر اسے بہار پور سے دہلی بلوایا لیکن حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

طبیب عاجز تھے کہ اس بیماری کو کیا نام دیا جائے۔ جلال الدین کے کانوں میں سیدی مولہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور آئے گا۔“

”کہیں یہ اسی بد دعا کا نتیجہ تو نہیں؟“ جلال الدین نے خود کلامی کی۔

اس نے اسی رات بھیجیں بدلا اور کسی کو ساتھ لیے بغیر سیدی مولہ کی خانقاہ پر پہنچ گیا۔ خانقاہ کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔

”بھائی، میں قریب کے گاؤں سے آیا ہوں۔ سیدی مولہ کا مرید ہوں۔ ان سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں آکر تو کچھ اور ہی معلوم ہوا۔ ان سے ملاقات نہیں ہوئی تو ان کی قبر پر فاتحہ پڑھ لوں۔ کیا تم مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟“

آنے والے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر دروازہ کھول دیا۔

جلال الدین، بادشاہ وقت، سر سے پاؤں تک کسی دیہاتی کا روپ دھارے سیدی مولہ کی قبر پر کھڑا تھا۔

”میں کسی مسلمان کا خون بہانے کا روادار نہیں۔ میں نے تو بھرموں کو بھی معاف کیا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں آپ کے قتل کے احکام جاری کرتا۔ یہ سب میرے بیٹے ارنگی خاں کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میرا بیٹا اختیار الدین آپ کا عقیدت مند تھا۔ آپ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس حادثے کے بعد وہ بیمار پڑ گیا ہے۔ اب تو مسلسل بے ہوش ہے۔ وہ میرا ولی عہد ہے۔ میں آپ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے گناہوں کی سزا اسے کیوں مل رہی ہے۔ اگر یہ سب آپ کی بد دعاؤں سے ہو رہا ہے تو مجھے معاف کریں اور اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو میں راضی بردشا ہوں۔“

وہ فاتحہ پڑھ کر سیدی مولہ کے حجرے سے باہر نکلا تو مریدوں نے اسے گھیر لیا۔

”ظالم جلال الدین نے ہمارے مرشد کو قتل کر دیا۔ یہ ایسا فعل بد ہے کہ اس کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ جس سلطنت پر وہ اکڑتا ہے وہ سلطنت ہی باقی نہیں رہے گی۔“

ایک سو سال پہلے کا یہ واقعہ تھا کہ جلال الدین نے ہمارے مرشد کو قتل کر دیا۔ یہ ایسا فعل بد ہے کہ اس کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ جس سلطنت پر وہ اکڑتا ہے وہ سلطنت ہی باقی نہیں رہے گی۔“

چڑھتا اس لیے دشوار تھا کہ فیصلوں سے تیروں کی بوجھاڑ ہوتی تھی۔ نظری میں نہ آتا تھا کہ تیسرے طرف سے آتے ہیں جبکہ نیچے سے تیر چلائے جاتے تھے تو قلعے تک پہنچتے ہی نہیں تھے۔ اس قلعے کی فتح صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جب پہاڑ کے اوپر پہنچا جائے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس نے ارکان دولت کو جمع کیا اور ان سے خطاب کیا۔

”میں چاہتا تو یہی ہوں کہ قلعے کا محاصرہ کروں۔ اس کے لیے مزید فوج بلواؤں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی لشکر طلب کروں لیکن قلعے کی مضبوطی یہ بتا رہی ہے کہ اس قلعے کو فتح کرنے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہید ہو جائے گی۔ میں اس جیسے دس قلعوں کے مقابلے میں بھی مسلمانوں کا بال بیکا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مال و اسباب جو اتنے مسلمانوں کے مرنے کے بعد ملے گا، دنیا میں میرے کس کام کا۔ اس وقت جبکہ ان مرنے ہوئے مسلمانوں کی ہوا میں اور قیمتی بچے میرے سامنے آکر کھڑے ہوں گے تو جو کچھ بھی اسی قلعے سے مجھے حاصل ہوگا، وہ میرے لیے ہر سے زیادہ بڑا ہوگا۔“

”تو کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ محاصرہ اٹھانے اور واپسی کا حکم دے رہے ہیں؟“ اس کے منہ چڑھے امیر ملک جیب نے وضاحت چاہی۔

”تم نے بالکل صحیح سمجھا بلکہ میں وضاحت کر چکا۔“

”گستاخی معاف، مہمات سے اس خوف سے جان چھڑانا کہ سپاہیوں کی جانیں تلف ہوں گی، آئین جہاگیر کی کے خلاف ہے۔“

سلطان نے بھی ترکی پر کی جواب دیا۔

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں آئین جہاگیر کی سے واقف نہیں مگر میں ان بادشاہوں میں سے ہوں جو ہوں ملک گیری میں مسلمانوں کی قیمتی جانوں کا خیال نہیں رکھتے۔ میں تم سے کہتی ہوں یہ بھی کہ چکا ہوں کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب تیری موجودگی میں، میں تاریخ کے چند ورق نہ پڑھتا ہوں۔ تو میرے لیے بچنے کی طرح ہے لیکن میرے سامنے رائے اس طرح دیتا ہے کہ گویا تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا مگر میں کہتا ہوں کہ خدا اور رسول خدا نے فرمایا ہے وہ اور کچھ ہے اور جو کچھ جاہلوں اور فرعون مفت حکمرانوں نے کہا ہے اور جو رسوم اور طریقے ان کی اقتدار کرنے والوں نے قائم کیے ہیں، وہ اور ہیں۔ میں اپنی بادشاہی میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو دل سے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ پیغمبروں نے کہا ہے سچ ہے۔ یہ

ضرور ہے کہ تیرے بتائے ہوئے طریقہ کار سے بادشاہوں کا رعب عوام پر قائم ہو جاتا ہے لیکن وہ انسان کو اسلام سے اس طرح باہر نکال دیتا ہے جیسے بال غیر میں سے گزر جاتا ہے۔ پس جو میں کہتا ہوں اور کرتا ہوں، وہ مسلمان ہونے کے لحاظ سے کرتا ہوں اور اسی کا مثلاًشی رہتا ہوں۔“

امیر ملک جیب بادشاہ کے یہ تیرور دیکھ کر سہم سا گیا۔

”بادشاہ کی مہربانیوں نے مجھے گستاخ کر دیا ہے۔“

میرے لیے بار بار فرمان ہوا ہے کہ بادشاہ کی حکومت اور دولت کی خیر خواہی کے لیے جو کچھ مجھے معلوم ہو، وہ میں اسی وقت عرض کروں۔ اس موقع پر بھی کہ آپ رن حضور کو فتح کیے بغیر واپس جا رہے ہیں، میں یہ دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے دلوں سے آپ کے احکامات کا اثر کم ہو جائے گا۔ آپ اسلام کی خدمت کے لیے نکلے تھے اور کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس سے میرا دل چل رہا ہے اور جو کچھ میرے دل میں آیا، میں نے عرض کر دیا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ آپ سلطان محمود اور سلطان سنجر کا اتباع کیوں نہیں کرتے۔“

اس کی یہ باتیں سن کر بادشاہ ہنسنا اور اس کی اصلاح کی۔

”اے لڑکے، سلطان محمود اور سلطان سنجر کے سلاح دار اور رکاب دار ہم سے بچتے تھے۔ ہمارے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس چند روزہ بادشاہی میں جو عار بتا ہمارے پاس آگئی ہے، اپنے دل میں یہ خیال بھی لائیں کہ ہم بھی وہی کریں گے جو ان راست باز فاقوں نے کیا ہے۔“

ملک جیب جب مجلس سے اٹھنے لگا تو وہ سلطان کے قدموں میں گر پڑا اور عرض کیا۔

”جن حقائق کو علما اور عقلمندوں نے پسند کیا، وہ وہی ہیں جو خداوند عالم کے دل میں آئے ہیں۔ میں جوان ہوں اور آپ کی مہربانی سے اس مرتبے پر پہنچا ہوں اس لیے میرے دل میں یہ خیالات آتے ہیں کہ ایسا ہو اور جلد ہو جائے۔“

جلال الدین دہلی کی طرف واپس ہوا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے تو دہلی پہنچ کر ان سازشوں کا علم ہوا جو اس کے بچنے علاؤ الدین کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ ملکہ جہاں علاؤ الدین کے بہت خلاف تھی اور اس نے ارگلی خاں کے ساتھ مل کر علاؤ الدین کو راستے سے ہٹانے کی سازش کی تھی۔ شکر ہے علاؤ الدین اس سے باخبر ہو کر ”کڑہ“ چلا گیا تھا۔ جلال الدین نے تمام حالات سے باخبر ہوتے ہی علاؤ الدین کو خط

لکھ دیا کہ وہ دہلی آنے کی ہرگز کوشش نہ کرے اور ملکہ جہاں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس نے علاؤ الدین کو گرفتار کرنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اس کے بعد اس نے ارگلی خاں کو ملتان کا حاکم بنا کر بھیج دیا تاکہ وہ ملکہ جہاں سے دور ہو جائے اور کوئی سازش تیار نہ ہو سکے۔

ابھی وہ ان اندرونی سازشوں میں گھرا ہوا تھا کہ ایک بیرونی جنگ میں الجھنا پڑ گیا۔ ہلاکو خاں کا ایک نواسہ ایک لشکر جرار سے کرہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔ رن حضور کو فتح نہ کرنے کا غصہ ابھی تک اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ غصہ اتارنے کا یہ موقع خود بخود اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے بھی ایک لشکر جرار تیار کیا اور آگے بڑھا۔ ایک بہت بڑے میدان میں دونوں فوجوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ لڑائی کا آغاز ہوا اور دونوں لشکروں کے درمیان معرکہ آرا لڑائی ہوئی۔ محسوس کا رن پڑا اور بالآخر مغلوں کے مقابلے میں غلیچوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بے شمار شہر دارموت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور چند مئی گرائی سرداروں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

اس دوران کچھ صلح پسند لوگوں نے فریقین کے درمیان صلح کی بات چیت اٹھائی۔ یہ بات چیت کامیاب رہی اور جلال الدین غلیچ اور مغلوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ مغلوں کا لشکر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

ابھی جلال الدین اس فتح کا جشن منا رہا تھا کہ اس کے بچنے علاؤ الدین کا خط موصول ہوا جو اس وقت کڑہ کا حاکم تھا۔ اس نے اس خط میں ”تہاسہ“ پر چڑھائی کی اجازت طلب کی تھی۔ بادشاہ خود بھی یہ چاہتا تھا کہ علاؤ الدین مہمات میں گھرا رہے اور دہلی کا رخ نہ کرے۔

علاؤ الدین نے تہاسہ پر حملہ کیا اور خوب تباہی پائی اور بے پناہ مال غنیمت بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی خدمات کو سراہا اور شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کر کے اسے اودھ کے صوبے کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس فتح کے بعد علاؤ الدین کچھ اور سوچنے لگے۔ اس نے سوچا وہ دہلی سے دور رہے اور دور دراز کا سفر کرتا رہے تاکہ ملکہ جہاں کی سازشوں سے بچا رہے۔ اسے جلال الدین پر بھی زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ ملکہ جہاں کے اثر میں ہے۔ اس کے بھڑکانے پر وہ کسی بھی وقت مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے بادشاہ کے نام خط لکھا۔

”چند یری کے آس پاس کے علاقوں میں بہت سے دولت مند ہندو راجا آباد ہیں۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنی

جاگیر کی آمدنی سے ایک نیا لشکر تیار کروں اور پھر ان راجاؤں کو کھست دے کر ان کی دولت شای خزانے میں جمع کر دوں۔“

جلال الدین نے لالچ میں آکر بغیر سوچے سمجھے اجازت دے دی۔ اجازت ملنے ہی وہ دیوگیری کی طرف روانہ ہو گیا اور مشہور یہ کیا کہ مصافات چند یری کی لوٹ مار کے لیے جا رہا ہے۔

ایک عرصے تک بادشاہ دہلی جلال الدین کو علاؤ الدین کی کوئی خبر نہ ملی البتہ علاؤ الدین کا نائب جو اس کی موجودگی میں فراغ انجام دے رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ علاؤ الدین چند یری کی غارت گری میں مصروف ہے۔ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے، علاؤ الدین کا ایک خط بھی بادشاہ کی خدمت میں نہ آیا۔ اسی زمانے میں علاؤ الدین کی بغاوت کی افواہ پھیل گئی۔ یہ افواہ دہلی کے چہرے بڑے کی زبان پر تھی لیکن جلال الدین نے ان افواہوں پر کان نہ دھرا اور علاؤ الدین کی طرف سے قطعاً بدگمان نہ ہوا۔

جلال الدین کو اطلاعات موصول ہوئیں کہ علاؤ الدین نے دیوگیری (دیو گڑھ) فتح کر لیا ہے لیکن علاؤ الدین کی طرف سے اب بھی کوئی اطلاع نہ آئی۔ جلال الدین کی فکر مندی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے بہت سے ایسے واقعات سنے تھے کہ مال غنیمت کے چھڑوں میں امرائے کبار نے بغاوت کر دی تھی۔ جلال الدین کے بالغ نظر مقررین بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ علاؤ الدین نے لشکر دولت حاصل کر لی ہے۔ اب وہ یقیناً بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔ وہ بغاوت کا راستہ اس لیے بھی اختیار کرے گا کہ ملکہ جہاں اور اس کے درمیان رنجش ہے لیکن یہ لوگ یہ بات بادشاہ کے سامنے نہیں کہہ سکتے تھے۔

سخت گرمی میں بارش کے قطرے کی طرح یہ خبر آئی کہ علاؤ الدین تمام مال غنیمت کے ساتھ کڑہ سے دہلی کی طرف آ رہا ہے۔

یہ خبر سن کر جلال الدین نے اپنے مشیروں سے بنیادی میں مشورہ کیا کہ علاؤ الدین دیو گڑھ سے اس قدر مال و دولت اور ساز و سامان وغیرہ لے کر آ رہا ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہوں یا آگے بڑھ کر استقبال کروں؟

امیر ملک جیب بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ کڑوی سے کڑوی بات بادشاہ کے منہ پر کھد دیا کرتا تھا، اس مرتبہ بھی خاموش نہ رہا۔

”مال و دولت اور لشکر کی کثرت ہمیشہ بغاوت اور سرکشی کا سبب بنتی ہے۔ علاؤ الدین بھی یقیناً بغاوت کے راستے پر چل پڑا ہے ورنہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر دکن کی مہم سر نہ کرتا۔ میں سمجھتا ہوں آپ آگے بڑھیں اور چند بری تک جائیں۔ جب علاؤ الدین کو شاہی لشکر کی آمد کی خبر ملے گی تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ وہ تمام مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے۔ بادشاہ کو اس موقع پر چاہیے کہ ان تمام مقصدوں کو جو سیدی مولہ کے قتل کے بعد علاؤ الدین کے گرد جمع ہو گئے ہیں، علاؤ الدین سے سلجھ کر کے دور دراز ممالک میں بھیج دے اور علاؤ الدین کی جاگیر میں اضافہ کر کے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔“

”میں اسے اپنے ساتھ دہلی لے آؤں یا کڑھ کی طرف روانہ کر دوں؟“ جلال الدین نے پوچھا۔ ”اگر حضور کی اجازت ہو تو اس مسئلے کو شاہی خاندان کے مسائل کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کروں۔“

”اجازت ہے۔“ ملک جہاں اور علاؤ الدین کی ناراضی سے حضور باخبر ہیں۔ ان دونوں افراد کی رنجش اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ علاؤ الدین یہ فیصلہ کر چکے ہوں گے کہ وہ دہلی میں نہ رہیں، کسی دور دراز کے مقام پر قیام پزیر ہوں۔ اگر کسی وقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو بغاوت یقینی ہوگی۔ ملک حبیب احمد کی یہ تقریر ملک فخر الدین کو بچی کے نزدیک حقائق پر مبنی تھی لیکن اس نے بادشاہ کی خوشنودی کے پیش نظر اسے ٹالنا چاہا۔

”ابھی یہ بات پوری طرح پایہ حقیق کو نہیں پہنچی کہ علاؤ الدین اس طرف آ رہا ہے لہذا اس وقت اس مسئلے میں غور و فکر نہ کر رہے۔ جب ان خبروں کی تصدیق ہو جائے گی تو ہم اپنے لشکر کے ذریعے اسے راستے میں روک لیں گے۔ اس برسات کے موسم میں اس کا تعاقب کرنا مناسب نہ ہوگا لہذا وہ جہاں جائے اسے جانے دیا جائے۔“

ملک حبیب کو ملک فخر الدین کو بچی جیسے تجربہ کار کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بہت غصہ آیا۔ اس نے ملک کو بچی سے کہا۔

”خدا کے لیے ضرورت سے زیادہ تن آسانی سے کام نہ لو ورنہ وقت ہم لوگوں کو دھوکا دے جائے گا۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ جب علاؤ الدین بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے کھنونی پر حملہ کرے گا، اس وقت تم کیا کر گے؟“

جلال الدین بھی ملک حبیب پر چراغ پا ہو گیا اور ملک کو بچی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ہمیشہ ہی علاؤ الدین کی طرف سے بدگمان رہتے ہو۔ میں نے اسے آغوش میں پالا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میرے حقیقی بیٹے میرے مقابلے پر اتر آئیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ علاؤ الدین میرے مقابلے پر اتر آئے۔“

ملک حبیب یہ کلمات سن کر سخت رنجیدہ ہوا اور بغیر کوئی بات کہے مجلس سے اٹھ گیا۔ ”عجب احمق بادشاہ ہے، اپنے ہاتھوں اپنے لیے مرکز کا کھود رہا ہے۔“ یہ ملک حبیب کے دل کی آواز تھی جو دل میں ہی رہ گئی۔ وہ کسی سے نہ کہہ سکا۔ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بالآخر علاؤ الدین کا خط بنام جلال الدین آ گیا۔

”میں 31 تھی، تمام قیمتی گھوڑے اور گراں قدر ساز و سامان جو کہ میرے ہاتھ آئے ہیں، بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ میں ایک مدت سے حضور سے جدا ہوں اسی لیے میں اور میرے ساتھی عتاب شاہی کے خوف سے پریشان ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت اپنے قلم خاص سے ایک فرمان میرے اور میرے ہم سفروں کے نام لکھ کر بھیجا دیں تو بڑی عزت ہوگی۔ اس کے بعد میں بڑے شوق سے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوجاؤں گا اور تمام مال و اسباب حضور کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

علاؤ الدین کا یہ خط پڑھ کر جلال الدین بھی اس کی مکاری کے دام میں بری طرح پھنس گیا اور اس کی محبت اور خلوص کا پہلے سے زیادہ دم بھرنے لگا۔

اس زمانے میں علاؤ الدین کھنونی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا یہ ارادہ تھا کہ جب بادشاہ کڑھ کے لیے روانہ ہو تو وہ خود کھنونی پہنچ کر جلال الدین کی مخالفت کا اعلان کر دے۔

جلال الدین ان تمام حالات سے بے خبر علاؤ الدین کی محبت کا دم بھر رہا تھا۔ اس نے ایک محبت بھرا فرمان اپنے قلم خاص سے لکھ کر دو خاص ملازمین کے ہاتھ علاؤ الدین کے پاس کڑھ روانہ کیا۔

یہ دونوں قاصد جب کڑھ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ علاؤ الدین بغاوت پر کمر بستہ ہے۔ علاؤ الدین نے ان قاصدوں کو گرفتار کر لیا تاکہ جلال الدین تک کسی قسم کی اطلاع نہ پہنچ سکے۔

قاصدوں کی واپسی نہیں ہو رہی تھی۔ بادشاہ ہزار

”میں اس سے انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران میں علاؤ الدین کا بھائی الماس جو بادشاہ کا داماد بھی تھا، جلال الدین کے دل میں اپنے بھائی علاؤ الدین کی محبت کے نفوذ گہرے کر جا رہا۔

بادشاہ سے بار بار کہتا۔ ”بادشاہ سے علاؤ الدین کی ناراضی کی خبر بہت مشہور ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے یہ خوف ہو گیا ہے کہ ممکن میرا بھائی ندامت کی وجہ سے خودکشی نہ کر لے۔“

بہی الماس بیگ پوشیدہ طور پر علاؤ الدین سے خط کتابت کر رہا تھا۔ اسی کے کہنے پر علاؤ الدین نے ایک خط الماس بیگ کے نام لکھا۔

”اگر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہو کہ بادشاہ میری جان کا دشمن ہے اور مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو فوراً مجھے لکھو تاکہ میں نہ ہرکھا کر اپنے آپ کو قتل نہ کر لوں۔“

الماس بیگ نے منصوبے کے مطابق یہ خط بادشاہ کے سامنے رکھ دیا اور اسی خوشحالانہ کھنونی کی کہ اسے خط کے مضمون پر پورا یقین آ گیا۔

جب الماس بیگ نے علاؤ الدین کو خط لکھ دیا کہ اس نے بادشاہ کو یقین دلادیا ہے تو علاؤ الدین نے الماس کے نام ایک اور خط لکھا جو بادشاہ کو نہیں دکھانا تھا۔

”اگر بادشاہ دولت کے لالچ میں کسی طرح تباہ چلا آئے تو ہمارا کام بن جائے۔“

اس خط کے موصول ہونے کے چند دن بعد الماس نے پھر بادشاہ سے ملاقات کی اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگا۔

”بہتر یہی ہے کہ حضور کیلئے ہی ”کڑھ“ کا سفر اختیار کریں۔ اس سے پہلے کہ میرا بھائی خودکشی کرے، آپ وہاں جا کر اسے تسلی دیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم جاں نثار پہلے سے زیادہ آپ کے ممنون احسان ہوں گے۔“

بادشاہ، الماس بیگ کی باتوں میں آ گیا۔ علاؤ الدین کی طرف سے ایسا نگر مند ہوا کہ اسی وقت الماس کو حکم دیا۔

”تم جلد از جلد ”کڑھ“ روانہ ہو جاؤ اور وہاں پہنچ کر علاؤ الدین کو میری طرف سے دلاسا دو اور اطمینان دلاؤ۔ میں بھی جلد ہی پہنچوں گا۔ خبردار..... وہ خودکشی نہ کرنے پائے۔“

الماس کو اور کیا چاہیے تھا۔ حکم ملتے ہی اس کی سوار ہوا اور سات روز کے سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔

”خدا کا شکر ہے تیرے بھائی آ گئے۔“ الماس بیگ نے کہا۔ ”اب کھنونی کا سفر ضروری ہے یا نہیں؟“ علاؤ الدین نے اسی سے مشورہ چاہا۔

”فی الحال کھنونی جانے کا ارادہ ترک کرنا چاہیے۔ بادشاہ اکٹلا آ رہا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلے اس کا کام تمام کیا جائے۔ اس کے بعد جب ارگلی خاں تخت نشین ہو کر ملکی انتظامات کی طرف توجہ کرے گا، ہم کھنونی پر لشکر کشی کر کے بنگالہ پر قبضہ کر لیں گے۔“

علاؤ الدین نے اس رائے کو پسند کیا اور کڑھ ہی میں رکھ رہا۔

ملک حبیب ایک مرتبہ پھر آڑے آیا اور بادشاہ کو روکنے کی کوشش کی۔ دوسرے امیروں نے بھی سمجھایا کہ وہ کڑھ نہ جائے لیکن جلال الدین دولت کے لالچ میں بری طرح خواس پاخت تھا۔ وہ صرف پانچ سو سواروں کے ساتھ کئی کے ذریعے روانہ ہو گیا البتہ ملک حبیب کو یہ حکم دے دیا کہ وہ لشکر کو اپنے ساتھ لے کر کھنونی کے راستے کڑھ پہنچے۔

علاؤ الدین کو جب بادشاہ کی روانگی کی خبر ملی تو اس نے دریائے گنگا کے پار تارے اپنے لشکر کے ساتھ ڈرے ڈالے۔

جب شاہی چتر دور سے پانی پر نظر آیا تو علاؤ الدین کے لشکر نے بظاہر شان و شوکت کے اظہار کے لیے خود کو سرخ کر لیا لیکن دراصل مقصد کچھ اور تھا۔

علاؤ الدین نے اپنے بھائی الماس بیگ کو بادشاہ کے انتقال کے لیے روانہ کیا اور اسے ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو، بادشاہ کو اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے تباہ کنارے پر لایا جائے۔ الماس بیگ اسی وقت روانہ ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

عرض کیا۔ ”اگر میں ایک دن بھی تاخیر سے پہنچتا تو علاؤ الدین خودکشی کر چکا ہوتا۔ اس نے میرے سمجھانے کے باعث خودکشی تو نہیں کی لیکن اس کے دل میں ابھی تک خوف باقی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کے ساتھ آپ کے ساتھیوں کو دیکھ کر یہاں سے فرار ہو جائے۔ اگر آپ اس سے تباہی کما سے تسلی دیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔“

یہ سن کر بادشاہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سب کشتیوں میں بیٹھے رہیں اور خود چند مصاحبوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ الماس بیگ کو یہ بھی ناگوار تھا کہ یہ چند مصاحب بھی اس کے ساتھ کیوں ہیں۔

جلال الدین کی رنجش نے ابھی تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ الماس نے عرض کیا۔

”یہ چند مصاحب بھی آپ کے ساتھ ہیں، انہیں بھی خود سے جدا کر دیں۔ ورنہ ان لوگوں کو دیکھ کر علاؤ الدین کسی

ناقابل یقین

تویر ریاض

ما فوق الفطرت واقعات ہمیشہ سے لوگوں کو چونکا دیتے ہیں۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ناقابل یقین صلاحیت سے نوازا تھا لیکن... چند لمحات کے لیے... اور پھر وہ اس صلاحیت سے معذور ہو گئی مگر ان چند لمحات کی اثر پذیری اتنی گہری تھی کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے ان چند لمحات میں جو منظر دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ کوئی مفروضہ نہیں تھا۔

ایک مادہ اور غیر یقینی خواب کے مابین عجیب تعلق کا قصہ



جن کی وجہ سے اسے تیز چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس اذکم دور سے دیکھنے پر ایرین کو ایسا ہی لگا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور وہ عورت تیزی سے اس کی خالی بس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس نے ٹھانے کے گاؤں کے بچے پاجامہ پہن رکھا تھا اور پیرول میں موٹے سلپرز تھے

اتار دیا۔

اس نازک وقت میں اسے وہ وقت ضرور یاد آیا ہوگا جب اس نے معز الدین کی قیاد کو قتل کرنے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔ ان لوگوں نے قیاد کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو دور یاٹے جتنا میں بہا دیا تھا۔ اس وقت بھی صرف دریا بدلا تھا، منظر وہی تھا۔ قیاد کے خون سے دریائے جتنا سرخ ہوا تھا۔ لگا کا پانی جلال الدین کی کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ اسے مکافات عمل کہا جائے یا کچھ اور؟ اس نے قیاد کے تخت پر قبضہ کیا تھا، آج اس کے تخت پر اس کا بیٹا جیسے اس نے بیٹوں کی طرح پالا تھا، قبضہ کرنے جا رہا تھا۔

مکافات عمل کا یہ سلسلہ ہمیں نہیں رک گیا۔ علاؤ الدین کے تمام سامی جو قتل کی اس سازش میں شریک تھے، بہت ہی جلد اس خون ناحق کی سزا میں بری طرح اپنے انجام کو پہنچے۔ محمود بن سالم ایک سال بعد ہی کوڑے کے مرض میں مبتلا ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر رہا تھا۔ اختیاریہ الدین پاگل ہو گیا۔ اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ کہتا پھرتا تھا: ”ووڑو... جلال الدین کی ہاتھ میں تلوار لیے میرا سر کاٹنے آ رہا ہے“

علاؤ الدین علم کی جس نے یہ تمام سازش تیار کی تھی، اسے بھی چند سال عیش و عشرت کے نصیب ہوئے پھر اس کا خاندان بھی جنکوں کی طرح بکھر گیا۔

سیدی مولے نے کہا تھا کہ میرا ہورنگ لا کر رہے گا، وہی ہوا۔ جلال الدین کے سر کو تیزے پر لٹکا کر گلی گلی ٹھکانا دیا گیا۔ اس کے دو بیٹوں اور داماد کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ لکھ جہاں قید خانے کی کال کوٹھری میں سرخسے

لکھ جہاں سے حماقت یہ ہوئی کہ اس نے سب سے چھوٹے بیٹے سلطان ابراہیم رکن الدین کو تخت پر بٹھادیا۔ اگر وہ ارکلی خاں کو بروقت ملتان سے بلا لیتی تو اس کی بہادری باپ کے تخت کو بچا سکتی تھی۔ علاؤ الدین کو جب معلوم ہوا کہ ابراہیم رکن الدین تخت پر براجمان ہوا ہے تو اس کے حوصلے بڑھ گئے اور اس نے سارے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا مہم ارادہ کر لیا اور وہ تو لکھنؤ کی جانا چاہتا تھا۔

لکھ جہاں کی غلطی نے تخت ہاتھ سے نکال دیا۔ کچھ ہے کہ یہ غلطیاں نہ ہوں تو مکافات کا عمل کیسے مکمل ہو۔

خطرے کا گمان کر کے آپ کی عنایات سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔“ یہ چند معاصی ہی تھیں۔ پھر بھی اگر تو چاہے تو میں انہیں غمیر کر دوں۔“

”بے شک...“ تمام لوگوں نے ہتھیار اتار دیے۔ جب کشتی کنارے کے قریب پہنچی تو بادشاہ کے ان معاصیوں نے دیکھا کہ علاؤ الدین ہتھیار بند ہو کر استقبال کے لیے آ رہا ہے۔

ایک امیر خرم نے الماس بیگ کی توجہ اس طرف دلائی۔ ”تمہاری خواہش کے مطابق ہم نے ہتھیار اتار دیے ہیں لیکن تم لوگ مسیح سج ہو اور لڑائی کے لیے تیار معلوم ہوتے ہو۔“ ان لوگوں نے بادشاہ کی توجہ بھی اس طرف مبذول کی لیکن بادشاہ اپنے بیٹے کی محبت میں اتنا اندھا ہو رہا تھا کہ اس پر کچھ اثر نہ ہوا، صرف اتنا کہہ رہا۔

”میں تو اتنی دور سے سفر لے کر آ رہا ہوں۔ اس وقت روز سے ہے مگر ہوں لیکن اس سے انتظار بھی نہ ہوا کہ کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دور تک میرے استقبال کے لیے آتا۔“

الماس بیگ نے پھر بات بتائی ”میرا بھائی یہ پسند نہیں کرتا کہ خالی ہاتھ حضور کی خدمت میں آئے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ بیٹے قیمت ساز و سامان، قیمتی ٹھوڑے اور ہاتھی لے کر آپ کی پاپوسی کا شرف حاصل کرے۔“

جلال الدین کشتی میں بیٹھا کلام مجید کی تلاوت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ عصر کے وقت کشتی نے کنارہ چکڑا۔ بادشاہ نے کشتی سے باہر قدم رکھا اور علاؤ الدین نے آگے بڑھ کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”تو نے یہ سوچا بھی کیسے تھا کہ میں تیرے خلاف ہو جاؤں گا۔ اب دیکھ میں تجھے لینے خود آ گیا ہوں۔ اس بڑھاپے میں اور اتنا طویل سفر لے کر کے روزے کی حالت میں۔ چل اب ساتھ مل کر روزہ افطار کریں گے۔ عید سے پہلے ہی میری توقع یہ ہو گئی ہے۔“

علاؤ الدین نے یہ باتیں سنیں ضرور لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اشارہ کیا جو بادشاہ کے قتل پر متعین کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے تلوار کا وار کیا۔ بادشاہ نے ہوا اس ہو کر کشتی کی طرف بھاگا لیکن ایک دوسرے سپاہی نے بھاگتے ہوئے بادشاہ کو زمین پر گرادیا اور اس کا سر کاٹ لیا۔ بادشاہ کے وہ ہمراہی جو کشتی میں تھے، انہیں بھی موت کے گھاٹ

صاخذات: تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، تاریخ فیروز شاہی، منتخب التواریخ

باوجود ایرین نے بس کا دروازہ کھلا رکھا۔ بس سروس میں بیس سال کی ملازمت کے بعد اس میں غیر معمولی مہر اور برداشت آگئی تھی۔

وہ عورت جب قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دو پالتو جانوروں میں سے ایک کتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایرین کو دیکھا اور بس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ "میری جیب میں ایک ڈالر ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے سوئی۔" ایرین نے کہا۔ "لیکن تم پالتو جانوروں کے ساتھ بس میں سوار نہیں ہو سکتی۔" چاہے وہ کتنے ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں۔

اس عورت نے اپنے پالتو جانوروں کی طرف دیکھا۔ ایرین کا خیال تھا کہ وہ کوئی جوان عورت ہوگی لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ چالیس کے لگ بھگ نظر آئی۔ اس کے سنہری بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنے بال سنوارنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بستر سے اٹھ کر سیدھی بس پکڑنے چلی آئی۔

"یہ میرے دوست ہیں۔" اس عورت نے کہا۔ "البتہ مددگار نہیں۔"

"اگر تم انہیں گھر پر چھوڑنا چاہو تو میں تمہارا انتظار کر لوں گی۔ تم غالباً سامنے والے اپارٹمنٹ کی پکیس میں رہتی ہو۔"

"ہاں۔" اس عورت نے کہا۔ "لیکن میں انہیں واپس نہیں لے جاسکتی۔ وہ انہیں مار ڈالے گا۔"

ایرین کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ گوکہ وہ دوستانہ مزاج رکھتی تھی لیکن اس نے کبھی لوگوں کے مسائل میں الجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس عورت میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا منہ کھولنے پر مجبور ہوئی۔

"کون ہنی؟ تم کسی کی بات کر رہی ہو؟"

"میرے اپارٹمنٹ میں ایک سیریل کُھر رہا ہے۔" ایرین نے اپارٹمنٹ کی پکیس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر یہ عورت سچ کہہ رہی ہے تو وہ اس کا چھچکا کرتا ہوا یہاں بھی آسکتا ہے۔ اس نے بس کا دروازہ بند کیا اور بولی۔ "بیٹھ جاؤ، میں تم سے کوئی کرایہ نہیں لوں گی۔" اس نے چپکے سے پولیس کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

☆☆☆

سار جٹ وٹس جوت کو نائٹ شفٹ پسند تھی کیونکہ دن میں کئی عجیب لوگ علاقے میں آدھر گردی کرتے رہتے تھے

اور پینرول آفیسر زیادہ تر ٹریفک کنکٹ جاری کرنے میں مصروف رہتے۔ جوت رات میں چش آنے والے واقعات کو ترجیح دیتی تھی جس میں زیادہ تر عجیب لوگ ملوث ہوتے تھے۔

یہ بات نہیں کہ وہ ان واقعات سے تفریح لیتی تھی اور نہ وہ ان لوگوں پر بطور خاص توجہ دیتی جو دیکھنے میں عجیب لگتے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے مشکلات پسند تھیں۔ اس کے خیال میں ہر وہ رات اچھی تھی جس کا اختتام کسی مسئلے کے پراسن حل پر ہوتا۔ جوت کو ان عجیب لوگوں کی یہ بات پسند تھی کہ وہ اسے رات بھر انداز سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

اس گوری عورت کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں آپ دیکھتے ہی پسند کرنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ باجاسہ بیٹے محوم رہی تھی لیکن اس نے اوپر ایک معمولی گاؤں بھی لیا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت کے مانند دکھائی دے رہی تھی جس کا گھر آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہو اور وہ یہ مشکل قسام اپنے جانوروں کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکی ہو۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

"میرا نام کینی ہے۔" اس عورت نے کہا۔ "کینی تھامس۔ یہ میرے دوست پیٹ اور ٹیکس ہیں۔"

جوت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تم اپنے گھر سے کیوں نکل آئیں؟"

"میرے اپارٹمنٹ میں ایک سیریل کُھر موجود ہے۔ میں صرف اتنی دیر اس میں رہنا چاہتی ہوں جب تک وہ چلا نہ جائے۔"

جوت نے بس ڈرائیور کی طرف دیکھا جو اس کے پارٹنر کو اپنا بیان کھوا رہی تھی۔ "کینی! ضروری نہیں کہ لوگوں کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے والا شخص سیریل کُھر ہی ہو۔ وہ کوئی چور بھی ہو سکتا ہے۔" جوت نے کہا۔

"نہیں۔" کینی نے کہا۔ "وہ پانچ عورتوں کو قتل کر چکا ہے۔ جیسے ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہیرولڈ دروازے پر آگیا ہے، میں جتنی دروازے سے نکل آئی اور مجھے اپنے ساتھ پیٹ اور ٹیکس کو بھی لانا پڑا۔ ورنہ وہ مجھے گھر میں بند کچھ کر انہیں بھی مار دیتا۔ وہ بہت سفاک ہے۔"

"تم اس کے بارے میں مجھے مزید کیا بتا سکتی ہو؟"

"وہ سفید قام اور پینتیس سال کا ہے۔" کینی نے کہا۔ "وہ اپنی ماں کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں اپنے گیسٹ ہاؤس پر رہتا ہے۔ چپے کے لحاظ سے وہ ریکل انٹیٹیو ایجنٹ ہے لیکن اس کام میں اسے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی کیونکہ

لوگ اس سے جلد ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا نام جان فوکس ہے۔"

جوت نے یہ تمام معلومات اپنی نوٹ بک میں لکھیں۔ "تم اسے کیسے جانتی ہو کینی؟ کیا وہ تمہارا ایجنٹ تھا؟"

"نہیں۔ میں نے اسے لیونگ روم کی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ میرے ہیرولڈ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لہذا میں نے اپنے دوستوں کو ساتھ لیا اور جتنی دروازے سے نکل آئی۔ عین اس وقت وہ میرے دروازے میں نقب لگا رہا تھا۔"

یہ سننے کے بعد جوت نے فیصلہ کیا کہ اسے ضابطہ کی کارروائی کرنی چاہیے۔ اس نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ ہم پولیس کی مدد لیں اور تمہارے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی جائے۔"

کینی نے کہا۔ "کیا تمہارے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس کے جانے کا انتظار کریں۔ اگر تم نے اس کا سامنا کیا تو وہ ٹپش میں آسکتا ہے اور پھر وہی صورت حال پیدا ہوگی جو ہم نے وی پر دیکھنے میں، یعنی پولیس پر فائرنگ، کاروں کا تعاقب اور اغوا۔ اگر کوئی اسے ناکام بنانے یا اس کے کام میں مداخلت کرنے کی کوشش کرے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے اور اس لیے وہ لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ خصوصاً ایک خاص عمر کی عورتوں کو۔"

"خاص عمر سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"چالیس یا اس کے لگ بھگ۔ وہ اسی عمر کی عورتوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور انہی سے نفرت بھی کرتا ہے۔ اس کا نشانہ غیر شادی شدہ عورتیں ہیں جو تہا رہتی ہیں اور خود مختار زندگی گزارتی ہیں۔"

"تمہاری طرح؟"

"ہاں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ عام حالات میں اس نے میرا فوٹس لیا ہوگا۔ وہ صرف اس لیے میرے پیچھے لگ گیا کیونکہ میں اسے پہچانتی ہوں۔"

"تم اسے کیسے پہچانتی ہو کینی؟"

"میں اس سے جہنم میں ملی تھی۔" جوت کو اس کا جواب سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اگر کینی جوت کی بہت پامل تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شخص اس کے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھا۔ عام طور پر بیمار ذہن کے لوگ کسی واقعے کو بیان کرنے کے لیے اس طرح کے استعارے استعمال کرتے ہیں۔

"تم اس سے جہنم میں کب ملی تھیں؟"

کینی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اس کی

وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ جب میرا کارڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور میں تیس سینڈنگ کروہ پڑی رہی لیکن جہنم میں وقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں اس سے جہنم میں مل سکی جبکہ وہ ابھی تک زمین پر زندہ ہے۔"

وہ جس جرم کو ان انداز میں گفتگو کر رہی تھی، اس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی برا سرسراہٹ بیان کر رہی ہے پھر اس نے ایک اور حیران کن انکشاف کیا۔ "میں جہنم میں دس ہزار چار سو تیس سیریل کُھر سے ملی تھی۔"

"یہ تو بہت بڑی تعداد ہے کینی۔"

"وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔" جوت نے سوچا کہ اگر اس نے مزید تفصیل جاننے کی کوشش کی تو بات بہت طویل ہو جائے گی اور وہ جس مقصد سے آئی ہے، وہ پورا نہ ہو سکے گا۔ اس نے کینی سے کہا۔ "میں مدد کے لیے فون کر رہی ہوں۔ اس کے بعد ہم اس موضوع پر مزید بات کریں گے۔ تم چاہو تو آفیسر اسمتھ کے ساتھ یہاں میخوردنس ایرین کے پاس چلی جاؤ۔ تمہیں جو جگہ بھی محفوظ لگے۔"

"ٹھیک ہے۔" کینی نے مطمئن انداز میں کہا۔ جوت آفیسر اسمتھ کے پاس گئی اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر وہ بس سے نچے اتری اور اس نے مزید فزری کے لیے فون کیا۔ اسے بتایا گیا کہ دس منٹ میں مدد پہنچ جائے گی۔ وہ واپس بس میں جانے والی تھی کہ شاید کینی سے مزید معلومات حاصل ہو سکیں مگر اچانک ہی اس کی نظر اپارٹمنٹ بلڈنگ میں ایک کھڑکی پر گئی اور اس نے پردے کے پیچھے ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ "کیا یہ کینی کا اپارٹمنٹ ہے یا کوئی پڑوسی ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے ہے یا پھر وہ اتنی جان فوکس وہاں موجود ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے؟"

☆☆☆

جوت نے اپنا ہتھیار نکال لیا۔ کینی کے اپارٹمنٹ کا دروازہ تقریباً آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ دروازے کی چوکت ٹوٹ گئی تھی اور اس کی تاب بھی مل کھا گئی تھی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام کمرے چیک کیے لیکن انہیں وہاں کچھ نہیں ملا پھر وہ ہاتھ روم میں گئی اور وہاں اس نے آئینے پر لپ اسٹک سے لکھی تحریر دیکھی۔

"کیا تم مجھے ہو کہ یہ اس نے خود لکھا ہوگا؟" آفیسر اسمتھ نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں نے پچھل بار ایسی ہی ایک تحریر دیکھی تھی۔ اس میں لکھا تھا، مجھے پڑا۔۔۔۔۔ اگر پڑھو۔۔۔“
 ”یہ تحریر اس سے مختلف ہے۔“ اسٹھ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم سے اگلی مرتبہ ملاقات ہوگی۔“
 جوز نے اپنی کن ہولسٹر میں رگی اور پچھلی جیب سے دستاؤں کی جوڑی نکال کر پہن لی پھر اس نے ہاتھ روم کی دروازہ کھولی۔ ”یہاں کوئی لب اسٹک نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ کیٹی لب اسٹک استعمال کرتی ہے۔ میں نے اس کی سنگار میز پر بھی لب اسٹک نہیں دیکھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔“

☆☆☆

”دس ہزار چار سو بیس؟“ آفیسر ڈیوس نے کار میں بیٹھ کر پیچھے مڑے بغیر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ جہنم میں اس سے زیادہ سیریل کلرز بھی ہوں گے؟“
 ”بالکل۔“ کیٹی مچھلی نشست پر اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔
 ”لیکن وہ تمام تانوں کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ میں نہیں سمجھتی کہ انہوں نے اس فہرست میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہوگا جنہوں نے ایک سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا ہے۔“

آفیسر بیگی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایسا زاویہ اختیار کیا کہ وہ باقی لوگوں کو دیکھ سکے۔ ”پھر ان دس ہزار چار سو بیس لوگوں میں کیا خاص بات ہے؟“
 ”وہ بیکے شیطان ہیں۔“ کیٹی نے جواب دیا۔
 ”تم بھوتوں کی بات کر رہی ہو۔ وہ صرف جہنم میں ہی نہیں بلکہ یہاں بھی ہوتے ہیں اور لوگوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔“
 ”وہ ہیں دیکھ رہا ہے۔“ کیٹی نے کہا۔
 اس کے لیے نے انہیں چوکنا کر دیا۔ ”یہ وہی شخص ہے جو تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا؟“

”ہاں۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”سڑک کے پار۔ اس اولڈ موبائل میں۔“
 ایک کار اسٹارٹ ہو کر نازل رفتار سے چل دی اور دونوں آفیسرز میں سے کوئی بھی اس شخص کی ایک جھلک نہ دیکھ سکا جو کار چلا رہا تھا۔
 بیگی نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیوس! کیا تم نے اس کی لائنس نمبر پٹیت دیکھی؟“

اس سے پہلے کہ ڈیوس کوئی جواب دیتا، کیٹی نے فرفر بولنا شروع کر دیا۔ وہ کار کا میک، ماڈل، رنگ، لائنس پلٹ نمبر اور جس کے نام وہ کار رجسٹرڈ تھی، اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ”نمبری فوکس۔ یہ اس کی ماں کا نام ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”کیٹی۔“ بیگی نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کار کسی کے نام پر رجسٹرڈ ہے؟“
 ”میں نہیں جانتی کہ مجھے یہ کس طرح معلوم ہوا۔ بس تم نے پوچھا اور میں نے بتا دیا۔“
 ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس شخص پاور بال کی لائری میں کس ٹکٹ کو پیلا انعام لے گا؟“

”میرا خیال ہے کہ میں صرف انہی معاملات سے متعلق سوالات کے جواب دے سکتی ہوں جو میں نے جہنم میں دیکھے۔“
 ڈیوس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”حیرت ہے کہ اس لائری کو چلانے والے جہنم میں نہیں گئے۔“

”بہر حال۔۔۔۔۔“ بیگی نے کہا۔ ”ہم اس کو نہیں روک سکتے۔ ہمارے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ کیٹی نے کہا۔ ”اگر اس وقت اسے روکا گیا تو وہ تم پر حملہ کر سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے پرسکون ہونے کا موقع دو لیکن تمہیں اس کے گھر کی گہرائی ضرور کرنی چاہیے تاکہ اس کی آمد رفت پر نظر رکھی جاسکے۔ جب اس کی ماں کہے گی کہ وہ ساری رات گھر پر تھا تو تم اسے جھوٹا ثابت کر سکو گے۔“
 ڈیوس اور بیگی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 ”یہ معقول تجویز ہے۔“ ڈیوس نے کہا۔

بیگی نے ریڈیو کے ذریعے ڈسچر کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں کو بتا دو کہ اس سے اچھے کی ضرورت نہیں۔ انہیں صرف یہ تصدیق کرنی ہے کہ یہ وہی شخص ہے اور یہ کہ وہ کس وقت گھر پہنچتا ہے۔“

”وہ باہر آ رہے ہیں۔“ ڈیوس نے کہا اور کار سے اتر کر جوز اور اسٹھ کا انتظار کرنے لگا جو کسی کی بلڈنگ کے سامنے بنا ہوا مختصر لان عبور کر رہے تھے۔ ”تم کار میں ہی آرام سے بیٹھو۔“
 بیگی نے اپنا سر کیٹی کی جانب گھمایا اور بولا۔ ”اس آدمی کا تذکرہ کیا ہے؟“
 ”چھ فٹ پانچ انچ۔“ اس نے کہا۔ ”وزن دو سو تریس پونڈ۔“

”یہ تو میرا ساڑھ ہے۔“ بیگی نے یہ معلومات ڈسچر کو اے دیں پھر کیٹی سے پوچھا۔
 ”اس کے بالوں کا رنگ کیا ہے؟“
 ”سیاہ اور اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ اس نے سیاہ پتلون پہن رکھی ہے لیکن شاید وہ کار میں اپنی قمیص تبدیل کر لے۔“

باہر کھڑے ہوئے تینوں آفیسرز نے آپس میں معلومات کا تبادلہ کیا پھر جوز کار میں چھانکتے ہوئے بولی۔
 ”کیٹی! میں تم سے ریکارڈ کی درستی کے لیے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم نے بھی جان فوکس کے ساتھ ڈینیٹ کی ہے؟“
 ”نہیں۔“ کیٹی نے کہا۔ ”میں کبھی اس کی پاس کی ماں کی دوست نہیں رہی۔ نہ ہی اس کے ساتھ میرا کوئی پیشہ ورانہ تعلق تھا۔ میں کبھی اس کے کارڈ بار میں شامل نہیں رہی۔ میں نے بھی اس سے فون یا ای میل کے ذریعے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی آن لائن گروپ میں شامل رہی۔ میرا بھی اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہا۔“

”اور نہ ہی اس نے بھی تم سے کوئی رابطہ کیا؟“
 ”بالکل ٹھیک۔ آج رات وہ پہلی بار میرے اپارٹمنٹ پر آیا۔“

آفیسر جوز کافی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ ”جانتی ہوں کہ میں ایک اچھی گواہ نہیں ہوں۔“ کیٹی نے کہا۔ ”میں گواہوں کے ٹکڑے میں کھڑے ہو کر جو دی کو سیریل کلرز کے بارے میں وہ سب نہیں بتا سکتی جو میں نے جہنم میں دیکھا لیکن آج رات جو کچھ پیش آیا، اس پر ایک رپورٹ ضرور بنا سکتی ہوں۔ شاید اس سے تمہیں کچھ مدد مل سکے۔“
 جوز نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ تم آج کی رات اپنے گھر میں گزارو۔ اس کا دروازہ بے کار ہو چکا ہے۔ کیا تم چاہو گی کہ ہم تمہارے لیے کسی ہونٹ میں انتظام کر دیں؟“
 ”ٹھیک ہے۔“ کیٹی نے جواب دیا۔

☆☆☆

جوز سرائی رساں اور بیگا کو ذاتی طور پر نہیں جانتی تھی، گو کہ وہ دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ البتہ کام کے سلسلے میں اس سے واسطہ پڑتا تھا۔ وہ اس کی قابلیت کا کام کرنے کے انداز سے متاثر تھی۔ گو کہ اس کی سپاٹ نظریں لوگوں کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ جوز سوچ رہی تھی کہ جب کیٹی کا اس سے سامنا ہوگا

تو وہ کس طرح اس کی نظروں کو برداشت کر پائے گی لیکن کیٹی نے اسے حیران کر دیا جب وہ ان دونوں کو ہونٹ کے کمرے میں لے گئی۔

”معاف کرنا۔ میں ابھی تک باجاء ہی بیٹھے ہوئے ہوں۔“ اس نے اور ہنگامے عذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ گھر سے نکلنے وقت اپنے لیے ایک بیگ تیار کر لیتی۔“

”آفیسر جوز نے بتایا ہے کہ جب تم گھر سے بھاگیں تو کوئی تمہارے پیرونی دروازے پر ضرب لگا رہا تھا۔“ اور بیگا نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم محفوظ رہیں۔“ وہ کیٹی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔ جوز دونوں ہاتھ بیٹھے پر پاندھے بیڈ کی پائنٹی پر کھڑی ہوئی تھی۔
 ”مجھے شروع سے بتاؤ۔“ سرائی رساں اور بیگا نے کہا۔ ”ہر وہ بات جو تمہیں یاد ہو۔“

”اس کا آغاز ساڑھے گیارہ بجے شب ہوا۔“ کیٹی نے کہا شروع کیا۔ ”مجھے اس کا پورا یقین ہے کیونکہ اس وقت میں ٹی وی پر اپنا پسندیدہ شو دیکھ رہی تھی پھر میں نے ایک کار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔“

اس کے بعد اس نے وہی سب باتیں دہرائیں جو وہ جوز کو بتا چکی تھی۔ اس میں سیریل کلرز کا بھی تذکرہ تھا جنہیں وہ جہنم میں دیکھ چکی تھی۔ جوز اس بارے میں پہلے ہی اور بیگا۔۔۔ کو بتا چکی تھی۔ اس لیے اس نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

کیٹی کا بیان ختم ہوا تو اور بیگا نے پوچھا۔ ”کیا تم بہت زیادہ مشہوری شوز دیکھتی ہو؟“

”بھی بھئی۔“ کیٹی نے کہا۔ ”مجھے ایسی فلمیں اور ٹی وی شوز پسند ہیں جو دلچسپ پس منظر میں بنائے گئے ہوں۔“
 ”کیا تمہیں خیال آتا ہے کہ ایک اچھی سرائی رساں بن سکتی ہو؟“ اور بیگا نے دوستانہ انداز میں پوچھا لیکن جوز جانتی تھی کہ وہ کیٹی کی نیت کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا وہ ایک ایسی عورت ہے جو یوریت کی وجہ سے پولیس کے ساتھ رابطے میں رہتا اور اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ ٹی وی پر سرائی رساؤں کو دیکھ کر اس طرح کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

”دراصل۔۔۔۔۔“ کیٹی نے کہا۔ ”میرا مشاہدہ بہت اچھا نہیں ہے اور میں حادثے کے بعد سے بہت سی باتیں بھولنے لگی ہوں۔ اس کے علاوہ کسی بھی قسم کا تھوڑا سا اداس

کردیتا ہے۔

اور بیگ چند لمحوں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے اس حادثے کے بارے میں بتاؤ۔“

”میں نہیں صرف وہی کچھ جانتی ہوں جو پولیس اور ڈاکٹروں نے مجھے بتایا۔ مجھے ایک چوراہے پر ڈیوٹی پر ٹرک نے ٹکر ماری۔ جب مجھے اسپتال لے جایا جا رہا تھا تو میرا دل رک گیا اور انہوں نے دل کی دھڑکن بحال کی۔“

”کیا وہ ٹرک ڈرائیور بھی کوئی سیریل کلر تھا؟“ اور بیگ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کئی نے کہا۔ ”وہ برا آدمی نہیں تھا بلکہ اس نے حادثے کے بعد مجھ سے معافی مانگی حالانکہ اس کی کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے بات کرے۔“

اور بیگ نے نوٹ بک نکال کر اس پر لکھنا شروع کیا۔

جوز سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی کس کے بارے میں کچھ لکھ رہا ہے یا سوچ رہا ہے کہ اگلا سوال کیا کیا جائے۔

”جو کچھ اس کے بارے میں بتاؤ۔“ اور بیگ نے کہا۔

”کیا یہ کلینک، نامی فلم کی طرح ہے؟“

کئی نے منہ نہ باز کرتے ہوئے کہا۔ ”تقریباً ویسی ہی ہے۔“

اور بیگ.... سلسل نوٹ بک پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس مرحلے پر جوز اپنے آپ کو سوال کرنے سے نہ روک سکی۔

”کیا تم جتنی ہو کہ لوگوں کو سزا دینے کے لیے خدا انہیں جہنم کی آگ میں جلاتا ہے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں۔“

”میرا نہیں خیال کہ خدا لوگوں کو جہنم میں جلاتا ہے۔“ کئی نے کہا۔

اور بیگ کا چہرہ ہمیشہ کی طرح جذبات سے عاری تھا لیکن جوز جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”کسی نے تو یہ آگ لگائی ہوگی۔ اگر خدا انہیں نہیں جلاتا تو وہ خود اپنے آپ کو آگ لگا رہے ہوں گے؟“

کئی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے جہنم نہیں بنائی۔ وہ خود جہنم ہیں۔“

اور بیگ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم جہنم میں کیسے چلی گئیں۔ دیکھتے ہیں تو اچھی خاتون بنتی ہو؟“

”وہاں پر کوئی جاتا ہے۔“

وہ چپکلیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا۔ میں سمجھا نہیں۔“

”جہنم میں تو سب ہی جاتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ

وہاں رکستے نہیں ہیں، وہ جلد ہی وہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”یعنی جہنم ایک انتظار گاہ کی طرح ہے؟“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، زیادہ تر لوگوں کے لیے۔“

”اگر تم مسٹر فوس کو پہلے سے نہیں جانتی تھیں تو تم نے اسے جہنم میں کیسے دیکھ لیا؟“

”اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ وہ دوسروں سے الگ دکھائی دے رہا تھا۔“

”کیا اس نے تم سے بات کی؟“

”ہاں۔“

”اس نے کیا کہا تھا؟“

”اس نے کہا کہ اسے اب بھی کوئی افسوس نہیں ہے۔“

اور بیگ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کا یقین ہے۔ ٹھیک ہے، کئی! تمہارے وقت کا شکریہ۔ تم گھر جا کر اپنے دروازے کی مرمت کروا سکتی ہو اور اگر چاہو تو اس ہوٹل میں مزید کچھ عرصہ قیام کر سکتی ہو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ محفوظ ہے۔“

”میں یہاں کچھ عرصہ قیام کروں گی۔“ کئی نے کہا۔ ”میری داہنی تک پڑی گھر کا خیال رہیں گے۔“

اور بیگ نے اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو مجھے فون کر دینا یا وہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اگر تم خطرہ محسوس کرو تو فوراً میرا فون کر سکتی ہو۔“

کارڈ کی طرف جاتے ہوئے جوز نے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا خیال ہے؟“

اور بیگ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جہنم کے بارے میں اس نے جو بتایا وہ کچھ عجیب ہے۔ اس پر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا لیکن اس کے علاوہ ہم نے سب چیک کر لیا ہے۔ اس کا اپارٹمنٹ جانے دو قعد کا منظر پیش کر رہا ہے اور ہمیں وہاں سے کچھ نشانات بھی ملے ہیں لیکن فوس گھر نہیں پہنچا۔ میں اس کی ماں سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ وہ بہت پریشان ہے اور نہیں جانتی کہ فوس کہاں ہے۔“

”اس کی ماں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”اس کا انداز مدافعت ہے۔ گوکہ ہم نے اس کے بیٹے پر شبہ نہیں کیا۔ ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ شاید وہ کئی کے علاقے میں ہونے والی مشہر سرگرمیوں کی گواہی دے

سکے لیکن وہ عورت بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنے وکیل سے بات کرنے کا مشورہ دیا۔“

جوز اپنی پینر دل کار کے پاس جا کر رک گئی اور سراغ رساں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اس کے بارے میں جانتی ہے؟“

”یعنی یہ کہ اس کا بیٹا عورتوں کو قتل کر رہا ہے؟ یہ تو ہم بھی نہیں جانتے لیکن میری چھٹی حس مجھے ماں بیٹے کے بے چارے تعلق کے بارے میں بتا رہی ہے۔ اسی وجہ سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اور میری بھی..... اس نے مشرق کی طرف ابھرتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا۔

”میری شفقت ختم ہو رہی ہے۔ گھر جانے کا وقت آ گیا۔“

”تم خوش قسمت ہو۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”مجھے تو ابھی کاغذی کارروائی پوری کرنی ہے۔“

☆ ☆ ☆

”اگر تم فوس کو پہلے سے نہیں جانتی تھیں تو جہنم میں اس سے کیوں ملیں؟“

”اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔“

جوز نے یہ اصول بتا رکھا تھا کہ شفقت ختم ہونے کے بعد وہ اپنا کام گھر لے کر نہیں جاتی تھی لیکن اس روز گھر جاتے ہوئے اس کا مارغ کئی تھکس کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی طرح کئی نے فوس کو پہلے ضرور دیکھا ہوگا اور وہ ایک دوسرے پر کسی طرح اثر انداز ہوئے ہوں گے اور کئی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قاتل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص واقعی ایسا ہی تھا لیکن کئی کے اپارٹمنٹ میں کبھی ہوئی تو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

”نہیں اگلی بار پکڑ دو گا۔“

کیا یہ ایک ہی براہ کی لب اسٹک تھی؟ ابھی اس کی لیبارٹری سے تصدیق ہونا باقی تھی لیکن جوز کو اس کا یقین تھا۔ میڈیا کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ متاثرہ خواتین کے ہاتھ روم کے آئینوں پر لب اسٹک سے کچھ لکھا جا رہا تھا لیکن وہ براہ کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح کئی بھی اس سے لاعلم تھی۔

جوز نے سر جھٹک کر اپنے ذہن کو آزاد کیا۔ اب یہ دن کی شفٹ والوں کا کام تھا کہ وہ فوس کو تلاش کر کے اس سے پوچھ چکھ کرے۔ اس نے معمول کے مطابق کافی شاپ پر گاڑی روکی اور وہاں سے گرم گرم ملک کافی کے تین ٹین بیک کر دائے۔ بچے ناشتے پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے

اور یہ کافی اس کا ایک حصہ تھی۔ اس کے بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور ابھی ان کی کالج کی پڑھائی شروع ہوئی تھی اور وہ اسی کے ساتھ رہ رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ دونوں جلد ہی اپنا ٹھکانا تبدیل کریں گے اور اس کی علامات نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کا خوب صورت بیٹا اور ڈچین بیٹی دونوں ہی اس سے مختلف تھے۔

اسے اپنا زمانہ یاد آ گیا۔ اس کی ماں نے نہ جانے کیا سوچ کر اس کا نام دیکس رکھ دیا جس پر اسے بڑی شرمندگی ہوئی تھی تاہم وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد تھی۔ اس نے کم عمری میں ہی شادی کر لی۔ انیس سال کی عمر میں وہ ماں بن چکی تھی۔ اس نے پر کام جلدی میں کیا، شاید اسی لیے اسے طلاق بھی جلد ہی ہو گئی۔

وہ ایسی کلی عورتوں کو جانتی تھی جنہیں اپنے شوہروں کے غیر ذمے دار ہونے کی شکایت تھی لیکن جارج اس کے برعکس تھا۔ اس نے ہمیشہ دو ششوں میں کام کیا جبکہ اسے بیویوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جوز نے بھی پولیس میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ اپنے پورے دن میں یہ مشکل چند گھنٹوں کے لیے دیکھ پانی اور اس وقت وہ ہی طرح تھا ہوا ہوتا۔ اس کے بچے نو اور دس سال کے ہو چکے تھے اور وہ بستر میں اس کے برابر لیٹے ہوئے سو جتی۔ ”تم نے شادی کیوں کی تھی جارج۔“ بچے کیوں پیدا کیے؟ جب تم ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔“

جب جارج نے اسے بتایا کہ وہ طلاق لینا چاہتا ہے تو اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس کے طرز عمل سے وہ یہ اندازہ بہت پہلے لگا چکی تھی۔ وہ اس کے ہنسنے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ وہ چست و چالاک شخص کہاں چلا گیا جس سے اس نے شادی کی تھی؟ جس کی مسکراہٹ پر میں جان چڑھتی تھی اور وہ اس طرح میرا چچا کرتا بیسے میں دنیا کا سب سے بھٹی انعام تھی۔

اس نے اپنی کارڈ رائیو سے من کھڑی کی۔ کافی کے ٹین اٹھائے اور بیرونی دروازے کی جانب چل دی لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ دروازہ آدھے سے زیادہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کافی کے ڈبے اس کے ہاتھ سے گر گئے۔ اس نے اپنا ہتھول نکالا اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں کا منظر بڑا ہی ہولناک تھا۔ اس کے دونوں بچے لیوگ روم میں موجود تھے۔ بیٹا جیس کا ڈونچ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بیٹی کبھی سلائیڈنگ دروازے کے پاس تھی۔ ایک بھاری بھر کم شخص نے

ایک بازو کے ذریعے کبھی کو کندھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک شکاری چاقو تھا جس کی نوک کبھی کی گردن پر رکھی ہوتی تھی۔

”ہیلو ویش۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام جان فومس ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم مجھے تلاش کر رہی ہو۔“

جوز نے کن آنکھوں سے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ اس کے بازو کبھی اور فومس کی طرف پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اس آدمی کو مٹانے اور کبھی کو اس سے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اب وہ اپنی جگہ پر جم رہا تھا۔ اس نے جوز کو نظروں ہی نظروں میں بتا دیا کہ اس کی کوئی معمولی سی حرکت بھی کبھی کی زندگی کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

”اسے چھوڑ دو۔“ جوز نے اپنی من کار رخ فومس کے ماتھے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر سکون لے لے میں جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم یہ سن یہاں میرے پاس پھینک دو۔ اس من کو حاصل کرنے کے بعد میں تم سے تمہوں کا کہنا ہے بچے کو اس کرسی پر باندھ دو۔“ اس نے اپنی ٹھوڑی سے ڈانٹنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد اسی طرح برابر دالی کرسی پر بیٹھ کر ابھی باندھ دینا پھر ہم دونوں بیڈروم میں کچھ وقت ساتھ گزاریں گے۔ مطلب پورا ہونے کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا اور تمہارے بچوں کی جان بھی بچ جائے گی۔“

یہ ایک انتہائی بے ہودہ مطالبہ تھا جس کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔ ”ورنہ میں اس کا گلا کاٹ دوں گا اس سے پہلے کہ تم مجھ پر فائر کرو۔“

جوز جانتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بچانے کے لیے اس کی ہدایات پر عمل نہیں کر سکتی اور نہ ہی کوئی معاونان حرکت کرنا ممکن ہے۔ البتہ اسے باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شاید اس دوران اسے کوئی موقع مل جائے۔ اس نے فومس سے پوچھا۔

”تمہیں میرے کمر کا پتا کیسے معلوم ہوا؟“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے لیے بہت آسان ہے۔ میں جاننا کہ خرید و فروخت کا کام کرتا ہوں۔ اگر کسی نے کوئی مکان خریدا ہو تو اس کے ریکارڈ تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ تم نے یہ مکان پندرہ سال پہلے خریدا تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ ایک اچھی سرمایہ کاری تھی۔“

”تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟“

”میں بہت پہلے سے تمہارا نام جانتا ہوں اور بچ پوچھو تو تمہارا بہت بڑا مداح ہوں۔ تم نے میرے تمام کرائم سین محفوظ کر دیے تھے اور مجھے پکڑنے کے بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ اگر آج بھی تم باج منٹ پہلے پہنچ جاتیں تو ہمارا آنا سامنا ہو جاتا۔ ویسے تم میرے مطلب کی نہیں ہو۔ میں عام طور پر سفید فام عورتوں کا پیچھا کرتا ہوں لیکن تم میرے لیے بہت خاص ہو گئی ہو۔“

اس نے کبھی کو اپنے قریب کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا اور وہ کانپنے لگی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ فومس نے پوچھا۔

جوز نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اس سے تعاون مت کرو۔“

کبھی اس کا اشارہ سمجھ کر نظر اٹھانے لگی۔ فومس کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ تھا۔ اس لیے وہ کبھی کو سہارا دینے کے لیے جھکا تو اس کی گرفت واصل ہو جاتا شروع ہو گئی۔ جوز کو اسے کبھی کہ اس طرح اس کی چھاتی سامنے آ جائے گی لیکن کبھی صرف چند انچ ہی پھسلتی تھی کہ اس نے اسے دوبارہ سیدھا کھڑا کر دیا۔ چاقو کی نوک اس کی کھال میں چھ رہی تھی۔

عین اس وقت سلاٹ دروازہ ٹھوڑا سا کھلا اور کبھی تھامس اندر داخل ہوئی۔ اس نے ابھی تک وہی پا جامہ پہن رکھا تھا اور اپنے کتے کو اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے وہ اسے فومس کو تحفے میں دینا چاہ رہی ہو۔ وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

”یہ دیکھو۔“ کبھی نے کہا۔ ”یہ بی بی فٹ تمہارے لیے ہے۔“

کتے نے کبھی کے بازوؤں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا فومس کے منہ پر آیا۔ اس سے پہلے کہ فومس سمجھتا، اس کتے نے اپنے دانت اس کی ناک پر گاڑ دیے۔ اس نے کبھی کو چھوڑ دیا جو لوٹ لگائی ہوئی اس سے دور چلی گئی۔ جوز نے فومس کے سینے کا نشانہ لے کر تین فائر کر دیے۔ فومس نے اپنے سینے پر پھیلنے ہوئے خون کے دھبے کو دیکھا پھر اس کی نظریں کبھی پر جم گئیں۔ ”تم سے جہنم میں ملاقات ہوگی۔“ اس نے کہا اور سینٹ کی بوری کی طرح فرش پر گر گیا۔

”مجھے عیسیٰ پر آنا پڑا۔“ کبھی نے کہا۔ ”کیونکہ وہ تمہارا گھر جانتا تھا۔ اس لیے مجھے بھی معلوم ہو گیا لیکن میں یہ

نہیں جانتی تھی کہ وہ تمہارے گھر پہنچ جائے گا اور جب مجھے معلوم ہوا، اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کی۔“

جوز نے وہ سب کچھ سنا جو کبھی کہہ رہی تھی لیکن وہ اس پر کوئی توجہ نہ دے سکی۔ اس نے کبھی اور کبھی کو پکڑا ہوا تھا جو بری طرح رو رہے تھے۔ اسے ان کا ردنا اچھا لگا۔ شاید اس طرح ان کے اندر سے وہ نہر نکل جائے جو اس نظام کے خلاف ان کے دل میں جمع ہو گیا تھا اور وہ گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔

”تمہارے بچے بہت ہوشیار ہیں۔“ کبھی نے کہا۔

”انہوں نے بالکل وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔“

اور بیگا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

”ہم نے اس کے مکان کی تلاشی کے لیے وارنٹ حاصل کر لیا ہے۔ تمہارا مکان بھی ٹھوڑی دیر کے لیے ہماری تحویل میں رہے گا اور شاید تم لوگوں کو ناشتے کے لیے باہر جانا پڑے۔ ابھی ہمیں تمہارے بیان بھی لیتا ہیں۔“

جوز کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی پھر ایک سوال اس کے ذہن میں آیا۔ ”اب اس کی ماں کیا کہتی ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ اسے کسی بات پر یقین نہیں لیکن جب ہم نے اسے فومس کے مرنے کی اطلاع دی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ ہم نے پہلے سے اس گیسٹ ہاؤس کے گرو پولیس والے تعینات کر دیے تھے جہاں فومس رہتا تھا۔ جب ہم بیرونی دروازے سے باہر آئے تو وہ پچھلے راستے سے گیسٹ ہاؤس میں جانے کی کوشش کرنے لگی تب ہم نے دیکھا کہ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا جوز۔ وہ شاید سب کچھ جانتی تھی۔“

پھر وہ کبھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ابھی یہ کیس فٹ نہیں ہوا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ تمہارا دیا ہوا اشارہ کارآمد تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس بقید دس ہزار چار سو اکتیس سیریل کلرز کی فہرست ہوگی جنہیں تم نے جہنم میں دیکھا تھا۔“

کبھی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں۔ ابھی تک تو نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔

”فہرست۔۔۔۔۔۔“ کبھی نے کہا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی اور اس کی آنکھیں کسی ایک جگہ مرکوز نہیں تھیں جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں دیکھ رہی ہو۔

”کبھی۔۔۔۔۔۔“ جوز نے کہا۔ ”کیا تمہیں ہوش واپس جانے کے لیے سواری چاہیے؟“

کبھی واپس اپنے حال میں آتے ہوئے بولی۔ ”ہاں اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔“

☆☆☆

جان فومس کے پاس سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو اس نے اپنے مفتوحین سے نشانی کے طور پر حاصل کی تھیں۔ اور بیگا اور اس کا سامی والا انہی چیزوں کو ترتیب دینے اور ان پر کیمبل لگانے میں مصروف تھے۔ اور بیگا کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ ان عورتوں کا کبھی تھا جس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ رابطے میں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ معلوم کر سکے گا لیکن فی الوقت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ یہ سب کیسے جانتی تھی لیکن ابھی اس کا ایک اور حیرت انگیز روپ دیکھنا باقی تھا۔

اور بیگا اور اس کے ساتھی کو چند لمحوں کے لیے سستانے کا موقع ملا ہی تھا کہ ایک کلرک کبھی کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک فولڈر پکڑا ہوا تھا۔

”میں آج بھی ایرین کی بس میں آئی ہوں۔“ کبھی نے کہا۔

اور بیگا نے فولڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم میرے لیے کچھ لے کر آئی ہو؟“

”ہاں۔ میں نے دس ہزار چار سو بیس لوگوں کی فہرست تاپ کر لی ہے۔ مجھ پر یہ لازم ہو گیا تھا۔ جب تم نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو میں یہ کام کرنے بیٹھ گئی۔ اس میں دو گھنٹے لگ گئے۔“

اور بیگا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کافی بڑا کام لگ رہا ہے کبھی۔“

”میں جانتی ہوں لیکن مجھے یہ کرنا تھا۔ تم نے مجھ سے اس کے لیے کہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ تمہارے کسی کام آجائے۔“ اس نے فولڈر اور بیگا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کی دو کاپیاں بنائی ہیں۔“

اور بیگا نے بے یقینی کے عالم میں وہ فولڈر لے لیا اور ایک کاپی والٹر کو پکڑادی۔ پھر اس نے ابتدا کی چند نام پڑھنا شروع کیے۔ ”پری پنک ہسپٹل ٹیل، جوئے جو، نو۔۔۔۔۔۔“

پیشہ ور

مادرِ خراب باب

بعض اوقات انسان پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ناپسندیدہ کام کرنے کے لیے بھی مجبور ہو جاتا ہے، جیسے کہ وہ ہوا مگر یہاں تو معاملہ ہی الفا نکلا... جو کبھی اس کی پسند تھی... جس کے ساتھ جیتے مرنے کی قسمیں کھاتیں اور جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے... پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سارے ہی خوابوں کی تعبیریں الٹی ہو گئیں لیکن قسمت کا پھیر دیکھو کہ زندگی کے اس موڑ پر وہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو آزمائے چلی آئی تھی۔

محبت کے چھوٹے دلوں کا امتحان لینے والی ایک کتاب کا اجرا

برائمان تھا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو سہرے بالوں والی حسینہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میرا دل گویا ایک ٹپ کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت خوبصورت تھی بلکہ وہ دس سال کے بعد بھی اتنی ہی خوبصورت تھی بلکہ شاید وقت نے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔

مجھے صبح سات بجے کال کر کے آفس بلایا گیا جبکہ میں ان دنوں ایک کیس کی تکمیل کے بعد رخصت پر تھا۔ بقول میرے باس ڈاکٹر اور جاسوس کو کسی بھی ایمر جیسی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جب میں اسی ایمر جیسی کے بارے میں سوچتا ہوا دفتر پہنچا تو میرا باس اپنی دونوں ہاتھیں کانوں تک پھیلائے ایک سہرے بالوں والی حسینہ دہواڑے کے سامنے

ایک گھنٹے بعد اسے کچھ جرائم کی خبریں مل چکی تھیں اور اس نے فہرست میں موجود مزید چند ناموں پر نشان لگا دیے۔ ان میں سے دو کیلے فوراً اور ایک نیو میکسیکو میں تھا۔ دونوں جگہ اور پیگ کے جاننے والے موجود تھے۔

اس نے سوچا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس فہرست کی نقول بھیج دے تو وہ اس میں سے مزید نام تلاش کر سکتے ہیں۔

اور پیگ نے سب سے پہلے کر بڑی پانز سے شروع کرنے کے بارے میں سوچا۔ اس نے والٹر سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیلی لچ پرا سکے گی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ ہماری مزید مدد کر سکتی ہے؟“

”وہ پہلے ہی ہماری مدد کر چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔ اب تک میں نے اس کی باتوں کو سمجھنے کی سے نہیں لیا تھا۔ اس کا تیسری سیکڑ کے لیے جہنم میں جاؤ اور وہاں دس ہزار سے زیادہ لوگوں سے ملنا مجھے محض اس کے تیل کی پرواز لگ رہا تھا لیکن جب اس نے فوگس کے بارے میں معلومات دیں تو میں چونک گیا۔ وہ ایک ایسے شخص کے بارے میں بتا رہی تھی جس سے وہ بھی نہیں ملی پھر جب وہ فوگس کا چچا کرتے ہوئے جونی کے گھر پہنچی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ غیر معمولی ملا جلتی رہتی ہے ورنہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ فوگس اس وقت جونی کے گھر پر ہے اور اب اس فہرست نے تو مجھے چکر اکر رکھ دیا ہے۔ میں نے اس سے مذاق میں ایک بات کہی تھی اور وہ واقعی ان دس ہزار سے زیادہ لوگوں کی فہرست بنا کر لے آئی جنہیں اس نے جہنم میں دیکھا تھا یہ کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کوئی مافوق الفطرت روح موجود ہے لیکن میں اس کی حقیقت جاننے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان پرانے کیسز کو حل کرنے میں اس کی مدد لی جائے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔“ والٹر بولا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ انسان ہے یا کوئی جن بھوت لیکن اب تک اس نے جو کچھ کیا ہے، اسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ پرانے کیس حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔“

اور پیگ نے کیلی کا دیا ہوا فورلڈر اوڑھ لیا اور اس کا نمبر ملائے لگا۔ کیلی نے چوتھی گھنٹی پر فون اٹھا یا تو وہ بولا۔

”کیا تم آج ہمارے ساتھ جاکر سکتی ہو... انا لیون نوڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

ایک گھنٹے بعد اسے کچھ جرائم کی خبریں مل چکی تھیں اور اس نے فہرست میں موجود مزید چند ناموں پر نشان لگا دیے۔ ان میں سے دو کیلے فوراً اور ایک نیو میکسیکو میں تھا۔ دونوں جگہ اور پیگ کے جاننے والے موجود تھے۔

اس نے سوچا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس فہرست کی نقول بھیج دے تو وہ اس میں سے مزید نام تلاش کر سکتے ہیں۔

اور پیگ نے سب سے پہلے کر بڑی پانز سے شروع کرنے کے بارے میں سوچا۔ اس نے والٹر سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیلی لچ پرا سکے گی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ ہماری مزید مدد کر سکتی ہے؟“

”یہ ان کے جہنم والے نام ہیں۔ مجھے ان کے اصل نام اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتے جب تک میں انہیں یہاں نہ دیکھ لوں۔“ کیلی نے کہا۔

”تمہیں ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اب میں کیا کروں... کیا انہیں فون تک میں دیکھا جائے؟“

”تم کو کل سے مدد مل سکتے ہو۔ شاید میں بھی تمہیں کچھ ایسی باتیں بتا سکتی ہوں جن سے تمہیں مدد ملے۔“

اور پیگ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کوشش کے لیے شکر یہ کیلی۔“

اس کے جاننے کے بعد اور پیگ نے فہرست پر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا لیکن فوراً ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور وہ بولا۔ ”والٹر! تم نے چھپس نمبر کا نام دیکھا؟“

”نہیں۔“

اور پیگ نے اسے وہ صفحہ دکھایا تو والٹر کی بھویریں تن گئیں۔ ”کر بڑی پانز...“

یہ وہ کیس تھا جسے انہوں نے غیر حل شدہ قرار دیا تھا۔ ایک ایسا مجرم جو نو جوان مردوں کو چنیدہ گروہوں سے باندھ دیا کرتا تھا۔ اور پیگ کے ذہن کے پردے پر فوراً ہی وہ پہلا متوال آ گیا جس کی لاش انہیں ملی تھی۔ اسے اس بری طرح کس کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے اس لڑکے کو سرنے سے پہلے شدید تکلیف ہوئی ہوگی۔

”نمبر دو سو ستانوے۔“ والٹر نے پڑھا۔

”اسپاکی۔“

”تم مذاق کر رہے ہو۔“ اور پیگ حیران ہوئے ہوئے بولا۔

والٹر نے ٹی میس سر ہلایا۔ اس کی نظریں فہرست میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ”نمبر تین سو سات۔“ اس نے ایک زرد مارکر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تین سو تیرہ۔ سلی اسٹرگ اور ڈاکٹر پیچ۔“

اور پیگ نے بھی ایک زرد مارکر اٹھا یا اور فہرست میں چند ناموں پر نشان لگائے لیکن وہ خاص طور پر ایک نام تلاش کر رہا تھا جو اسے بائج ہزار چھ سو پچتر دس نمبر پر ملا۔

اسکا رلیٹ پیرل... اس شخص کی خبریں لپ اسٹیک کلر کے نام سے چلی تھیں لیکن وہ اور اس کا ساگھی ہمیشہ انہیں لوگوں کو اپنا اصلی نام ہی بتاتے تھے اور انہیں پکڑنے کی کوشش اب بھی جاری تھی۔ اگر کوئی سراسر اس فہرست کو دیکھتا تو اسے مزید کچھ جاننے پہچاننے ناممکن تھے۔

اس نے کیلی کے کہنے کے مطابق کوکل سے مدد لی۔



”اور یہ ہیں مسٹر محسن میرے نائب جو آپ کا کیس دیکھیں گے۔“

باس نے مسکراتے ہوئے میرا تعارف کر دیا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔

میں آگے بڑھا جب مجھے باس کی خوش خلقی کی ایک اور وجہ نظر آئی۔ پہلی وجہ اس کی خوبصورتی تھی اس نے سیاہ شیون کی ساڑی پر بہت مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا جو باس جیسے رنگین مزاج انسان کو خوش خلقی دکھانے پر مجبور کر سکتا تھا۔

”اور مس سائزہ امجد یہ ہماری کلاسٹ ہیں، محسن ان کا کیس تم ذاتی توجہ سے حل کرو گے۔“

باس کی اشار ہوئی تھی ان کا ایک لمبے لمبے سائزہ کے چہرے سے ہنسنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ بات مجھ سے کر رہے تھے مگر دیکھ سائزہ کو رہے تھے۔

”انہیں تو میں پہلے سے جانتی ہوں فرمان صاحب۔“

وہ ایک ساحرانہ مسکراہٹ کے ساتھ نزاکت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

یہ بات حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ اس نے ابھی تک مجھ جیسے معمولی انسان کو یاد رکھا ہوا تھا۔ وہ میری کلاس نمبر وہ پہلی تھی اور شاید گرل فرینڈ بھی۔ شاید کال ففٹ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ میرا اور پورے ڈیپارٹمنٹ کا خیال تو یہی تھا لیکن سائزہ ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ میں اپنی کلاس کا ایک چھوٹا سا کچھا جاتا تھا جسے پڑھنے کے علاوہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی اور ایسے میں سائزہ کا میری طرف دوشی کا ہاتھ بڑھانا بذات خود ایک حیران کن امر تھا۔ ان دنوں مجھے سائزہ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پارٹ ٹائم جاب سے ملی رقم سے میں اس کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن اس کی خواہشات زیادہ وسیع تھیں اور میری جیب مختصر۔

جب کلاس میں ایک نیا لڑکا آیا مٹان۔ جس کے باپ کی بے پناہ دولت نے اس کی طبیعت کو کورٹ کی طرف مائل کر دیا تھا اور اسے لڑکے کی نظر سائزہ جیسی خوبصورت لڑکی پر نہ بڑے یہ کیسے ممکن تھا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ سائزہ کی توجہ خاص بھی مجھ سے ہٹ کر اس پر مرکوز ہو چکی تھی۔ میں جتنا بھی بے حس اور چند نظر آتا تھا مگر تھا تو ایک انسان ہی، دل میں سائزہ کے تعاقب نے حسد و رقابت کے بجائے جھڑپ سے جلا دیے تھے۔

کچھ عرصے بعد ہم وہ علاقہ چھوڑ کر ایک نسبتاً مضائقہ

علاقے میں منتقل ہو گئے اس طرح اسکول بدلتا تو سائزہ اور اس سے متعلق دل آزار یادیں بھی وہیں رہ گئیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انسان اپنی پہلی محبت بھی نہیں بھولتا حالانکہ اس دوران کئی عورتیں میری زندگی میں آئیں کیونکہ اب میں ایک بیوقوف اسکول بوائے کے بجائے ایک خوب رو برسر روزگار انسان تھا۔

اور اب وہی فائدہ میرے سامنے ٹھہری تھی تاکہ اس کے شوہر امجد کی بے وفائی کے ثبوت اکٹھے کروں کہ اس کا شوہر ایک مجبوزا صفت مرد تھا جس کی توجہ جوی سے زیادہ دوسری عورتوں پر رہتی تھی اور وہ اس بات کو بنیاد بنا کر طلاق لینا چاہتی تھی۔

”محسن تم نہیں جانتے میں تمہیں کھوکھلا بچھتا ہوں۔“

امجد ایک بے حس اور جذبات سے عاری انسان ہے جس کے لیے میری بے پایاں محبت کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہ کھٹیا عورتوں کے ساتھ وقت بتاتا ہے۔ ”وہ کھوکھیر لہجہ میں بولی۔

میری آنکھوں سے چھلکتے سائیں جذبات یقیناً اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہے تھے۔ اس کے لہجے کی نرمی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

جتنی دیر وہ میرے پاس رہی میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ یہ عورت تو کسی کبھی دل کا مریض بنادے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔

اس کے گھر..... امجد کے آفس کا پتا اور تصویر ایک لفافے میں موجود تھی۔ میں نے ایک نظر تصویر کو دیکھا وہ مونا اور بھدرا سا ایک اوجیز عرصہ تھا جس کی واحد خوبی شاید اس کی دولت تھی۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن اس کے آفس کی بلڈنگ کے باہر اپنی کار پارک کرتے ہوئے میں نے بالکل نہیں سوچا تھا کہ کامیابی اتنی بڑی اور غیر متوقع..... ہوگی۔ وہ ایسی بلڈنگ سے باہر نکلا اور میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگا۔ وہ آفس کے مخصوص فائرل لباس میں تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ میں پکڑے سٹیل فون پر نظر ڈالی اور نمبر دیکھ کر اس کے مونے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ چھلنے لگی۔ سٹیل فون کان سے لگا کر اس نے بات کرنا شروع کر دی۔ میری تمام توجہ اس کی گفتگو کی طرف تھی۔ وہ یقیناً دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی محبوبہ سے محبتگو تھا اور میں نے اچھی طرح اس ہونٹ کا نام اور دردمنہ لٹ کر لیا جہاں وہ رات کو ٹپنے والے تھے۔ وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا تو میں نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے اخبار اٹھا کر منہ کے آگے پھیلایا۔

☆ ☆ ☆

ان کے نکلنے ہی میں نے فوراً وہاں سے ہڑیا ہٹا دیا۔ اب میری گاڑی کا رخ اس ہونٹ کی طرف تھا جہاں ان کو ملاقات کرنا ہی ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنا ہوم ورک مکمل کر لینا چاہتا تھا تاکہ اچانک کوئی غیر متوقع صورت حال پیدا ہونے پر پلان بی تیار ہو۔

میرا یہ طریقہ کار ہمیشہ کام آتا تھا۔ وہ ایک دہلا پتلا ڈیڑھا تھا جو اس ہونٹ کی پچھلی گلی میں پکڑا جھنجھٹے لگا تھا۔

”شش شش۔“

میں نے زور سے ہشکارا بھرا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر دائیں بائیں۔

”ہاں ہاں تمہیں ہی پکارا ہے۔“ میں نے ہزار کا ایک نوٹ ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ میرے نزدیک آیا۔ اس کی نظر نوٹ پر پڑی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ کچھ حش سے بولا۔

”یہ نوٹ لینا چاہو گے۔ اور ایسے ہی چند اور نوٹ بھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ٹھوکر لگا۔

”کرنا کیا ہوگا؟“

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کیا کرنا ہوگا۔ اس کی آنکھیں یہ سب سن کر پچھلتی چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

یہ اسی ہونٹ کا لاڈلہ ری روم تھا جہاں میں ایک سٹریٹ ڈانگری پہنے ہوئے تھا۔ رات کے اس پہر بہت مشکل تھا کہ کوئی مداخلت کرنا مگر احتیاج لازم تھی۔

دیرمیں اللہ نے اس کمرے کی بیرونی دیوار کے پاس ایک سیزمی لائٹر رکھ دی تھی جس کے برابر والے کمرے میں میرا مطلوبہ جوڑا موجود تھا اور میں تمام سائزہ و سامان سے لیس تھا جس میں شیشہ بدلنے کے لوازمات کے ساتھ میرا کیمرا بھی موجود تھا۔ میں ایک شیشہ سائز کے روپ میں اس سیزمی پر کھڑا تھا۔ حالانکہ شیشہ بدلنے والے راتوں میں کام نہیں کرتے لیکن یہ بات کوئی پوچھتا ب دیکھی جاتی۔

میں نے ماحول سازگار دیکھ کر سیزمی کھسکی جسے سازگار بنانے میں یقیناً محب اللہ کا بڑا ہاتھ تھا میں مطلوبہ کمرے کی بالکونی میں اتر گیا۔ بالکونی کے دروازے پر پردے تھے مگر میرے ڈیجیٹل کیمرے کو بس ایک معمولی سی جھری کی ضرورت تھی جو ہر آسانی مل گئی۔ میں نے تیزی سے کئی تصویریں بنائیں اور سامان سمیٹا ہوا اپنے نچے اتر گیا۔

☆ ☆ ☆

آج میں پھر سیزمہ امجد کے دفتر کے باہر موجود تھا۔ طویل

معلومات

☆ سب سے زیادہ لمبے لوگ ہالینڈ میں پائے جاتے ہیں۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ کھائی جانے والی سبزی آلو ہے۔

☆ آلو میں 78 فیصد پانی ہوتا ہے۔ اگر چھلے ہوئے آلو کو دیر تک ابالا جائے تو حیاتین سی کا زیادہ حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔

☆ کاغذ سب سے پہلے چین نے بنایا۔

☆ دنیا میں گلاب کی کم بیش 792 اقسام ہیں۔

☆ پہلی کا نام ویکٹر گبرٹ نے رکھا تھا۔

☆ پوری دنیا میں کم بیش 3064 زبانیں بولی جاتی ہیں۔

☆ ہم بولتے ہیں تو 70 عضلات حرکت کرتے ہیں۔

☆ انسانی جسم میں کل 639 عضلات ہیں۔

☆ مسلمان محمد جواد خان، تحصیل علی پور

تھوڑی دیر انتظار کر کے میں بھی بیرونی دیوار پھلانگ کر ان کے پیچھے لپکا۔ کسرا تیار حالت میں میرے پاس تھا۔ میں باہر نکلا تو نہ صرف تصویریں بلکہ ان کی ویڈیوز بھی ہاتھ آچکی تھیں۔ اب یہ اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ سائرہ کے حوالے کیا جاسکتا۔

☆☆☆

اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے مجھے چندہ منٹ ہونے لگے تھے اور وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی یا شاید میں ہی وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ میں نے صرف اسے کام مکمل ہونے کی اطلاع دی اور اس نے فوراً یہاں ملنے کا پروگرام بنالیا۔

اچانک ریسٹورنٹ کے وینڈلے احوال میں روشنی سی بھر گئی وہ اپنی پسندیدہ سیاہ رنگ کی بھلملائی ساڑھی میں ملیوں اندر داخل ہوئی تھی۔

”کیا تمہیں یہ جگہ پسند آئی، یہ میرا پسندیدہ ریسٹورنٹ ہے۔“ وہ ایک ادا سے میری طرف جھٹکے ہوئے بولی اور میں نے شیشے کے گلاس میں بنائیں لیکن پھر ترجمی نظر سے دوبارہ دیکھنے لگے۔

”ہاں ضحیک ہے۔“ میں خود سے اسے دیکھتے ہوئے بولا لیکن تم مجھے موقع دیتیں تو میں اس سے بھی بہتر جگہ کا انتخاب کرتا۔“

”اوہ ضرور اگلی بار یہ چوائس تم رکھ لینا۔“ وہ بظاہر بے نیازی سے بولی تو میں نے قہقہہ لگا دیا۔

”دیکھتے ہیں فی الحال تو یہ لو۔“

میں نے ایک تصویروں کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکرا کر وہ کھول کر دیکھا۔ ایک ایک کر کے تمام تصاویر دیکھتی گئی۔ وہ سب عام سی تصویریں تھیں اس میں ایسا کچھ نہیں تھا جو سینہ امجد کو کسی کس میں الجھا سکتا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ تب میں نے اپنے موبائل میں محفوظ سیٹھ امجد کی ویڈیو بے کر کے اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ کسی بھی طرح قابل اعتراض نہیں تھی۔ ہونجی ٹیوشن کسی کیونکہ وہ لڑکی سیٹھ امجد کی بیٹی تھی۔ ایک ایسی بیٹی جسے وہ دنیا کے سامنے اپنانے سے قاصر تھا۔ کچھ دیر وہ ابھی ہوئی نگاہوں سے ان تصاویر کو دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس کی نگاہوں میں چمک ابھری اور میں اس روشنی کا سبب جان گیا۔ وہ اب بھی سیٹھ امجد کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ اس بیٹی کو دنیا کے سامنے نہ لانا یقیناً سیٹھ کی مجبوری رہی ہوگی اور وہ اس کا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

”زبردست۔“ وہ چھپکالی۔ ”تم نے بہترین کام کیا ہے۔ اب دیکھنا میں کیسے سیٹھ امجد کو کتنی کاٹاچ چھپاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ وہ میرے سامنے اپنی اصل شخصیت بے نقاب کر رہی ہے۔

”یقیناً.....“ میں نے مسکرا کر ایک اور لفافہ اس کے حوالے کیا۔

”تمہارے لیے بطور خاص۔“ میں نے وہ دیکھ لیا اس کے ہاتھ میں تھمایا اور غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے نزاکت سے وہ لفافہ کھولا، کھول کر دیکھا اندر موجود تصاویر دیکھ کر وہ کچھ چونکی، پہلی پھر دوسری اور تیسری تصویر دیکھتے تک اس کا گلابی چہرہ دھلے ہوئے لٹھے جیسا سفید ہو چکا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“ اس نے جلدی سے لفافہ بند کر دیا اور چورنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”اوہ تم باقی تصاویر تو دیکھو ان میں تم نے زیادہ خوبصورت بکواس کی ہے۔“

”ویسے تمہاری تصویریں بہت واضح آتی ہیں اور یہ شخص کون ہے تمہارے ساتھ؟ امجد تو نہیں لگتا۔ ہاں اس جتنا بھدا ضرور ہے۔ اس کا پارنر تو نہیں؟“ میں نے لوفرتا انداز میں ایک آنکھ دپائی۔

”بہت مشقت ہوئی مجھے ہوئی کی بالکونی میں لٹک کر تصویریں لینے میں کافی رقم بھی خرچ ہو گئی مگر بے وفائی کا ثبوت بھی تو حاصل کرنا تھا۔“ میں نے اسے جھجھکا۔

”بکواس بند کر دو ذیل آؤ۔“ یہ سب کرنے کا جھبہا مقصد کیا ہے؟ ”وہ دو ہنسی آواز میں بولی۔

”بس پانچ لاکھ.....“ میں نے ساٹھ انداز میں کہا۔

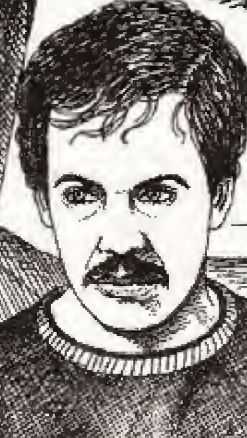
کئی روز کی بارش اور ابر کے بعد پہلی بار دھوپ لگی تھی۔ جمرات کی چھڑی لگی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے لگ بھگ پورے پتے پر سنے والی بارش سے گھاس، پھول، درخت..... سب کچھ جل دھلا کر گھر گئے۔ وہ فردری کے

ٹھنڈاں چائے

مختار آزاد

انسان احساسات و جذبات کے سپارے بہت اچھی زندگی جی لیتا ہے مگر کبھی زندگی بار بھی جاتا ہے۔ وہ جو اپنے گھر کا خوبصورت خواب آنکھوں میں سجائی اپنے معصوم بچوں کے لیے دنیا بھر سے خوشیاں سمیٹ لایا تھا اور ان کے لمس میں ہی اس کے لیے توانائی پوشیدہ تھی کہ دھیرے دھیرے زمانے کی گرم اور بے مروت فضا نے وہ خوبصورت چہرے اور دلگداز لمس کو اپنی کالی چادر میں چھپا لیا۔

خفلات کے کارندوں میں سوز بچائی
ایک پر لکھتے تھے



تھا بالکل اپنی ماں کی طرح مگر جب کچھ دنوں بعد انہوں نے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ لفظ پریشانی لاتا ہے۔ اس لفظ کے بعد گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔

”اماں! ہم کہیں جا رہے ہیں؟“ اس نے گھر کا سامان سمیٹ کر باغیچہ میں ہوائی گھیراں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس صبح ماں نے اسے اسکول جانے سے بھی روک دیا تھا۔

”بیٹا..... ہم دوسرے شہر جا رہے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

مل کو لے آف کے نام پر تالا لگا تو وہ لاہور آگئے۔ احمد علی کو نئے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں اس کے باپ کے جاننے والوں نے اسے ایک اور مل میں کام دلوا دیا تھا۔ دو تین سال کے بعد اسے کسی جاننے والے کی معرفت محکمہ ڈاک میں چھ ای سی کی ملازمت مل گئی۔ وہ اب پکا سرکاری ملازم بن گیا تھا۔ یوہی لمبا عرصہ گزر گیا۔

کہ ایک دن اس کا باپ دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اسے جھکے کے کچھ لوگوں کی کوششوں سے باپ کے کوٹے پر پوسٹ میں کی نوکری مل گئی۔ تب وہ انٹر میں پڑھ رہا تھا، اس نے تعلیم ادھوری چھوڑی اور بس اب وہ صرف کام کا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کی ملازمت کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ماں کو بخار چڑھا۔ لاکھ دوا دارو کی مگر بے سود۔ ایک رات وہ بھی چل دی۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اسی دوران اس کا تبادلہ گجرات کے ایک قصبے میں کر دیا گیا۔ گھر تو تھا سرکاری، سو چھوڑنے میں تردد کیا۔ اس نے مختصر سامان باندھا اور نئے شہر میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے لگا۔

گجرات میں کئی برس تک وہ ڈاک بانٹا رہا۔ اسی دوران احمد علی نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پرائیویٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کیا، جس کے بعد اسے ترقی ملی۔ اب وہ قصبے کے ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر لگا دیا گیا تھا۔ کئی برس وہ قصبے میں گزار چکا تھا۔ اس نے پیسے جو جوڑ کر وہیں ایک پلاٹ خریدا۔ ایک دن وہ اپنے پلاٹ کو دیکھتے کیا تو چاک اس کی نظر ایک دوشیزہ پر پڑی۔

وہ دوشیزہ ماہ انجم تھی۔ سبزیوں کے آدمی کرم الہی کی بیٹی۔ وہ آٹھ جماعت پڑھی ہوئی تھی۔ اسے چلی بار کیا دیکھا کہ احمد علی اپنا دل ہی پار کیا۔ بس..... پھر اس کے بعد کیا تھا۔ اب اکثر احمد علی اپنے پلاٹ پر نظر آنے لگا۔ وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر یہیں پہنچ جاتا۔ کبھی پلاٹ کی صفائی کرنے

لگتا، کبھی چوڑے سے کبیریں کھینچنے کے جیسے کل ہی بنیادوں کی کھدائی شروع ہونے والی ہے۔ یہ بات تو صرف وہی جانتا تھا کہ محبت کا کل اس کے دل میں قہر ہونے لگا تھا۔

اس دوران احمد علی نے کئی بار ماہ انجم کو گلی میں آتے جاتے ہوئے دیکھا۔ خاموش نگاہوں کے دائرہ بھی بھابھ چلی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد چلی بار احمد علی کے دل میں وہ جذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا جسے محبت کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی محبت عشق میں بدلتی گئی اور پھر اس نے کچھ دوستوں سے بات کی۔ دو تین بزرگ گلی میں آئے، کرم الہی کے ہاں رشتے کی بات چلائی گئی اور پھر ایک دن ماہ انجم کے نور سے اس کا سونا آگن رنگ دنور میں نہا گیا۔

احمد علی ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا مگر آج..... وہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا تو دوسرا قدم اٹھانا دو بھر ہو رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اس کا شروع سے ہی پسندیدہ تفریحی مقام تھا۔ اسے وہاں بیٹھ کر جانے بیٹھا اور آتی جاتی ٹرینوں میں سوار اپنی مسافروں کو بتا کر کسی تعلق کے، ہاتھ ہلا کر الوداع کہنے میں بہت لطف آتا تھا۔

وہ چلتے چلتے ٹھک گیا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھا کر کنارے لگے تنگ میل کا سہارا لیا اور خالی خالی نگاہوں سے سڑک کو کھنکے لگا۔ یہ بڑی سڑک تو کبھی نہیں کہ آتی جاتی گاڑیوں کا شور ہوتا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر باغی میں پہنچ گیا۔

جب اس کے بچے چھوٹے تھے تو وہ ہر شام انہیں سائیکل پر بٹھا کر اس سڑک پر گھماتے کے لیے لے کر نکلتا تھا۔ بڑا بیٹا پیچھے کچھ تیر پر بیٹھا تھا۔ دوسرا بیٹا آگے ڈنڈے پر اور سب سے چھوٹی بیٹی کو وہ سامنے باسکٹ میں بٹھا دیتا تھا۔ وہ سب ہنسنے کھیلنے، باتیں کرتے مڑے کرتے تھے۔ قریب میں کھیت تھے۔ اکثر بچے فرما لیں کرتے کہ سائیکل روکو اور پھر وہ چاروں وہیں سڑک کنارے آکھ چلی کھیلنے لگتے۔

تیزی سے ایک کار ہارن بجاتی گزری، وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی کو محو حظ رہا ہو مگر وہاں تو دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ اب تک باغی کے سر میں گرفتار تھا۔ اس نے کندھے سے لٹکے بیگ کا قہقہہ اڑا دیا اور اوپر کی طرف کھسکا یا اور آگے بڑھنے لگا۔

ریلوے اسٹیشن اور اس کا پرانا ساتھ تھا۔ اب بھی ہر شام وہ وہاں تک ٹھہر کر آتا تھا مگر آج وہ گھر سے نکل کر وہاں جا تو رہا تھا کمرٹ کر آنے کے لیے۔ وہ اپنے قصبے،

اپنی ماں اور اپنی محبوب بیوی کی قبر کو ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنی چھوڑ کر انجان منزل پر پہنچنے کے لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر قبرستان واقع تھا۔ اس کی اوئی ماہ انجم کی قبر سڑک کے قریب تھی۔ وہ اس جگہ پر پہنچ کر وہ ایک حائرانہ نظر قبرستان پر ڈالی اور سڑک سے اتر کر قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وہ بیوی کی قبر کے قریب پہنچ کر وہ کندھے سے تھملا اتارا۔ اس میں کچھ سدا بہار پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ اس نے آج صبح ہی باغ سے وہ پھول توڑ کر اپنے ہاتھوں سے یہ گلدستہ بنا دیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے پہلے قبر کے سر ہانے رکھے۔ تھملا قبر کے ایک کونے سے لگا یا اور فاتحہ پڑھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

ماہ انجم اور اس میں مثالی محبت تھی البتہ بچوں کے ہونے کے بعد اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ اکثر وہ بڑے پیار سے اس کی بے رخی کی شکایت کرتا تھا اور ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ”تمیں بچے تم کو تو بھر پتا چلے گا۔“

یہ حقیقت تھی۔ خود احمد علی بھی اس بات کا اکثر اس کے سامنے اعتراف کرتا تھا۔ جب سے بچے اسکول جانا شروع ہوئے تھے، جب سے تو ماہ انجم کی مصروفیات اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ وہ خود بخود بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا احساس رہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ جب سے بچے ہوئے تھے، اس کی ایک ہی خواہش تھی سب اعلیٰ تعلیم پانے ہوں۔ وہ اکوٹی بیٹی کو ڈاکٹر بننا کر اپنی ناسودہ خواہش کی تکمیل چاہتی تھی۔ وہ اپنی عمرانی میں ان کا ہوم ورک مکمل کراتی۔ خود احمد علی بھی اپنے سینے ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ بچوں کی پڑھائی میں بیوی کا ہاتھ ملے۔ یہ ان دونوں کی لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ بچے بھی پڑھائی کے میدان میں غیر معمولی طور پر آگے تھے۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب ان کی محنت کا ثمر نظر آنے لگا۔ جس دن اس کے دونوں بیٹے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکا ر شپ حاصل کر کے امریکا گئے، وہ دن کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ وہ دن جب بیٹی نے ایم بی بی ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا، وہ دن ان دونوں کے لیے ہی بہت خاص تھا مگر ماہ انجم کے لیے تو یہ یوم سعراج تھا۔ بیوی کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے اسے یاد آ رہا تھا کہ بیٹی کے ڈاکٹر بننے کی خوشی میں اس روز کتنے چاکے ماہ انجم نے پورے محلے میں جلیبیاں، کھاجا جان اور موٹی چور کے لڈو

پائے تھے۔ کتنی خوش تھی وہ اس دن۔ لگتا تھا جیسے بیٹی نے نہیں، خود اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہے۔

اسے وہ دن بھی یاد آ رہا تھا جب بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ وہ ان سب سے بہت دور جا رہی تھی۔ لڑکا لندن میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کے دور کے ایک رشتے دار کا بیٹا تھا۔ دو بھائی ڈاکٹر تھا۔ اب بیٹی بھی بیاد کر لندن جا رہی تھی۔ احمد علی کو یہ بھی یاد آ رہا تھا جس دن وہ لندن کے لیے روانہ ہونے والی تھی، اس روز اس کی بیٹی کتنی خوش تھی۔ وہ وہاں جا کر میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی مگر ماہ انجم..... وہ تو اس روز بالکل چپ تھی۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں، چہرہ المردہ تھا۔ وہ دیکھ تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی کھکھ سے جھم لینے والی اولاد ایک، ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ بھی اس وقت جب وہ سمجھ رہی تھی کہ اب اسے ان بچوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ جب بچوں کو ماں کی آغوش کی ضرورت تھی، تب وہ ایک پلی بھی ان سے دور نہ ہوئی مگر اب جب اسے بچوں کے قریب ہونے کا احساس رہ رہا تھا، تب سب انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

”دکھ نہ کر۔“ لاہور ایئر پورٹ پر بیٹی کو الوداع کہتے ہوئے ماہ انجم کی آنکھیں پھٹک گئی تھیں، تب احمد علی نے اس کا ہاتھ تھام کر کھلی دی۔ قبر پر بیٹھ کر فاتحہ پڑھتے وقت وہ منظر اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ اس شام جب وہ بیٹی کو الوداع کہہ کر گھر لوٹ رہے تھے تو کتنے اداس اور خاموش تھے۔ ماہ انجم تو اس سے بھی زیادہ دل گرفتہ تھی۔ دلوں کا حال جاننے کے لیے انہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں گھر پہنچنے کی بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ذرا نیور بہت لمبی رفتار سے بس چلا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ راکٹر ایک بار بھی ماہ انجم نے اپنے لب نہ کھولے۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے ٹپک لگائے اپنے آپ میں گم تھی۔ تب احمد علی نے سمجھ لیا کہ اس کی زندگی نئی راہ پر چل پڑی ہے۔

اسے یہ بھی یاد آیا کہ ایک بار وہ کسی ضروری کام سے بیوی کو لاہور لے کر گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جانے پر تیار ہوئی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ مغرب سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ وہ بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ سارا دن وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ ”جلدی چلو، بچے گھر میں اکیلے ہیں۔“ حالانکہ اس وقت بچے میٹرک اور نویں کلاس میں پڑھتے تھے اور بیٹی ساتویں جماعت میں تھی۔ وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے وہ ابھی پڑھیں ڈرا نیور بہت تیز بس چلا رہا تھا مگر وہ بہت

ہے جین جی۔ وہ رہ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی، آسمان کی طرف دیکھتی اور پھر احمد علی سے کہتی۔ ”یہ گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہا؟“ وہ عصر کے وقت گھر پہنچے۔ بچے محنت میں مہل رہے تھے۔ پورے دن میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی۔

وہ بیٹی کو اودار کہہ کر گھر جا رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد تو وہ بالکل ہی تنہا ہو چکے تھے۔ احمد علی سوچ رہا تھا کہ بچوں کو چند گھنٹے تنہا چھوڑنے والی ماں اب کتنی تنہا ہوگئی ہے۔ وہ بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر وہ خود کتنا اکیلا پڑ گیا تھا، یہ بات شاید ماہ انجم سوچ رہی ہوگی۔ کبھی بچے اسے خوش آمدید کہتے تھے مگر اس دن جب احمد علی نے گھر کا تالا کھولا تو... تنہائی نے بوڑھے جوڑے کو خوش آمدید کہا تھا۔

اولاد کے چلے جانے کے بعد ایک دن بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور یہاں قبرستان میں آکر ڈیرے ڈال لے گئے تھے۔ خالی گھر، تنہائی اور سناٹے کا عذاب صرف احمد علی کے حصے میں رہ گیا تھا لیکن اب وہ بھی جا رہا تھا سب کچھ اپنے ذہن کے کہناں خانوں میں سمیٹ کر۔

”میں آج تیرے پاس آخری بار آیا ہوں۔“ اس نے جیب سے رومال نکال کر کتے پر پڑی گرد صاف کرتے ہوئے خود کلامی کی۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا کتے کو لکھتا رہا۔ ماہ انجم اس کی بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی تھی اور عشق معراج پر پہنچ جاتے تو جذبے اظہار کے لیے الفاظ کے محتاج نہیں رہتے۔ یہی حال احمد علی کا بھی تھا۔ وہ کم مہم بیٹھا تھا مگر اس کا دل بائیں کر رہا تھا۔ دل، جس کی بات وہی سن سکتا ہے جس کا دوسرے سے رشتہ بھی دل کا ہو۔ ماہ انجم کی موت کے بعد بھی وہ دلوں کے رشتے برقرار تھے۔ کم از کم اس وقت احمد علی کو تو کچھ کر سکی محسوس ہو رہا تھا۔

”اچھا... اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے یہ ظاہر تو خود کلامی کی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت وہ اپنی محبوبہ سے ہم کلام تھا۔ اس نے کیا جواب دیا۔ چہاں سوسنا تھا مگر احمد علی کے دل نے وہ جواب ضرور سن لیا ہوگا۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ”او پر والے سے کہنا کہ اب ہمیں یہاں نہیں، وہاں ملوادے۔“ اس نے آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو اللہ ہی حافظ ہے ہمارا۔“

یہ کہہ کر اس نے کندھے پر تھپلا اٹکا یا اور تھکے تھکے قدموں اور شکستہ روح کے ساتھ قبرستان سے باہر نکلے گا۔ سڑک پر پہنچ

کر اس نے ایک بار پھر محبوبہ کی قبر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ پلایا اور سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ ٹکٹ گھر، ریلوے اسٹیشن کے باہر بنا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جیب سے بٹولا نکالا اور پیسے نکٹ گھر کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر باہر کی طرف بڑھائے۔ ٹکٹ لے کر وہ چند سیڑھیاں چڑھا اور پلٹ فارم پر پہنچ گیا۔

”گاڑی کب آ رہی ہے؟“ اسے چائے کے اسٹال پر ٹکٹ چیکر نظر آیا تو اس نے پوچھا۔

”آدھا گھنٹا لیت ہے۔“ اس نے گرم گرم چائے کی چسکی لے کر کہا۔

”ارے بابو صاحب آپ.....“ اسی دوران چائے والے کی نظر اس پر پڑی تو اس نے مگر خوشی سے کہا۔ ”کہاں چل دیے آج؟“ اس نے احمد علی کے کندھے سے لگتے سفری تھیلے پر گہری نظر ڈالی اور معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”سیر و تفریح کا ارادہ ہے؟“ کچھ لمبے کی خاموشی کے بعد اس نے گول مول جواب دیا۔

بھولا چائے والا بڑا باتونی تھا۔ وہ قصبے سے کافی دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ہر روز اپنی سائیکل پر یہاں تک آتا جاتا تھا۔ سائیکل بھی پلٹ فارم پر اس کے کھوکھے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

”کدھر کا ارادہ ہے بابو جی۔“ اس نے شرارت سے پوچھا۔ ”چائے پیو؟“ یہ کہہ کر اس نے جواب کا انتظار نہ کیا اور خود ہی سیکٹی میں پانی اور دو دھڈالنے لگا۔ ”لو بھلا، اتنی سردی میں چائے سے انکار کون کرے گا اور وہ بھی میری چائے۔“ اس نے احمد علی کو دیکھتے ہوئے غر سے کہا اور سیکٹی چوبیسے پر رکھ دی۔

احمد علی اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ اسی لیے دونوں میں کچھ کچھ دوستانہ بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ ویسے بھولا عمر میں تو اس کے بیٹے سے بھی چھوٹا تھا۔

”دیسے تمہاری چائے ہوتی مزیدار ہے۔“ دھکرے جی۔ ”یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”سچ بات تو منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا، احمد علی بھی مسکرایا۔ بھولا چائے بنانے میں مصروف تھا۔ وہ طائراندہ نگاہوں سے پلٹ فارم کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت وہاں صرف دو چار ہی مسافر موجود تھے، تقریباً پورا پلٹ فارم

مالی تھا۔

”سن بھولے.....“ احمد علی نے پکارا۔ بھولا جھٹک کر لڑائی کے پچھلے خانے سے کچھ نکال رہا تھا۔ ”یہاں شیڈ کے نیچے کافی ٹھنڈ ہے۔“ احمد علی نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”میں سامنے دھوپ میں بیٹھا ہوں، وہاں چائے دے جانا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ اس نے جواب دیا اور پھر اپنے ہاتھوں میں لگ گیا۔

احمد علی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ تھیرا ہاتھ رکھ کر رکھا اور پھر خود بھی اسی تنگی بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ خاموشی، سردیوں کی زبردست دھوپ، سامنے سرسوں اور گیہوں کے سرسبز کھیت، پلٹ فارم پر جنگلی گیہروں، چڑیاؤں اور میناؤں کی چپکار..... کچھ دیر کے لیے وہ اپنا دکھ بھول کر اس منظر میں کھو گیا۔

اسے یاد آئے گا جب اس کے تینوں بچے چھوٹے تھے تو وہ پچھلی والے دن ناشتے کے بعد انہیں لے کر یہاں آ جاتا تھا۔ ایک تھیلے میں وہ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھ کر لے آتا اور پھر وہ دوپہر تک یہاں ٹھہرتے تھے۔ بچے سمجھتے کہ وہ انہیں تفریح کے لیے لاتا ہے مگر وہ سمجھتا تھا کہ سردیوں میں کم از کم بچوں کو ہفتے میں ایک دن چند گھنٹے تک ضرور دھوپ تاہنا پناہ ہے۔ جس سے وہ کئی سو فیصد تیار ہوں۔ سچ کہتے ہیں۔ یہ بات اس کی ماں کہا کرتی تھی۔ بچپن میں سنی یہ بات اسے خود صاحب اولاد رہنے تک یاد تھی۔

اچانک کوسے نے زور سے کائیں کائیں کی۔ احمد علی کا اٹھنا ٹوٹ گیا۔ اس نے گردن موڑی۔ وہ برابر لگے شیم کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ حدنگاہ تک فلوادی پٹری نظر آ رہی تھی۔ گاڑیوں کے آنے جانے سے پٹری کی اوپر سی چاندی سی تیزی رنگت اختیار کر چکی تھی۔ صبح کی کرنوں میں تو وہ اور چمک رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ بچوں کو گھمانے کے لیے یہاں لاتا تھا اور اگر گاڑی کے آنے کا وقت نہ ہوتا تو وہ لائن بنا کر اس پٹری پر ایک لمبے بعد ایک قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ یہ ان کا پرل گاڑی ٹھیک ہوتا تھا۔ سب بچے اپنے سے آگے والے کی آنکھیں کا پھیلوا دامن پکڑ کر ڈبے کی طرح بڑا جاتے تھے۔ احمد علی اس بچے گاڑی کا انجن ہوتا تھا۔ وہ منہ پر کھڑی پھٹلی رکھ کر انجن کی طرح سیٹی بجاتا اور جھٹک جھٹک کرتا آگے بڑھتا۔ اس وقت بچے جو شیلے انداز میں شور مچاتے تھے۔

”انجن جلدی چل، انجن جلدی چل اور تیز اور تیز.....“

احمد علی اپنی رفتار بڑھا دیتا تھا۔

جب گاڑی کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو اس سے پہلے احمد علی ان بچوں کی آنکھوں کے سامنے پٹری پر دس پیسے کا سکہ رکھ دیتا تھا اور پھر وہ سب پلٹ فارم پر بیٹھ کر گاڑی کے آنے کا انتظار کرنے لگتے۔ سب کی نظریں اس طرف جمی ہوتی تھیں، جہاں سے گاڑی کو آتا ہوتا تھا۔ جیسے ہی انہیں دور سے آتا ہوا انجن نظر آتا، بچے خوشی سے تالیاں بجاتے، شور مچاتے اور پھر جب گاڑی گزر جاتی تو سب پٹری کی جانب اس طرف کود پڑتے، جہاں انہوں نے سکہ رکھا ہوتا۔ دس پیسے کا سکہ گاڑی کے بوجھ تلے دب کر پھیل جاتا تھا۔

”یہ میں لوں گی۔“ اس کی بیٹی بیٹھ اس چمک دار چپٹے ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے لڑتی تھی۔ بھائی بھی اسے لینے کے لیے پاؤں بٹھکتے تھے۔ برسوں بیت گئے مگر اب بھی وہ تینوں چمک دار ٹکڑے کے لیے لڑ رہے تھے۔

پٹری پر چمکتا دھاتی ٹکڑا..... وہ چمک دار دھاتی ٹکڑا، بچوں کے بچپن سے بڑی احمد علی کی ان گنت یادوں میں سے ایک یاد تھی جس میں ریلوے پلٹ فارم، پٹری اور انجن کبھی موجود تھے۔ پلٹ فارم کی تنگی بیچ پر بیٹھا احمد علی اس وقت اپنی یادوں میں کھوتا تھا۔

بچے بڑے ہوئے لگے تو ان کے کھیل بھی بدل گئے۔ وہ اور بڑے ہوئے تو ان کی زندگی کی گاڑی نے اپنی پٹری ہی بدل لی۔ احمد علی کی گاڑی کے ڈبے اب کسی اور پٹری پر دوڑ رہے تھے۔ احمد علی کی ریل گاڑی کے ڈبے تو چھوٹ چکے مگر وہ اب ایک اسٹیشن پر تھا۔ مدتوں سے اس نے خوشی کی سیٹی نہیں بھائی تھی۔

”یہ میں بابو جی۔“ بھولے نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ.....“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ذرا غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، پٹری کی چمک آنکھوں پر پڑی۔ اس نے دونوں آنکھیں میٹلے ہوئے بھولے سے کہا۔

”ہاں جی..... آج تو دھوپ بہت مزہ دے رہی ہے۔“ اس نے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ”دھوکھٹ بھرے ہی سستی دور ہو جائے گی۔“ اس نے اپنے شورش لینے میں کہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کپ تھام لیا۔ ”ابھی آکر برتن لے جاؤں گا۔“ وہ واپس جاتے ہوئے بولا۔ احمد علی خاموش تھا۔ سرد موسم میں بھولے کی گرما گرم

کہہ کر اس نے جواد کی طرف دیکھا۔ ”بھولے کی چائے پیو، انتظار اچھا کٹ جائے گا۔“

”ہاں بھئی، چائے تو پینی چاہیے۔“ اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”بڑی ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے اب تو۔“

”تو چل بھولے، لے آ دو گرم کپ چائے کے۔“ احمد علی نے بنواداپس جب مہر لکھایا۔ ”اب اسٹیم پیسے لے جاتا۔“

”او جی! کوئی بات نہیں۔“ بھولے نے فراخ دلی سے کہا۔ ”چاچا! تم میرے گاہک تھوڑا ہی ہو، دوست ہو دوست۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسا اور برتن لے کر واپس چل دیا اپنے فی اسٹال کی طرف۔

”گلتا ہے، آپ کی نوجوانوں سے اچھی بنتی ہے۔“ اس نظر ان کی بے تکلفی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے یہ تو میرے بچوں سے بھی بہت چھوٹی عمر کا ہے۔“ احمد علی ہنس دیا۔

”اچھا۔“ یہ کہتے ہوئے جواد نے اپنا بیگ کھولا اور لیپ ٹاپ نکالا۔ ”میرا خیال ہے کہ جب تک چائے آتی ہے، تب تک اسی میبل چیک کر لوں۔“ اس نے لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے کہا۔

”بڑے کام کی چیز ہے یہ۔“ احمد علی نے لیپ ٹاپ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”چاچا!..... اب تو پوری دنیا ہی آن لائن ہو گئی ہے۔“ ملنے کی ضرورت نہیں، سب اس پر عمل لیتے ہیں۔“ اس نے لیپ ٹاپ میں وائزلیس انٹرنیٹ کنکشن ڈیوائس لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھو، اسے لگایا، انٹرنیٹ آن۔ اب پوری دنیا سے رابطے قائم کر لو۔“

”ہاں بھئی، تو چاچا کوئی چیز ہے۔“ احمد علی نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”اس کے آنے سے تو میبل ملاقات بھی گئی۔ اب تو رشتے ناتے، یاری دوستیاں، خوشی پر مبارکباد اور غمی پر افسوس..... سب کچھ آن لائن ہو گیا ہے۔“

”ہنس جی! اب تو سارا کام ہی ڈاٹ کام سے چل رہا ہے۔“ جواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انٹرنیٹ ہو یا فون، ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے ذریعے سب سے رابطے میں ہیں مگر.....“

”مگر کیا؟“ یہ سن کر جواد چونکا۔

”مگر یہ کہ جہاں سے میں دیکھتا ہوں، وہاں سے انسان ہر وقت مزید تنہا ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔“

”تنہا.....“ جواد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیپ ٹاپ آن ہو رہا تھا۔

”جی جیٹا..... انسان کی تنہائی اب اپنی معراج پر پہنچ رہی ہے، ان چیزوں کی بدولت۔“ اس نے لیپ ٹاپ کی طرف اٹکی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر کیسے؟“ اس نے اپنی گود میں رکھے لیپ ٹاپ پر نظر ڈالی۔

”فیکس، انٹرنیٹ، موبائل فون..... یہ سب رابطے کے ذریعے ہیں۔ اچھی چیزیں ہیں یہ۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”نہیں بک، فکس، ای میل، کروڑوں ویب سائٹس، اسکاٹپ..... یہ سب ہماری سہولت کے لیے ہیں مگر ہم نے اسے باہمی تعلق کا متبادل بنالیا ہے۔ ان کے استعمال کو کوئی دوسری چیزوں کا نعم البدل سمجھ لیا ہے۔“

”آپ ان سب چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ اسے بھی احمد علی کی باتوں میں حزو آنے لگا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

”کیوں نہیں.....“ احمد علی نے فخر سے گھبراہٹ سے اسے گھورا۔ ”یہ تمہارے دور کی ٹیکنالوجی ہے مگر پرانے دور کے لوگ بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔“ اس نے مذاق کے لہجے میں کہا۔ ”ٹیکنالوجی کی خاص عمر والوں کے لیے مخصوص نہیں ہوتی۔“ یہ کہہ کر وہ رکاو اور کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ”وہیے آپس کی بات ہے۔ ہے یہ اچھی چیز.....“

”یہ بات تو ہے۔“ جواد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرے دوست کے بیٹے نے اپنے کمپیوٹر پر مکی بار میری بچوں سے بات کروائی ہے۔“ احمد علی نے انٹرنیٹ کی خوبیاں کا بیان شروع کیا۔ ”میں نے مکی بار اسکاٹپ کے ذریعے اپنے بچوں، پوتا بیویوں اور نواسے نواسیوں سے ویڈیو پر بات کی ہے۔ ایک دوسرے کو سامنے مایٹر پر دیکھتے ہوئے بات کرنے کا مزہ بھی الگ ہے۔“

”واہ..... مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ انسان تنہا ہو رہا ہے، ان چیزوں کی بدولت۔“ جواد نے تلمذ دیا۔

”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔“ اس نے قطعیت سے جواب دیا۔ ”مکی بار اسکاٹپ پر اولاد کی اولاد سے باتیں کرتے ہوئے دل چاہا کہ ان کے سر پر ہاتھ پھیروں۔ انہیں گلے سے لگاؤں مگر.....“ اس کا لہجہ بھرا گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ”ہنس، اسی موقع پر احساس ہوتا ہے کہ یہ سب اچھی چیزیں ہیں مگر ہم نے انہیں اصل باہمی تعلق کا متبادل سمجھ لیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

جواد پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ”اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ٹیکنالوجی کے استعمال کے ہم نے غلط مطلب

الال لیے ہیں۔ انہی غلطیوں کی وجہ سے آج کا انسان بہت تنہا پڑتا جا رہا ہے۔“

”تو آپ کے بچے.....“

”وہ سب عمر سے امریکا اور برطانیہ میں رہ رہے ہیں۔“ احمد علی نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔ ”ان کے تو بچے بھی وہیں پیدا ہوئے ہیں۔“

”واہ..... اب سمجھا۔“ جواد نے خود کلامی کی۔ ”وہ آتے ہیں جہاں آپ سے ملنے کے لیے؟“

”ہاں ابھی پچھلے دہائی میں آئے تھے ہفتہ بڑھ کے لیے۔“ احمد علی نے جواب دیا۔ ”کہہ رہے تھے کہ وہاں تو کرس کی چٹیاں تھیں، سوچا کہ اس دوران آپ سے مل لیں۔“

”تو ہر سال آتے ہوں گے؟“

”نہیں۔“ احمد علی نے قطعیت سے جواب دیا۔ ”سات سال میں پہلی بار آئے تھے وہ تینوں۔ میں نے تو بچوں کے بچوں کو پہلی بار درود بھیجا تھا۔ بہت خوش ہوا انہیں دیکھ کر مگر پھر خیال آیا کہ پیدا کس کے بعد ان سب کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اب اگر میری زندگی رہی تو شاید وہ جوان ہو کر ہی ملنے آئیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ افسردہ ہو گیا تھا۔

”مگر آپ ان سے اسکاٹپ پر ویڈیو بات چیت تو کر لیتے ہیں نا۔ مکی تو پوری ہو جاتی ہوگی ایک دوسرے کو دیکھنے کی۔“ جواد نے دہل دی۔

”ولس کے بغیر انتظار اچھا رہا ہے۔“ احمد علی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کی بات کاٹنے کو مانگا۔

”ولس.....؟“ جواد نے یہ سن کر انتظار یہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جب تمہارے سامنے کوئی پیارا سا بچہ کھیل رہا ہو اور تمہیں اس پر پیارا آجائے تو کیا کرو گے؟ تمہاری ماں بچہ دونوں کے بعد تمہیں دیکھے گی تو کیا کرے گی؟“

احمد علی کے سوال سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ نظریں جھکا کر فرش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”مجھے کوئی بچی اچھا لگتا تو اس کا گال جھٹھکاؤں گا، اسے گود میں لے کر پیار کروں گا.....“

”بالکل ٹھیک۔“ احمد علی نے قطع کلامی کی۔ ”اور جب تم کی روز بعد مگر کوٹھنے ہو تو.....“

”ماں دیکھتے ہی اپنے گلے سے لگا کر خوب پیار کرتی ہے۔ میں اس کے پیار کی حدت سے پھل جاتا ہوں، بالکل بچہ بن جاتا ہوں۔“ جواد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”انتظار میں کس شال نہ ہو تو یہ صرف رابطہ جاتا ہے۔“ احمد علی نے کہنا شروع کیا۔ ”جب محبت کا لمس موجود نہ رہے تو جذبے کا احساس بھٹکا ہو جاتا ہے، ان میں بھی تڑپ باقی نہیں رہتی۔ محبت ٹھنڈی چائے کی پیالی بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک عجیب سے سردین کا احساس روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکاو اور پھر گہری سانس لے کر کہنے لگا۔

”دنیا کی سیر کے گرد بیٹھے ہم لوگوں کے درمیان محبت چائے کی گرما گرم پیالی کے مانند ہے۔ وہ ہم سب کے جسم میں نئی حرارت پیدا کرنے کو بے قرار ہے۔ چائے کا ایک گھونٹ اور پیالی سے لیوں کا لمس..... محبت کا درس ہے مگر نہ جانے کیوں ہم اس جدید ٹیکنالوجی میں مکمل طور پر خود کو کھو کر، اپنے بیٹے جیسے جذبوں کی حرارت کو مردہ جسموں جیسی بے زندگی دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انجام..... شدید سردی میں خطرے جسم کے لیے صرف ٹھنڈی چائے کی پیالی۔ ٹھنڈی چائے جو موت کا استعارہ ہے۔“

جواد دم بخود اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچ کے سمندر میں غرق تھے۔ کافی دیر بعد احمد علی نے سر اٹھایا اور جواد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ سب رابطے کے بہت اچھے اور مفید ذریعے ہیں مگر.....“ اس نے انتظار یہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے قطع کلامی کی۔

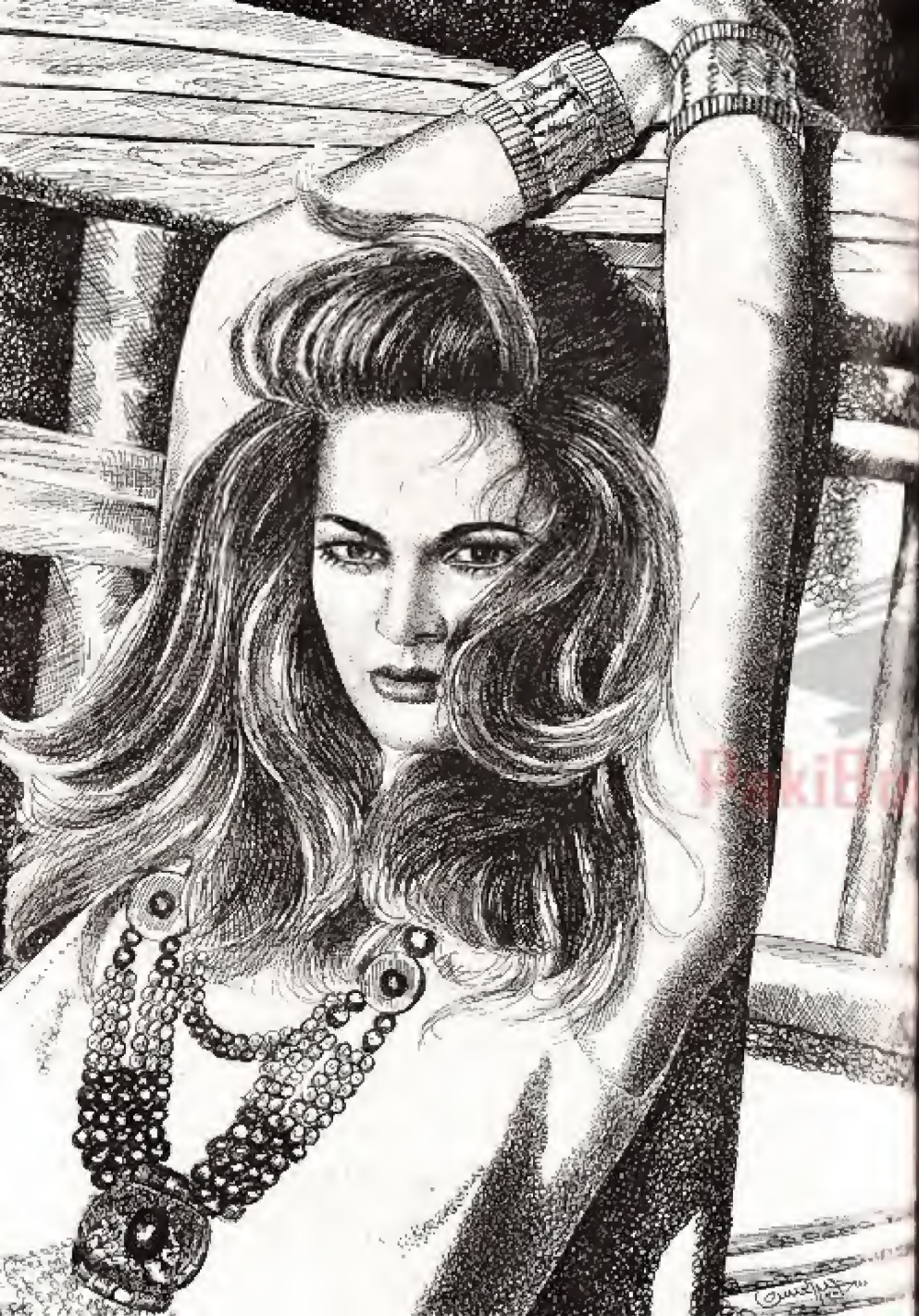
”یہ سب چیزیں کس کا متبادل نہیں، ان سے محبت کے پرنطوس انتظار کا سو فیصد انتظار ہو ہی نہیں سکتا۔“ احمد علی کا لہجہ قطعی تھا۔ ”مگر بد قسمتی سے ہم نے ان چیزوں کو کس کا متبادل سمجھ لیا ہے۔ حیرت ہے جہاں ان سب چیزوں کے ذریعے لوگوں کے باہمی رابطے بڑھ رہے ہیں، وہیں ان کی تنہائی بھی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔“ احمد علی نے اس کی گود میں رکھے لیپ ٹاپ کی طرف ایک بار پھر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بد قسمتی یہ ہے کہ ہم اب تک سمجھ نہیں پا رہے کہ جو مزہ ایک دوسرے سے ملنے کا ہے، وہ ٹیکنالوجی کی آسائش کو استعمال کر کے ایک دوسرے کا احوال جان لینے میں نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔

”ٹیکنالوجی اور تنہائی؟“ جواد نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ احمد علی کی باتیں اس کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔

”یہ یس باؤنٹی۔“ بھولا چائے لے لیا تھا۔

”بڑے مزے کی چائے ہے۔“ جواد نے پہلا گھونٹ بھر کر ہی کہا۔

”اس کی چائے تو بہت مشہور ہے یہاں پر۔ شہر بھر سے



بارہواں حصہ

رنگ آسمان

اے آر راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترقیب دے کر ان کی زندگی کی بے قرار یوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اثر اکر دل کی دھڑکنوں کو بے ترقیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولتا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فردگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبات کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب احراج اور تاریخی جہول خیروں کے مہرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہ شاہیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں مختصر قافلہ جو سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برٹنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ و وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جنتو اسے لندن سے یہاں تک پہنچا لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی بلرج وہ بھی فطرتاً جیسے پسند اور ہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اڈا باش بیٹیا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیما بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور راجہ خاں، اڈیٹر خاں، خاں ساہاں میاں پوری مندو اور شاننا کے علاوہ ایک ہانکا بھیللا ٹریل جو ان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل انگلیک شا کے ساتھی کریم بخش کا اکوٹا پیلا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مرزا جاجا گھمنڈی اور مغزوہ فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و ظالم جیسارو بدردار کے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برٹنارڈ اپنی اس ہم جوئی کے دوران ایک پراسرار ہنسٹری کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہ شاہیہ کی تین خود مختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو بیوقوفانہ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جرجی جانناز گرویلز کا گروپ اپنی جائیں جو ہم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریمان ہے جو فریج آزادی کے سپہ سالار جنرل خیر خان کے ایک خاص مکائدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا فریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذات خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ”کاروانِ مجاہد“ کہلاتا ہے۔ باقی دوسرا بھی شرنیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ قاصد فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باقی گروہ کوہ شاہیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ سنے سنے سے اپنی طاقت کو نیکیا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ”سلسلہ تسلط“ کوہ شاہیہ کی ان تینوں قابل ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہذا کمکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست نگرہ کے مہاراجا چندر گپتی کی طرف سے ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر گدھ گدی ٹھہن ہوتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجوبائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ملی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتی کی پہلی اور مرحوم بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجوبائی کی ایک جوان سال خوبصورت بیٹی جو بیٹا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوچنے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو داسے سے بنائے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا کاراست صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہاپجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا پانا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برٹنارڈ کو گھل کر دیتا ہے۔ مہارانی نجوبائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بھائے و دوست کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا جان جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کر دیتا ہے۔ ملک نجوبائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجوبائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال بیچتا ہے تو اسے پولیس چکڑکتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انکسپکٹر اسے نواب کے بھائی سرراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم دونوں نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سرراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لیٹرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اسی عہد کے ہاتھوں فرنگی افسر برادر کاٹل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے جیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور راجہ خاں، مندو بابا اور شاننا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار ہنسٹری کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کہہ لیتی ہے اور عقین دلائی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی چڑھا دیتا ہے۔ مار یا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھا جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا

ارپیہ کے یہ آخری الفاظ..... ”کہ تمہاری بات مان لینے کی صورت میں کیا میری جان بچ جائے گی اور میں اس منہوں قید خانے سے زندہ سلامت بھی نکل جاؤں گی؟“ منہوں ہیمن تھا کہ ارپیہ قید خانے کے ان دونوں فرنگی پہرے داروں کی ”بات“ ماننے کے لیے تیار تھی۔

زمانہ نے اپنے سنسناتے ہوئے ذہن سے اس راہیہ کے متعلق سوچا۔ اس کے اندر کوئی چٹا "سنگ"..... کیا راہیہ محض اپنی رہائی اور جان بچانے کی خاطر اپنی عزت کو داؤ پر لگانے والی تھی؟ کیا راہیہ اسکی عورت تھی؟ وہ تو اسے ایک مضبوط اور با اعتماد اور وفادار عورت سمجھتا تھا۔

”ہرگز نہیں.....“ اس کے دل کی آواز نے ان الفاظ کو دگر دیا۔ ”اگر یہ بھی مجھے بھی ان فرشتوں کے آگے اپنی عزت کا سوا نہیں کر سکتی۔ وہ جان دے سکتی تھی مگر اپنی عزت پر ایک را آج بھی لانے والے عورت نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوئی تو وہ اس جگہ کے فرشتے اشریف بروچر کا خون کیوں کرتی، جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔“

تو پھر اس کے ان آخری الفاظ کا کیا مطلب تھا؟ اس نے الجھ کر سوچا۔

اس نے دروازے سے بدستور اپنا کان لگائے
 کھا۔ پکلی والی مردانہ آواز ابھری۔

”کیا اذہری؟“ اسے اریبہ کی خیرت میں ڈوبی ہوئی

اور سنانی دی۔ زمان کی کیشیاں ابھی تک سنسنار ہی تھیں۔
یہ تو بڑی گمنامی جگہ ہے۔ کم از کم مجھے ابھی جگہ پر تو لے

”ارے..... تو بھی پینے پلانے کا شوق رکھتی ہے بے

ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پر تاب کا مار اید یہ کوری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ اور پھر پنچورام مار یا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خیرد جتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیب میں مندروں کے چھاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر پنچورام کرنل کو سختی خبر دیتا ہے کہ مار یا کے غیب میں مندرو والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریزوہ شمال پر چڑھا نئی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ اور بدری ناتھ اپنے پیٹلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حیندرو یناکو اغوا کرلیں۔ دو چھاری رہنما کو اگر کے مندرو لئے آتے ہیں۔ ار یہ اور شاہ زمان کی پاک نامی بھانجرتاہ کرنے کے مشق پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ مدح ملنے جاتے ہیں۔ اور شوکی رہنما کی تلاش میں کافی کے مندرو جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے چھاری ٹھہر لیتے ہیں، اسی وقت گو لی ولس کی آزاد فضا میں ابھرتی ہے..... ۔۔۔ انگریز وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک ناؤ بہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کافی کا مندر تباہ ہو جاتا ہے اور شوکی لمبے تنے دب جاتا ہے۔ اور شاہ زمان آزاد ہوکرار یہ کوچہ چراگئے کی جدوجہد کرتا ہے اور..... فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے۔ اندر کسی کمرے سے اسے ار یہ کی آزادی آتی ہے جسے سن کر اس کی کنپیاں ساکس ساکس کرنے لگی ہیں۔

جی؟ یہ دوسرے پہرے داری آواز تھی۔ ذرا غور کرنے پر زمان کو ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہوا کہ ایک پہلے والا پہرے دار فرنگی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔

اور یہ کہ اس بات پر یقین تھا کہ زمان کے ہوتوں پر زہریلی شکرابھٹ عود کر آئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر یہ ان دونوں ہوس کار پیرے داروں کے ساتھ کوئی تکمیل کھیلنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اس روایتی "تھیلار" کا استعمال خوب اچھی طرح جانتی تھی۔

”کرکھ لے شیک کہہ رہی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔ یہاں تو سارا جہاز جھکنا پھیلا ہوا ہے۔ ایک بستر تک نہیں ہے یہاں۔“

”ہوں..... تمہاری بات سمجھ ہے مسٹر بڑا! چلو پھر دیر کس بات کی ہے۔“

زمانہ فوراً دروازے سے ہٹ کر ذرا پیچھے ایک تاریک گوشے میں سرک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر یہ ان دونوں کے ساتھ کوئی ”گیم“ کھیلا جا رہی تھی اور وہ اس کی مدد کے لیے تیار تھا۔

تصویری در بعد دروازہ کھلنے کی آہٹ ابھری۔ زمان
کی بے تاب نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے
باں بالترتیب تین انسانی ہولوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔

سب سے آگے والا ایک دروازہ قحط زدہ تھا۔ اس کے گاندھے سے رائل جھول رہی تھی۔ درمیان میں کسی عورت کا بیولا تھا جسے زمان پہچان گیا تھا کہ وہ اریہہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ اس کے عقب میں ایک بھگتے قد کا دوسرا پہرے دار تھا۔ اس کی سر پر رائل نہیں تھی لیکن اس نے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پتھول پکڑ رکھا تھا۔ وہ اریہہ

نکلے اور چنگ کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ دونوں اس وقت تک دوڑتے رہے جب تک کہ بے دم ہو کر گر نہ پڑے۔ نرم نرم گھاس نے انہیں جیسے اپنی گود میں سمالیا۔ گھاس کافی اونچا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بے حال سے اسی طرح پڑے رہے۔

انہوں نے گویا اپنے جسم کی ساری طاقت کو انگوٹوں میں جمع کر کے دوڑ گئے میں بہت زور لگا پاتا تھا کیونکہ وہ جلد سے جلد اس خطرناک مقام سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے لیکن ابھی انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنی دور نکل آئے تھے۔

وہ شاید مزید تھوڑی دیر اور اسی طرح خاموشی سے پڑے سستاتے رہتے کہ اچانک انہیں کسی درندے کی ہاڑ سنائی دی۔ صرف زمان ہی بے اندازہ لگا پایا تھا کہ یہ اس فرنگی آفسیر رینالڈ کے پاس گھلدار کی وہاں تھی۔

تین میں سے ایک گھلدار کو زمان پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ وہ دھل گیا۔ گویا رینالڈ اور فرنگی فوجی اس کے تعاقب میں تھے اور اس غصیت رینالڈ نے اپنے دونوں ہاتھ گھلداران کے تعاقب میں آزاد چھوڑ دیے تھے۔

”اربیہ.....! جلدی اٹھو۔ ہم ابھی خطرے میں ہیں۔“ اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اور سستائیں دو زمان! اور شاید کسی درندے کی دھاڑ سے پریشان ہو گئے ہو۔“

”اربیہ بات نہیں کر رہا ہے!“ زمان فکر و تشویش سے بولا۔ ”کیونکہ یہ کوئی درندہ نہیں بلکہ اس موڑی فرنگی آفسیر رینالڈ کا ہاتھ گھلدار ہے اور یہ ایک نہیں دو ہیں۔“ کہتے ہوئے زمان نے اربیہ کو اس کی تھوڑی سی تفصیل بتادی۔

”اوہ میرے خدا!.....!“ یہ سن کر اربیہ دہشت زدہ سی ہوئی۔ ”تنت..... تو اس کا مطلب ہے کہ اس غصیت نے ہماری تلاش میں درندے دوڑا دیے ہیں۔“

”ہاں، جلدی اٹھو.....!“ زمان نے مزید وقت ضائع کے بغیر اربیہ کو بازو سے پکڑ کر سہارا دیا۔

زمان کا منصوبہ کچھ اور تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انسانوں کے تعاقب سے تو بچا جاسکتا تھا مگر ان درندوں کے تعاقب کو کھل دینا تقریباً ناممکنات میں سے تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جیسے اور شیر کے مقابلے میں گھلدار زیادہ خطرناک تیز رفتار اور پھرتلا جانور ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ گھلدار پالتو تھے تاہم درندے تو تھے۔ اسی سبب اس نے جلد ہی دوڑنا متوقف کر دیا اور اربیہ کو ایک درخت

کے نکاسی والے دروازے کی طرف پہنچے لیکن وہاں پہنچنے ہی دونوں ٹھنک کر رکے۔ سامنے وسیع و عریض احاطے میں تین چار گڑیاں اور پندرہ سولہ کے قریب مسلح فوجی دکھائی دیے۔ اگر یہ دونوں دروازے سے باہر نکلے تو ان کے دیکھ لیے جانے کے واضح امکانات تھے، لیکن اگر وہیں کھڑے رہتے تو ذرا ہی دیر بعد ہی عمارت جہنم کا منہ پیش کرنے والی تھی۔ وہ اس میں مجسم ہو جاتے۔ گویا دونوں طرف موت ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اپنی ان پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”زمین پر لٹ جاؤ۔“ زمان نے اربیہ سے کہا اور پھر دونوں سینے اور کہنیوں کے بل جتنی جلدی ہو سکتا تھا، عمارت کے دروازے سے دور نکلنے چلے گئے مگر کب تک..... اسی وقت ایک فرنگی نے چلا کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ زمان کو رینالڈ کی جیب بھی دکھائی دی تھی۔

”فائر.....!“ انہیں رینالڈ کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔ ان کے دل دھک سے رہ گئے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور سب سے پہلے زمان نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنی زمینی پوزیشن بدلی اور اربیہ کا ہاتھ پکڑ کر قریب واقع جڑواں خوں والے درخت کی جانب اندھا دھند بھاگا۔

اسی وقت تک وقت کئی راتوں نے فائر اگلے مگر زمان، اربیہ کا ہاتھ پکڑے بالآخر اس جڑواں سنے والے درخت کی آڑ لیتے میں کامیاب ہوئی کیا لیکن جانتا تھا کہ یہ آڑ بھی انہیں زیادہ دیر ان فوجیوں کی بلاکت فیزی سے نہیں بچا سکے گی کیونکہ وہ ان کی نظروں میں آچکے تھے اور یوں یہ درخت زیادہ دیر ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی وہ وقت تھا جب تمام مسلح فوجی چیتے چلاتے ہوئے اس طرف راتھیں تانے دوڑے۔ اسی وقت عمارت کے اندر ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ وہ ہولکا گئے پھر دوسرا دھماکا ہوا۔ وہ سارے زمین پر لٹ گئے، پھر تیسرا اور چوتھا..... اس کے بعد تو جیسے زلزلہ آگیا۔ دھماکوں پر دھماکے ہوتے چلے گئے۔ شعلے اور جلے ہوئے لے کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا لالہ..... اڑاڑ کر فضا میں بکھر رہے اور گرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف آگ اور شعلوں کی برسات ہوئی تھی۔

کانوں کے پردے دھماکوں سے پھٹے جا رہے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں درخت کی آڑ سے

”مم..... میرا پیٹ..... ہائے..... درد.....“ ”کیا ہوا..... تمہارے پیٹ کو.....؟“ فرنگی کی آواز ابھری مگر دوسرے ہی لمحے وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”یہ کیا حرکت کر رہی ہو؟ کتنا؟ میں نہیں..... اس کی غصیلی آواز گولی چلنے کے دھماکے میں ایک چیخ بن کر ابھری۔ زمان سمجھ گیا کہ اندر اربیہ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی گل کھلا دیا ہے۔ اس نے دروازے کو اپنے کندھے کی زوردار ضرب رسید کی اور اسے توڑنا ہوا اندر آ گیا۔ منظر غیر متوقع نہیں تھا۔ وہی دروازہ صدمت فرنگی پہرے دار خون کی چھپڑی میں فرش پر پڑا تھا اور اس کے قریب اربیہ ہاتھ میں رائفل لیے کھڑی تھی۔

دونوں کی نگاہیں چاد ہوئیں اور جیسے صدیوں کے پھڑے دوبارہ مل گئے ہوں، وہ ایک دوسرے کی طرف لپکے۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو زمان! میرا دل کہتا تھا کہ تم زندہ ہو۔“ اربیہ نے بے قرار سی کہا۔ زمان کو دیکھ کر اس کے انگ انگ سے مرتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ زمان نے بھی بے قرار سی اربیہ کو اپنے گلے کا لیا تھا۔

”اب جلدی کرو، یہاں سے نکلنے کی کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ..... جھیل کی سمت گئے ہوئے ہیں۔ گولی کا دھماکا انہیں متوجہ نہ کر ڈالا۔“ اربیہ نے کہا۔ دونوں فوراً وہاں سے نکلے اور راہداری میں آ گئے۔ زمان نے گرگھ کی گری ہوئی چیخ جس (ماپس) اٹھائی تھی۔

”مجھے ایموویشن ڈسپ اور ان کے میگزین (اسلحہ و بارود خانے) کی تلاش ہے۔“ زمان نے کمرے سے باہر نکلنے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ مشن نمٹانا زیادہ اہم ہے۔“ اربیہ نے بھی اسی حوصلے اور عزم سے کہا۔ زمان نے باہر پڑے گرگھ کا پستول اٹھا کر اربیہ کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے ہاتھ سے بڑی رائفل لے لی تھی۔ دونوں عمارت کے اندر منڈلاتے رہے اور بالآخر ایک ہال نما کمرے میں انہیں اسلحہ اور بارود کا ذخیرہ نظر آ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک عمارت کے باہر گڑیوں اور بہت سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔

”خش..... شاید دشمن پلٹ پڑے ہیں زمان! جو کمرتا ہے جلدی کرو.....“ اربیہ نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا اور زمان نے جلدی جلدی وہاں موجود فلیٹ جمع کیے اور انہیں دیاسلانی دکھا کر باہر آ گیا۔ اس کے بعد دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے عمارت

کو لیے تاریک سی راہداری کی طرف مڑ گئے۔ زمان نے چونکا پیچ کے مانند بے آواز اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت محتاط روی کے ساتھ ان کے پیچھے ہولیا۔

راہداری زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی۔ چند قدموں کے بعد وہ تینوں دائیں جانب گھوم گئے۔ زمان ان کے پیچھے دبے پاؤں چلتا ہوا وہاں تک پہنچا مگر اس نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور موڑ والی دیوار کی آڑ کے پاس جا ٹھہرا اور ایک ذرا سراسر اچھا کر دوسری جانب بھاگا۔

وہ تینوں ایک کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے، آگے والا پہرے دار کٹھڑی کھول رہا تھا۔ اسی دوران پیچھے کھڑے پہرے دار نے اپنے ساتھی کو غائب کرتے ہوئے کہا۔

”مسٹر برڈ! پہلے تم اس چوکری کے ساتھ مزے کرو۔ میں یہاں پہرہ دیتا ہوں مگر ذرا جلدی..... ایسا نہ ہو کہ میری باری پر وہ سب یہاں آ جائیں۔“ اس نے اب اپنی کسی نال والا پستول.... فاکا ٹیکر کے بیٹھ میں اڑس لیا تھا۔

”فکر مت کرو مسٹر گرگھ! تمہاری باری بھی آ جائے گی۔“ فرنگی..... یعنی خیر انداز میں کہتا ہوا مذکورہ کمرے کا دروازہ کھول کر اربیہ کو لیے اندر داخل ہو گیا۔ گرگھ باہر کھڑا رہا۔

زمان نے بیخفت اپنی جگہ سے حرکت کی اور دیوار سے چپکا چپکا کرگھ کی طرف سرکنے لگا۔ وہ اس وقت اپنے کان میں ابھی ہوئی بیزی نکال کر اسے دیا سلائی سے لگانے میں مصروف تھا کہ زمان اس کے سر پر چاہنچا، مگرگھ کسی کی آہٹ محسوس کر کے فوراً چونکا۔ اس کا ہاتھ پستول اچکنے کے لیے بڑھا مگر تب تک اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ زمان اس پر بجلی بن کر ٹوٹا اور اپنی دائیں ٹانگ کے گھٹنے کی پھر پور ضرب اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ ساتھ ہی پھرتی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر بھی رکھ دیا۔

دشمن کے ناپاک وجود سے گھٹنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ضرب کی شدت پھر پور اور نتیجہ خیز ہو، وہی ہوا۔ مگرگھ اس ضرب کو سہہ نہ سکا اور ایک ہی وار میں ڈھے گیا۔ زمان نے پھر بھی آہستہ آہستہ اسے گرفت سے چھوڑا۔ وہ بھکا اور آفری وار اس کی بجلی ہوئی گردن پر کھڑی پھٹیلی سے کیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”گرگھ! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ شاید کوئی ہلکی کھڑ بڑا اندر موجود فرنگی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ زمان نے دانستہ پھنسی پھنسی اور جھول سی آواز میں کہا۔

پر جلدی سے چڑھا دیا۔

”تم بھی اوپر آ جاؤ۔۔۔۔۔“ اریہ نے ایک موٹی شارخ پر نکتے کے بعد زمانے سے کہا۔

”نہیں، میں اس درندے کو نشانہ بنانا گا۔“ زمان نے اریہ سے ابھی اتنا کہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں موجود قد آدم جھاڑیوں میں کوئی دھاری دار شے جیزی سے حرکت کرتی ہوئی اپنی جانب بڑھتی محسوس ہوئی۔ ایک لمبے کواس کا سانس رک گیا مگر اس نے فوراً اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے رائل سیدھی کرتے ہوئے درخت کے تنے کے تھوڑے پڑیشن بنائی۔

انگلے ہی لمحے اس نے طوفانی رفتار سے اپنی طرف آتے ہوئے گھدار کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ جنگل کے دم بہ خود سے سناٹے میں گولی چلتے کلاھا کا ہوا اور گھدار کی چنگھاڑ ابھری۔ وہ اس کے پیروں کے قریب آ کر ”دھپ“ سے گر اٹھا۔

زمان نے گہری نظروں سے جانچا، وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کا پیٹ جیزی سے پھول اور پچک رہا تھا۔ واضح تھا کہ ابھی اس کی سانس چل رہی تھی۔

کئی درندے کوئی نکتے ہی گر جایا کرتے ہیں اور پھر اچانک ایک کچک کر حملہ کر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زمان ابھی اس پر دوسری گولی چلانے کی تیاری میں تھا کہ گھدار ایک دھشیاہی غراہٹ کے ساتھ دو بارہ اٹھا اور اس سے پہلے کہ گھدار اس پر حملہ آور ہو جا، زمان نے ٹنگر دیا دیا۔ اس بار اس نے گھدار کی پیشانی کا نشانہ لیا تھا۔ گھدار کھٹی کھٹی غراہٹ سے گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

”اریہ۔۔۔۔۔! جلدی بیچے اترو۔۔۔۔۔“ زمان نے شل پڑتے اعصاب پر قابو پا تے ہوئے اسے نکارا۔ ایک غوغوار درندے سے مقابلے نے اس کے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔ اریہ نے اس کی آواز سننے ہی درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں پھر دوڑ پڑے۔

مراد نے انہیں بتایا تھا کہ جزیرے میں قابض فرنگیوں کے ہیڈ کوارٹر (جسے زمان تباہ کر چکا تھا) کے علاوہ جتنی نما چھوٹی سی عارضی بندرگاہ بھی بنی ہوئی تھی۔ اسی بندرگاہ کے قریب ہی کرنل اینڈرسن اور اب ایک کپٹن پیمنس کی ہاؤس بوٹ ٹائپ رہائش بھی تھی۔

یہ بوٹ ”سی پاک“ اسی بکری جہاز کے قریب ہی پانی میں بکھورے کھائی رہتی تھی۔ اس پر بڑی بڑی سرخ لائٹیں نصب تھیں جو ہر وقت سی پاک اور اس کے ارد گرد

سمندر کی سطح پر گردش کرتی رہتی تھیں۔ اب ان کا رخ اسی جانب تھا۔

☆☆☆

”سسٹر۔۔۔۔۔! میرا مقصد اب پورا ہو چکا۔۔۔۔۔! اب میں بہت جلد تمہیں خدا حافظ کہنے والا ہوں۔“ اپنی بہن کا ریشا کو مکاری سے مسکراتے ہوئے دیکھ کر بالآخر رابرٹ نے اس سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔

”تمہارا مقصد تو پورا ہو گیا برادر۔۔۔۔۔! یہ کہتے ہوئے گاریشا چند قدم چلتی ہوئی سر اسیدھی کھڑی سوچنا کے قریب آ گئی اور ایک نگاہ طعن اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ ”مگر۔۔۔۔۔! میرا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں! ٹھیک ہے ڈیئر سسٹر!“ رابرٹ بے پروائی سے بولا۔ ”تم کئی رہو اپنے مقصد میں، ایک نہ ایک دن شوکی تمہارا ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے بہن کو بہلانے کی کوشش کی۔ یہ سن کر گاریشا کے ہنٹوں پر بڑی کینہ توڑی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بھائی سے بولی۔

”لیکن تم نے میرے اس عزم میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، برادر کہ اگر شوکی میرا نہ ہوتا تو میں اسے رہنا کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔! رابرٹ نے اس کی بات کا جیسے مسخرہ ڈایا۔ ”میں نے تو تم سے کوئی مدد نہیں لی، خود ہی سب کچھ کیا۔ تم بھی ایسا کیوں نہیں کرتی ہو۔ اب یہ تو بھینس سکا کہ میں تمہاری فضول سی ضد کے آگے اپنا بتانا تحمل بگاڑ دوں۔“

بھائی کی اس بات نے گاریشا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ دھشلا بار لہجے میں بولی۔

”تم مجھ سے دغا بازی نہیں کر سکتے رابرٹ! ہم دونوں اب تک اپنے اپنے مقادات اور مقاصد۔۔۔۔۔ کے لیے ساتھ رہے ہیں۔ تم مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“

”کون رو کے گا مجھے۔۔۔۔۔! ہاں! بولو۔۔۔۔۔!“ رابرٹ آنکھیں نکال کر بہن پر چڑھ دوڑا۔

”میں روکوں گی۔“ گاریشا بھی جیسے تم ٹھوٹک کر بولی۔ سوچنا ایک طرف ڈری سہی کھڑی ان دونوں بہن بھائی کو جیرانی سے نکلے جا رہی تھی۔

بہن کے اس جارحانہ انداز نے رابرٹ کو ہل بھر کے لیے تو کم مہم سا کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے دانت چب کر بولا۔

رنگ آسمان

”تم۔۔۔۔۔! تم مجھے رد کو گی؟ ڈیئر سسٹر! کیا تم اپنے بھائی کو نہیں جانتی ہو؟“ اس کے لہجے میں تہدید نمایاں تھی۔ ”اچھی طرح جانتی ہوں، مگر شاید تم مجھے نہیں جانتے ہو۔“ گاریشا نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”اگر تم نے میرا ساتھ چھوڑا تو میں ابھی جا کر راج محل میں چلا چلا کر بتا دوں گی کہ تم یہاں کی ایک راجگاری کو مال و اسباب کے ساتھ بھاگ کر لے جا رہے ہو۔“

گاریشا کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ رابرٹ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور پھر وہ ہوا جس کی سوچنا کو تو کیا، خود گاریشا کو بھی شاید توجہ نہ تھی۔ رابرٹ نے کسی بھیڑے جیسے غراہٹ اپنے حلق سے خارج کی اور دونوں ہاتھوں سے بہن کا گھاد بوج لیا۔ سوچنا نے یہ دیکھا تو کھٹی کھٹی منہ مار کے رہ گئی اور خستہ کرنا پڑی۔

گاریشا کے حلق سے کھٹی کھٹی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت جیسے سخت ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی گردن کو بھائی کے ہاتھوں کے شکنجے سے چھڑانے کی بے سود دھک دے کر رہی لیکن رابرٹ دونوں ہاتھوں سے اس کا گھاد باٹا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گاریشا نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور جب رابرٹ نے اس کے جھولتے بدن کو چھوڑ دیا۔ گاریشا قائلین پر بے حس و حرکت گر پڑی۔

”ت۔۔۔۔۔! تم نے اپنی بہن کو مار ڈالا۔۔۔۔۔!“ سوچنا لرزتی آواز میں رابرٹ سے بولی۔

رابرٹ ایک لمحے کو ڈر کر کہیں سوچنا کا اس کی طرف سے دل خراب نہ ہو جائے، لہذا وہ ایک دم چالاک لومڑی بن کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”سوچنا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دیکھو، میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہاری خاطر، اپنی محبت کی خاطر میں نے اپنی بہن کو بھی نہیں بخشا۔۔۔۔۔! اور تم بھی تو یہ قربانی دے رہی ہو۔ یہی محبت ہے سوچنا! محبت اور جنگ میں صرف اپنے مفاد پر نظر رکھو، جو تمہارا راستہ کھوٹا کرے اسے راستے سے ہٹا دو، ورنہ پھر خود مرے کے لیے تیار رہو۔ ہم بہادر ہیں، اپنی محبت کی بدعنوانی حفاظت کرنا جانتے ہیں پھر تم خود ہی تو کچھ رہی تھیں کہ گاریشا بلا وجہ اپنے مفاد کی خاطر ہمارا راستہ کھوٹا کر رہی تھی۔ درحقیقت یہ ہماری کامیابی سے جل گئی تھی۔“

سوچنا کھٹی کھٹی آنکھوں سے کھٹی قائلین پر مگر گاریشا کی لاش کو دیکھتی اور بھی رابرٹ کا منہ نہ کھلے سکتی۔

”ذیر مت کرو سوچنا! میرے ساتھ جیسے مرنے کی قسم

کھائی ہے تو اسے پورا کرو۔ میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔ یہ راج محل اور یہ تخت و تاج بہت جلد چمن جائے گا۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی باغیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے اور تم ساری عمر قید خانے میں گزار دو پھر تمہیں بچھٹا دیا ہو گا کہ تم نے میری بات کیوں نہ مانی۔ بتاؤ مجھے۔۔۔۔۔! تیار ہو؟“

شاہر داغ رابرٹ نے سیدھی سادی سوچنا کے سامنے جنگ و جدال کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ ہمت کھڑنے لگی۔ وہ رابرٹ سے محبت بھی تو کرتے لگی تھی۔ اب وہ اس کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔

”شاباش۔۔۔۔۔! آؤ یہ سب چیزیں سنبھالو، اور سونے کے اس قید خانے سے نکل چلیں۔“ مکار رابرٹ اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا اور یوں دونوں نے قائلین پر بکھرنا مال و اسباب جلدی جلدی سینٹا شروع کر دیا۔

یہ سارا سامان اپنی جگہ پیش قیمت تو تھا ہی مگر اس کی نوادراتی حیثیت اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ نقشین صندوق بھی کم قیمت کا حامل نہ تھا، اس میں بھی سونے کے تاروں کی ڈیزائننگ تھی اور۔۔۔۔۔! موتی جڑے ہوئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جسے یہ آسانی ایک ہاتھ میں کسی چھوٹے سے بکسے کی طرح اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس کے اندر جواہرات رکھے تھے۔

رابرٹ نے اسے کپڑے میں لپیٹ لیا تھا۔ باقی سامان کی اس نے بٹنی بنائی تھی۔ وہ اس نے اپنے کندھے پر ڈال لی۔

جس وقت یہ دونوں چوری چھپے راج محل سے نکل رہے تھے، ٹھیک اسی وقت باہر تار یک آسان میں بڑے زور کا کڑا کا ہوا۔ سوچنا کا دل دھل گیا۔ اس نے سر اٹھا کر آسان پر دیکھا تو کھلے آسان پر بھٹی کی ایک پھٹتی ہوئی دراڑ سی پھٹتی دکھائی دی، یوں جیسے آسان جل گیا ہو۔ سوچنا کو یوں لگا جیسے اس کا دل کسی نے کھٹی میں لے لیا ہو۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہاں راج محل کے اندر لوٹ جائے مگر وہ اس کی ہمت نہ کربانی۔

رابرٹ نے ایک گھوڑا اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی۔ رابرٹ نے پہلے سہارا دے کر سوچنا کو گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے بعد خود بھی اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔

رات کی اس شدید طوفانی بارش میں جب سوچنا، رابرٹ کے ساتھ گھوڑے پر سوار کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو رہی تھی تو اس کی خوبصورت آنکھیں بھی مینہ

برساری تھیں۔ اس کا سندر سا چہرہ بارش اور اشکوں سے بھیجا جا رہا تھا۔

چالاک لومڑا اپنی رواجی کہانی کے مطابق بکری کے مینے کو بالآخر بہلا چھلا کر اپنے جیزوں میں دبائے اپنی مین گاہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

گھوڑا دو جوان دھار اور شرانے دار بارش میں مناسب رفتار کے ساتھ کوہ شمالیہ کی آخری حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ دونوں بارش سے بھیگ چکے تھے۔ رابرٹ نے ایک چالاک کی بھی کسو گتیا کا ران بھکاری والا شاہی لباس اترا دیا تھا اور اسے عام سالباں پہنا دیا تھا۔

خود اس کا اپنا مختصر آ ذاتی سامان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے سوچنا کو بھگا دیا تھا کہ اس نے راستے میں ملنے والے لوگوں کو کیا جواب دینا تھا۔

پلو سے ایک گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا سوچنا آرام و آسائش کی زندگی میں ملنے والی ایک نازک انعام لڑی تھی۔ سفر کی اس پریشان مسافت نے اسے نڈھال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ رابرٹ نے محبت سے اپنا ایک ہاتھ اس کے گرد و لعل کر رکھا تھا اور اپنے جسم کی گرمی کو اس کے جوان اور نوجوان بدن کی آج میں رلا ملا کر اسے گرمائے ہوئے تھا۔

وہ اب کوہ شمالیہ کی حدود پار کر کے ہرودار کے گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔ جنگل بھیگ رہا تھا۔ بھیگی بھیگی دریا کوہ شمالیہ کی چوٹیوں کی جانب آسانی ملتی تھی۔ کالج بھر کو کڑا کا ہوتا اور پھر گہرا سکوت طاری ہو جاتا۔

چالاک لومڑے جب دیکھا کہ وہ اس منصوبے میں کامیاب رہا ہے تو اس نے سوچا سوچنا کو بہلا نا ضروری ہے۔ اسے ایک نئی دنیا کا مزہ چکھنا ہوگا۔ ایک نئی اور انوکھی لذت سے روشناس کرنا ضروری تھا تاکہ اس کے دل و دماغ کا سکندر خیم ہو جائے اور وہ ایک نئی لذت، ہر شاری اور اس کی محبت کے نشے میں غرق اسی کے بارے میں سوچتی رہے اور اپنے ماضی کو بیکسر فراموش کر دے۔

اس نے ایک گھٹائے کے قریب گھوڑا روک لیا۔ دونوں نیچے اترے۔ سوچنا کو گھوڑے سے نیچے اتارتے ہوئے رابرٹ نے اسے بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا اور دیوانہ وار اس کا گھبراہٹ اور سندر چہرہ جو سنا شروع کر دیا۔

بارش کے پانیوں میں بھیج دیا سوچنا کا بدن گیلیا ہو رہا تھا۔ اس پر سفر کی نکلان غالب تھی لیکن جیسے ہی چالاک رابرٹ نے محبت کی آج دی تو سوچنا کی یہ تھکن اس کے

..... ایک ایک کو توڑنے لگی۔ محبت اس کے بدن کو توڑ رہی تھی، سفر کی تھکاوٹ ایک مزہ بن کر ابھر رہی تھی۔ ایک سرور جگا رہی تھی۔ سوچنا ایک نوجوان اور نوجوانہ کی ہی تھی۔ ایک ذرا ہاتھ لگاتے ہی جج مکی۔

رابرٹ اسے اس ہر شاری کے عالم میں گھسائے اندر لے گیا۔

باہر گھوڑا ایک درخت سے بندھنا تھا آلود گھاس چرنے میں مصروف رہا۔ پیچھے ہوئے جنگل میں گہرا سکوت طاری تھا۔ ایسے میں ایک گلیڈز کہیں سے نمودار ہوا اور گھسائے قریب ایک نسبتاً اونچی ٹیکری پر چڑھ گیا پھر اپنا تھوڑا سا نیم روشن آسان کی جانب اٹھا کر محسوس آواز نکال کر رو دیا۔

پھر اپنا وجود بھر بھر کر بھگاڑا اور ٹیکری سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ گھسائے قریب تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا، تھوڑا آگے بڑھا۔ اندر لٹائی وجود کی موجودگی محسوس کی اس نے تھوٹے سے ایک "جج" خارج کی اور ایک طرف کو جا کر تار یک جنگل میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆

علی راجا پر تاب کمار سے ملنے کے بعد اپنے سفید براق گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے گھٹت بھگاتا ہوا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ وہاں اس کا نائب سالار اقبال خان موجود تھا۔ اپنے سالار کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ علی کو شرمندگی سی ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال خان ایک نواب زادہ تھا۔ یہ اس کا بڑا پاپن تھا کہ وہ یہاں میدان جنگ میں خود کو نواب زادہ نہیں بلکہ علی کا ایک ماتحت ساتھی ہی سمجھے ہوئے تھا۔ یوں علی بھی اسی اعلیٰ طرفی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"نواب زادہ صاحب! آپ کا یوں میرے احترام میں کھڑے ہونا مجھے شرمندہ کرتا ہے۔"

"گھر نہیں۔" اقبال خان بولا۔ "میں یہاں صرف آپ کا ایک ماتحت ساتھی ہوں اور آپ کا ہر حکم بجالانا میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ آپ راجا پر تاب کمار سے ملنے گئے تھے، کیا کہا انہوں نے آپ کے تحفظات اور خدشات کے بارے میں؟"

اقبال خان نے دانستہ موضوع بدل دیا۔ علی نے ایک گہری ہکاری خارج کی اور فرش کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اقبال بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جب میں وہاں پہنچا تو ان کا سینا پتی موج سگھ بھی وہاں پہلے سے... موجود تھا۔ میں نے اس کی ناراضی کی پروا

کے بغیر راجا پر تاب کمار سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جب تک فرنگی افواج کوہ شمالیہ کی سرحدوں میں موجود ہے، ہمیں ہر حال ان سے جنگ کا خطرہ رہے گا۔" علی نے بتایا۔

"دوران گفتگو مجھے احساس ہوا کہ راجا پر تاب کمار بھی کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا کیونکہ جب میں نے اس کے ایک سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ ان کا سینا پتی موج سگھ فرنگیوں کی پسیا پتی کو جگھے ہوئے ہے اور میری کیا بات کو خاطر میں نہیں لارہا ہے تو پر تاب کمار نے کچھ تکنیکی نظروں سے اپنے سامنے کھڑے سینا پتی کو گھوڑا، خیر لید میں انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے خدشات پر صاف کرتے ہوئے اپنے سینا پتی موج سگھ کو حکم دے ڈالا کہ اتحادی افواج کے سالار کے مشوروں پر آئندہ حرف بہ حرف عمل کیا جائے۔" علی اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔

اقبال خان خاموشی سے چند منے کے لیے کچھ سوچتا رہا۔ علی بھی اس درمیان میں چپ رہا لیکن اسے بدستور سوچنا پانچر بھی کی مسکراہٹ سے بولا۔

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟"

"آں..... ہاں!" وہ جیسے خیالات کے بہنور سے ابھرا۔ "مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ ہماری فکری منصوبہ بندی اور چالوں کو کوئی اندر کا آدمی سبوتا کر کے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کیا یہ اندر کا آدمی ہم میں سے ہے؟" علی نے سوال کیا۔

"ایسا لگتا تو نہیں لیکن زیادہ شبہ مجھے ناکہ دی فوج کا ہے۔"

"آپ کے شبہ کی کوئی ٹھوس وجہ؟"

"میں ابتدا سے ہی یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔"

اقبال نے کہا۔ "ہماری جنگی چالیں جب کامیاب ہونے لگتی ہیں تو اس کے آگے روڑے لگائے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو ایسا ہی لگتا تھا مجھے کہ اختلافت رواجی سے ہیں لیکن ہر بار جب ایسا ہونے لگتا تو ذہن کا ٹھکانا لازمی ہو جاتا ہے۔"

علی بھروسے کیلئے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اقبال اسے ایک ذریعہ دماغ آدمی لگا، جس کا ذہن اندر کی اور گہری بات پر گھسنے کا ہنر جانتا تھا۔

"ابتدا میں جب ہم دشمن پر جوابی حملہ کر رہے تھے تو وہ اتنا موثر نہیں ہو پا رہا تھا، اگر یہی حال رہتا تو دشمن اب تک ناکہ رہتا، بعض ہو چکا ہوتا لیکن تم نے فوراً جواب لیا کہ خرابی اتحادی افواج کی طرف سے تھی۔ تم نے فوراً اپنا گھوڑا بھگا دیا اور موج سگھ کے پاس پہنچے۔ بقول تمہارے وہ خرمستی

کے عالم میں اپنے خیمے میں موجود تھا۔ اسے آخر کس بات کی تسلی تھی؟ لیکن تمہاری بات پر اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور ہمارے ساتھ مل کر انہوں نے دوسری جانب سے فرنگی افواج پر بھرپور حملہ کیا تو بات بنی۔ اب دوبارہ وہی ہونے جا رہا تھا، یعنی دفاع کی جیت کوچ جگھے ہوئے تھے یہ لوگ..... حالانکہ تم نے موج سگھ کو اپنی تشویش سے بھی آگاہ کیا مگر وہ تو اپنی جگہ سے جلد راجا پر تاب کمار تک پہنچا کر اپنا سینہ بھلا نا چاہتا تھا۔ تم وہاں پہنچے تو وہی ہوا۔ بات ہماری ہی درست تسلیم کی گئی۔"

یہ ساری صراحت سن کر علی بھی ہونٹوں میں انگلی داب کر رہ گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے اس طرح کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے... شکر سے لہجہ میں اقبال سے مخاطب ہوا۔

"اقبال صاحب! تو آپ کا مطلب ہے کہ دشمن کا کوئی غدار یا جاسوس ہماری منوں میں موجود ہے؟"

"ہماری منوں میں نہیں، موج سگھ کی صف میں۔"

اقبال خان نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ اس کا کوئی بہت ہی قریبی ساتھی ہے سینا پتی جس کی بات کو بھٹاتا نہیں ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"اس غدار کا کھوج لگانا لازمی ہے، ورنہ فرنگی اسے خریدنے میں دیر نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر....." بالا فری نے فیصلہ کر لیے جس میں کہا۔ "میں ابھی ایک ہوشیار اور مستعد آدمی کو موج سگھ کے پاس بھیجے گا بندوبست کرتا ہوں۔"

"آپ صرف میدان جنگ کی حکمت عملی اور اس پر نگاہ رکھیں، یہ کام میرے لیے چھوڑ دیں۔" اقبال خان نے تدریس سے کہا۔ "اب آئندہ آپ کی کیا حکمت عملی ہے؟"

علی نے ایک دہی نقشہ قلعین پر پھیلادیا اور اقبال خان کو کچھ بتانے لگا۔

جنگی حکمت عملی تیار ہوتے ہی علی نے دشمن کے "تین حدے" پر واقع جنگی میں یکم پر ہلا بول دیا۔ اتحادی افواج اور ناکہ کی فوج نے، شکست کا حکم کرنے والے فرنگی دشمنوں کے نہ صرف چکے چھڑا دیے بلکہ ان کے دواہم افسروں کو قیدی بھی بنالیا۔ بچی نہیں بلکہ مال غنیمت کے طور پر کئی سارا اسلحہ بشمول توپیں ان کے ہاتھ لگیں۔ یہ سارا سامان علی نے جنگی قیدیوں سمیت اپنے قبضے میں کر لیا۔ اور پھر گورام کاغدا راجا جاسوس آتما شکہ جو تواتر اپنی ناپاک کوششوں میں اب تک ناکامی کا ہی منہ دیکھ رہا تھا،

جہانگیر بکس

450/-	انسان اور یوتا	475/-	معظم علی	550/-	آخری معرکہ	550/-	آخری معرکہ
300/-	پاکستان سے دیوار تک	550/-	خاک اور خون	500/-	گمشدہ قافلے	300/-	ثقافت کی تلاش
450/-	آخری چٹان	450/-	کلیسا اور آگ	599/-	قافلہ حجاز	625/-	قیصر و کسریٰ
225/-	سوسال احمد	425/-	محمد بن قاسم	300/-	پورس کے ہاتھی		
325/-	سفید جزیرہ						
475/-	شاہین						

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

550/-	اورنگزادہ ٹوٹ گئی	550/-	آخری معرکہ
500/-	گمشدہ قافلے	300/-	ثقافت کی تلاش
599/-	قافلہ حجاز	625/-	قیصر و کسریٰ
425/-	محمد بن قاسم		
300/-	پورس کے ہاتھی		

اپنے ”گورے“ آقاؤں کی شکست پر تھلا گیا لیکن ہندی کبھی کی طرح اس نے بھی شریہا نے کا موع و صومند ہی لیا۔ اس شاندار راج کے بعد و فوراً سینا پتی موج شکھ کے کان بھرنے جا بیٹھا۔

”یہ کیا بات ہوئی مہاشے جی..... فتح ہماری اور مال نیست سارا اتحادی فوجی سمیت کر چلے ہے؟“

موج شکھ اس وقت فتح کے جشن کی تیاری کے انتظامات کروا رہا تھا۔ بے گری سے بولا۔

”تو کیا ہوا شکھ جی! لے جانے دو..... ہمارے پاس بھگوان کی کرپاے سب کچھ ہے۔ ہم ان غاصب فرگیوں سے اپنی دھرتی بچانے میں کامیاب ہو گئے، یہی ہمارے لیے بہت ہے۔“

”پر تو مہاشے جی! اس جنگ میں ہم بھی تو برابر کے شریک تھے..... ہمارا بھی تو حق بنتا ہے؟“

موج شکھ فطرتاً ہی ایک مثبت ذہنیت کا آدمی تھا۔ وہ کسی کے ہر کلمے میں کم ہی آتا تھا۔ باقی روایتی انسانوں کی طرح اس کی بھی کچھ کمزوریاں تھیں۔ وہ تھوڑا بے پروا اور تساہل پسند تھا مگر سوچہ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا نائب آتما شکھ ایک فضول سی بحث چھیڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کا یہ ”فضول“ سی بحث چھیڑنے کا اصل مقصد کیا تھا؟ تاہم وہ بولا۔

”شکھ جی! اب چھوڑو ان باتوں کو..... ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، یہ کیا کم ہے؟ اب ہم چند لوگوں کے مال نیست پر انہیں میں ہی لڑ پڑیں۔ میری بات تو چھوڑو خود راجا پر تاب نہ مار اس بات کو سخت ناپسند کریں گے۔ اسی لیے تم اپنا دار مار نہ کھاؤ اور جیت کے جشن کے مزے اڑاؤ۔“

آتما شکھ اس جواب پر اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ ہو جاتی تو کہیں نہ کہیں نا کامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اسے اب یہ ڈر ہونے لگا تھا کہ وہ بچھوڑا م کو کیا جواب دے گا؟

☆☆☆

شوکی کو ہوش آیا تو وہ ایک دم بڑبڑا سا گیا۔ اس کے گرد کالی گھپ تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کہیں وہ اس جہان سے ہی تو نہیں سدھار گیا۔ اس کی تصدیق کے لیے اس نے اپنے جسم کو چھوا اور اسے حرکت دی۔ درد کی نہیں اس کے وجود میں اتنی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے خود کو ایک کھال کے بستر پر پایا تھا۔ پھر اسے روشنی دکھائی دی۔ وہ کھڑا ہوا تو اس کا سر کسی مٹی کی مجسمت سے ٹکرایا۔ اس کے

حلق سے کراہ سی نکل گئی۔ وہ جھکے جھکے انداز میں روشنی کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اندھیری اور ٹھک گھبرا کے اندر موہ جاتا تھا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔

عالم بے ہوشی سے اس کا ذہن دھیرے دھیرے بیدار ہوا تو اسے بالترتیب سب یاد آ چلا گیا۔ کیسے وہ رینا کی تلاش میں کالی کے مندر تک پہنچا اور وہاں اس کا اور اس کا بکا رہا بیماری بدری کا تھکا کا خون تیز آ رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں بدری کا تھکا اپنی ہی کسی شیطانی قوت کے زیرِ عتاب آ کر اچانک نہیں غائب ہو گیا۔ مندر بھی تباہ ہو گیا تھا اور رینا.....؟

”وہ کہاں گئی؟“

رینا کا خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس کے سامنے آئی تھی، ایک تو قاتی گھی اور دوسری اصلی، جبکہ اصلی والی صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی اور پھر اسے بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ کالی کا مندر گھنٹہ بھر چکا تھا مگر یہ کون سی جگہ تھی؟ اسے یہاں کون لایا تھا؟

وہ اب اپنے متعلق سوچنے لگا۔ تب اس نے شک و تاریکی کی گھما سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ باہر تیز اور بریلی کاٹ دار ہوا میں چل رہی تھیں۔ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ وقت دن کا ہی تھا مگر شاید آسمان پر چھائے گہرے بادلوں اور کالی گھٹاؤں نے ہلکے ہلکے اندھیرے کا سماں پیدا کر رکھا تھا لیکن پھر بھی وہ ہمت کر کے گھما کے سرے تک آیا اور جب باہر نکلا تو دیکھا تو بری طرح دہل کر رہ گیا۔ اگر وہ جلدی سے پیچھے کو نہ ہٹ جاتا تو کئی سو فیٹ کی بلندی سے نیچے بریلی چٹانوں میں جا کر تباہ کالی کے مندر کے بعد شوکی کے لیے یہ ایک نیا ”اسرار“ تھا مگر اسے سمجھنے سے بھی ہنوز قاصر ہی تھا۔

بدری کا تھکا سے خونخیزی مقابلے اور ایک طرح سے اس موذی مردود شیطانی کو شکست دینے کے بعد وہ خود بھی زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے رینا کی گمراہی تھی۔

اس کا جانے کیا سفر ہوا ہوگا؟ وہ جلد سے جلد اسے تلاش کر کے اس کی خبریت جانتا چاہتا تھا لیکن اپنے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا تھا اور وہ بھی اتنی بلندی پر واقع غار کے اندر.....؟ کون اسے یہاں اٹھا کر لایا تھا اور کیوں؟

وہ ہمت کر کے پھر غار کے سرے تک گیا۔ تاہم اب وہ دیوار سے چپکا ہوا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھا تھا کہ کہیں باہر تیز بریلی کاٹ دار ہوا میں اسے..... نیچے دھکیلتے



ادولفت

(جامعہ شریعت)

مفتی محمد رفیع الرحمن صاحب مدظلہ العالی

جہانگیر بک ڈپو

سبق آموز کتب سلسلہ



- 165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ
- 165/- اقوال امیر کرام
- 195/- حکایات گشتان سعدی
- 140/- اقوال شخص سعدی
- 180/- حکایات رونی
- 170/- دلچسپ و عجیب حقائق
- 199/- حکایات بوستان سعدی
- 150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں
- 180/- ایمان افروز سبق آموز سچے واقعات
- 165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

کی کوشش نہ کریں۔ اس نے بچے اور پھر سامنے دیکھا پھر دائیں بائیں۔ اسے اپنے گرد و پیش میں کسی مفید شے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کسی بلند ترین پہاڑی سلسلے کے ایک غار کے اندر موجود ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی اونچائی پر لایا گیا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کیا اور اب اسے لانے والا خود کہاں غائب تھا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ اس سارے پراسرار کھیل میں اس مفید رہی نمائش کو فراموش کر گیا تھا جس نے مہاجر بادی بدری ناتھ سے لڑائی کے دوران اس کی کئی خطرناک مرحلوں میں مدد کی تھی۔ یہی نہیں، بدری ناتھ کے شیطانی حربوں کو بھی یاد کر ڈالتا تھا۔ پراسرار گڈے کی مورلی، اس کا بدری ناتھ کے روپ میں آنا اور اسی کو علت ملامت کرنا۔ اس کو بڑی کی وہ بات بھی اسے یاد آگئی جو اس نے بڑے غیظ میں بھی کہی تھی کہ اس کی وجہ سے کالی کے مندر میں ایک اور ایسی ہستی بھی آگئی تھی جو ان کی سب سے بڑی دشمن تھی۔

وہ ہستی کون تھی؟ شوکی سوچنے لگا۔ کہیں وہی تو اسے یہاں لے کر نہیں آئی تھی؟ اس کے اندر طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے لیکن پھر رینا کا خیال پریشان کرنے لگا تو اس نے انہیں ذہن سے جھٹکا اور صرف رینا کے حلق ہی سوچنے لگا۔

وہ اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ حرکت کرنا جانتا تھا۔ چلا بیٹھنا اسے کہاں آتا تھا۔ اس کی فطرت میں ہی کھوجنا اور آگے بڑھنے کا عنصر غالب تھا۔ لہذا اس نے یہاں سے نکلنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

اس بار اس نے سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا۔ وہ کسی جلدی بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے قدم بڑھائے۔ کھال کا بستر اٹھایا۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ اس نے اپنے جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ اب اسے سردی کا احساس کم ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ غار کے سرے پر پہنچا۔

کوتی برف پوش پہاڑی وادی تھی۔ وہ فکر مند ہونے لگا کہ نہ جانے وہ اپنے اصل مقام و منزل سے کتنی دور یہاں لاکر پہنچ گیا تھا لیکن اب تو وہ مطمئن تھا کیونکہ اس نے عزم کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر رہے گا۔

غار کے دہانے پر آکر اس نے تھوڑا سا جھک کر

دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں جانب اسے ایک سفید پہاڑی بکرا نظر آیا جو اپنے چاروں کھربڑی چٹائی دیواروں کے رخنوں میں پھنسائے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شوکی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

اس نے ایک چو پائے کو اس طرح چٹائی دیواروں پر چلنے دیکھا تو سوچا کہ وہ تو انسان ہے، اس کے لیے کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اس نے حوصلہ پکڑا اور اندھا کا نام لے کر ایک پاؤں نیچے رکھا۔ پاؤں تھوڑا پنا، وہ سنبھلا پھر آگے کو بڑھا۔..... ذرا پھسلا، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا توازن برقرار رکھا اور اب تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ غار سے باہر تھا۔

اب اس کے نیچے لاجورد و خطرناک برفیلی۔۔۔ گہرائیاں تھیں۔ یعنی اگر اس کا پاؤں پھسل جاتا تو وہ نیچے ان ابھری ہوئی ٹوکوں میں پرودیا جاتا۔ ایسی خوفناک موت کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا مگر اس نے بہت نہیں ہاری اور اسی طرح چٹائی دیواروں کا سہارا لیے وہ دوسرے دھڑے آگے بڑھتا رہا۔

دفعاً نجانے کیا ہوا کہ وہی پہاڑی بکرا بدکا برف کے سنگ ریزے اس کے کھروں کے نیچے سے پھسلے اور اتھاہ گہرائیوں میں جا لٹکے۔ بکرے نے جب لگائی تھی۔ اس کے دو بڑے بڑے سینک خاصے نکلیے تھے۔

اس نے شوکی کو کھردرے ماری۔ شوکی کا لہو خشک ہو گیا۔ اس نے ایک گھروسی طرح سہ لگی مگر جانتا تھا کہ اگلی نکر وہ نہیں سہ پائے گا۔ لہذا اس نے بکرے کو پہلے ہٹکارے دیے پھر اسے پچکارے کی کوشش کرنے لگا، لیکن بکرہ بھی ایک ڈیلا تھا، وہ اپنی عمل داری میں شوکی کو بالکل پسند نہیں کر رہا تھا۔

اس نے دوسری نگر رسید کی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے تھوچنے سے..... مخصوص آواز بھی نکالی۔

شوکی کا ایک ہاتھ چٹائی رخنے سے نکل گیا۔ شوکی مڑتے مڑتے بچا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن لگا۔ وہ چچھٹانے لگا کہ اس کی بیروی کرنے سے پہلے وہ اس بکرے کو آگے نکل جانے دیتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ واپس اپنے غار کی جانب بھی نہیں پلٹ سکتا تھا۔ نہ وہی بکرے پر کسی قسم کے حملے کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

بکرے نے تاک کر ایک اور زوردار نکر اسے رسید کی۔ شوکی کے حلق سے مارے خوف کے چیخ خارج ہو گئی

رنگ آسمان

کیونکہ شوکی کے دونوں ہاتھ چھوٹ گئے تھے۔ ایک پاؤں بھی رہ پٹ گیا تھا۔..... وہ بلندی سے نیچے آ رہا تھا اور سیدھا کی سوئفٹ کی گہرائیوں میں گرنے لگا تھا۔ اتنی بلندی سے گرنے کا مطلب اس کی دردناک موت تھا۔ شوکی نے دردناک موت کے تصور کے باعث اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کے تیزی سے نیچے کھائی میں گرتے وجود کو کسی نے تمام لیا ہو۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے کوئی نظر نہ آیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہی رہا سفید شے اسے دکھائی دی جواب اپنا جھم پھیلا بھی گئی اور شوکی کے جسم کو گویا اپنے غیر مرئی ہاتھوں کے جھولے میں اٹھا کر دوبارہ اسی غار کے اندر لے آئی تھی۔

شوکی نے دردناک موت سے بچ جانے پر پہلے تو اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اس پراسرار حسن کو دیکھنے لگا، جواب دہرے دھڑے سے سکونے لگا تھا۔

”تت۔۔۔ تم کون ہو؟ بتاتے کیوں نہیں؟ اور..... اور مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟“ اس نے بہت کر کے پوچھ ہی لیا۔ وہ سفید شے اچانک پھر اپنی بہت اور نرم بدلنے لگی اور دوسرے ہی لمحے شوکی کی پھٹی ہوئی آنکھوں نے ایک حیران کن منظر دکھا۔

ایک انتہائی حسین و جمیل عورت اس کے سامنے کھڑی منظر آ رہی تھی۔ شوکی اس کے حسن کی ایک جھلک دیکھ کر اپنی جگہ مہو بہت سا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

پچھورام بدحواس سا ہو رہا تھا۔ اس پر اپنی غیر متوقع ناکامی کے باعث سخت بوکھلاہٹ اور بدحواسی طاری تھی۔ اس نے یہ سارا غصہ آتما شک پر اتارا۔

”نف ہے تم پر..... میدان جنگ میں رہتے ہوئے بھی تم اتنا نہیں کر پائے کہ ہمارے آقاؤں کی شکست کو فتح میں بدل دیتے؟“

آتما شک اس کے سامنے شرمندہ اور چہرہ جھکاے خاموش کھڑا تھا، پھر اسی انداز میں بولا۔

”میں نے تو بہت کوشش کی تھی پر بھلا پر تو ہمارے آقاؤں کی قسمت ہی خراب تھی۔“

”اب کیا ہوگا؟ میں اور تم اسی طرح ہاتھ باندھے ساری عمر راج محل میں گزار دیں گے۔“ پچھورام بولا۔

”تو پہلے ہی یہی کرتے چلے آ رہے تھے پر بھلا اب بھی یہی کریں گے۔ ہم پر کسی نے غداری کا شبر تو نہیں کیا ہے نا.....؟“ آتما شک نے اپنی عقل کے مطابق ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”لغت ہے تم پر، دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ پچھورام جھلا گیا۔ آتما شک اپنا سامنے کر چلا بنا۔ پچھورام اپنے کمرے میں بے چینی سے بیٹھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ نوبائی کے پاس کیا منہ لے کر جائے؟ لیکن جانتا تو تھا ہی۔ لہذا وہ ہمت کر کے وہاں پہنچا۔ اور نوبائی بھی اس کی بے چینی سے متاثر تھی۔

پچھورام جب وہاں پہنچا تو اس نے فوراً پر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پچھورام! تم یقیناً مجھے بدحواسی دینے آئے ہو گے کہ اب ہم سریر آرا حکومت ہونے والے ہیں۔ ہمارے آقا جنگ جیت گئے؟ انہوں نے راج محل پر قبضہ کر لیا؟ اس مورکھ موئے پر تاب کار کو قیدی بنالیا گیا؟ اب میں ناگرہ کے سنگھاسن پر کب براجمان ہوں گی؟ تم..... تم بولتے کیوں نہیں ہو پچھورام..... چپ کیوں کھڑے ہو؟“

”ہمارے آقا (فرنگی) جنگ ہار چکے ہیں نوبائی!“ بالآخر پچھورام نے لٹکے ہوئے منہ سے یہ بری خبر سنائی تو نوبائی کو جیسے سکتہ سا ہو گیا، وہ ایک تک اس کا چہرہ کتنی رہ گئی۔ اسے جیسے پچھورام کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ چلا کر اور اس کا گریبان چھوڑ کر بولی۔

”ی۔ی..... تم کیا کہہ رہے ہو پچھورام؟ یہ..... کیسے ہو سکتا ہے؟ تت..... تو کیا میں ساری عمر اسی طرح..... ناجی لباس پہنے اس شخص قید خانے میں بند رہوں گی؟ نہیں پچھورام..... ہرگز نہیں..... تمہیں حساب دینا ہوگا۔ ان رستہ جگہوں کا جو تم نے میرے ساتھ ناگرہ کے تخت اقتدار کی آس میں گزارے۔ ان غلو توں کا بھی جو تم نے میرے..... ساتھ، ایک مہارانی کی شان اور عزت کو روندتے ہوئے بتائے..... نہیں پچھورام.....! ہرگز نہیں..... تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ مجھے راج محل کے سنگھاسن پر بٹھانا ہوگا، ورنہ..... ورنہ..... میں اب تمہیں بھی نہیں بخشوں گی، میں تو جیسی ہوں ویسی ہی ہوں لیکن تمہیں بھی راج محل میں اتنی آسانی سے زندگی بتانے نہیں دوں گی۔ چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں گی کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ تم کون ہو؟ ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے تم نے غداری جیسے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نہیں

نہیں.....

لیں۔ یاد ہے اس میں آپ اپنی طرف سے کوئی معروف اضافہ (یہاں معروف سے مراد منقہ ہے) کرنا چاہیں تو اس کی خط میں منجانب سے پہلے ہی سے رکھ دی گئی ہے۔
راجا پر تاب کمار نے اپنی بات ختم کر کے خط پہلے نواب شہباز کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پہلے تو حیران حیران سی نظروں سے خط کو دیکھتے رہے، پھر جیسے جیسے وہ اس کی عبارت پڑھتے گئے ان کے چہرے پر جوش کی سرخی آتی چلی گئی۔

پورا خط پڑھ لینے کے بعد ان کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے ایک نگاہ راجا پر تاب پر ڈالی اور ہولے ہولے اپنے سر کو ہنسی انداز میں جنبش دیتے ہوئے وہ خط مہاراجا مہندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ ان کے بعد خط علی اور اقبال خان کو بھی پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ سب سے آخر میں ان کے مشیروں نے بھی خط پڑھا۔
اس خط کی عبارت یہ تھی.....

”عزت مآب ملکہ عالیہ ایک معاہدے کے تحت ہندوستان کی جو آزاد ریاستیں ہیں اور جو اپنی اپنی عملی داری میں اپنے داخلی و خارجی مسائل کے لیے خود مختار رہیں اور ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کی غیر مشروط و قادیاری کا دم بھی بھرتی ہیں، ان پر کبھی کے چاہوں نے ایک اور بلا جو آزاد و حاویاں دیا۔ ایک وقت میں ریاستوں ناگرہ پالن پورا در تریپال پر حملہ کیا اور عام لوگوں پر ویشیانا گولہ باری کی گئی۔

”ان کا مقصد محض ریاستوں کے خزانوں، ذاتی جائیداد اور دولت پر قبضے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے خیال میں اس بڑا داپالسی کے باعث ان معزول حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ریاست کے عوام میں بھی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور غم و غصے کے جذبات ابھرے ہیں۔ اسی طرح ماضی میں راجا مجور کے گل میں گھس کر راجا کی مامریاست اور ذاتی جائیداد اور دولت پر قبضہ کر کے انہیں ہر چیز سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ جہانگیری کی رائی کو معزول کرنے کا بھی ذبردست راجا سامنے آیا تھا، کیونکہ کشی پالی عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ لہذا میں ملکہ عالیہ کی حکومت کے اعلیٰ حکام کو خبردار کرتا ہوں کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے احمق و فسران (گورنروں کی کاسٹوفر، جنرل مانگیل شاہ، ڈان کیرمور وغیرہ) کی یہ پالیسی جاری رہی تو اس سے انگریزوں کے مفادات کو سخت

لیکن ابھی اس عظیم تقریب کا اصل مقصد باقی ہے۔“
راجا پر تاب کمار اتنا کہہ کر کہ سب لوگ حیرانی اور کچھ الجھی ہوئی نظروں سے راجا کا چہرہ دیکھنے لگے۔
”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے صرف چار معزز افراد کے ساتھ ایک الگ نشست کا بندوبست کیا ہے جو ذرا سنجیدہ نوعیت کی ہے اور اہم بھی..... کیونکہ یہ موقع بھی ایسا ہے کہ ہم سب یہاں ایک چھتری تلے ”دو دو ہیں۔“

اس کے بعد راجا پر تاب نے پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ، تریپال کے نواب شہباز خان، ان کے بیٹے اقبال خان اور علی رحمان کو اس آخری نشست گاہ میں آنے کی دعوت دی۔
البتہ راجا پر تاب نے بالخصوص مہاراجا مہندر سنگھ اور نواب صاحب سے اپنے چند ایک مشیروں کو بھی ساتھ لانے کا کہہ دیا تھا۔

نواب صاحب نے تو کسی مشیر کو ساتھ نہیں لیا، اگرچہ ان کے بھی خدام اور مصاحبین و مشیر ساتھ آئے تھے مگر علی اور اپنے بیٹے اقبال کی موجودگی میں انہیں ان کی چنداں ضرورت نہیں پڑی تھی۔ البتہ مہندر سنگھ نے دو مشیر اپنے ساتھ کر لیے تھے۔

یہ نشست ایک شاہانہ کمرے میں طے پائی تھی۔ وہاں کھانے پینے سے متعلق کسی بھی قسم کے لوازمات نہیں تھے۔ صرف تخت نما چڑنی آرام دہ نشستیں تھیں، جن پر دلکش..... بستر بچے ہوئے تھے۔ نقین اور سونے کی کڑھالی کے ہوئے گاؤں بھی ان پر دھرے پڑے تھے۔

پر تاب کمار کے ہمراہ بھی صرف ان کا ایک ہی مشیر خاص، سترام داس موجود تھا۔

”اختیارے کے دوران میں اب ایک مختصری تجویز اپنے بھی خواہوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔“ راجا پر تاب نے کہنا شروع کیا۔ پانی سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر اس نے اپنے ساتھ بیٹھے سترام داس کی طرف دیکھا اور مخصوص انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تو اس نے فوراً اپنے لباس سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر سب کے سامنے پھیلا دیا۔

سب کی نظریں اب راجا پر تاب کمار سے ہٹ کر اس کاغذ پر جم کر رہ گئی تھیں۔

”یہ وہ خط ہے جو میں نے انگلستان ملکہ عالیہ کو روانہ کرنا ہے۔ آپ پہلے اسے باری باری پڑھ

کھلا دے۔ اسی لیے اس نے سوچا کہ ابھی شیورائے سے جا کر ملنا قبل از وقت ہوگا۔ اسے کچھ دن بعد روانہ ہونا چاہیے۔ جب تک ”یہاں“ اور ”وہاں“ کی صورت حال کچھ واضح نہیں ہو جاتی۔

تاہم اس نے دل میں تجویز کر لیا تھا کہ وہ اب نجو بانی کی تجویز گاہ کارخ..... نہیں کرے گا، یوں بھی اب وہاں اس کے جانے کا کوئی جواز..... کب بچا تھا.....؟

☆☆☆

اتحادی افواج کو ناگرہ کے راج محل میں فتح کے جشن میں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔

تریپال کے نواب شہباز خان نے علی کو فریاد جہاں سے اپنے محلے سے لگایا تھا۔ پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ نے بھی علی کو خراج تحسین پیش کیا تھا کیونکہ ناگرہ کے راجا پر تاب کمار نے علی الاطلاق اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ اس جنگ کی عظیم فتح کا سہرا علی رحمان کے سر جاتا ہے، اس نے اپنی بہترین جنگی حکمت عملی اور بہادری سے فرنگیوں کو مہرت ناک شکست سے دوچار کیا تھا۔

غرضیکہ راج محل میں ان سب کی بڑی آؤ بھٹت ہوئی۔ فتح کی اس عظیم الشان تقریب میں تریپال اور پالن پور کے نواب اور مہاراجا، ان کے خاندان کے افراد نیز مشیر، مصاحبین وغیرہ..... سب ہی موجود تھے۔

راجا پر تاب کمار نے راج محل میں ہی اس جشن والی تقریب کا شاندار اہتمام کیا تھا جبکہ پوری ریاست کے محل کوچوں میں بھی راجا کی طرف سے لوگوں کو انواع و اقسام کے کھانے، نواکھات (فروٹ وغیرہ) اور مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں۔

عصر کے وقت سے شروع ہونے والی یہ پزدکار تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔

یوں تقریب جب اہتمام کو پہنچنے لگی تو راجا پر تاب کمار نے مدعوین خاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میرے معزز، دوست احباب اور میرے ہم عصر سریر آرا ساتھیو! ہمارے بے مثال اتحاد نے آج کی گنا زیادہ طاقت رکھنے والے فرنگی دشمنوں کے دانت کھٹے کر ڈالے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ عظیم الشان ریاستی یکجہتی ہمیشہ اسی طرح قائم و دائم رہے گی۔“ اتنا خطاب کر کے راجا پر تاب ڈرار کا اور پھر کہنا شروع ہوا۔

”یوں تو ہم نے یہ جشن فتح کی خوشی میں منایا ہے،

پچھورام! میں اتنی آسانی سے تمہیں یہاں کے پیش نہیں کرنے دوں گی۔ یا پھر تم ہمیشہ کے لیے راج محل چھوڑ کر دور نکل جاؤ..... اتنی دور کہ میں تمہارا سایہ بھی دوبارہ یہاں نہ دیکھوں۔“

سب سب کہتے کہتے نجو بانی بری طرح ہانپ گئی۔ وہ غصے اور غم کے مارے کانپنے لگی تھی۔ اس میں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

وہ بہ مشکل ایک نشست کی پشت گاہ کا سہارا لے کر اس پر ڈھسے جانے کے انداز میں گری گئی۔ وہ از حد دل گرفتہ اور مایوس ہو رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو پچھورام، جواب میں چیخے نہیں ہتا لیکن اب معاملہ اور ہو چلا تھا۔ اس نے ٹھوڑی دیر تک دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس کے بعد جب اس نے نجو بانی کو ٹھہر ٹھہر کر سانس لینے پایا تو بولا۔

”نجو بانی! آپ کا میرے لیے جو حکم ہو میں اس کے لیے دست بستہ تیار ہوں۔ اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں جنگ کی راہ لیتا ہوں۔“ پچھورام کا لہجہ ایک دم سوز دہانہ ہو گیا تھا۔ وہ مزید بولا۔

”پر تو ایک بات بتائے دیتے ہیں نجو بانی! آپ بہت جلد زاراش ہو گئی ہیں۔ جنگ میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے۔ پر تو میں کل ہی دہلی جا کر ہوکر صاحب سے ایک ملاقات کروں گا اور اس وقت تک وہاں نہیں لوٹوں گا جب تک کہ کوئی نئی اور اہم خبر نہ آجائے..... آگے آپ کا جو حکم ہو۔“ وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے چپ ہو رہا۔

”ہمارا اب کچھ بھی کہنے کو سن نہیں جا رہا ہے پچھورام! بس ہمیں تنہا چھوڑ دو۔“ نجو بانی نے ایک ہاتھ کھڑا کیا اور اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا کیے بغیر اس سے کہا۔ پچھورام خاموشی سے وہاں ہی پلٹ گیا۔

اپنے اقامتی گوشے میں آکر وہ عجیب عجیبے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیونکہ نجو بانی نے اسے کوئی مسکت جواب نہیں دیا تھا۔ پچھورام کو اس کی مایوسی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں نجو بانی دل شکنہ اور مایوس ہو کر راج محل میں اس کا بھانڈا نہ چھوڑ دے۔

کہنے کو تو وہ نجو بانی سے یہ کہہ آیا تھا کہ وہ اگلے دن صبح سویرے شیورائے ہوکر سارے ملے نکل جائے گا تاکہ فرنگیوں کی طرف سے نئی صورت حال کا علم ہو سکے لیکن اب وہ ڈر رہا تھا کہ نجو بانی جیسے سے اس کے خلاف کوئی عمل نہ

ہنسنا سہری لکھت



موسم کی بدلتی صورتیں

اکتوبر کے شمارے کی کتابتیں

اولین صفحات

خود اعتمادی کا مہابی کی کتنی ہے جس کے ذریعے ہر منزل پر پہنچا جاسکتا ہے۔ ایک ہم ہمت شخص کی داستان حیات، **کاشف زبیر** کے قلم سے.....

انگاریے

دشمنوں کے قتلے میں اپنی اعصاب کے ہانک چھینکے کا امتحان، محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتی **ظاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گز

پلچھلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سسر گزشت.....

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سہری کے رنگ

جرائم کی دنیا سے شلک ہو جانے والی کاہلرت اگنیتر ماجرا

مسائل و مصائب سے بھرا کے غلط راہوں کا انتخاب کرنے والوں کا انجام

جیتی لکھت چیتی

آپ کے تہمتے... مشورے... نکلتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

بے سدھ ایک کمرے میں پڑے ہوئے کسی خادم نے دیکھا تھا۔ چونکہ یہ راج محل کے مہانوں میں سے تھے اور انہی لوگ جانتے تھے کہ یہ رینا کے حوالے سے راجا پر تاب کے خاص مہانوں میں سے ہیں۔ اسی لیے اسے اس میں لانے کی تنگ دودھ کی جانے لگی۔

شاہی ویدوں اور حکیموں نے گارشیا کا بیلا پڑنا چہرہ اور گردن کے گرد پڑے نعل، جواہریوں کے تھے، دیکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ اسے گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی گئی تھی مگر شاید ”مارنے والا“ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا اسی لیے اس نے ادھ سوا کر کے گارشیا کے جسم کو چھوڑ دیا تھا۔

تھوڑی کوششوں سے گارشیا کو ہوش آگیا مگر گلے کی دھن کی وجہ سے وہ ابھی بات کرنے سے قاصر تھی۔ لہذا اسے آرام کرنے دیا گیا۔

گارشیا نے پہلے تو دل ہی دل میں اپنی جان بچ جانے کی خوشی محسوس کی، اس کے بعد اس کے پورے وجود میں اپنے خود غرض اور سفاک بھائی رابرٹ کے لیے نفرت کی لہریں دوڑ گئیں جس نے اس کے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ رابرٹ سے انتقام لے لے گی جو اسے اپنی طرف سے ماری چکا تھا۔ اب وہ کیوں اس سے رعایت برتے؟

وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ سب کے سامنے یہ انکشاف کرے گی کہ..... رابرٹ، راجکاری سوچنا کو بیٹنی زور و جوار اور نادانوں کے ساتھ یہاں سے بھاگ لے گیا ہے تو راجا پر تاب کمار پر کیا گزرسے گی.....؟ اسے

جلد سے جلد یہ حقیقت بتا دینی چاہیے تاکہ رابرٹ کو ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہی گرفت میں لے لیا جائے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بچنے کے لیے اسے جلد سے جلد ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہی گرفت میں لے لیا جائے تاکہ وہ معافی اور سنگین جرم کی کس قدر سخت سزا مل سکی۔ البتہ سوچنا کے خاموش غیاب کا ابھی تک کسی کو پتا نہ چلا تھا۔

اور رینا کی حالت بھی کم غیر نہ تھی۔ شوکی کو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولی تھی۔

راجا پر تاب اس درمیان میں تقریب وغیرہ کے سلسلے میں مصروف رہا تھا۔ رینا کی بھوری نگاہوں کے سامنے بار بار شوکی کا چہرہ دکھانے لگا تھا۔

رینا سے وہ دل خراش منظر بھلائے نہیں بھولتا تھا جب اس نے نیم دا آنکھوں سے اپنے دیوانے محبوب کو

تاکہ اپنا بھی پیٹ بھر سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب اس گوری چڑی والی فرخمن رینا کی وجہ سے ہے اور راجا اس کے عشق میں کوڑوں کوڑوں اتر چکا ہے۔ وہ سنے راجا کو اس کے ”اثر“ سے بھی لگنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے دودی باتیں ذہن میں رکھی تھیں، پہلی تو یہ کہ رینا کو گلے سے ہی نہیں ناگہ سے بھی بے دخل کر دیا جائے مگر کچھ ذریعہ دماغ اور ابن الوقت نوکر شاہی نے اس خیال کو رد کر دیا اور کہا گیا کہ رینا کی شادی راجا پر تاب سے ہو جانی چاہیے۔ جب ہی ان کے دماغ سے عشق کا بھوت اتر سکا ہے اور وہ ”دوسری طرف“ بھی متوجہ ہو سکتے ہیں۔ آخر کو ان کی رگوں میں بھی ایک مہاراجا کا خون گردش کر رہا تھا۔ شرب و شباب جن کا ہمیشہ سے دھیرہ رہا ہے۔

بہر کیف..... پہلے اس خط پر نواب شہباز خان کی مہر لگائی گئی اس کے بعد مہاراجا مہندر سنگھ اور راجا پر تاب کمار کی بھی شاہی مہر اس خط میں ثبت کر کے خط برطانیہ ملکہ عالیہ کی طرف بذریعہ فرستادہ روانہ کر دیا گیا۔

پہلے پہل اس اہم خط کو ملکہ تک پہنچانے کے لیے شاہی نیا خانے کا استعمال مل میں لایا جانے والا تھا مگر پھر موجودہ حالات میں اس خط کے مضمون کے افشا ہونے کا احتمال محسوس کرتے ہوئے اسے دستی طور پر روانہ کرنے کا حتمی فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے لیے راج محل کے ایک پرانے اور وفادار شخص کا انتخاب کیا گیا۔

اسے منتخب کرنے والے راجا پر تاب کے مشیر..... اور ان کے سربراہ سترام داس نے اس نام کی حتمی اور باضابطہ طور پر منظوری دے دی تھی۔ نیز اسے راز میں بھی رکھا گیا تھا۔ البتہ بیٹنی سوچ سنگھ کو اس کا علم تھا اور اس کے ذریعے آتش فشاں کو بھی پتا لگ گیا۔ یہ بات پچھو رام تک بھی پہنچا لازمی تھی کیونکہ آتش فشاں اسی کا خام آدی اور خداداد جاسوس تھا۔

پچھو رام کا دل خوشی سے جلیوں اچھل پڑا اور وہ اپنی فراست پر خود ہی فخر سے لبک اٹھا کہ شیورائے بھوکر سے ملنے میں جلد بازی سے کام نہ لے کر ایک سنہری موقع اس کے ہاتھ آگیا تھا لہذا وہ شاہی خفیہ ایجنسی کی روانگی سے ایک دن پہلے ہی خاموشی سے شیورائے بھوکر سے ملنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا کیونکہ وہ ان دنوں وہیں تھا۔

☆☆☆

راج محل میں شوریج کیا۔ گارشیا کو سب سے پہلے

نقصان پہنچے گا اور ملکہ عالیہ کی حکومت ہندوستان میں غیر مقبول اور عدم استحکام کا شکار ہوگی، کیونکہ اس طرح کسی ملک کے عوام کے ساتھ ظلم و نا انصافی کا سلوک کر کے ان پر زیادہ دیر حکومت نہیں کی جاسکتی۔

”غیر سگالی کے طور پر برٹش آرمی کے دو اہم جنگی قیدی کرنل ایڈرمن اور میجر ڈی فارست کو ہم رہا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

”ہاں! ساتھ ہی ملکہ عالیہ کی خدمت میں، میں ریاست ناگہ کا نواب راجا پر تاب کمار، اپنے دو پڑوسی ریاستی حکمرانوں تریبال کے نواب شہباز خان اور پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ، جنہیں عزت آباد کی طرف سے سرکاری طور پر ”راجا“ اور ”مہاراجا“ کی تسلیم شدہ حیثیت کی مہر بھی جاری کی گئیں، ان کی ترمیمی کرتا ہوں، ثبوت کے طور پر مذکورہ حکمرانوں کی مہریں خط میں ثبت ہیں۔“

”خط آپ نے پڑھ لیا۔ اب میں آپ دوستوں کی رائے لینا چاہوں گا۔“ راجا پر تاب کمار نے آخر میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نفست گاہ میں چند تانے کے لیے سمجھیری خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ماسوائے علی رحمان کے سب نے متفقہ طور پر اس خط کو موجودہ غیر یقینی حالات کے عین مطابق قرار دے کر اسے معروریت کی سند عطا کر ڈالی۔

علی کے خیال میں راجا پر تاب کمار کا یوں براہ راست ملکہ عالیہ سے مخاطب ہونا مناسب نہ تھا۔ اس میں سازش کا احتمال ہو سکتا تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ اپنے اس خیال کی اس کے پاس سر دست کوئی ٹھوس توجیہ بھی نہ تھی اسی لیے وہ خاموش ہی رہا۔

اس کے بعد یہ نشست برخاست کر دی گئی۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوا..... اس خط کا مشورہ راجا پر تاب کمار کے مشیر خاص سترام داس نے دیا تھا۔ وہاں کچھ ایسے مصاحبین اور وزراء بھی تھے جو راج محل میں اپنے امور کے علاوہ شراب و کباب کے عادی تھے، مگر نیا راجا ایسا کوئی شوق نہیں رکھتا تھا لہذا اس نے راج محل میں ایسی تمام چیزوں پر پابندی تو نہیں لگائی تھی، مگر کھلے بندوں اور آزادانہ اس کا استعمال ممنوع ہو گیا تھا۔ لہذا..... نوکر شاہی اپنی ”پیٹ پوجا“ کے لیے حرکت میں آ گئے تھے۔

اب یہی لوگ اسے ”غراب“ کرتا چاہتے تھے

شاہ زمان کی گھڑتاری تھی۔ وہ ایک اہم اور خطرناک مہم پر اپنی روانہ ہو چکے تھے، ان کی بھی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں آئی تھی۔ وہ ان کی طرف سے بھی فکر مند تھا اور اب ان کی مدد کو جانے کے لیے بے چین تھا۔

چنانچہ ایک پورا دن آرام کرنے کے بعد اگلے روز شام کو پری محل کی نشست گاہ میں باپ پینا اور علی چائے پینے اور باتوں میں مشغول تھے تو علی نے اسی دوران ہی اپنے آئندہ کے پروگرام سے نواب شہباز اور ان کے بیٹے اقبال خان کو آگاہ کر دیا۔

دونوں باپ بیٹا اس کی بات پر چونک پڑے۔ شہباز تو علی کے رخصت ہونے کی بات پر ہی اداس سا ہو گیا، لہذا فوراً بولا۔

”علی بھائی! تم اب اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ میرا کوئی بھائی نہیں، لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں نے تمہیں صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ دل سے بھی بھائی مانا ہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے، بلکہ ادھر ہی رہو گے۔“

”اقبال بیٹا بالکل سچ کہہ رہا ہے برخواستہ دار علی!۔۔۔“ نواب شہباز خان نے بھی اپنے بیٹے کی حمایت و تائید میں علی سے پریشانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں یہی سمجھوں گا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ تم بھی تو آخر کو میرے بیٹے جیسے ہی ہو۔“

علی ان دونوں باپ بیٹے کے اپنے بارے میں ایسے خیالات جان کر دل ہی دل میں بے حد متاثر ہوا اور اس کا اظہار بھی کر ڈالا۔ بولا۔

”میں آپ کے خیالات کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں نواب صاحب! اور پھر اقبال صاحب۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سراشی کی جانب تھوڑا سا گھمایا اور بات جاری رکھی۔

”انہیں تو میں نے واقعی پہلے ہی روز سے ایک بھائی کی طرح ہی پایا ہے۔ میدان جنگ میں انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا اور نہ ہی مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ میرے نائب سالار نہیں بلکہ ایک نواب زادے ہیں۔“

علی نے اتنا کہہ کر تھوڑا تو وقف کیا پھر گہری متانت سے دوبارہ بولا۔

”درحقیقت ہم جس راہ کے سپاہی ہیں، ہمیں جب تک اپنی اصل منزل نہیں مل جاتی، ہم کسی بھی جگہ کو زیادہ دیر تک اپنا ٹھکانہ نہیں بنا سکتے۔ دوسرے، مجھے اپنے

کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس نے میری ہی نہیں بلکہ ہمارے قافلے کے ہر فرد کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی ہے۔“

راجا پر تاب کو اس وقت اپنے ”معاملہ دل“ کی پڑی ہوئی تھی۔ مسکرا کر بولا۔

”اچھا تم فکر مت کرو۔۔۔۔۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں، امید ہے کہ کل تک وہ شوکت حسین کو ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے شوکی کو اپنی آنکھوں سے مندر کے کنڈرات تھے شدید زخمی حالت میں دے پڑے پایا تھا، پھر نیچے عدسے کے باعث ہوش نہ رہا، بعد میں شوکی غائب تھا۔“ رینا بولی۔

راجا پر تاب شوکی کے تذکرے سے راجا پر تاب کو کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ رینا کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کی غرض سے بولا۔

”تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے میرے ساتھیوں نے بھی شوکی کو ایسی ہی حالت میں دیکھا تھا۔ اسی لیے مجھے لگتا تو یہی ہے کہ وہ مشکل ہی زندہ بچا ہو۔ کنڈرات کے لیے میں دب کر وہ ہلاک ہو چکا ہوگا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ فارغا ڈسک راجا صاحب! اس بے چارے کے لیے ایسے ظالم الفاظ اپنے منہ سے مت نکالیں۔“ رینا نے تڑپ کر کہا۔ ”وہ بے چارہ ایک غریب مگر بہت دلیر اور اپنی ذات میں سچا آدمی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، مجھ کو ان کے وہ زندہ ہو۔ ہم نے تو یوں ہی اپنے ایک خیال کا اظہار کیا تھا۔“

راجا پر تاب نے کہا پھر وہ اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا۔ اسے تنہائی میں رینا کی سنگت میں بیٹھنا اور اس پر دس انگریز دو شیخہ سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ اسی وقت اپنا حال دل اس کے سامنے کھول ڈالے اور اس کا بھی اپنے متعلق منہ پر لینے کی کوشش کرے، مگر کچھ سوچ کر اس نے یہ کام کل تک کے لیے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

علی کے پاس ترپال (پری محل میں) اب رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ ترپال سے ہی نہیں بلکہ کوہ شالیہ سے ہی کوچ کر جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنی اب تک کی مہمات کو کامیابی سے تمام کر چکا تھا۔ لہذا اب اسے اپنے دو عزیز ترین ساتھیوں اور بیہ اور

کالی کے مندر کے لیے میں دے دیے ہوئے معزوب حالت میں پڑے پایا تھا۔ تب سے ہی ہوجا شوکی کی جانب سے تشویش نے اسے ادھ موا کر رکھا تھا کہ پتا نہیں اس دیوانے فرزانے کا کیا حال ہوا ہو

اسے اندازہ تھا کہ شوکی اس بد قاش اور شیطان پہلاری بددی ناچھ کی قید سے اسے چھڑانے کے لیے ہی اس سے جا بھڑا تھا۔

کنڈالیر تھا وہ۔۔۔۔۔! مجھے پانے اور ایک شیطان کے قبضے سے رہائی دلانے کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر کالی کے مندر چلا آیا تھا، کیونکہ اسے اس بات کا یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اسے (رینا کو) اغوا کرنے والے کون اور کس کے ساتھی ہو سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگی۔

ادھر راجا پر تاب جب اپنی مصروفیات وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کے پاس آیا تو رینا کو اس نے ہتوڑ غم زدہ معزوب اور تشویش میں مبتلا پایا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ موجودہ جنگی حالات کی وجہ سے شاید وہ پریشان ہے۔ رینا اسے ایسی دکھ زدہ حالت میں بھی بیماری محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب حسن تھا اس کا بھی۔۔۔۔۔ وہ مسکراتا اور ہولے سے کھنکھارتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو رینا اسے دیکھتے ہی بڑی بے قراری سے اس کی جانب بڑھی۔

”آ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ نے سش۔۔۔۔۔ شوکت حسین کا کچھ پتا چلا یا؟“

رینا کو ایک معمولی ملازم کے لیے اس قدر بے چین اور تشویش زدہ یا کر راجا پر تاب کما ایک لمحے کو حیران سا رہ گیا پھر بولا۔

”میں کوشش کر رہا ہوں، لیکن کیا تمہیں واقعی شوکی نے اغوا نہیں کیا تھا؟“ راجا پر تاب نے دھیرے سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ بھلا وہ کیوں میرے ساتھ ایسی حرکت کرے گا۔ یہ سارا کیا دھرا اس خبیث مہا پہلاری بددی ناچھ کا ہے۔“ رینا نے اسے اس بارے میں مختصراً صراحت بیان کر دی۔

بالآخر راجا پر تاب کما رے رہا نہ گیا۔ وہ بولا۔

”ایک معمولی ملازم کے لیے تمہارا اس قدر بے چین ہونا مجھے عجیب ہی لگا ہے۔“

”ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔“ رینا نے چور سے لہجے میں بہت دھیرے سے جواب دیا۔ ”وہ میری ذمے داری ہے۔ وہ اکل مالیک کے خاص، پرانے اور وفادار ملازم

”میں جانتا ہوں برخواستہ دار! تم ایک عابدانہ زندگی گزار رہے ہو۔ یہ مرود فرنگی ہماری جنگ آزادی (1857ء) کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں پوری طرح سے اپنے قدم جما چکے ہیں، مگر اس زوال میں تمہارے جیسے حریت پسندوں اور عابدوں کا بھی حوصلہ کمال کا ہے۔“

”ایک سچے مسلمان کی اللہ کے بھروسے پر اور امید آزادی کی جستجو میں ثابت قدمی ایک دن درخشاں فتح کی نوید ضرور سناتی ہے۔ ہم تمہیں اپنے اس عقیم مقصد سے روکنے کا بالکل بھی حق نہیں رکھتے۔“ وہ اتنا کہہ کر لحد بھر کو وقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”لیکن علی! بھڑھو تا کہ تم صبح صادق کو ہی روانہ ہو جاتے۔ اب شام ہو رہی ہے اور پھر رات ہونے میں کیا دیر لگے گی۔ تمہارا سفر بھی طویل ہے۔ آگے جیسا تم مناسب سمجھو۔“

علی نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سمجھنے لیے تھے۔ درحقیقت اس نے شاہ زمان اور ادیب کی مدد کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے فوج آزادی کے سالار جنرل غیر خان سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ انہیں اب تک کے اپنے مشن اور پانچ ساتھیوں کے بارے میں آگاہی بھی دینا تھی جن میں کتن تو ابتدا میں ہی شہید ہو گئے تھے، تاہم اسے اندازہ تو تھا کہ ان کی زیر زمین علی قیادت ان کی جانب سے بے خبر نہیں ہوگی۔ ان کے جاسوس انہیں بھی پلی کی اطلاع دیتے ہی ہوں گے لیکن باوصف اس کے علی ایک ملاقات اپنے سالار جنرل غیر خان سے کرنا بے حد ضروری سمجھتا تھا۔

لہذا اس نے نواب شہباز کو اپنی یہ مجبوری بتادی اور اسی وقت روانگی کے بندوبست کی درخواست بھی کر دی۔

”اچھا بیٹا! جیسا مناسب سمجھو لیکن ایک گزارش ہماری بھی سن لو تو تمہاری بہر بانی ہوگی۔“ نواب شہباز نے علی کی

کی آواز بھی مدھم تھی۔

”ہاں، بولو! میں سن رہا ہوں۔“
 ”علی بھائی!.....“ وہ پھر اٹکنے لگا لیکن ہمت کر کے
 کہہ ہی دیا۔ ”وہ..... چھوٹی بی بی..... نے آپ کے لیے
 ایک پیغام دیا ہے۔“
 ”چھوٹی بی بی.....؟“ علی نے سوالیہ نظروں سے
 اس کی طرف دیکھا۔

”جی بالکل! وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر علی کے چہرے پر یکایک عجیب سی سنجیدگی کھنڈ آئی اور محروم چہموں سے اسی لہجے میں بولا۔

”چہموں! تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو تم؟“ اور اس وقت کہاں کھڑے ہو؟ مت بھولو کہ تم اس عزت دار خاندان کے ایک پرانے اور قابل اعتماد ملازم ہو۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں..... علی بھائی!“ وہ جیسے ہلکیانے کے انداز سے بولا۔ ”اسی بات کا تو مجھے بھی تو یاد کہ آپ براہ مان جاتیں۔“

”بات براہمانے کی تو بالکل ہے۔“ علی نے عرض کیجے میں کہا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اپنے معزز اور عزت دار بیڑبان کی پرودہ لٹین بھوکے کہنے پر ان سے ملاقات کو قطعیں جاہیں گے؟ ہرگز نہیں، ان سے کہو کہ جو بات بھی کہنا ہے وہ اپنے خاوند سے کریں اور پھر وہ مجھ سے بات کریں گے۔“

ہو سبیاں کا منہ خشک ہونے لگا تھا، وہ بار بار اپنے
 منہ پر تھوڑے ہونٹوں پر زبان پھیرے جا رہا تھا۔ بولا۔
 ”علی بھائی! اجن باتوں کی آپ وضاحت کر رہے
 ہیں، ان کا مجھے ہی نہیں خود چھوٹی بی بی صاحبہ کو بھی اندازہ
 ہے مگر وہ بات ہی ایسی ہے کہ وہ صرف آپ سے کہنا چاہتی
 ہیں۔ خدارا مان جائیں۔ چھوٹی بھینچے اچھا بھائی کہتی ہیں
 اور مجھ سے انہوں نے اس وعدے کے ساتھ تین بھی کر
 لی تھیں کہ وہ یہ بات خاندان کی عزت ہی کی خاطر کر رہی
 ہیں اور مزید یہ کہ وہ اپنے شوہر ہی سے نہیں بلکہ سسر
 صاحبہ جنہیں وہ اباجان کہتی ہیں، ان سے بھی کرنا چاہتی
 ہیں لیکن ان کی ایک مجبوری ہے کہ وہ پہلے آپ کے علم میں
 بات لانا چاہتی ہیں۔“

”فیک سے، اگر ایسی بات سے تو ہمیں کوئی
ملا کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گا پھر بولا۔

طرف بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔
 ”کیوں شرمندہ کرتے ہیں نواب صاحب! آپ
 حکم کریں۔“ اس کی بات سن کر انہوں نے ایک نگاہ قریب
 بیٹھے اپنے بیٹے اقبال پر ڈالی اور علی سے بولے۔
 ”ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے اس نیک اور عظیم مقصد
 میں ہمارے فرزند ارجمند اقبال کو کبھی ساتھ شامل
 کر لو، تاکہ ہمارا ضمیر بھی مطمئن رہے کہ آزادی کی اس
 جنگ میں ہم بھی پیچھے نہیں ہیں۔“

”آپ سب اس جنگ میں شامل ہیں تو اب صاحب!“ علی نے فوراً کہا۔ ”جس کا تازہ ترین ثبوت ہماری فرنگیوں کے خلاف کوہِ شالیہ پر جارحیت کا منہ توڑ جواب ہے۔ ماشاء اللہ آپ کے فرزند ارجمند نے اس جنگ میں دلیری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے دانت کھٹے کر ڈالے تھے لیکن ان کا ابھی ریاست میں رہنا ضروری ہے۔ فرنگیوں کی تازہ کار سازشوں کا نقشہ، ان کا طریقہ کار تینوں ریاستوں کا زامہ جنگ میں اتحاد یہ سب اقبال صاحب کی نظروں کے سامنے ہے۔ فرنگی یوں تو اب کچھ دنوں تک اپنا زخم چاٹ رہے گا، لیکن ہے وہ دوبارہ بھی منصوبہ بندی کرے تو اس کا جواب اسی طرح منصوبہ بندی سے دینے کے لیے اقبال خان یہاں موجود ہے۔ تاہم مجھے نہیں لگتا کہ فرنگی اب دوبارہ کوہِ شالیہ پر چڑھائی کی جرأت کر سکتا ہے۔“

علی کی باتوں سے اب دونوں باپ بیٹا مطمئن نظر آ رہے تھے۔ لہذا علی روایتی کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اچانک اسے دروازے پر کسی کی آہٹ کا احساس ہوا۔ وہ اس وقت اپنا کمر بند درست کر رہا تھا۔ فوراً دروازے کی طرف اپنا رخ پھیرا تو چونک پڑا۔

دروازے پر سچ خالد المعروف پہنچا تھا۔
اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔
"ارے، یہ میاں!! تم..... آؤ..... آؤ.....
رک کیوں گئے؟" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہوادھر ادھر دیکھتا ہوا اب آہستگی چلا اس کے قریب
کھڑا ہو گیا۔ علی کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ وہ یہاں
پر ان ملازم تھا مگر اس کا انداز یوں چوروں کا سادکھ کر علی
جو کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

”وہ... وہ... علی بھائی! ایک بات... کہنا
تھی... آ... آپ سے...“ وہ انک انک کر بولا۔ اس

کھاوت

☆ جو شخص کسی کا حق بھول کر لینے سے وہ خود کو فروخت کر چکا ہوتا ہے۔ (برطانوی کہات)

☆ خطا کرنا انسان کی فطرت سے ہی ہوئی غلطی کو مان لیتا مردگی ہے۔ (عربی کہات)

☆ جب دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو سمجھ لو دونوں خطاوار ہیں۔ (ڈچ کہات)

☆ جو ذرا سی بات پر دوست نہ رہا، وہ کبھی دوست تھا ہی نہیں۔ (پرتگالی کہات)

☆ جب بچے اور سیدھے روئے کو دروازے سے دھکیل دیا جاتا ہے تو چالپوی دیوان خانے میں آتی ہے۔ (انگریزی کہات)

☆ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے۔ (فارسی کہات)

☆ نفرت اور محبت دونوں اندھی ہوتی ہیں۔
(مشرقی کہاوت)

بلا پیٹ بھرا ہونے پر تے کی نصیحت کرنا
آسان ہے۔ (اطالوی کہاوت)

☆ ادب لوگوں کے لیے ڈھال ہے۔ (عربی کہاوت)

☆ ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ ایک احمق کے صاحب اختیار ہونے پر ہوتا ہے۔ (عربی کہاوت)

نہ چاہوں کہ دل میں جس اعتقاد کا وزن رکھو
گے، ادھر ہی جھک جائے گا۔ (جرمن کہاوت)

جنگ دوستی اعتقاد کو حائل کرتی ہے۔ (فارسی کہاوت)
 ہنر آزادوی ہے اور مفلسی غلامی۔ (جرمن کہاوت)

☆ مفلس کو افلاس سے جو تکلیف پہنچتی ہے،
دولت مندوں کو دولت کی حرص اس سے زیادہ تکلیف

☆ تنگ دستی میں قرض بہت مشکل بات ہے۔

☆ عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کے

لیے تین چیزیں درکار ہیں (1) عمر نوح (2) حج
قارون (3) صبر ایوب (عربی کہاوت)

مرکز: محمد الیاس، بیوچستان

افتراس نہیں، لیکن ان سے ایک وعدہ لے لو کہ اس کے بعد ہمارے مشورے سے نواب صاحب اور اپنے ہمراہ قبال سے بھی یہ بات کریں گی۔“

چو میاں ایک دم خوش ہو گئے۔ فوراً یہ کہہ کر پلٹ گئے کہ وہ ابھی پوچھ کر جواب دے رہے تھے۔

اس کے جانے کے بعد علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کیا وہ اپنی اصلیت آشکار ہو جانے کے بعد اب کوئی نئی چال یا سازش کھیلنا چاہتی تھی؟ کیا اس کے خداداد راج خان نے اپنی بیٹی کا بھانڈا اچھوٹنے پر اسے کوئی نئی بیڑی بنی رہانی تھی؟

بہر کیف..... علی نے یہ سب سوچتے ہوئے ایک گہری ہنکاری خارج کی۔ یوں اس نے بھی تہہ کر لیا تھا کہ اسے مہر النساء کی بات پر ذرا بھی گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ اس کا اظہار سب سے پہلے اس کے شوہر اقبال خان سے کرے گا۔

گھر ایک ہی تھا اور مقام بھی..... لہذا یہاں فوراً
 ہی جواب لے کر علی کے سامنے حاضر ہو گئے۔

”میں نے آپ کا پیغام چھوٹی لیٹی تک پہنچا دیا ہے۔
 ہاں! وہ ولی اور آدم میں ہوا۔ انہیں کوئی اعتراض
 نہیں ہے، بلکہ وہ خود بھی یہی جانتے ہیں، لیکن چاہیں کیا
 بات کہے وہ یہ بات سب سے پہلے آپ کے علم میں لانا
 ضروری سمجھتی ہیں۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے وکب اور کہاں ملنا ہے؟ لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم برواٹھی کے لیے تیار ہیں۔“ بالآخر غلطی نے گنگو سے انداز میں پوچھا۔ یہ پوچھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے وجود میں ایک عجیب سی سسکی کا احساس ہوا تھا کہ..... اگر کل کے کسی فرد کی ان پر نگاہ پڑ گئی تو کہیں بات کا بیخونگر ہی نہ بن جائے۔ میرا انشاء ہے اسے عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔

پو نے جواب دیا۔ ”بس! آپ ابھی تشریف لے
 لیے ہمارے ساتھ۔“

علی تھوڑا سا چمکیا یا اس کے بعد پھر کے ساتھ چل

☆ ☆ ☆
خاصاً قاصد ملے کر نے کے بعد شاہ زمان نے ظہیر
کا جانا ضروری سمجھا۔ وہ دونوں اب خطرے سے کافی
دور نکل آئے تھے۔ دشمن بکھر گئے تھے۔ ان کا انہوشین
مہم تباہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے یہ لوگ جزیرے میں

☆☆☆

خاصاً قاصد ملے کرنے کے بعد شاہ زمان نے ٹھہر جانا ضروری سمجھا۔ وہ دونوں اب خطرے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ دشمن بکھر گئے تھے۔ ان کا ہوشیہن سب تباہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے یہ لوگ جزیرے میں

سزائے انتظار

رشا کر لطیف

جب سچے خلوص و محبت میں لالچ و طمع کی ملاوٹ ہو جائے تو جذبات میں منافقت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔۔۔ مغرب کے آزاد ماحول میں بھی والدین کی شفقت اور اولاد کی محبت دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور اس ماحول کا حصہ ہونے کے باوجود والدین کے دلوں میں چھپی محبت اور امید اولاد کی بے اعتنائی پر آج بھی افسردہ ہو جاتی ہے۔

مخالف پرست رشتوں کے لیے ان کی سزا کا انتخاب

انتہائی غصیلی طبیعت کے مالک ہیں اور اب کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد تو وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو کہیں وہ ہمیں جانکاد سے عاق نہ کر دیں۔

”اسی تشویش کی وجہ سے میں بھی ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔“ بیڑ نے کھیانے لہجے میں

”اگر ڈیڈ اسی طرح اپنی دولت لٹاتے رہے تو ایک دن ان کا بینک بیلنس زبرد ہو جائے گا اور ہم دونوں ہاتھ تلخ رہ جائیں گے۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا۔“ بیڑ نے اپنے چھوٹے بھائی جاسن سے فکر مند انداز میں کہا۔

”مگر ہم ڈیڈ کو روک بھی تو نہیں سکتے؟“ جاسن نے پریال لہجے میں جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ ڈیڈ ویسے بھی

پر پورٹ ہول پانچ روٹھ ان اور شیپے کی کھڑکیاں نصب تھیں۔

شاہ زمان نے سامنے کے دروازے سے جانے کے بجائے عقبی سمت کے ایک نسبتاً چھوٹے دروازے کا رخ کیا، جو اسے چپکلی ہی نگاہ میں دکھائی دے گیا تھا۔

تھوڑی سی کوشش سے یہ دروازہ کھلا تو دونوں اندر ایک خوبصورت سے بچن میں موجود تھے۔

بچے پاؤں وہ بچن کے اندرونی کوشے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے تو انہیں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

”ڈارلنگ جیس! بیڑن مان لونا میری خاطر۔۔۔۔۔ وہ یاقوت اور لعل۔۔۔۔۔ میرے دل دو مارچ میں انک کر رہ گئے ہیں۔“ یہ ایک نرم اور میٹھی سی نسوانی آواز تھی۔

”مائی سوٹ ہارٹ ایہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“ یہ آواز کسی جوان مرد کی تھی۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔؟ تمہارے لیے کیا مشکل ہے ڈارلنگ! تم خزانے اور اس جزیرے کے ہی نہیں بلکہ اس عظیم الشان شپ ہی ہاک کے مالک بھی ہو۔“

زمان نے ان دونوں کی گفتگو سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دونوں اس کے ”بیکاز“ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے، اسی سبب زمان کا ہاتھ اپنی گھٹن کی طرف چلا گیا تھا۔

”وہ تو خلیک ہے، میرے لیے ان دونوں چیزوں کا حصول کوئی مشکل بھی نہیں مگر مائی ڈارلنگ! از ایلا! میں ان سارے معاملات سے خوش نہیں ہوں۔ ہم نے یہاں عظم و جبر کی جو فضا قائم کر رکھی ہے، اس پر میں کڑھتا ہوں اور چوری کے اس مال کو میں اپنے اوپر حرام بھی سمجھتا ہوں۔“

ایک فرنگی آفیسر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر زمان اور اریب ایک لمحے کے لیے گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ زمان کا رائل کی جانب بڑھنے والا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

اسی وقت ایک آواز پردہ دونوں چوٹے۔ وہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی موٹر بوٹ تیزی سے اسی طرف بڑھی چلی آ رہی ہو۔

(جاری ہے)

کی تنگ دو میں تھے۔

دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی کہ ہاؤس بوٹ ویران نظر آرہی تھی۔ یعنی اس میں کچھ خاص پہرا وغیرہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ تاہم زیادہ پہرا ہی ہاک پر نظر آ رہا تھا۔

ممکن تھا کہ یہاں اس کی کوئی خاص ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ بہر حال یہ ان دونوں کے لیے ایک اچھا موقع تھا لہذا وہ دونوں مختار روی کے ساتھ باری باری ہاؤس بوٹ کے دروازے میں اتر گئے۔

وہ وہاں ایک کونے میں دیواری آڑ میں ہو کر چند ثانیے کے لیے سستانے کھڑے ہو گئے۔ مسلسل تیرتے رہنے کے سبب ان کا جسم شل ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد سردی نے انہیں ادھ موا کر ڈالا تھا۔ شاہ زمان کے مقابلے میں بے چاری اریب تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”چلو، ہمت کرو اریب! اندر کی محفوظ کوشے میں چل کر پہلے اپنی حالت درست کرتے ہیں۔ کم بخت سردی تو جیسے ہڈیوں کے گودے میں اترتی محسوس ہو رہی ہے۔“ شاہ زمان نے ہلکی سرگوشی میں کہا اریب نے کچکپاتے سر کے ساتھ ہولے سے ایشیائی جنبش دی۔ اس کا چہرہ سردی کے سبب ٹیلا پڑ رہا تھا، آنکھیں اور ناک متورم ہو رہی تھیں۔

وہ دونوں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھے۔ ابھی وہ ایک تنگی سی راہداری میں چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ انہیں خشک کر رکنا پڑا۔ آگے ایک پھرے دار کا پیلا دکھائی دیا تھا۔ اس کے کندھے سے رائل جھول رہی تھی۔ وہ رینگ کے ساتھ لکاسگرینٹ کے کش لگا رہا تھا۔

شاہ زمان چاہتا تو اسے چند سیکنڈوں میں ہی اننا غصیل کر ڈالتا مگر ابھی اس نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا، وہ کسی کو اپنی یہاں موجودگی کا شبہ بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ دونوں راست بدل کر ایک ایسی جگہ آ کر رہے جہاں ان کے سامنے ایک چکر دار زینہ اوپری منزل کی جانب جانا نظر آ رہا تھا۔

یہ بوٹ ایک منزل تھی۔ بہت احتیاط کے ساتھ زینے طے کرتے ہوئے وہ آگے اوپری منزل تک پہنچے تو انہیں ایک خوبصورت سائیکلین بنا نظر آیا، جس کی دیواروں

کہا۔ ”اب تو مجھے شہ ہونے لگا ہے کہ ان کی ذہنی حالت بھی درست نہیں رہی۔“

”میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔“ جانسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھو نا، پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم انہوں نے تین بیچوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ادارے کو چندے کے طور پر دے دی ہے۔ کیا کوئی ہوش مند امریکی ایسا کر سکتا ہے؟ ایک دو ہزار ڈالر کی بات ہوتی تو شاید ہمیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر پچاس ہزار ڈالر لڑکاتے کماتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ ڈیڑھ کسوچنا چاہیے کہ پیسے ان کی اولاد کا حق ہے اور وہ ایسا کر کے ہماری حق تلفی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ ڈیڑھ کی اور ہماری سوچ میں بہت زیادہ فرق ہے۔“ پیٹر پیچکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”وہ موت کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور اس طرح جیسا لانا کہ انہیں ذہنی سکون ملا ہے۔ اپنی دانست میں وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے پیسا خرچ کر رہے ہیں۔ اب تو وہ ہر سٹرے کو اپنی وہیل چیئر پر چرچ بھی جانے لگے ہیں۔“

”انسانیت کی بھلائی کے لیے ہی پیسا خرچ کرنا ہے تو ہم پر کر لیا کریں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہی ہیں۔“ جانسن نے جملائے ہوئے لہجے میں کہا تو پیٹر بے اختیار ٹھٹھکا کر ہنس پڑا۔

”ارے اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ابھی ڈیڑھ کے چنگ اکاؤنٹ میں بہت مال پڑا ہے اور پھر یہ مگر اور ڈیڑھ کی زمینیں بھی تو ہیں۔ پچاس ہزار ڈالر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“

”میں مانتا ہوں کہ پچاس ہزار ڈالر کے جانے سے ڈیڑھ کی دولت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔“ جانسن نے لہجے میں بولا۔ ”مگر مجھے خدشہ ہے کہ یہ شروعات ہے۔ جب تک ڈیڑھ کو کینسر کا مرض لاحق نہیں ہوا تھا، کیا انہوں نے بھی چندے کے طور پر اپنی بڑی رقم دی؟ ایک صحت مند آدمی اور بیمار آدمی کی سوچ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک صحت مند آدمی میں جینے کی تمنا ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اکٹھا کرتا ہے اور اگر اس کے پاس پیسا ہو تو اس کی زندگی بہت پر لطف ہو جاتی ہے مگر اس کے برعکس ایک مرتے ہوئے شخص کی سوچ اور خیالات بہت مختلف ہوتے ہیں۔ سر پر مٹھانے والا موت کا خطرہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ تک چھین لیتا ہے۔ ڈیڑھ بھی ڈیڑھ کی اذیت میں جٹکا ہیں۔ پیچھڑوں کے کینسر نے انہیں جسمانی تکلیف سے

تو دو چار کر ہی رکھا ہے مگر یہ تو قریب آتی موت نے انہیں ذہنی اذیت میں جٹکا کر دیا ہے اور شاید انہوں نے اپنی ذہنی اذیت کم کرنے کے لیے ہی تین بیچوں کے اس ادارے کو پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم چندے میں دے دی ہے۔

”وہ ڈیڑھ پہلے ایسے دریا دل تو نہ تھے۔“

”مگر ان کی یہ دریا دلی ہمارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔“ جانسن کی بات کا جواب دیتے وقت پیٹر کے چہرے پر موجود تشویش کے تاثرات گہرے ہو گئے۔

”ہمیں نہیں معلوم کہ ڈیڑھ کب تک زندہ رہیں گے؟ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال تک زندہ رہ پا سگے۔ پیچھڑوں کے کینسر کا ابھی تک کوئی مؤثر علاج دریافت نہیں ہوا۔ ڈیڑھ کے زندہ رہنے کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں، مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی جلدی اس دنیا سے رخصت ہوں گے۔ شاید ہمیں ایک سال تک انتظار کرنا پڑے۔“

”میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔“ جانسن نے بے چینی سے پہلو ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں پچاس ہزار ڈالر سے بھی بڑی رقم چندے کے طور پر دیں گے۔“

”مگر ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔ ڈیڑھ اس دولت کے مالک ہیں۔ وہ جیسے چاہیں اپنی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ یہ مگر ہوشیاری سب کچھ ان کے نام پر ہے۔“ پیٹر بے بسی سے بولا۔

”میرے خیال میں ہمیں ڈیڑھ سے براہ راست بات کرنی چاہیے۔“ جانسن پُرسوجھ لہجے میں بولا۔ ”یہ ممکن ہے کہ ڈیڑھ کو ہماری بات سمجھ میں آجائے۔“

”میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔“ پیٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ڈیڑھ ہمیں کام چور اور ٹھٹھکتے ہیں۔ وہ ہماری بات کو اتنی اہمیت نہیں دیں گے۔ اس لیے میں نے جیکو لین کو فون کر کے تمام صورت حال سے مطلع کر دیا ہے۔ ڈیڑھ سے وہی بات کرے گی۔ ڈیڑھ اس کی باتوں کو اہمیت بھی دیتے ہیں۔ جیکو لین نے بھی اس بات پر شدید حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ڈیڑھ نے اتنی بڑی رقم بطور عطیہ دے دی ہے۔ اسے ڈیڑھ کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ وہ آج شام تک پہنچ جائے گی۔“

”تم نے اچھا کیا کہ جیکو لین کو بلا لیا۔ شاید بیٹی کی بات ڈیڑھ کی سمجھ میں آجائے۔“ جانسن نے لہجے میں کہا۔ ”وہ پیسے بھی انہوں نے جیکو لین کو ہمیشہ ہم پر فوقیت دینی ہے کیونکہ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے جبکہ ہم ایسا نہیں کر پائے۔ جیکو لین اب ایک پروفیشنل ڈاکٹر بن چکی ہے۔ خود

کافی بچے اپنے شوہر پر ہی انحصار نہیں کرتی جبکہ اس کے برعکس ہم دونوں نے نہ ہی اپنی تعلیم مکمل کی اور نہ ہی ہم نے کبھی نہیں ملازمت کی ہے۔ آج بھی ہمارے اخراجات کا تمام تر انحصار ڈیڑھ پر ہی ہے۔“

پیٹر نے غصے سے ایک اظہاری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال جیکو لین کو آئیے وہ اس سے بات ہو جائے بھی ڈیڑھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔“

پیٹر جانسن اور جیکو لین کے بہن بھائی تھے۔ ان کے ڈیڑھ کا نام مسٹر ہارڈ تھا۔

مسٹر ہارڈ نے اپنے نام کی طرح خاصی سخت مزاج طبیعت پائی تھی۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور ضابطے طے کر رکھے تھے اور وہ ان اصولوں اور ضابطوں پر خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے اور اپنی اولاد سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی ان ضابطوں کے اندر رہ کر اپنی زندگی بسر کریں۔ مسٹر ہارڈ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے پاس دولت و جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ ساری جائیداد ان کی موت کے بعد وراثت میں ان کی اولاد کو ہی ملنے والی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ مسٹر ہارڈ اس بارے میں ذرا مختلف نظریہ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ان کے بیٹوں اور بیٹی کا تمام تر انحصار ان کے باپ سے ملنے والی وراثتی جائیداد پر ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ انہیں اپنے قدموں پر بھی کھڑا ہونا چاہیے۔

مسٹر ہارڈ کی بیوی ان کے بچوں کے بچپن میں ہی وفات پا چکی تھی۔ اگرچہ مسٹر ہارڈ بہت سخت گیر طبیعت کے مالک تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹی کی پرورش بڑی محبت اور ناز و نعم کے ساتھ کی تھی اور دوستوں کے مشورے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے لیے اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے وہ سارے جن کے جو ایک باپ کے طور پر دہ کر سکتے تھے۔

ان کی بیٹی جیکو لین ان کی امیدوں پر پوری اترتی تھی۔ وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن چکی تھی اور شادی کرنے کے بعد اس گھر سے رخصت بھی ہو چکی تھی۔

مسٹر ہارڈ کو اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ ان کی بیٹی نے ڈاکٹر بن کر ان کا سفر سے بلند کر دیا تھا مگر ساتھ ہی انہیں یہ غم بھی کھائے جا رہا تھا کہ ان کے دونوں بیٹے پیٹر اور جانسن خاصے کام چور اور ٹھٹھکا ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنی

تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائے تھے۔ مسٹر ہارڈ کی بیٹی جیکو لین تو ترقی کر کے ڈاکٹر بن گئی تھی مگر ان کے بیٹوں نے اگر ترقی کی بھی تھی تو بس کچھ فارغ رہ کر باپ کی کمائی پر پیش کرتے رہنا۔ اگرچہ مسٹر ہارڈ اپنے بیٹوں کی حرکات سے سخت نالاں تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے نالائق اور لکھے بیٹوں کا جیب خرچ بھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ پیٹر اور جانسن کو ہر ماہ جیب خرچ کی مدد میں خاصی معقول رقم دیتے تھے۔ زندگی کا سفر بونہی رواں دواں تھا مگر پھر ایک دن مسٹر ہارڈ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ پیچھڑوں کے لاعلاج کینسر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مسٹر ہارڈ کو اکثر اوقات سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر پھر ان کا یہ مرض بڑھتا چلا گیا تو انہوں نے ڈاکٹر کو پیک کر لیا۔

کچھ ٹیسٹ ہونے کے بعد ان پر یہ خوفناک حقیقت منکشف ہوئی۔... کہ اب وہ اس دنیا میں زیادہ عرصے کے مہمان نہیں ہیں۔ پیچھڑوں کا یہ لاعلاج مرض کسی بھی وقت ان کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا ہے۔ ان کے پاس چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کی زندگی تھی۔

مسٹر ہارڈ بہت باہمت اور حوصلہ مند انسان تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی جرأت سے اپنی اس بیماری کا سامنا کیا۔

اگر کسی انسان کو یہ بتادیا جائے کہ اب اس کے پاس بہت کم بڑی زندگی باقی رہ گئی ہے تو اس کی سوچ اور مزاج میں تغیر پیدا ہو جانا فطری ہی بات ہے۔ پیچھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہونے کے بعد مسٹر ہارڈ کے مزاج میں بھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ خاصے حساس اور زورورج طبیعت ہو گئے تھے۔ کسی دوسرے کے کام آنا انہیں اچھا لگنے لگا تھا۔ کسی کی مدد کر کے انہیں دلی سکون ملا۔ اب انہوں نے ہر سٹرے کے دن چرچ جانا شروع کر دیا تھا اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے رقم بھی خرچ کرنا شروع کر دی تھی۔

طبیعت میں طبعی پیدا ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے ٹھٹھکیوں کی وجہ سے چڑچڑے پن کا بھی شکار ہو جاتے تھے۔ انہیں دل ہی دل میں اس بات کا شدید دکھ تھا کہ ان کے دونوں بیٹے اس قافلے ہی نہیں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اپنا راستہ بنا سکیں۔ انہیں تو شاید اب اپنے باپ کی بھی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ وہ مسٹر ہارڈ کے کمرے کا درج اسی وقت کرتے تھے جب انہیں اپنے اخراجات کے لیے رقم درکار ہوتی۔

مسٹر ہارڈ کی دیکھ بھال ان کے ملازمین ہی کرتے

تھے۔ ایک ڈاکٹر بھی روزانہ آکر انہیں چیک کرتا تھا وہ اپنے چہروں پر چلنے کی حالت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وصل چیز کا استعمال کرنے لگے تھے۔ مسٹر ہارڈ نے جب سے خیراتی اداروں کو چندہ دینا شروع کیا تھا، ان کے قلبی سکون میں اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ مسٹر ہارڈ کے خیالات اور سوچ تھی جبکہ ان کے بیٹوں پیٹر اور جاسن کی سوچ اپنے باپ کے بالکل برعکس تھی اور اس سلسلے میں ان کی بہن جیکو لین بھی ان کی ہمنوا تھی۔ اس کا بھی یہ خیال تھا کہ اس کے ڈیڈ کا پیاری کی وجہ سے ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ بھلا کوئی ہوش مند انسان بھی اتنی خطرہ لہم چنے کے طور پر دے سکتا ہے۔

جیکو لین کے لیے یہ صورت حال نشوونما تک تھی۔ وہ تو اپنے والد کی وراثتی جاکد میں سے اپنا حصہ وصول کر کے ایک ذاتی کلینک کھولنے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر اس کے بھائیوں نے اسے فون پر یہ خبر سنا کر پریشانی سے دوچار کر دیا تھا کہ اس کے والد مسٹر ہارڈ پر ان دنوں انسانی ہمدردی کا دورہ پڑا ہوا ہے اور وہ اس سلسلے میں بے دریغ اپنی دولت بھی خرچ کر رہے ہیں۔ پچاس ہزار ڈالر ذوق شخص آغاز ہے۔

مسٹر ہارڈ گورو کنا ضروری ہو گیا تھا اس لیے جیکو لین شام سے بھی کچھ پہلے پہنچ گئی۔ اس وقت وہ پیٹر اور جاسن کے کمرے میں موجود تھی اور ان سے اسی سلسلے میں بات چیت کر رہی تھی۔ وہ تقریباً ایک ماہ بعد وہاں آئی تھی مگر اس نے باپ سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیڈ سے وہ بعد میں مل لے گی۔ پہلے اس معاملے کو حل کرنا ضروری ہے۔ شاید اس لیے کہ دولت کی اہمیت باپ سے زیادہ تھی۔

”تم دونوں نے اچھا کیا جو مجھے مطلع کر دیا۔ ورنہ نہ جانے ڈیڈ مزید کتنی دولت اسی طرح لٹا دیتے۔ بہر حال اب میں انہیں قائل کر لوں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کو تسلیم کرتے ہوئے آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ بھی کریں گے۔“ جیکو لین پر خیال لہجے میں بولی۔

”وہ تمہاری بات کو اہمیت دیتے ہیں اسی لیے تو ہم نے جہیں بلایا ہے۔ ورنہ ہم خود بھی ان سے بات کر سکتے تھے۔ ڈیڈ کے خیال میں ہم دونوں بھائیوں سے بڑا بے وقوف اور احمق پورے امریکا میں نہیں ہے۔“ پیٹر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ویسے ڈیڈ کی رائے اتنی غلط بھی نہیں ہے۔“

جیکو لین طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”مگر تم دونوں اپنی تعلیم مکمل کر لیتے تو شاید آج تمہاری بابت ڈیڈ کا نظریہ خاصا مختلف ہوتا۔ انہوں نے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواب دیکھے تھے اور اس سلسلے میں تم دونوں کو شہر کے ہنگام ترین اسکول اور کالج میں بھی داخل کر دیا۔ مگر تم نے ڈیڈ کے سارے خواب چٹکا چور کر دیے ہیں۔ اسی لیے وہ تمہیں احمق، کاہل اور گھٹو قرار دیتے ہیں مگر تمہارے برعکس میں نے ان کی امیدوں اور اعتماد کو محسوس نہیں پہنچائی۔ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ڈیڈ کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر بنی بن گئی۔ اسی لیے ڈیڈ کی نگاہوں میں میرا مقام تم دونوں سے کہیں اونچا ہے۔ وہ میرا ہر مشورہ اور رائے پوری توجہ سے سنتے ہیں۔“

”بہتر ہے کہ ہم دونوں پر اپنی زبان کی نشتر زنی کرنے کے بجائے تم اصل مدد کی طرف دھیان دو۔“ پیٹر ناگوار لہجے میں بولا۔ ”یہ مت بھولو کہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود تم حیثیت میں ہم دونوں سے زیادہ نہیں ہو۔ ہمیں وراثت میں تم سے کچھ زیادہ ہی جاکد ملے گی اور ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں انسان کا اصل رتبہ اور مقام دولت کے ترازو میں ہی تو لا جاتا ہے۔“

”دولت کمانے اور پیسے بٹھانے دولت مند بن جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ پیٹر نے جیکو لین کو اس کی حیثیت کا احساس دلایا تو اسے بھی خصرہ آگیا۔ ”میں کم از کم آج اس پوزیشن میں تو ہوں کہ ڈیڈ کی دولت کے بغیر بھی ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہوں مگر تم دونوں سے اگر وراثت میں ملنے والی جاکد اچھن جائے تو ہم دونوں امریکا کے کسی بولٹ میں برتن دھو تے ہوئے نظر آؤ۔“

”میرے خیال میں تم دونوں غیر ضروری بحث میں الجھ رہے ہو۔ ہمیں آپس میں بحث و تکرار کے بجائے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ڈیڈ کو آئندہ اپنی دولت لانے سے کیسے روکا جائے۔“ جاسن نے منطابانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں آج رات کے کھانے پر ڈیڈ سے بات کروں گی۔“ جاسن کی بات سن کر جیکو لین بھی لہجے میں بولی۔ ”بہتر ہے کہ رات تم دونوں بھی آوارہ گردی کرنے کے بجائے کھانے کی میز پر موجود رہنا۔ اب جو بھی بات ہوگی سب کے سامنے ہی ہوگی۔ فی الحال میں ڈراڈیڈ کے کمرے میں جا رہی ہوں تاکہ انہیں اپنی آمد کے بارے میں مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عیادت بھی کر لوں۔“

”ڈیڈ کے ملازمین تمہاری آمد کے بارے میں انہیں

مطلع کر چکے ہوں گے۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”بہر حال تم ان کی عیادت کر لو۔“

جیکو لین نے اس بار خاموشی سے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اور پھر پیٹر اور جاسن کے مشترکہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا جیکو لین ڈیڈ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی؟“ اس کے جاتے ہی جاسن نے پیٹر سے پوچھا۔

”اسی لیے تو اسے بلایا ہے۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”بہر حال رات کے کھانے پر گھر میں ہی موجود رہنا۔“

”اوکے!“ جاسن نے مختصر سا جواب دیا اور پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ مسٹر ہارڈ کے باورچی نے ان سب کی پسند کے مطابق کھانا تیار کیا تھا۔ جیکو لین اپنے والد کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ایک طرف پیٹر اور جاسن بھی کرسیوں پر برابر اٹھائے تھے۔

”تم لوگ کھانا کیوں نہیں شروع کر رہے؟“ مسٹر ہارڈ نے جیکو لین، پیٹر اور جاسن کو کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے نہ دیکھ کر استفسار کیا۔

”دو دراصل ڈیڈ آج میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے کے لیے بڑی مشکل سے اسپتال کی ڈیوٹی سے وقت نکال کر آئی ہوں۔“ جیکو لین نے تعہید باندھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ ذرا میں بھی تونوں کو میری بیٹی کو مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ مسٹر ہارڈ نے بغور جیکو لین کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جو معاملہ میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں، وہ پیسوں سے متعلق ہے۔“

”کہو، میں سن رہا ہوں۔“ مسٹر ہارڈ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”وہ ڈیڈ..... دراصل میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ نے اب خیراتی اداروں کو ضرورت سے کچھ زیادہ رقم ہی دینی شروع کر دی ہے۔ میں اس قسم کے اداروں کو رقم دینے کی مخالف نہیں ہوں۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے رقم خرچ کرنا اچھی بات ہے مگر ایک ساتھ پچاس ہزار ڈالر زکی خطرہ رقم محض چندے کے طور پر دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ آپ کو سوچنا چاہیے کہ اس رقم پر آپ کی اولاد کا زیادہ حق ملے گا۔“ جیکو لین نے بڑے سچے سچے الفاظ میں مسٹر ہارڈ کے سامنے سارا مدعا رکھ دیا۔

”اوہ..... تو ان دونوں بکوں نے یہ جرم تک پہنچا دیا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے جیکو لین کی آمد کا مقصد جانتے ہی خشکیں لگا ہوں سے پیٹر اور جاسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر ہلکے سے غصے کے تاثرات اُٹھ آئے تھے۔

”ڈیڈ! ہم نے کیا غلط کیا ہے؟ آپ ہماری بات تو سنتے ہی نہیں۔ اس لیے ہم نے جیکو لین کو بلایا ہے کہ شاید آپ کی پڑھی لکھی ڈاکٹر بنی آپ کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائے۔“ بات کرتے ہوئے جیکو لین کے پڑھے لکھے ہونے کے ذکر پر نہ جانتے ہوئے بھی پیٹر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ اسے ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا تھا کہ تعلیم کی وجہ سے جیکو لین کی اہمیت ان سے زیادہ ہے۔

”میرے خیال میں، میں ڈیڈ سے زیادہ بہتر طریقے سے بات کر سکتی ہوں اور تم دونوں نے بھی مجھے اسی لیے بلایا ہے۔ لہذا اپنا منہ بند رکھو۔“ جیکو لین نے برہم نگاہوں سے پیٹر کو گھورتے ہوئے کہا تو پیٹر ہنسنے لگا کہ خاموش ہو گیا۔

”دیکھو بیٹی۔“ مسٹر ہارڈ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے پہلے کسی خیراتی ادارے کو اتنی بڑی رقم نہیں دی ہے۔ مگر میری سابقہ زندگی اور آج کی زندگی میں بہت نمایاں فرق ہے۔ پہلے میری نگاہوں میں دولت کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ میں ہر اس کاروبار میں پے لگا رہا تھا جہاں سے قیمتی منافع حاصل ہونے کی امید ہوتی تھی۔ کاروباری ہیتے میں میری قابلیت اور ذہانت کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے پچھڑوں کے لاعلاج کینسر میں مبتلا ہونے کے بعد سے میری سوچ اور خیالات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ انسان کو دوسروں کے غموں اور مصیبتوں کا سچ اور اک ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اب مجھے ہر پہل مسرت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ ایسی حالت میں، میں جسمانی تکلیف میں تو مبتلا تھا اور ساتھ ہی سخت ذہنی اذیت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر جب سے میں نے دیکھی انسانیت کی خدمت کے لیے پیسا خرچ کرنا شروع کیا، مجھے ایسا قلبی سکون حاصل ہوا ہے جسے شاید میں الفاظ میں بیان نہ کر پاؤں۔ تم پچاس ہزار ڈالر زکی شکایت لے کر میرے پاس آئی ہو۔ میں تو جلد ہی اپنی آدھی جاکد انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کرنے والا ہوں۔“

”کیسا؟“ جیکو لین، پیٹر اور جاسن پر اپنے ڈیڈ کے آخری الفاظ کسی ہم کی طرح گرے۔ وہ تینوں ہنسنے لگے۔

بنائے مسٹر ہارڈ کا منہ جھکنے لگے۔

”ہاں میرے بچو! میں نے اپنی آدمی جاکر ادا ایک ٹرسٹ کو دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم تینوں کے لیے باقی آدمی جاکر ادا بھی بہت ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”آپ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے..... ڈیڈ۔“ بیٹر نے پھر سے ہونے لہجے میں کہا۔

”کون روکے گا مجھے؟“ مسٹر ہارڈ نے چیخو کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا تم میں اتنی جرأت ہے کہ اپنے باپ کے مد مقابل کھڑے ہو سکو۔ تم ہر ماہ اپنے جب خرچ کے لیے میرے سامنے بیٹگی ملی بنے کھڑے رہتے ہو۔ کیا تم مجھے ایسی وصیت کرنے سے روک پاؤ گے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ڈیڈ۔“ مسٹر ہارڈ کا دھمکی آمیز لہجہ سنتے ہی بیٹر کو ہوش آ گیا اور اس نے بات کرتے ہوئے حتی الامکان اپنا لہجہ بھی نرم کر لیا۔ ”میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے ڈیڈ کہ ایسا کر کے آپ اپنی اولاد کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو اپنی اولاد کے حق کا قطعی کوئی خیال نہیں؟“

”کیا حق صرف اولاد کا ہی ہوتا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے زہر خند لہجے میں چیخو کو جواب دیا۔ ”کیا باپ کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ تم سب جانتے ہو کہ میں اس وقت شاید اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہا ہوں مگر اس کے باوجود تم دونوں میرے کمرے میں کئی کئی دنوں بعد ہی تشریف لاتے ہو اور جبکہ لیٹن تم بھی ایک ماہ بعد مجھ سے ملنے کے لیے آتی ہو اور وہ بھی میری عیادت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ تمہیں میرا پیاس ہزارڈ الرز چندے میں دینا ہضم نہیں ہو رہا۔“

”نہیں نہیں ڈیڈ! ایسی بات نہیں ہے۔“ جبکہ لیٹن کھانے سے لہجے میں بولی۔ ”دراصل آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ایک اسپتال میں ملازمت کرتی ہوں۔ وہاں سے وقت نکالنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔“

”بس بس۔“ مسٹر ہارڈ نے جبکہ لیٹن کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ”میں نے تمہارے اسپتال چند دن پہلے فون کیا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ تم ایک ہفتے کی چھٹی پر ہو لہذا معذرت کا بہانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”میں نے یہ چھٹی چمک منانے کے لیے نہیں لی تھی ڈیڈ۔“ جبکہ لیٹن رسائیت سے بولی۔ ”دراصل میں لاس ویکاس گئی ہوئی تھی۔ وہاں ڈاکٹر کی ایک ٹیم نے فری میڈیکل کیپنگ لگا رکھا ہے۔ میں بھی انسانیت کی خدمت کے

لیے ایک ہفتے تک اس فری میڈیکل کیپنگ کا حصہ بنی رہی تھی۔ آپ کو تو اپنی بیٹی پر فخر ہونا چاہیے کہ وہ ایسے فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔“

”تم میرے پرانے دوست مسٹر جوزف کو تو جانتی ہی ہو۔“ مسٹر ہارڈ نے موضوع سے ہٹ کر ایک اور سوال کیا تو جبکہ لیٹن چونک پڑی اور بھر جرت بھرے لہجے میں بولی۔

”شاید آپ اگلے جوزف کی بات کر رہے ہیں؟ مگر یہ آپ کو ان کی اچانک یاد کیسے آگئی؟“

”جوزف، ان دنوں امریکا کے ایک مشہور بینک پوائنٹ پر گیا ہوا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”چند دن پہلے اس نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ اس نے جنہیں وہاں اپنے شوہر کے ساتھ سیر و تفریح کرتے دیکھا ہے۔ غالباً اسپتال سے چھٹیاں بھی تم نے تفریح پر جانے کے لیے حاصل کی تھیں اس لیے میرے سامنے کسی فری میڈیکل کیپنگ کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں۔ شاید بیٹر یا جانسن کے فون کرنے اور میرے پیاس ہزارڈ الرز چندے میں دینے کا علم ہونے پر تم اپنے تقریبی دورے کو ترک کر کے سیدھا یہاں پہنچی ہو۔ آخر تمہاری وراثتی جائیداد کا معاملہ ہے، اس لیے تمہاری فکر مندی سچا ہے۔“

”وہ دراصل ڈیڈ بات یہ ہے کہ.....“ جبکہ لیٹن سے فوری طور پر کوئی جواب نہ نہ پڑا۔

”رہنے دو جبکہ لیٹن..... میرے سامنے مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مسٹر ہارڈ سخت لہجے میں بولے۔ ”میں تمہیں اپنے بھائیوں سے مختلف سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم اپنے بھائیوں جیسی لاپٹی سوچ کی حامل نہیں ہو مگر آج احساس ہوا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے یہ لازم نہیں ہو جاتا کہ انسان کے خیالات اور سوچ بھی اعلیٰ ہو جائے۔ بہر حال میں تم تینوں کو اپنے فیصلے کے بارے میں آگاہ کر چکا ہوں۔ میں اپنی آدمی جاکر ادا غریب اور نادار لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے کسی ادارے کو دوں گا۔ ایسے بین الاقوامی ادارے پوری دنیا میں غربت کی سطح نیچے لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ جہاں چاہیں گے میری دولت خرچ کریں گے اور یاد رکھو تم تینوں بین بھائی میرے اصولوں کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے ہو اس لیے مجھے اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ ایسی کوئی بھی کوشش تمہیں باقی آدمی جاکر ادا

سے بھی محروم کر دے گی۔“ یہ کہتے ہوئے مسٹر ہارڈ نے اپنے ایک خاص ملازم کو آواز دی۔

ڈیوڈ نامی ملازم ان کی آواز سن کر فوراً حاضر ہو گیا۔

”ڈیوڈ! مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔ میرا آج کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا.....“ مسٹر ہارڈ نے جھکسانہ لہجے میں کہا تو ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسٹر ہارڈ کی وکیل چیخو کو کھانے کی ٹیکل سے پیچھے بھجوا دیا۔

ڈیوڈ نامی ملازم وکیل چیخو کو دھکیلتا ہوا مسٹر ہارڈ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ جبکہ لیٹن بیٹر اور جانسن ہونٹ پیچھے اٹھیں جاتے دیکھتے رہے۔ انہوں نے جبکہ لیٹن کو اس لیے بلوایا تھا کہ وہ مسٹر ہارڈ کو دوبارہ کسی خیراتی ادارے کو چندے میں خطیر رقم دینے جیسے اعتقاد فعل سے روک سکے مگر یہاں تو معاملہ ان کی توقع سے بھی زیادہ مبہم ہو چکا تھا۔ مسٹر ہارڈ تو اپنی آدمی جاکر ادا ہی ایسے کسی ادارے کو دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ آج انہوں نے خلاف توقع جبکہ لیٹن کو بھی کھری کھری سنا دی تھی۔

اگرچہ کھانا میز پر لگ چکا تھا مگر مسٹر ہارڈ کے مصمم ارادے جان کر ان تینوں کی بھوک بھی مر گئی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس خاصا تکلیف دہ تھا کہ جس دولت کو پانے کے وہ خواب دیکھ رہے ہیں، اس میں سے آدمی دولت کی ٹرسٹ کے نام ہونے والی ہے۔

”میں کمرے میں جا رہا ہوں۔“ میرا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ بیٹر نے اٹھتے ہوئے کہا تو جانسن بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ جبکہ لیٹن نے بھی ان کی تقلید کی۔

وہ سب بیٹر اور جانسن کے مشترکہ کمرے میں آ گئے۔ جبکہ لیٹن نے اندر داخل ہوتے وقت دروازہ بند کیا اور پھر کمرے میں موجود ایک کرسی پر براجمان ہو گئی۔ بیٹر اور جانسن پہلے ہی صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ان سب کے چہروں سے غم مندی اور پریشانی مترشح تھی۔ وہ تینوں کافی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

”تم نے دیکھا جبکہ لیٹن..... ڈیڈ کیسا بے وقوفانہ اقدام سرانجام دینے جا رہے ہیں؟“ کچھ دیر بعد بیٹر نے خاموشی کو توڑا۔

”ڈیڈ کا دماغی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔ مجھے ان کے لہجے سے ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنے کہے پر ہر صورت عمل کریں گے۔“ جبکہ لیٹن نے شکر لہجے میں جواب دیا۔

”میں ڈیڈ کو ہر صورت روکنا ہوگا۔“ جانسن پُر زور

احترام

پولیس کے ایک سپاہی کو رات کے وقت ایک کنوئیں سے بھاڑ بھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ سپاہی نے کنوئیں میں دی ڈال کر کھینچنا شروع کیا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا افسر ہے۔ سپاہی افسر کو کچھ کرگھبرا یا اور اس نے فوراً سی پھوڑ کر سلیپٹ کر دیا۔

کنجوس

بس میں سوار ایک کنجوس گریہ کم ادا کر رہا تھا اور برابر جھکڑا کیے جا رہا تھا۔ کنڈیکٹر کو جو غصہ آیا تو وہ مسافر کا بکس اٹھا کر باہر پھینکنے لگا۔ مسافر طیش میں آ کر چلا یا۔ ”ایک تو مجھ سے زیادہ کراہی جھکنے کی ٹھکر میں ہو اور پھر میرے بچے کو بھی باہر پھینک رہے ہو۔“

مرسلہ۔ راجہ شفیق، نیکو کراچی

لہجے میں بولا۔

”ہم ان کے ساتھ زبردستی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ جبکہ لیٹن پُر خیال لہجے میں بولی۔ ”اگر ہم نے ان کے ساتھ کسی قسم کا سخت برتاؤ کیا تو وہ ہمیں باقی آدمی جاکر ادا سے بھی عاق کر سکتے ہیں۔ کھانے کی میز پر وہ ایسا کرنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں۔“

”مگر ہم یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بھی تو نہیں بیٹھ سکتے؟“ بیٹر غصیلے لہجے میں بولا۔ ”میں نے اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔“

”ڈیڈ کی موت تک تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔“ جانسن نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”مگر مجھے نہیں لگتا کہ ڈیڈ اتنی جلدی اس دنیا سے رخصت ہوں گے نہ جانے ہمارا انتظار کب ختم ہوگا۔“

”اگر یہ انتظار ختم نہیں ہو رہا تو پھر اس انتظار کو اپنے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“ جبکہ لیٹن نے سفاکانہ لہجے میں کہا تو بیٹر اور جانسن بری طرح چونک پڑے۔ جبکہ لیٹن کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کا چہرہ بڑا بھیا تک لگ رہا تھا۔

”جیکو لین! کیا تمہاری بات کا وہی مطلب ہے جو میری سمجھ میں آ رہا ہے۔“ پیٹر نے تھکے لہجے میں کہا۔
 ”ہاں۔“ جیکو لین نے جواب دیا۔ ”میری بات کا وہی مطلب ہے جو تمہیں سمجھ میں آ رہا ہے کہ اگر اپنی آدمی جائداد کو کسی ٹرسٹ میں جانے سے بچانا چاہتے ہو تو ڈیو کو خاموشی کے ساتھ دوسری دنیا رخصت کرو۔ ان کی موت پر کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ سب بھی سمجھیں گے کہ وہ پیچھے ہٹنے والے ہیں۔“
 ”تم ہمیں ڈیو کو قتل کرنے کا مشورہ دے رہی ہو؟“ اس بار جانسن بولا۔ پیٹر کی طرح اس کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات موجود تھے۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیکو لین انہیں قتل جیسے مذموم اور بے لگتھل کے ارتکاب کا مشورہ بھی دے سکتے ہیں۔
 ”تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔“ جیکو لین کا لہجہ مزید سفاکانہ ہو گیا۔ ”اس مسئلے کا یہی حل ہے۔ ڈیو کی موجودہ زندگی خاصی تکلیف دہ ہے۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے روزی راتیں گزر رہے ہیں اور روز مرہ پر بھی کیوں نہ انہیں ایک ہی بار مار دیا جائے۔ بادی انظر میں دیکھا جائے تو تم انہیں قتل نہیں کرو گے بلکہ ایک تکلیف دہ زندگی سے نجات دلاؤ گے۔“
 ”مگر جیکو لین وہ ہمارے ڈیو ہیں۔ ہم اپنے باپ کو کیسے مار سکتے ہیں؟“ جانسن معترض لہجے میں بولا۔
 ”جب انہیں اس بات کا احساس نہیں رہا کہ ہم ان کی اولاد ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کا کوئی احساس نہیں ہونا چاہیے۔“ جیکو لین پر زور لہجے میں بولی۔ ”ڈیو کی کافی یا چائے میں اگر خاموشی سے زہر ملا دیا جائے تو ڈیو کو اس دکھ بھری زندگی سے نجات مل جائے گی۔“
 ”مگر ان کے لیے چائے یا کافی تو ان کا باورچی بناتا ہے۔ اس کے سامنے ہم کافی میں زہر کیسے ملائیں گے؟ اور پھر ہر کا بندوبست کہاں سے کیا جائے گا؟“ پیٹر نے کہا تو جانسن نے ایسی نگاہوں سے اسے دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ بات پیٹر نے کی ہے۔
 ”تم بھول رہے ہو پیٹر کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔“ جیکو لین نے رسانییت سے جواب دیا۔ ”زہر کا بندوبست کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ باورچی کو ڈانچ دینا بھی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔“
 ”یہ تم دونوں کی باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“ جانسن نے بے چینی سے پہلو ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے جیکو لین۔۔۔۔۔“ پیٹر نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اگر آدمی جائداد کو کسی ٹرسٹ کی قدر ہونے سے بچانا چاہتے ہو تو پھر ڈیو کو دوسری دنیا رخصت کر دینا ہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔“
 ”میں بھی تم دونوں کی طرح ڈیو کی موت کا خواہاں ہوں۔“ جانسن نے کہا۔ ”مگر تم دونوں ایک بات بھول رہے ہو اور وہ یہ کہ اگر ڈیو کی موت پر کسی کو شک ہو گیا اور معاملہ پولیس تک پہنچ گیا تو پولیس ڈیو کا پوسٹ مارٹم کروائے گی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں سب ظاہر ہو جائے گا کہ ڈیو کی موت کینسر سے نہیں بلکہ زہر سے ہوئی ہے۔ میں اس منصوبے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ میں نو جوانی میں جیل نہیں جانا چاہتا۔“ جانسن نے جیکو لین اور پیٹر کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔
 جانسن کی دلیل سے صرف نظر پیٹر کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ اپنے ڈیو کا قتل انہیں قانون کی گرفت میں بھی پھنسا سکتا ہے۔
 ”جانسن ٹھیک کہہ رہا ہے، جیکو لین۔ اس طرح تو ہم قانون کے شکنجے میں بھی پھنس سکتے ہیں۔“ پیٹر کو کچھ دیر پہلے تک اپنے ڈیو کو دوسری دنیا رخصت کرنے کے بارے میں جیکو لین کا ہنسا ہوا تھا، پولیس کا ذکر آتے ہی ہنسی ختم بن گیا۔
 ”میرے خیال میں ہمیں کچھ اور سوچنا چاہیے۔“
 ”تم دونوں بھائی بھین سے ہی خاصے ڈیو پوک اور بڑول واقع ہوئے ہو۔“ پیٹر کو پیٹر اپنے دل سے دیکھ کر جیکو لین استہزاء لہجے میں بولی۔ ”میں اب بھی کہہ رہی ہوں کہ ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے کسی کو شک نہیں ہوگا۔ بس تم دونوں کو تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“
 ”نہیں جیکو لین۔“ پیٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ڈیو کا معائنہ کرنے کے لیے ایک ڈاکٹر روزانہ آتا ہے۔ اگر ہم نے ڈیو کی چائے یا کافی میں زہر ملا دیا تو اس کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کا ڈاکٹر شک میں مبتلا ہو جائے۔ میرے خیال میں جانسن کی رائے ٹھیک ہے۔ ہمیں احتیاطاً اس تک نہیں لینا چاہیے۔“
 ”تو پھر تم دونوں بھڑ میں جاؤ۔“ جیکو لین غصیلے لہجے میں بولی۔ ”میں دوسرے کمرے میں سونے کے لیے جا رہی ہوں اور صبح ہوتے ہی واپس روانہ ہو جاؤں گی۔ بہتر ہے کہ اب ڈیو کی آدمی جائداد پر ہی اکتفا کرو۔ جو تم جیتوں میں قانون کے مطابق تقسیم ہوگی۔“

”دیکھو جیکو لین! تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔“ پیٹر نامحاشانہ لہجے میں بولا۔ ”مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ ڈیو کا ذاتی باورچی ان کے لیے چائے یا کافی تیار کرتا ہے اگر ہم میں سے کوئی بچن میں جا کر اس کی نظروں سے بچ کر کافی میں زہر ملا بھی دیتا ہے تو اس بات کی گارنٹی ہے کہ ڈیو کافی پی لیں گے؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈیو کے لیے بنائی گئی کافی ان کا خاص ملازم ڈیو یا معائنہ کے لیے آنے والا ڈاکٹر پی لیتا ہے کیونکہ ڈیو کی عادت ہے کہ وہ پہلے اپنے باورچی کو کچھ بنانے کا حکم تو دے دیتے ہیں مگر جب ان کی سن پسند ڈش تیار کر دی جاتی ہے تو اچانک ان کا موڈ بدل جاتا ہے اور وہ کافی ڈیو ڈیو نے پی تو پھر ایک صحت مند آدمی کی اچانک موت کسی کو قسم نہیں ہوگی اور معاملہ لازماً پولیس تک جائے گا۔ اس طرح ہم مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔“
 ”مجھے اپنے بڑول اور ڈیو پوک بھائیوں سے اسی جواب کی توقع تھی۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے اندر ہمت و جرأت کا فقدان ہے؟ بہر حال میں سونے جا رہی ہوں۔ اب جائداد کا نصف ہی ہماری ملکیت میں آئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے جیکو لین ابھی اور پیٹر بھینچی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ پیٹر اور جانسن نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اگرچہ وہ دل ہی دل میں جیکو لین کی اس تجویز سے متفق تھے کہ جائداد بچانے کے لیے ڈیو کو دوسری دنیا رخصت کر دینا بہتر ہے مگر اپنی بڑولانہ طبیعت کی وجہ سے وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔ پولیس کا خیال آتے ہی ان کا دل دھلنے لگا تھا اور انہوں نے جیکو لین کو بھی انکار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے جیکو لین ان سے ناراض ہو کر کمرے سے چلی گئی تھی۔
 جیکو لین اگلے دن صبح سویرے ہی واپس روانہ ہو گئی۔ اس نے جانے وقت پیٹر جانسن یا اپنے ڈیو سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کافی دنوں تک اس نے نہ ہی انہیں فون کیا اور نہ ہی وہ مسٹر ہارڈ سے ملنے کے لیے آئی۔
 پیٹر اور جانسن کی زندگی بھی پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں اب آدمی دولت پر ہی اکتفا کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے مسٹر ہارڈ کو کئی مرتبہ اپنے خاص ملازم ڈیو اور ڈیو راتیر کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جاتے بھی دیکھا تھا۔
 پیٹر اور جانسن کو یقین تھا کہ ان کے والد گاڑی میں اپنے والدہ کی ٹیم سے ملے جاتے ہیں۔ شاید وہ اپنی وصیت

تیار کر رہے تھے۔ جس کے مطابق آدمی جائداد ان کی اولاد کے لیے اور آدمی کسی ٹرسٹ کے نام کی جاتی تھی۔
 پیٹر اور جانسن اب بڑی بے چینی سے اپنے باپ کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد ان کے ڈیو کی آدمی جائداد ان کے قبضے میں آجائے۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور ایک دن مسٹر ہارڈ انتقال کر گئے۔
 پیچھے چھڑوں کے علاوہ کینسر میں مبتلا مسٹر ہارڈ بالآخر موت سے ہار گئے تھے۔ جیکو لین بھی اپنے والد کی موت کی خبر سنتے ہی کچھ گھٹی۔ مسٹر ہارڈ کی موت پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تاننا بندھ گیا۔
 پیٹر، جانسن اور جیکو لین تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعزیت قبول کرنے کے لیے موجود تھے۔ شام تک مسٹر ہارڈ کی آخری رسومات ادا کرتے ہوئے انہیں ایک تابوت میں ڈال کر سپرد خاک بھی کر دیا گیا۔
 جب مسٹر ہارڈ کے تابوت کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو جیکو لین ہچکچاہٹ لے لے کر رونے لگی اور اس کے آس پاس موجود مرد و خواتین اسے تسلی دینے لگے۔
 پیٹر اور جانسن اپنی بہن کو روتے دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ جیکو لین کو یقیناً ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعی کمال کی ایکٹر تھی۔ ورنہ مسٹر ہارڈ کی موت پر ان دونوں سے ایسی خوشی چھپانے نہیں چھپ رہی تھی۔
 مسٹر ہارڈ کے تابوت کو سپرد خاک کرنے کے بعد پیٹر، جانسن اور جیکو لین گھر واپس آ گئے۔ اب تعزیت کرنے والے افراد کی بھی خاصی بڑی تعداد واپس جا چکی تھی۔ تاہم کچھ قریبی عزیز و اقارب اب بھی موجود تھے۔
 پیٹر، جانسن اور جیکو لین اپنے ان رشتے داروں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جیکو لین کا چہرہ رونے کی وجہ سے سو جھٹکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے دکھ اور غم کے تاثرات موجود تھے۔ وہ واقعی میں غصہ کی اداکاری کر رہی تھی۔
 عین اسی لمحے ڈرائنگ روم میں ایک بوڑھا شخص داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ان تینوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ان کے ڈیو مسٹر ہارڈ کے والدہ کی ٹیم کا ایک سینئر وکیل تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کی وردی میں ٹیموں ایک سار جنت بھی تھا۔
 وکیل کی آمد کا مقصد تو سب کی سمجھ میں آتا تھا۔ شاید وہ مرحوم مسٹر ہارڈ کی وصیت کے بارے میں بات کرنے آیا تھا مگر اس کے ساتھ ایک پولیس افسر کی آمد کی وجہ جیکو لین، پیٹر اور جانسن میں سے کوئی بھی نہ سمجھ پایا۔ وہ پولیس افسر

عقباتی نظروں سے ڈرانگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔
 ”مسٹر پیٹر یقیناً آپ مجھے جانتے ہوں گے۔ میں آپ کے مرحوم ڈیڈ مسٹر ہارڈ کا وکیل ہوں۔“ اس بوڑھے نے پیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ سے..... آپ کے بھائی جانسن اور بہن جیکو لین سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ میں آپ کے مرحوم والد مسٹر ہارڈ کی وصیت کے سلسلے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔“

”میں آپ کو جانتا ہوں۔“ پیٹر نے جھنجھکی ادا میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا نام مسٹر مورس ہے اور آپ میرے مرحوم ڈیڈ کے خاٹے پرانے دکھاء میں شامل ہیں۔ مگر وصیت کے معاملات چند دنوں بعد بھی تو حل کیے جا سکتے ہیں..... اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی تو ہمارے گھر میں تعزیت کے لیے آئے ہوئے عزیز واقارب بھی موجود ہیں۔“

”آپ کے ڈیڈ مسٹر ہارڈ کی وصیت میں اسی بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ان کی موت کے بعد جیسے ہی ان کی تدفین ہو جائے اس وصیت پر فوری طور پر عمل درآمد کرایا جائے۔ اس لیے مجھے مجبوراً آنا پڑا ہے۔“ مورس نامی وکیل نے جواب دیا۔

”مگر اتنی جلدی بھی کیا جلدی تھی۔“ اس بار جانسن نے اعتراض کرنا چاہا مگر مورس کے ساتھ آئے ہوئے سار جنٹ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”بھتر ہے کہ آپ تینوں بہن بھائی علیحدگی میں مسٹر مورس کی بات سن لیں۔“ سار جنٹ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اوکے..... پیٹر نے مومنے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر ایک طرف بیٹھے جانسن اور جیکو لین بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آج وکیل صاحب۔“ پیٹر نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مورس نامی وکیل، جانسن اور جیکو لین بھی اس کے پیچھے ہوئے جبکہ پولیس افسر وہیں کھڑا رہا۔

”اب بتائیں مسٹر مورس کہ آپ کو ڈیڈ کی وصیت کے بارے میں اتنی جلدی کیوں ہے؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی پیٹر نے اس بوڑھے وکیل سے سوال کیا۔

”بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ گھر خالی کرنا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق جیکو لین تو یہاں رہائش پذیر نہیں ہے۔ یہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے مگر آپ دونوں بھائی اسی گھر میں رہتے ہیں۔ بہر حال آپ کو اس گھر سے ماسوائے اپنے کپڑوں کے کسی اور شے کو لے جانے کی

اجازت نہیں ہے۔ آپ کے والد نے آپ کو بتایا ہی ہوگا کہ وہ اپنی آدمی جانکاد ایک ٹرسٹ کے نام کر رہے ہیں۔“ مورس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”مگر بانی آدمی جانکاد تو ہمارے نام ہی ہے پھر آپ ہمیں یہ گھر خالی کرنے کا کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ گھر بھی ٹرسٹ کے نام چلا گیا ہے؟“ پیٹر نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی طرح جانسن اور جیکو لین کے چہرے پر بھی مورس کی بات سن کر حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

”یہ گھر آپ تینوں بہن بھائیوں کے نام ہی ہے۔“ مورس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کے والد نے اپنی آدمی جانکاد بھی آپ تینوں کے نام ہی ہے مگر اس جانکاد کو آپ تینوں کے حوالے کرنے کے سلسلے میں آپ کے مرحوم والد نے اپنی وصیت میں کچھ قواعد وضوابط اور شرائط بھی عائد کی ہیں اور اب یہ پیریز ڈس واری ہے کہ میں آپ تینوں سے ان شرائط کی پاسداری کراؤں۔ بہر حال پہلے آپ یہ خط پڑھ لیں۔ یہ آپ کے والد نے اپنی وصیت تیار کراتے وقت مجھے دیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مورس نے جیب سے ایک سرسبز لفافہ نکال کر پیٹر کے حوالے کر دیا۔ ”میں نے یہ خط پڑھا تو نہیں مگر آپ کے ڈیڈ نے مجھے بتایا تھا کہ اس خط میں انہوں نے وہ تمام وجوہات لکھ دی ہیں جن کی بنا پر وہ یہ وصیت تیار کرانے پر مجبور ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس خط کو پڑھتے وقت ان کے دونوں بیٹوں اور بیٹی کے سوا اور کوئی موجود نہ ہو۔ اس لیے میں باہر آپ لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اپنے آخری الفاظ ادا کرتے ہی مورس کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کر دیا۔

”یہ کیسا خط ہے؟“ جانسن نے پیٹر کے ہاتھوں میں موجود لفافہ دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ خط سرسبز ہے۔“ پیٹر پر خیال لگے میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ڈیڈ چاہتے تھے کہ یہ خط ہمارے سوا کوئی اور نہ پڑھے۔“

”اسے کھولو تو۔“ جیکو لین بے چین لہجے میں بولی تو پیٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لفافہ کھول کر اس میں موجود نقیص کاغذ نکال لیا۔ تحریر خاصے خوشخط انداز میں لکھی گئی تھی۔ جیکو لین اور جانسن پیٹر کے شانہ بشان کھڑے ہو گئے۔ اب وہ تینوں بیک وقت اپنے باپ کی لکھی گئی اس آخری تحریر کو پڑھ سکتے تھے۔ ان کے والد مسٹر ہارڈ نے وہ

خط کچھ اس طرح شروع کیا تھا۔

”میری وصیت کے مطابق یہ خط تم تینوں کو اس وقت ملے گا جب میں اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہوں گا۔ دے تو میری وصیت کے بارے میں تمہیں میرے دکھائی ٹیم کے انچارج مسٹر مورس سے بھی معلوم ہو جائے گا۔ تاہم پھر بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تم تینوں کو اس قسم کی وصیت تیار کروانے کی وجوہات سے آگاہ کروں، مگر اس سے پہلے میں اپنی اولاد کو کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں یا یوں سمجھ لو کہ کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

”جب تمہاری ماں کا انتقال ہوا تو عزیز واقارب کے مشوروں اور خواہش کے باوجود میں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے نہیں کی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پر سوتیلی ماں کا سایہ بھی پڑے۔ میں نے اپنی تمام خواہشات کا گلا کھوٹ دیا..... اپنی اولاد کی خاطر اور پوری زندگی یونہی گزاری۔ حالانکہ تمہاری ماں کی موت کے وقت میں جوان تھا۔“

”اگرچہ میں کچھ سخت گیر طبیعت کا مالک بھی واقع ہوا تھا مگر اس کے باوجود میں نے تمہاری پرورش بڑی محبت اور چاہت سے کی اور تمہاری ہر جائز ضرورت بھی پوری کی۔ میں نے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے بھی وہ تمام جن کیمے جو بطور باپ میرے فرائض میں شامل تھے مگر افسوس کہ تم تینوں میں سے صرف جیکو لین ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر پائی۔ اگرچہ جانسن اور پیٹر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر پائے تھے اور میں انہیں کامل، کام چور اور نکاح سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے ان کی زندگی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ آخر وہ میرے بیٹے تھے۔“

”زندگی یونہی گزری تھی مگر پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ میں پیچھڑوں کے علاوہ مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں اور اب اس دنیا میں کچھ ہی عرصے کا مہمان ہوں۔ یہ خبر میرے لیے بڑی روح فرسائی۔ زندگی چھن جانے کا احساس کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا صحیح انداز مجھے اسی وقت ہوا۔ بہر حال میرا مرض علاوہ اس لیے میں نے اسپتال کے بجائے گھر پر ہی اپنی زندگی کے آخری ایام گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا تھا کہ یہ خبر میری اولاد پر بھی بجلی بن کر گرے گی اور میرے بیٹے اور بیٹی پر وقت میری تیمارداری میں لگے رہیں گے۔ چلو اپنی اولاد کے ساتھ ہشتے کھیلے میرا آخری وقت اچھا کٹ جائے گا۔ یہ ایک بے وقوف باپ کی اپنی اولاد کی بابت خوش فہمیاں تھیں جو جلد ہی دور ہو گئیں۔ جیکو لین اپنی نوکری کی نجور یوں کاروبار کر بیٹھے ہیں ایک آدمہ باری مجھ سے ملنے

آئی۔ جبکہ میرے دونوں بیٹے بھی کبھی کبھار ہی میرے کمرے کا رخ کرتے تھے۔ میں بس اپنے ملازمین کے ساتھ ہی بات چیت کر کے وقت گزار لیتا تھا۔

”ان دنوں اپنی اولاد کی عدم توجہ کا شکار ہو کر مجھے بڑی شدت سے اپنی کم مائیگی اور بے توقیری کا احساس ہونے لگا۔ میری سگی اولاد میرے ساتھ ایسا کرے گی، کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے ان کی بڑی محبت اور توجہ سے پرورش کی تھی مگر جب مجھے ان کی توجہ اور محبت کی ضرورت تھی تو وہ مجھ سے گویا بالاتعلق سے ہونگے تھے۔ میں اس وقت بیماری کی وجہ سے جسمانی اذیت میں تو مبتلا تھا ہی مگر اپنی اولاد کے رویے نے مجھے ذہنی اذیت میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔“

”ان دنوں میں نے مختلف خیراتی اداروں کو چندے کے طور پر رقم دینا شروع کر دی۔ اس طرح مجھے خاصا کٹلی سکون حاصل ہونے لگا۔“

”میں جانتا چاہتا تھا کہ میری اولاد مجھ سے اتنا بالاتعلق ہو کر کیوں بیٹھ گئی ہے؟ میرے دونوں بیٹے میری موجودگی میں کیا بات چیت کرتے ہیں؟ اپنی اس تجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ایک انوکھا آئینہ یا سوچا اور میں نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے پیٹر اور جانسن کے مشترکہ کمرے میں ایک خفیہ کیمرا نصب کرا دیا۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر شخص شغل کے طور پر یہ حرکت کی تھی کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ میرے دونوں بیٹے اپنے کمرے میں میرے بارے میں کیا گفتگو کرتے ہیں؟ کیمرا نصب ہونے کے بعد اب میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک چھوٹی سی اسکرین پر پیٹر اور جانسن کی تمام گفتگو سن سکتا تھا اور انہیں دیکھ بھی سکتا تھا۔

”کہتے ہیں کہ علم قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے مگر کبھی کبھی لاعلمی بھی قدرت کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے بیٹوں کے مشترکہ کمرے میں خفیہ کیمرا نصب کر دیا کہ اس نعمت کو خود ہی ٹھوکر مار دی تھی۔“

”یہ بڑا کرناک اور اذیت ناک احساس تھا۔ کاش میں اس بات سے انجمن رہتا کہ میرے بیٹے جانکاد حاصل کرنے کے لیے میری موت کے خواہاں ہیں۔ ان سے اب مزید صبر نہیں ہو رہا۔ انہیں یہ بات بھی سخت ناگوار گزری ہے کہ ان کے باپ نے ایک ٹرسٹ کو بچاس ہزار ڈالر دے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے بات کرنے کے لیے میری بیٹی جیکو لین کو بھی بلا لیا ہے۔ بہر حال جیکو لین آئی اور میں نے کھانے کی میز پر تم تینوں کو صاف صاف بتا



موت سے پہلے

منظف رامام

محبت میں اکثر ناکام عاشق اپنی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ جو لمحے لمحے سے خوشی کشید کرنا چاہتا تھا، مقدر نے اتنا ہی اسے اندھیروں میں ڈھکیل دیا، اور جب زندگی کی واحد خوشی نے بھی منہ موڑ لیا تو اس کے پاس جیتنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔

قدم قدم پر ٹھوکر کھانے والے ایک مجبور بے بس عاشق کا اجرا

زندگی اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ لیکن اب اسے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ اسے مرنا تھا۔ موت جو تمام قوموں سے نجات دلا دیتی ہے۔ انسان سکھ اور بے کسی کی چار اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ کوئی اس کو پریشان کرنے والا نہیں ہوتا۔ وقار اور بے وفائی کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں چاہے کچھ بھی ہوتا رہے، اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس نے سنا تھا کہ انکیشن میں ایک پارٹی نے دھاندلی کی ہے۔ دوسری پارٹیاں اس کے خلاف انکیشن لے رہی ہیں۔ دوسری طرف دنیا میں ایسی جنگ کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن سب اندیشے زندہ لوگوں کے ہوتے ہیں۔ موت کے بعد کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

کے بعد میں نے تم تینوں کے لیے ایک انوکھی سزا سوچ لی۔ سزائے انتظار..... یعنی انتظار کی سزا۔ تم تینوں سے چند ماہ کا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ بیڑ اور جاسن فوری طور پر میری موت کے خواہاں تھے۔ جیکو لین بھی یہی خواہش رکھتی تھی کیونکہ اسے اپنا ذاتی کلیک بنانا تھا مگر اب میرے مرنے کے بعد بھی تمہارا انتظار ختم نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارے اس انتظار کو بہت طویل کر دیا ہے۔ میری آدھی جائیداد ٹرسٹ کو ملے گی اور میری موت کے فوراً بعد ملے گی مگر میری باقی آدھی جائیداد میری اولاد کو اپنے باپ کی موت کے تیس برس بعد ملے گی۔ تم تینوں میں برس تک اس گھر میں بھی داخل نہیں ہو سکو گے۔ جاسن اور بیڑ کو اس گھر سے صرف اپنے کپڑے لے جانے کی اجازت ہوگی۔ میرے تمام ملازمین جن کا انچارج میرا خاص اور بااعتماد ملازم بیڑ ہے، اس گھر کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوگا۔ ملازمین کو تیس سال کی ایڑوائس بخواہی جانی جائے گی۔

”وصیت کے ساتھ میری ذہنی صحت کا ایک سرٹیفکیٹ بھی منسلک کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے باکل قرار دے کر تم تینوں اس وصیت کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکو گے۔ تم تینوں سے تھوڑا سا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اب تمہیں تیس برس تک صبر کرنا ہوگا۔ جیکو لین کو ذاتی کلیک بنانے کا خواب تیس برس تک بھٹو کرنا ہوگا۔ بیڑ اور جاسن کو تیس برس تک اپنے ٹل بوتے پر جینا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت سے پہلے انہیں جائیداد میں سے ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ ان دونوں کو اپنی رہائش کا انتظام بھی خود کرنا ہوگا۔

”میرے وکلاء کی ٹیم کے سینئر وکیل مسز مورس اب میری وصیت پر عمل درآمد کروائیں گے اور اس سلسلے میں وہ پولیس کا تعاون حاصل کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر بیڑ اور جاسن نے کوئی پرتشدد مزاحمت کی تو انہیں جیل بھی جانا پڑ سکتا ہے۔ ویسے وہ دونوں خاصے بزدل واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے پرتشدد مزاحمت کے چانس خاصے کم ہیں۔ سزائے انتظار..... ایک ٹکٹ خوردہ اور زخم خوردہ باپ کی طرف سے اپنی خود غرض اولاد کو دی جانے والی سزا کا نام ہے۔ اب تم ایک دین کن گرتیں برس پورا ہونے کا انتظار کرو گے۔ اگر تم نے میرا خط پڑھ لیا ہے تو پھر اپنی خود غرضی کا شہیاد جھٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ تمہاری سزائے انتظار کا آغاز ہو گیا ہے۔ تمہارا ابد نصیب باپ..... ہارڈ۔“

دیا کہ میں اپنی آدھی دولت ایک ٹرسٹ کو دے رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر میں نے تم تینوں کی وہ گفتگو سنی جو تم نے کمرے میں جا کر کی تھی۔ ”یہ سن کر دو جگہ کھڑے ہو گئے کہ جیکو لین نے اپنے بھائیوں کو مجھے راستے سے ہٹانے کا مشورہ دیا۔ اگر میں نے جیکو لین کو اسکرین پر اپنی آنکھوں سے یہ بات بیڑ اور جاسن سے کہتے نہ سنا ہوتا تو شاید میں کبھی یقین نہ کرتا کہ میری بڑی لکھی ہوئی اپنی آنکھوں اور غریبی سوچ کی مالک ہو سکتی ہے مگر مجھے یقین کرنا پڑا۔ اب کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا تو غلط نہیں ہو سکتا۔“

”میرے دونوں بھائی بیڑوں کے تو کیا ہی کہتے۔ انہوں نے آپس میں گفتگو و تشدد کرنے کے بعد جیکو لین کی تجویز رد کر دی مگر اس لیے نہیں کہ ان کے دل میں اپنے باپ کے لیے عزت یا احترام کا کوئی جذبہ موجود تھا بلکہ انہوں نے یہ تجویز اس لیے رد کر دی کہ انہیں پکڑے جانے کا خوف تھا۔ میرے دونوں بیٹے بچپن سے ہی خاصے بزدل واقع ہوئے ہیں۔ ”اپنی تجویز رد ہونے کے بعد اگلے دن جیکو لین واپس چلی گئی اور پھر جب تم دونوں اپنے معمول کے مطابق آوارہ گردی کرنے نکلے تو میں نے بھی اپنے ملازم کے ذریعے تمہارے کمرے سے وہ کبیرا اتر دیا کیونکہ مجھے اب مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے سامنے میری اولاد کے اصل چہرے ظاہر ہو چکے تھے۔

”اپنی اولاد کے چہرے بے نقاب ہونے کے بعد میرے اندر بچنے کی قناعت ختم ہوئی۔ میں حسرت و داس کی ایک تصویر بن کر رہ گیا۔ میں نے سنا تھا کہ ہمارے معاشرے میں دولت حاصل کرنے کی دوڑ نے رشتوں کا تقدس ہمال کر دیا ہے۔ اپنی اولاد کی صورت میں، میں اس کا عملی نمونہ بھی دیکھ چکا تھا۔

”میں نے اس کیمبرے کی تمام ریکارڈنگ ضائع کر دی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی اولاد سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ویڈیو ریکارڈنگ کو کوئی دوسرا دیکھے اور کہے کہ مسٹر ہارڈ کی اولاد اتنی گھٹیا خود غرض ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ ساتھ میری تربیت پر بھی آنکلی اٹھتی۔ ”بہر حال اس وقت میں نے بھی ایک فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ تم تینوں کو کوئی ایسی سزا دوں کہ تمہیں زندگی بھر اپنی خود غرضی اور گھٹیا پن کا احساس ہوتا رہے۔ چاہتا تو تم تینوں کو اپنی جائیداد سے عاقق کر دیتا مگر مجھے لگا کہ یہ تمہارے لیے مناسب سزا نہ ہوگی اور پھر بڑی سوچ بچار

اس کے سامنے کئی بچہ کھیل رہے تھے۔ یہ بچے زندگی سے بھرپور تھے۔ ان کے شور سے پورا پارک گونج رہا تھا۔ وہ پارک ایک ایسے لمبے کے قریب تھا جس کے بچے سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ حمید نے اپنی موت کے لیے جو طریقہ سوچا تھا وہ بہت آسان تھا۔ اسے لمبے کے اوپر جا کر کھڑے ہو جانا تھا اور آنے والی ریل کو دیکھتے رہنا تھا۔ ریل جیسے ہی قریب آتی وہ پل سے چھلانگ لگا دیتا۔ دو پہیوں پر ریل اس کے جسم کے ٹکڑے کرتی ہوئی گزر جاتی۔ کہاں کی ختم۔ نہ کوئی، ابھن نہ کوئی پریشانی۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا۔ کہیں مزار ہوتا۔

ایک لڑکے کی بال اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے بال اٹھا لی۔ وہ لڑکا بھی دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ”اگلے بال میری ہے۔“ اس نے کہا۔

”چھا۔“ حمید مسکرایا۔ اتنی دیر کے بعد وہ مسکرایا تھا۔ اس نے بال واپس کر دی۔ وہ لڑکا اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔

اس نے وقت دیکھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔

یادوں نے اس پر حملہ کر رکھا تھا۔ جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے سے ایک ساتھ نکل پڑی ہوں۔ کیسی کیسی یادیں..... بچپن کی..... اسکول کی، اس زمانے کے دوستوں کی..... اس زمانے کے مزیدار کھیلوں کی، آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کی..... اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جب انسان کا آخری وقت قریب آتا ہے تو دنیا بھر کی یادیں اس کو گھیر لیتی ہیں۔

دھندلے موت کے لئے کرجب افتاد آتے ہیں مجھے بھولے ہوئے لوگوں کے چہرے یاد آتے ہیں ایسا ہی اس وقت ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کاسیالی تو بہت تھی۔ تاکامی ہی تاکامی تھی۔ سخت محنت اور کوشش کے باوجود وہ زندگی کے کسی لحاظ پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نہ جانے کچھ لوگوں کی نقد پر ایسی کیوں ہوتی ہے؟

اس کے والدین ایک ساتھ ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ زندہ رہ جانے والا صرف وہ تھا۔ زخمی تو وہ بھی ہوا تھا لیکن اس کو موت نہیں آئی تھی۔ وہ اسپتال سے اپنے چاچا کے گھر آ گیا تھا، کیونکہ وہی اب بڑے تھے۔

اس کے باپ کے پاس جانکا دنام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنا گھر تک نہیں تھا۔ یہ لوگ کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس کا باپ ایک ٹیکسری میں

بہر داز رہتا تھا۔ اتنی خواہ مل جاتی تھی کہ جیسے تیسے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کی ماں کپڑے بھی سیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں یہ ہتھ تھا جو اس وقت کام آ رہا تھا۔

اس کے باپ نے حمید کو ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔

وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے کی کامیابیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ نہ جانے کیسے خواب ان کی آنکھوں میں ہوں گے۔ خواہشوں کا بھی حال ہوا کرتا تھا اور جب یہ خواب بکھر جائیں تو ایک ایسے کرب کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جس کا بیان ناممکن ہوتا ہے۔

اس نے میٹرک کیا۔ آگے بڑھتا رہا، ماسٹر تک کر لیا لیکن اس کے لیے خواب دیکھنے والے ہی نہیں رہے۔ اس کے والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ وہ زخمی ہو کر اپنے چاچا کے گھر آ گیا۔

چاچا اسے اپنے گھر میں زیادہ عرصہ نہیں رکھ سکے۔ کیونکہ حمید نے ان کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ شروع ہی سے انتہائی بدتمیز اور چھوڑ لڑکی تھی۔ حمید کے ماں باپ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کو اپنی بیوی بنا کر ان کی روجوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اسے اس گھر سے لکھنا پڑا جبکہ اس لڑکی کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی۔

حمید اپنے چاچا کے گھر سے کچھ دنوں کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس آ گیا۔ یہ قیمت تھا کہ اس کی جاب مل گئی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔

اس نے کچھ دنوں کے بعد ایک چھوٹا سا قلیت کرائے پر لے لیا۔ یہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

وہ جہاں بھی جاتا، اس سے دریافت کیا جاتا۔ ”بھائی آپ کی فلیٹ کتنی ہے؟“

”نہیں بھائی، میری کوئی فلیٹ نہیں ہے۔“ جب وہ جواب دیتا تو لوگ بدک جاتے۔

”نہیں بھائی، ہم کسی ایسے کو قلیت نہیں دے سکتے جس کی کوئی فلیٹ نہ ہو۔“

”اگر کسی کے ماں باپ مر چکے ہوں، اس کا کوئی نہ ہو تو کیا اس کے لیے اس معاشرے میں کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا؟ کیا وہ سڑکوں پر رہا کرے؟ کیا کرے؟“

”بھائی، جذباتی یا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔ یہ ہمارا اصول ہے۔“

اس طرح کی زندگی تھی اس کی۔ کوئی خوشی نہیں کوئی امید نہیں۔ ہر طرف مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں اس کی ملاقات نورین سے ہو گئی۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی جس نے حمید سے محبت کی۔ اس کو اپنانے کا اہتمام کیا۔

حمید نے بتایا اسے زندگی میں سوائے محرومیوں کے اور کچھ بھی نہیں ملا۔

نورین مسکرا دی۔ بہت ہی امید افزا مسکراہٹ تھی اس کی۔ ”تو کیا ہوا؟ کیا تم زندگی کی دوز سے ٹھک کر بیٹھ جانا چاہتے ہو؟“

”بیٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اب نہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ اب تم مل گئی ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے جینے کا ایک نیا حوصلہ مل گیا ہے۔ اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوری توانائی کے ساتھ۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ نورین چمک اٹھی۔ ”اے کہتے ہیں مردانگی۔ پتا نہیں لوگ ہر ایسے سوچ پر مردانگی کیوں کہتے ہیں۔ یا عورت میں بھی تو بہت ہوتی ہے۔ حوصلہ ہوتا ہے تو مردانگی کی ضد میں اسے عورتانگی کیوں نہیں کہتے؟“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ خیر میں اس پر احتجاج کروں گا۔ تم اطمینان رکھو۔“

اس دن دونوں کے موڈ بہت خوشگوار تھے۔ خاص طور پر حمید بہت خوش تھا۔ اس قسم کی کوئی خوشی اسے پہلی بار ملی تھی۔

اس کے بعد اس کے حالات میں بہتری آئی شروع ہو گئی۔ وہ جس دفتر میں کام کرنے لگا تھا، اس کے پاس نے یہ عندیہ دیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد اسے ہیڈ بنا دیا جائے گا۔ کسی نے کہا تھا کہ اگر انسان کو محبت حاصل ہو جائے اور یہ محبت خالص ہو تو اس پر برکتیں نازل ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ قدرت اس کی مدد کرنے لگتی ہے۔ شاید اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔

اسے نورین کی محبت بھی حاصل ہو گئی تھی اور اس کے لیے اس کا نام بھی پیدا ہونے لگے تھے۔

وہ اپنی دنیا کی جنت بنانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ دونوں شام کا وقت اسی پارک میں گزارا کرتے۔ نورین کو ریل گاڑی کی سیٹی بہت پسند تھی۔ وہ کہا کرتی۔ ”یہ جو ریل ہوئی ہے، یہ انسان کو زندگی کے سفر کی یاد دہانی کرائی دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگی بھر کسی ریل ہی میں

سنہریے اصول

☆ جو باتیں تم لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتے، ان کی پیٹھ پیچھے بھی مت کرو۔

☆ زندگی کی راہوں میں اس طرح پھول بکھیرو کہ جب پیچھے مڑ کر دیکھو تو گلستان نظر آئے۔

☆ احسان کا بدلہ ادا نہ کر سکو تو زبان سے شکریہ ضرور ادا کرو۔

☆ اپنے زخم ایسے لوگوں کو مت دکھاؤ جن کے پاس مرہم نہ ہو۔

☆ محبت کے سمندر میں وہ لمحہ تلاش کرو جو تمہیں سب سے ممتاز بنا دے۔

☆ جو کچھ مانگتا ہے، اپنے رب سے مانگ۔ جو واپسی کا تقاضہ نہیں کرتا۔

☆ شمع بن کر بزم ہستی میں زندگی بسر کرو تاکہ دوسرے بھی منور ہو سکیں۔

☆ جس آدمی کے پاس کتاب ہو۔ وہ تنہا نہیں رہتا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن اہلال

سفر کرتی رہوں۔“

”بالکل، بالکل ایسی ہی سوچ میری بھی ہے۔ میں اسی لیے اس پارک میں آتا ہوں کہ یہاں پارک کی دلچسپی بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے اور ریل کی آوازیں بھی کسی انجانی منزل کی طرف بلاتی ہیں۔“

”پتو۔ منزل انجانی سہی لیکن ہمیں ایک عہد ضرور کر لینا چاہیے۔“ نورین نے کہا۔

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ زندگی کا سفر چاہے جیسا بھی ہو ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔“

حمید یہ سن کر سرشار ہو گیا تھا۔ کل کا بد قسمت انسان آج کا خوش نصیب ترین انسان بن گیا تھا۔ نورین بھی لڑکی نے اس اعزاز سے الفت کا اظہار کیا تھا لیکن ہیٹھ کی طرح اس بار بھی اس کے ساتھ محرومیوں کا چکر شروع ہو گیا۔

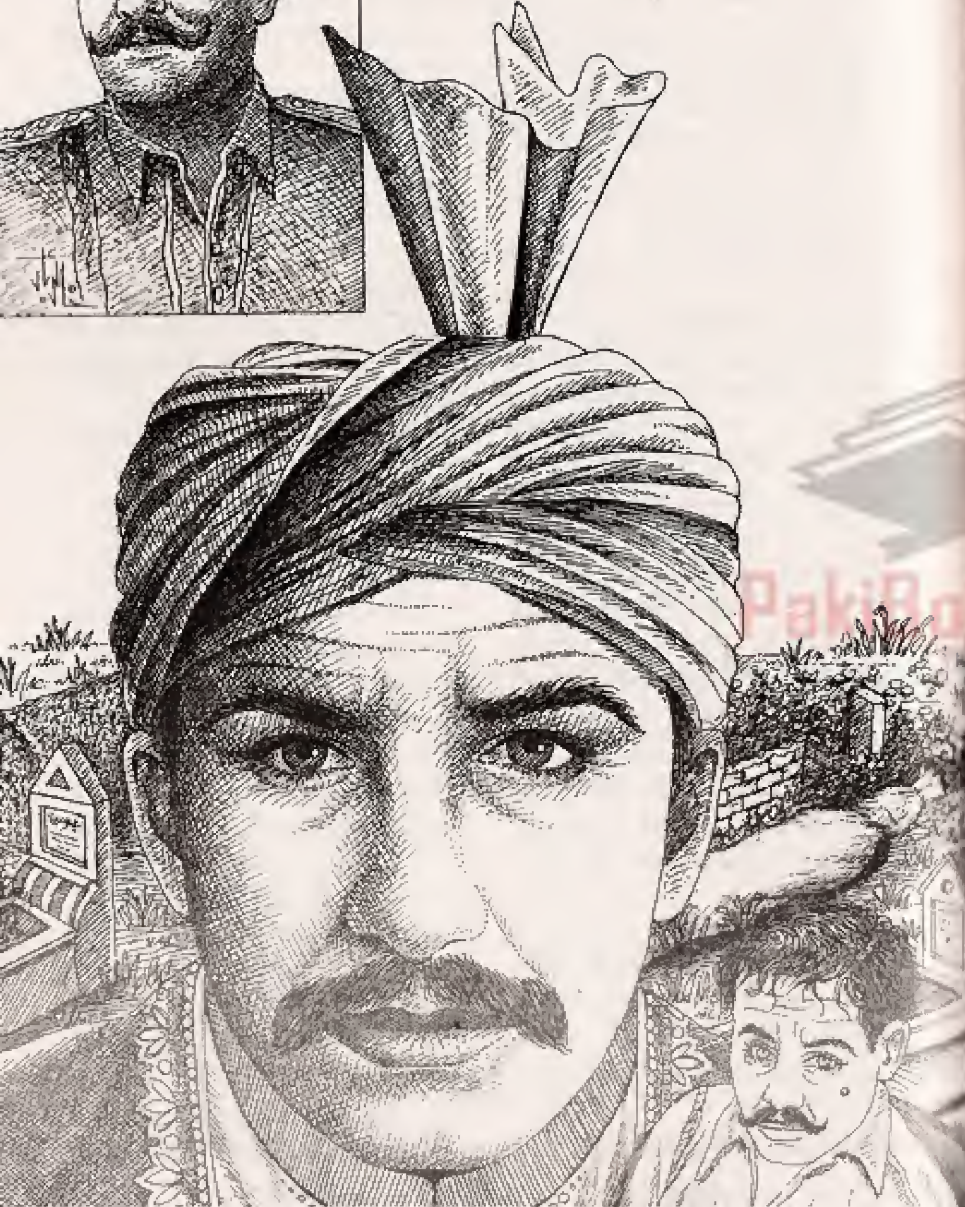
سب سے پہلے دفتر سے اسے مایوسی ہوئی تھی۔

اس کے پاس نے اس سے کہا تھا۔ ”مسٹر حمید بھیرا خیال تھا کہ میں تمہیں ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دوں گا لیکن اب

2010 21

چاروناچار

ملک مسند حیات



اقتدار کی ہوس چاہے کسی بھی سطح پر ہو ہمیشہ غلط سمت میں سفر کرتی ہے اور اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں پیروں تلے روندتی ہوئی انتہائی سفاکی سے آگے بڑھتی ہے... یہ ہوس جس کے دل میں بھی گھر کر جائے اور اسے اگر اپنے سگے بہن بھائی بھی بوجھ محسوس ہونے لگیں تو ان کے خون سے بھی ہاتھ رنگنے میں وہ دیر نہیں کرتا... اب یہ اور بات کہ اس غلطی کا احساس اسے تمام عمر خون کے آنسو رلانے مگر وقت نکل جانے کے بعد ایسی غلطیوں کی تلافی بھی ممکن نہیں ہوتی... سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں بچتا... لیکن پچھاؤں کے باوجود مجرموں کے لیے وقف سزا اس کی منتظر رہتی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی فرار حاصل کرنا چاہے مگر ملک صدف جیسے قانون کے محافظ اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچاتے ہیں۔

ملک صاحب کی تیش کے پیچھے انداز اور مجرموں کا عبرت ناک انجام

اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”میں دڑے رانا صاحب، رانا مظفر کا چھوٹا بیٹا ہوں گی۔“ پھر اس نے لاچار شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اس ذلیل انسان نے بڑی گھٹیا حرکت کی ہے تمہارے دار صاحب۔“

میں رانا مظفر سے بھی ملا نہیں تھا، صرف اس کا نام سن رکھا تھا۔ رانا مظفر موضع ظفر پور کا چودھری تھا۔ ظفر پور گاؤں کا نام مظفر کے والد چودھری رانا ظفر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ موضع ظفر پور میرے قحانے سے ایک میل کے فاصلے پر شرق میں واقع تھا۔ رانا ریاض کے نام سے تعارف کرانے والے اس نوجوان کی عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ شغل سے خسرور اور بات چیت سے خاصا اونکھا لگتا تھا۔ رانا ریاض جس شخص کو زدوکوب کر رہا تھا، اس کا نام

ایک ٹھنڈی ٹھارہ میں حسب معمول تیار ہو کر قحانے پہنچا تو ایک عجیب و غریب ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ میں نے قحانے کے برآمدے میں لگ بھگ نصف درجن افراد کو دیکھا جن میں دو نما یاں تھے۔ ایک انتہائی غریب، مجبور اور مسکین صورت جبکہ دوسرا خوش لباس، صاحب ثروت اور رعب داب والا تھا۔ طاقتور، کمزور کو دبانے، ڈرانے اور دھمکانے کے لیے لات جوتے سے اس بے چارے کی مرمت کر رہا تھا۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے...؟“ میں نے یہ آواز بلند کہا پھر زور آور خوش حال صورت شخص کو گھورنے لگا۔

”میرا نام رانا ریاض ہے جناب۔“ دودڑے بھر سے

ہوئے کہا۔ ”شکر ہے!“

اصل میں، صغریٰ بی بی کی لاش کی بے حرمی کے حوالے سے میں جس خطرناک بلکہ شرمناک زاویے پر سوچ رہا تھا، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ مجھے شکر ادا کرتے سن کر رانا ریاض نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! کیا آپ اس واقعے کو بہت معمولی سمجھ رہے ہیں؟“

”نہیں ریاض، ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کی تضحیک کے لیے جلدی سے وضاحت کر دی۔ ”میری نظر میں یہ ایک انتہائی افسوسناک اور قابلِ مذمت واقعہ ہے۔ خیر، تم مجھے بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا؟“

”جناب! میں غصے کے عالم میں سیدھا گورکن کے پاس پہنچا۔“ وہ اپنی کارگزاری سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بتاتے لگا۔ ”یہ ذلیل انسان بڑے مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے لائیں مار کر اسے جگایا اور اس واقعے کے بارے میں پوچھتا چھٹی۔ اس نے اپنی عملی لاشی ظاہر کر دی لیکن تھانے دار صاحب! مجھے اس تک حرام کی بات کا یقین نہیں ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس واقعے کا ذمہ دار گورکن صدر ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جناب! یہ تو دور دو چار کی طرح بالکل سیدھی بات ہے۔“ وہ خشکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”گورکن قبرستان کے اندر ہونے والی ہر سرگرمی سے ابھی طرح واقف ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ پتا ہی نہ ہو۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ امی جی کی لاش کے ساتھ جو مذموم کارروائی کی گئی ہے، وہ یا تو صدر کی حرکت ہے اور یا پھر یہ جانتا ہے کہ یہ کام کس کا ہے۔“

”محقق طور پر دیکھا جائے تو رانا ریاض کی بات وزن سے خالی نہیں تھی، ممکن زبان میں وہ متاثرہ پارٹی تھی لہذا میں نے اس کے ”وثوق“ کی تصدیق کا کوئی ثبوت نہیں مانگا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”رانا ریاض! تم اپنے دماغ کو غنڈا رکھو۔ میں معاملے کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جس کسی نے بھی صغریٰ بی بی کی لاش کے ساتھ یہ مذاق کیا ہے وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔“

اپنی ہی دھن میں بول چلا گیا۔

”امی جی کو دفنانے کے بعد میں نے ایک بندے کی بوٹی لگا دی تھی کہ وہ پورے چالیس دن تک امی جی کی قبر پر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جس بندے کو اس کام پر مامور کیا، وہ بڑا نیک اور پرہیزگار ہے۔ وہ مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سیدھا قبرستان جاتا اور امی جی کی قبر کے پہلو میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔“

وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہ جانا، البتہ میں اس سوچ میں ضرور ڈوبا رہا کہ انسان کیسا عجیب و غریب جاندار ہے۔ یہ ہر معاملے میں اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ رانا ریاض کا فرض بنتا تھا کہ وہ اپنی ماں صغریٰ بی بی کی بخشش کے لیے خود کچھ پڑھے بڑھائے۔ اگر وہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا تو کم از کم اپنی والدہ کے لیے دعائے خیر تو کر سکتا تھا لیکن اس نے شارت کٹ حلاش کر لیا تھا۔ ایک ٹیک آدی کو اس کام پر لگا کر وہ بری الذمہ ہو گیا تھا۔

”آج صبح جب وہ بندہ امی جی کی قبر پر پڑھائی کرنے گیا تو اس نے وہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔“ رانا ریاض نے بتایا۔ ”کسی شخص نے امی جی کی قبر کو کھول کر ان کی لاش کو باہر نکال لیا تھا۔ امی جی کی لاش قبر کے پہلو میں مٹی کے اوپر پڑی تھی۔ مجھے جیسے ہی اس واقعے کی اطلاع ملی، میں فوراً قبرستان پہنچ گیا۔ میں نے.....“

”کیا صغریٰ کی لاش کفن کے اندر ہی پٹی ہوئی تھی یا.....؟“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”جی..... ویسے تو امی جی کی لاش کفن کے اندر ہی پٹی ہوئی تھی لیکن.....“ اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”لیکن چہرے کی طرف سے کفن کی گرہیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی ہو۔“

میں نے اپنی تسلی کی خاطر تصدیقی لہجے میں پوچھا۔ ”بس، تمہاری امی جی کے کفن کو چہرے کی جانب سے کھولا گیا تھا۔ اس کے علاوہ لاش کے ساتھ اور کسی قسم کی چیز چھڑ تو نہیں کی گئی؟“

”نہیں جناب.....! اس نے نفی میں گردن ہلائی۔“

”جو میں نے بتایا، بس اتنا ہی۔“

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے

میں نے ایک کانٹیل کو بلا کر حکمرانہ انداز میں کہا۔ ”رانا صاحب! اور صدر کے سوا باقی تمام افراد کو برآمد سے باہر نکال دو۔“

کانٹیل نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ ان میں زیادہ تر افراد رانا ریاض کے حاشیہ بردار تھے۔ جب برآمد سے میں صرف رانا ریاض اور صدر رہ گئے تو میں نے رانا ریاض سے کہا۔

”تم انصاف کی امید لے کر میرے پاس پہنچے ہو نا تو اپنے دماغ کو غنڈا رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا لیکن دونوں فریقین کو فرداً فرداً سننے کے بعد۔ پہلے تم میرے کمرے میں آؤ اور اپنی گفتگو سناؤ۔“

اتنا کہہ کر میں پلٹا پھر گورکن سے کہا۔ ”صدر! جب رانا صاحب میرے کمرے سے نکل جائیں پھر تم میرے پاس چلے آنا۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں اور رانا ریاض روبرو بیٹھے تھے۔ ایک کانٹیل نے گرما گرم چائے کے دو کپ لا کر ہمارے سامنے سجادیے۔ میں نے چموتے رانا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چائے نوش کرو اور مجھے کھل کر بتاؤ، ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا ہے جس نے تمہارا پارا سائوس آسمان تک پہنچا دیا ہے؟“

رانا ریاض نے اپنی گفتگو میں ”امی جی کی لاش کی بے حرمی“ اور ”امی جی کی لاش کے ساتھ حرکت“ کے الفاظ استعمال کیے تھے جس سے میرا ذہن ایک خاص نوعیت کے مجرمانہ فعل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ رانا منظر کی اہلیہ یعنی رانا ریاض کی امی جی کا چند روز پہلے انتقال ہوا تھا۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث اس موقعی میں جا نہیں سکا تھا۔ اس تھانے میں میری تقرری کو ابھی دو ماہ ہوئے تھے۔ ابھی تک رانا منظر سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی تاہم مجھے پتا چلا تھا کہ وہ ایک معقول اور بھلا مانس چودھری تھا۔

”ملک صاحب! رانا ریاض نے کہا شروع کیا۔“ آپ کو پتا ہے، ابھی تین دن پہلے امی جی فوت ہوئی تھیں.....؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے افسوس ہے کہ محکمہ جانی مصروفیات کی بنا پر میں صغریٰ بی بی کی تدفین میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔“

اس نے میرے اظہار افسوس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور

صدر و معلوم ہوا۔ صدر کی عمر پچاس سے تجاوز تھی۔ وہ مومنہ نظر پور کا گورکن تھا۔

میں نے بڑے جمل سے رانا ریاض کی بات سنی پھر گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”اس بے چارے سے ایسی کیا خطا ہوئی جو تم اسے بری طرح پیٹ رہے ہو؟“

”تھانے دار صاحب! اس بد بخت نے امی جی کی لاش کی بے حرمی کی ہے۔“ رانا ریاض غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

”رحم سرکار!“ صدر و دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتیمانہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں جی۔ رانا صاحب! خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔“

”اے خواہ مخواہ کی ناجائز اولاد۔“ رانا ریاض، صدر کو کھانچ مارنے کے لیے آگے بڑھا۔

میں نے اس کا بازو پکڑ لیا پھر ایک جھٹکا دے کر خشکی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”رانا ریاض! کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت تم کہاں کھڑے ہو؟“

”جی.....“ میرے سوال پر اس نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”یہ تھانہ ہے جناب۔“

”ہوں.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس تھانے کا انچارج کون ہے۔ میرا مطلب ہے، یہاں کا تھانے دار کون ہے؟“

”ظاہر ہے جی.....“ وہ دستوراً ابھمن بھرے انداز میں بولا۔ ”تھانے دار آپ ہیں۔ ملک مصدحیات صاحب۔“

”شاباش!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر بڑی رساں سے کہا۔ ”برخوردار! میں تمہارے ابا جی رانا منظر کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لیے تم سے سزئی کے ساتھ پیش آ رہا ہوں ورنہ تمہاری جگہ اور کوئی ہوتا اور اس انداز میں میرے تھانے میں آکر شوشر ایا کر رہا ہوتا تو میں پہلی فرصت میں اسے حوالات میں بند کر چکا ہوتا اس لیے.....“

میں نے لگائی تو توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس تھانے کے اندر تم مجھے ہی تھانے داری کرنے دو تو یہ تمہارے حق میں سودمند ثابت ہوگا۔“

”ملک صاحب! آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ اس کہنے نے امی جی کی لاش کے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔“ وہ خوشنوار نظر سے صدر کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو شکر کریں کہ یہ ابھی تک زندہ نظر آ رہا ہے ورنہ میرا دل تو مٹی کی کدہ رہا ہے کہ اس جذبات کے نکلنے کے کہنے کیل کوں کھلا دوں۔“

زودہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہوسکتا ہے، اچانک قبرستان کی طرف سے کسی کا گزر ہوا اور ہوا پکڑے جانے کے خوف سے بدری اپنا کام احوراً چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔“

صدر دو کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ رانا ریاض نے مجھے بتایا تھا کہ مغربی کا کفن چہرے کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اگر صدر دو کی سوچ کو درست مان لیا جاتا تو ہادی انکس میں بھی کچھ میں آتا تھا کہ بدری کفن چہرے کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ یہ مغربی بی بی کی قبر کھولنے والا کوئی شخص کسی ہنگامی صورت حال میں اپنا کام مکمل چھوڑ کر قبرستان سے نکل گیا تھا۔

”چاچا! اس قبرستان میں کب سے کام کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سرکار! میں تو پیدائشی اسی قبرستان میں ہوا ہوں۔“ اس نے عاجزی بھرے انداز میں بتایا۔ ”مجھ سے پہلے میرا باپ قمر الدین عرف قمر واس قبرستان کا کورکن ہوا کرتا تھا۔ میرے ماں باپ کی لاشیں بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔ آج تک ظفر پور کے کسی دستیک کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں، چھوٹے رانا صاحب کو اچانک مجھ سے کیا دشمنی ہو گئی ہے۔“

بات کے اختتام پر وہ آبدیدہ ہو گیا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ”کیا تم نے بدری کفن چور کا ذکر رانا ریاض کے سامنے کیا تھا؟“

”نہیں جناب۔۔۔۔۔“ وہ لٹی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔ ”رانا صاحب نے تو آتے ہی مجھ پر چڑھا کر دی گئی۔ مجھے کچھ سوچنے بجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اسی بری طرح مجھے پیٹ رہے تھے کہ میری موت مت ہی ماری گئی تھی۔ بدری کا نام بھولے بیٹھے سے بھی میرے دماغ میں نہیں آیا۔“

”چاچا! غور سے میری بات سنو۔“ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ایک سپاہی کو بھیج رہا ہوں۔ تم دونوں یہاں سے سیدھے صورت گرجاؤ گے اور شام سے پہلے بدری کفن چور کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آؤ گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔۔؟“

میرے تھانے سے موضع ظفر پور ایک میل کی دوری پر مشرق میں واقع تھا اور صورت گرجا کی گاؤں تھانے سے جنوب مشرق میں لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ ظفر پور اور صورت گرجا میں چار میل کا فاصلہ حائل تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ ظفر پور کو کچے بغیر صورت گرجا میں اور شام سے پہلے بدری کو گرنارڈ کے تھانے لے آئیں۔

”جی، بالکل سمجھ گیا۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے

نازک لمحات میں وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اگر وہ بہت اچھا اداکار نہیں تھا تو پھر وہ واقعتاً مغربی کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے بے خبر تھا۔

”فرض کرو کہ میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا۔“ میں نے صدر دو کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جلدی سے میرا دوسرا کام بھی کر دو۔۔۔۔۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کے دوسرے کام کے بارے میں، میں حتی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن۔۔۔۔۔“

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔ ”لیکن کیا چاہا۔۔۔۔۔؟“

”وہ جی۔۔۔۔۔ مجھے ایک بندے پر شک ہے۔“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا دھیان بار بار اسی کی طرف جارہا ہے۔“

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کس بندے کی بات کر رہے ہو؟“

”بدری۔۔۔۔۔!“ اس نے جواب دیا۔

”اس بدری کا حدود اربعہ بیان کر دو۔“ میں سیدھا اور کرجیفہ کیا۔ ”اور یہ بھی بتاؤ، یہ بندہ رہتا کہاں ہے؟“

میرے استفسار کے جواب میں گورکن صدر دو نے جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق بدر الدین عرف بدری نامی وہ شخص موضع صورت گرجا کے رہنے والا تھا۔ پورے علاقے میں بدری کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ تک کر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ چار بار وہ مردوں کے کفن چوری کرتے ہوئے بھی پکڑا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ”بدری کفن چور“ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے یہی بچے نہیں تھے اور نہ ہی کوئی رشتے دار۔ بنیادی طور پر وہ صورت گرجے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اکثر و بیشتر وہ صورت گرجے سے باہر دور و نزدیک کے مختلف گاؤں دیہات میں گھومتا پھرتا پایا جاتا تھا۔

اس تفصیل کی روشنی میں اگر موجودہ صورت حال میں گورکن صدر دو کا دھیان بدری کی طرف گیا تھا تو اس میں ایجنسی کی کوئی بات نہیں تھی لیکن ایک بات شروع ہی سے میرے دماغ میں کلک رہی تھی۔ اس پچاس کو نکالنے کے لیے میں نے صدر دو سے پوچھا۔

”چاچا! اگر مغربی کی قبر کو بدری نے کھولا ہے تو پھر اس نے کفن چوری کیوں نہیں کیا۔ یہ تو اس کے ”پیشہ ورانہ اصول“ کے خلاف ہو گیا نا۔۔۔۔۔؟“

”جناب! یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔“ وہ ابھین

ہوں کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپ مجھے رانا جی کے غضب سے بچائیں۔۔۔۔۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔“ اس نے میرے جملے میں موجود ”پہ شرط یہ کہ“ کے الفاظ پر توجہ نہیں دی تھی یا تو میرے الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور یا پھر وہ پریشانی کے سبب اس پر غور نہیں کر پایا تھا۔

”چاچا! میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔ میں نے آگے کو جھکتے ہوئے رانا دار انداز میں کہا۔ ”اگر میں چاہوں تو چھوٹا رانا یا اس کا باپ صہیں ساتھ بھی نہیں لگائے گا لیکن میں ایسا اس وقت چاہوں گا جب تم میرے دو کام کرنے کا وعدہ کر دو گے۔۔۔۔۔“

”آپ حکم کریں مائی باپ۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ ”دو کیا، میں آپ کے دوسو کام کرنے کو تیار ہوں۔“

”دوسو نہیں، صرف دو۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”نمبر ایک، مجھے یقین دلاؤ کہ مغربی بی بی کی لاش کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ نمبر دو، یہ جس کسی کی بھی حرکت ہے تم اس بندے تک مجھے پہنچاؤ گے۔۔۔۔۔“

”تھانے دار صاحب! اپنی بے مٹائی کا یقین دلانے کے لیے میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“ وہ روہائی آواز میں بولا۔ جب یہ وعدہ روہا ہوا تو اس وقت میں اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا چھوٹے رانا صاحب نے آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ مغربی بی بی کی قبر اور لاش کے بارے میں مجھ سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے لیکن میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، ان کو کیا جواب دیتا۔ وہ مجھے مارتے ہوئے تانگے میں ڈال کر تھانے لے آئے اور یہاں بھی آپ کے آنے سے پہلے انہوں نے میرے ساتھ بہت زیادہ مار پیٹ کی ہے۔ ابھی تین دن پہلے تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے مغربی بی بی کی قبر کھودی تھی۔ وہ ڈے رانا صاحب کی بیوی کی موت کا مجھے سخت دکھ تھا۔ میں بھلا ان کی لاش کی بے حرمتی کیسے کر سکتا ہوں پر۔ چھوٹے رانا صاحب کو میری بات کا اعتبار ہی نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“

بات کے اختتام پر اس نے رحم طلب نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس دوران میں میری نگاہ مسلسل اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھی۔ صدر دو کی آنکھوں سے جھلکتے تاثرات کو دیکھ کر میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا تھا کہ ان

انداز میں کہا۔ ”تم فکر نہیں کرو۔“ میں نے اس کی براہین خواہش پر تسلی کا مہم رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اس بڑھے کا وہ حشر کروں گا کہ اس کا ایک ایک جوڑ بول اٹھے گا۔۔۔۔۔ مغربی بی بی کی قبر کو کس نے کھولا ہے۔“

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”ملک صاحب! میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم چپ چاپ اپنے گھر جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”تھوڑی دیر میں، میں بھی ظفر پور آ رہا ہوں۔“

”کیا میں ای جی کی لاش کو دوبارہ قبر میں اتار کر قبر کو بند کر دوں؟“

”نہیں!“ میں نے دونوں الفاظ میں کہا۔ ”جب تک میں موقع کا تفصیلی معائنہ نہ کروں، کسی بھی چیز کو ادھر ادھر نہیں کرنا اور لوگوں کو بھی مغربی بی بی کی قبر سے دور ہی رکھو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ گیا ملک صاحب۔“

”کیا وہ ڈے رانا صاحب گھر پر ہیں؟“ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب! وہ ایک ضروری کام سے آج صبح لاہور گئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”امید ہے، شام تک واپس آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم چلو۔“ میں نے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں، میں بھی نکلی رہا ہوں۔“

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

صدر الدین عرف صدر دو چاچا میرے سامنے یزکی دوسری جانب ایک چوٹی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے خوف مترشح تھا۔ میری معلومات کے مطابق صدر دو کی رہائش قبرستان کے ایک حصے میں تھی جہاں وہ اپنی بیوی شاداں کے ساتھ مستقل قیام پزیر تھا۔ صدر دو کی شادی کو لگ بھگ پچیس سال ہو گئے تھے لیکن یہ جوڑا ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے محروم تھا۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ”رانا ریاض یہاں سے جا چکا ہے اور میں بے گنا ہوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا یہ شرط یہ کہ۔۔۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے بے تابانی سے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! میں رب کی قسم کھا کر کہتا



MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.

UAN 111-152-152

کیونکہ صحت بہ اہم اول
مرحباً اسپغول



ہوئے بولا۔
”اور جب تک تم بدری کو لے کر نہیں آجاتے، اس
مشن کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے؟“
”جی، ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“
صدر رو کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے
اسے کاشییل بشارت کے ہمراہ صورت نگر روانہ کر دیا۔
بشارت کو میں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہر قیمت پر
بدری کفن چور کو گرفتار کر کے تھانے لانا ہے۔ اس نے مجھے
شکم کی تعمیل کا یقین دلایا تھا۔
☆☆☆
جب میرا تھکا مٹا وضع ظفر پور میں داخل ہوا تو دن کے
کیارہ بج رہے تھے۔ سورج اگرچہ آسمان پر سو جود تھا تاہم
اس کی تھمازت میں دم نہیں تھا۔ خشکی خم ٹھوٹک کر ماحول کی ہر
شے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی تھی۔
یہ ماہ جنوری کا ایک دوا بیتی منج بستان تھا۔
تھانے سے میں دو افراد کو اپنے ساتھ لایا تھا جن میں
سے ایک کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا یعنی کاشییل
وحید اور دوسرے شخص کا نام تھا فیروز دین عرف بابا فیروزہ۔
بابا فیروزہ پراپیوٹ طور پر پولیس کی مدد کرتا تھا جس کا اسے
معاوضہ بصورت انعام دیا جاتا تھا۔ اس کا تعلق سراغ رسانی
یعنی کھون سے تھا۔ عرف عام میں وہ ”کھو جی بابا“ کے نام
سے مشہور تھا اور کھراٹکالے کے شعبے میں وہ مسلح بھر میں بڑا
ماہر اور تجربہ کار سمجھا جاتا تھا۔
ہمارا تھکا قبرستان کے قریب پہنچا تو رانا ریاض مجھے
دور ہی سے نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی رانا فیاض
بھی تھا۔ میری معلومات کے مطابق رانا فیاض شادی شدہ تھا
اور اس کے تین بچے بھی تھے جبکہ رانا ریاض ابھی تک بچپن ہی
گھوم رہا تھا۔ ریاض کے برعکس فیاض نرم خور اور ٹھنڈے
مزاج کا مالک تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملا اور بولا۔
”دیکھیں نا ملک صاحب! ہماری کتنی بے عزتی
ہو رہی ہے۔ کسی نامراد نے ہماری ماں کی قبر کھود کر ہمارا
مذاق اڑایا ہے۔“
”مہر رانا صاحب!“ میں نے رانا فیاض کا شانہ
چھپھٹاتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جس بھی
بدبخت نے یہ مذموم حرکت کی ہے، میں اس کا سزاؤ شکر کروں گا۔
آپ اپنی آنکھوں سے اس کا عبرت ناک انجام دیکھو گے۔“
”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ وہ گہری
سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے کیچے میں تو اسی وقت ٹھنڈ پڑے

میرے ذہن میں یہ تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہے جو رانا مظفر ایڈ کپنی سے کسی قسم کی غارتگری کر رہا تھا۔ اس شخص نے ان لوگوں کو بے عزت کرنے کے لیے یہ درامد رانا چاہا تھا۔ اس واقعے کو کسی دیرینہ دشمنی کے کھاتے میں ڈالنے کے بعد میں کھوجی بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بابا فیروزہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کاشمیریل وحید تھمارے ساتھ رہے گا۔ تم اپنا کام شروع کر دو۔ سب سے پہلے قبر کے اندرونی اور بیرونی حصے کو کھینچ کر رہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نہ؟“

”جی جی! میں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں جانتا ہوں، مجھے اپنا کام کسی طرح کرنا ہے۔“

”جب تک دن کی روشنی ہے، تم اپنا کام تندی سے جاری رکھو گے۔“ میں نے غصے سے ہونے لگے میں کہا۔ ”اس کے بعد وحید کے ساتھ تم تھانے پہنچو گے۔ بانی بائیں دو ہیں یہ ہوں گی۔“

بابا فیروزہ نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ ”رانا صاحب!“ میں نے رانا ریاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا کھوجی جیسے ہی قبر کے قریب وجود رکھ کرے، ہم صفائی بی بی کی لاش کو قبر میں رکھ کر قبر کو اچھی طرح بند کر دیتا۔“

”تھیک ہے جناب۔“ وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔ ”وہ نامراد صندوق میں نظر نہیں آ رہا۔ مردے کو قبر میں اتارنا اور قبر کو بند کرنا تو اسی کام ہے۔“

”بے شک! یہ گورنری کا کام ہے لیکن اس وقت مجبوراً یہ کام تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کرنا ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ صندوق تم نے آج صبح تھانے میں بند کر دیا ہے۔ وہ میری تحویل میں ہے۔ جب تک مجرم ہاتھ نہیں لگ جاتا، میں صندوق کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”جی، میں سمجھ گیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

آخری بات میں نے رانا ریاض پر دباؤ برقرار رکھنے کے لیے کی تھی۔ فطرتاً اور مزاجاً وہ ایک اڈکھا اور اتھرا نوجوان تھا۔ اگر اسے یہ یقین رہتا کہ میں اس کی ای بی کی قبر کھودنے والے بندے کو بڑی شدت سے ستاؤں گا تو وہ ہر کام میں توجہ دے گا۔ میں نے یہی چاہا تھا کہ رانا ریاض اس وقت تک اپنے دماغ کو بھندار سکے جب تک میں اس سے کوئی عمل نہیں کر لیتا۔ اسی مقصد کی بنا پر میں نے صندوق کی پولیس

کسٹڈی کی بات کی تھی حالانکہ سچی بات تو یہی تھی کہ اس افسوس ناک واقعے کے حوالے سے مجھے گورنری صدر پر بالکل شک نہیں تھا۔

میں قبرستان سے نکل کر رانا فیاض کے ہمراہ اس کی حویلی میں آ گیا۔ ایک تو رانا فیاض مندر کے مجھے اپنے ساتھ لے آیا تھا، دوسرے حویلی یا تیار میری خواہش بھی تھی۔ میں رانا مظفر سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا جو رانا ریاض کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق لاہور گیا ہوا تھا۔ باب کی غیر موجودگی میں اس کے بیٹے فیاض سے بات ہو سکتی تھی۔ میں نے رانا فیاض کو رانا ریاض کے برعکس خاصا سمجھ دار اور بردبار پایا تھا۔

موضوع ظفر پور ایک بھرا پڑا گاؤں تھا۔ میرے مختار انداز سے کے مطابق وہاں پڑ پڑے سو کے قریب مکان آباد تھے یعنی اس گاؤں کی آبادی تقریباً چھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ رانا مظفر کی حویلی بھی خاصی وسیع و عریض اور عالیشان تھی۔

رانا فیاض نے مجھے ایک سٹی جانے چھٹک میں بٹھایا اور میری خاطر تواضع کے اہتمام میں لگ گیا۔ اس کا اصرار تو یہی تھا کہ میں حویلی میں بھر پور سچ کر دوں لیکن میرے لیے ڈیروں کو اوقات چھٹک کی تنگ سائے میز پر لگوا دیے۔ ماذن زبان میں آپ اس اہتمام کو ”ہائی ٹی“ کہہ سکتے ہیں۔

”بڑے رانا صاحب تو لاہور آگئے ہوتے ہیں۔“ خور و نوش کے سلسلے کے بیچ میں ہمارے درمیان بات چیت کا عمل بھی جاری تھا۔ ”آپ کے چھوٹے بھائی نے بتایا ہے کہ بڑے رانا صاحب رات تک وہاں آ جاہیں گے۔ میں ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔“

”ملک صاحب! چند ماہ کے بعد انکسٹن ہونے والے ہیں اور اباجی تو ہر انکسٹن میں حصہ لیتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے آج تک کوئی انکسٹن ہر انکسٹن سا۔“ رانا فیاض نے بتایا۔ ”اباجی اسی سلسلے میں لاہور آگئے ہیں۔ آج کل بعض لوگوں سے ان کی اہم میٹنگز چل رہی ہیں۔ امید تو یہی ہے کہ وہ رات تک وہاں آ جائیں اور ہو سکتا ہے، آج وہ لاہور ہی میں رگ جائیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ سے بات کرنے کے خیال ہی میں تھوڑی دیر آ گیا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”امید ہے، آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔“

”بے شک! کر دوں گا جناب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”آپ حکم کریں، بس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”سلسلہ تو یہی افسوس ناک واقعہ ہے جو پچھلی رات اسی وقت قبرستان میں پیش آیا ہے۔“ میں نے اس کے پیچھے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے خیال میں صفائی بی بی کی قبر کو کس نے کھولا ہوگا؟“

”ملک صاحب! اگر مجھے اس بندے کے بارے میں پتا ہوتا تو میں اسے گردن سے پکڑ کر سیدھا آپ کے پاس نہ لے آتا۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”گردن سے دیوچ کر بلکلات جوتے مارتے ہوئے آپ کا بھائی گورنری صدر کو میرے پاس لایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے رانا صاحب۔“

”کوئی اور ہی معاملہ!“ اس نے ابھین زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”یہ بات میرے علم میں ہے کہ ریاض گورنری کو مارتے ہوئے تھانے لے گیا تھا۔ اگر کوئی اور معاملہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صندوق کا اس واقعے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے؟“

”میں فی الحال ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ سمجھ لے میں بولا۔ ”مجھے بھی سمجھا میں ملک صاحب!“

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اللہ میں نے اسی سے پوچھ لیا۔ ”کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ صندوق کی آپ کی حویلی اور اس حویلی کے اندر کھنسنے والے انسانوں سے کوئی خاندانی دشمنی ہے؟“

”نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک گورنری کام سے کیا مقابلہ۔“

”جی تو انسان اپنے برابر کے بندے سے کرتا ہے۔ کہاں وہ مسکین گورنری اور کہاں ہم موضوع ظفر پور کے چودھری۔“

”آپ ایک داخل مند انسان ہیں رانا صاحب اس لیے آپ فوراً میری بات کی تنبیہ کر رہے ہیں۔“ میں نے حویلی کے اندر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ اندازہ ہی دیرینہ دشمنی کا شائبہ لگتا ہے۔“

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ ”میں نے سمجھ لیا۔“ ملک صاحب! یہ کسی شخص کا رشتہ ایسی ہو سکتی ہے۔“

”میں نے کفن کی چوری والے معاملے کو نظر انداز کر دیا ہوا رانا صاحب۔“ میں نے سرسراہٹ سے ہونے لگے۔

”میں نے یہاں آنے سے پہلے ایک ہم معروف چور کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دی تھی۔ آج شام

سے پہلے مذکورہ کفن چور میرے تھانے کی حوالات میں بند ہوگا پھر میں اپنے مخصوص انداز میں جب اس کفن چور سے کڑی پوچھتا چھ کروں گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

”آپ کس کفن چور کا ذکر کر رہے ہیں؟“ وہ متذبذب نظر سے مجھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”بدرا الدین عرف بدری کفن چور۔“ میں نے اکتشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”فرام موضوع صورت مگر۔۔۔!“

”ادھر اچھا!“ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

”لیکن۔۔۔“ میں نے بدستور رانا فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بدری میری دوسری ترجیح ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ بدری کی اتنی حیثیت اور اوقات نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ کی ای بی کی لاش کے ساتھ ایسا بھانک مذاق کرتا۔ اگر بات کو ”کفن چوری“ تک محدود رکھ کر بدری پر فوکس کیا جائے تو ایسا کوئی واقعہ ہے جس سے میں نہیں آیا۔ آپ کی ای بی کا کفن جوں کا توں موجود ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ چند لمحات تک گہری سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر مسخر ہوا۔ ”اور آپ کی سبکی ترین کیا ہے؟“

”دیرینہ دشمنی!“ میں نے غصے سے ہونے لگاؤ میں کہا شروء کیا۔ ”میرے خیال میں یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہے جس کی آپ کے خاندان کے ساتھ کوئی پرانی نسل چلی آ رہی ہو۔ بڑے رانا صاحب اپنے گاؤں کے چودھری ہونے کے علاوہ ایک معروف سیاسی شخصیت بھی ہیں جنہوں نے اپنے بد مقابل سیاسی حریف کو ہمیشہ شکست دی ہے۔ اس نوعیت کی مسلسل کامیابی میں جہاں آپ کے دس دوست پیدا ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ دشمن کے وجود سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔“

”ملک صاحب۔۔۔!“ میری بات کے اختتام پر وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اس طرف تو ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان نہیں گیا تھا۔“

میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا کیونکہ اس کی کوئی بات بھی میرے بے یمن پڑی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”آپ کو پتا ہے، میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟“

”نہیں!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”آپ بتائیں، کس حوالے سے میں نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں؟“

”سیاسی حریف!“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اس بار سیاسی میدان میں ایک ایسی جدلی دیکھنے میں آئی ہے جس کے بارے میں کبھی سوچا جی نہیں جاسکتا تھا۔“

”میں کچھ بھی نہیں سمجھا رانا صاحب!.....“ میں نے بہترن گوش رہتے ہوئے کہا۔ ”آپ کھل کر بات کریں۔“

”میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“ وہ میری جانب جھٹکتے ہوئے تنبیہ کی سے بولا۔

آئندہ چندہ منٹ میں رانا فیاض نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے تھا.....

ہر انکیشن میں رانا مظفر کے مد مقابل موضع کوٹ خاسن کا چودھری لطیف چیمہ ہوا کرتا تھا۔ رانا مظفر نے اسے ہمیشہ شکست دے کر انکیشن میں کامیابی حاصل کی تھی۔ کوٹ خاسن نامی یہ گاؤں مظفر پور سے پانچ میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا یعنی میرے قحانے سے چھ میل کی دوری پر۔ اب کی بار لطیف چیمہ نے رانا مظفر کے دونوں کو تقسیم کرنے کے لیے ایک تیسرے امیدوار کو میدان میں اتار دیا تھا اور اس نو امیدوار کا نام تھا رانا منور فرام صورت نگر یعنی رانا مظفر کا چھوٹا بھائی۔ گاؤں دیہات کے انتخابات میں برادری کی سسٹم کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ رانا منور چاہے انکیشن میں کامیابی حاصل کرتا یا نہ کرتا لیکن وہ رانا مظفر کے دو دروز کو ضرور تقسیم کر دیتا جس کا سب سے بڑا فائدہ لطیف چیمہ کو پہنچتا کیونکہ وہ سدا سو پچاس دونوں کی کمی ہی سے ہارا کرتا تھا۔ اگر رانا منور اس حلقے میں اپنی رانا برادری کے کم از کم سو یا اس سے کچھ زیادہ ووٹ بھی حاصل کر لیتا تو رانا مظفر کے مقابلے میں لطیف چیمہ کا پلہ یقیناً بھاری ہو جاتا تھا۔

”رانا جی!“ میں نے فیاض کی بات پوری تو جہ سے سننے کے بعد کہا۔ ”کیا آپ کا چاچا رانا منور اتنی ہی موٹی عقل کا مالک ہے کہ لطیف چیمہ کی سازش اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ آپ کو لوگوں کے خلاف لطیف چیمہ کا ساتھ کیوں دے رہا ہے؟“

”میں آپ کو یہ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ آج کل ہمارا اور چاچا منور کا شدید اختلاف چل رہا ہے۔“ وہ ایک ٹھنڈی سا رخ خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے کچھ عرصے سے دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کا حقہ پانی بند کر رکھا ہے اور اس خطرناک رجحان کے دو بنیادی اسباب ہیں.....“

مجھے دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مئی سال پہلے چاچا منور نے اپنے سب سے بڑے بیٹے جواد کا رشتہ میری بڑی بہن کنیز فاطمہ کے لیے مانگا تھا لیکن اباجی نے اس رشتے کے لیے انکار کر دیا تھا اور اس انکار کا سبب امی جی اور کنیز فاطمہ تھیں کیونکہ امی جی اپنے بھائی کے بیٹے سے کنیز کی شادی کرنا چاہتی تھیں اور کنیز بھی ماموں کے اس بیٹے کو پسند کرتی تھی۔ اس رشتے سے انکار کو چاچا منور نے کم اور چاچا شادہ نے زیادہ محسوس کیا تھا بلکہ چاچا شادہ نے تو اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور کئی سال بعد اس نے بدلہ بھی لے لیا.....“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسا بدلہ رانا صاحب؟“

”چند ماہ پہلے اباجی نے ریاض کے لیے چاچا کی سب سے چھوٹی بیٹی زہت بی بی کا رشتہ مانگا تو صورت ٹھہرے چٹا انکار آیا اور اس انکار کے ساتھ چاچا شادہ کا یہ بیڑا بھی مظفر پور پہنچا تھا..... میری بیٹی کا رشتہ مانگتے ہوئے صفرائی کو ذرا سی بھی حیا نہیں آئی۔ صفرائی وہ دن بھول گئی جب اس نے میرے جواد کے رشتے کو جوڑنے کی نوک پر ہارا تھا۔ لگتا ہے، صفرائی میں شرم اور غیرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔“

”اباجی تو پرانی ناراضیوں کو ختم کر کے خاندان کو جوڑ کر رکھنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے چاچا سے زہت کا رشتہ مانگا تھا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن چاچی کے الفاظ نے ہم سب کے کلیجے چیر کر رکھ دیے تھے۔ اباجی کو چاچی کے روپے سے اتنا دکھ نہیں پہنچتا تھا جتنا چھوٹے بھائی کی بے اختیاری اور بے حسی کا غم ہوا۔ چاچا نے چاچی کی بدتمیزی پر کسی ندامت یا معذرت کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی بیوی کا ساتھ دیا اور بٹ دھری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے ہر طرح کا تعلق ختم کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں، اسی بائیکاٹ کی وجہ سے چاچا نے لطیف چیمہ کی سازش کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”رانا جی!.....“ میں نے فیاض کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے، آپ کو میری بات پسند نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کی چاچی نے جو کچھ بھی کیا اگر اس میں سے بد اخلاقی والا حصہ نکال دیا جائے تو یہ آپ کی امی جی کے عمل کا رد عمل ہے۔ کسی زمانے میں آپ کی امی نے جواد کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ اب شادہ نے ریاض کے

رشتے سے انکار کر کے پرانا حساب بے باق کر دیا۔ ہاں، شادہ نے جو بد زبانی کی وہ ہر حال میں قابل مذمت ہے۔“

”ملک صاحب! سب نے بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ رانا فیاض اسکاٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جن گھروں میں مورخوں کے فیصلوں کو اہمیت دی جاتی ہو، وہ گھرا ایک دن تباہ ہو جاتے ہیں۔ اباجی نے امی جی کی ضد سے مجبور ہو کر جواد اور کنیز کے رشتے سے انکار کر دیا تھا اور چاچا نے چاچی کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے ریاض اور زہت کے رشتے کو ٹھکرا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ چاچا اور اباجی ”عورت راج“ کی وجہ سے آج دو حریفوں بلکہ دو دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابلے کھڑے ہیں۔ لطیف چیمہ کو زیادہ الزام اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ انکیشن ہو یا کسی بھی قسم کا بیچ اور مقابلہ، اپنے حریف کے کمزور پہلوؤں پر ضرب لگانے کا سب کچھ ہوتا ہے۔ میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آج کل وقت ہم سے روٹھا ہوا ہے۔“

رانا فیاض کے تجزیے کے جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن کل اس کے کہ میں اپنی زبان کو زحمت دیتا، کا نشیلم وحید وہاں پہنچ گیا۔ وحید کو میں بابا فیروزہ کی معاونت کے لیے قبرستان میں چھوڑ آیا تھا۔ حویلی میں اچانک اس کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا دیا اور تھوڑے لمحے میں استفسار کیا۔

”وحید، خبریت..... تم یہاں؟“

”ملک صاحب! آپ کو امی وقت میرے ساتھ قبرستان چلنا ہوگا۔“ وہ مضطرب انداز میں بولا۔

”ایسا کیا ہو گیا وحید۔“ میں نے ابھمن زدہ نظروں سے اسے گھورا۔ ”تم اس قدر حواس باختہ کیوں ہو رہے ہو۔ کیا تم نے کسی قبر سے کوئی مردہ باہر نکلنے دیکھا ہے؟“

”اس سے بھی زیادہ بھیانک اور تشویش ناک صورت حال ہے ملک صاحب.....“ وہ ہوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”بابا فیروزہ نے کھرا نکالنے کے دوران میں ایک ایسی قبر کا سراغ لگایا ہے جسے تازہ تازہ کھول کر بند کیا گیا ہے۔ جب ہم نے اس قبر کی مٹی ہٹا کر اندر جھانکا تو مردہ غالب تھا.....“

کا نشیلم وحید کے انکشاف نے مجھے ریڈ ارٹ کر دیا تھا۔

☆☆☆

میں مذکورہ قبر کے کنارے پر کھڑا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ قبر الیاس نامی ایک شخص کی تھی جس کا انتقال چودہ جنوری کو ہوا تھا یعنی صفرائی بی بی کے انتقال کے ایک دن

بعد۔ الیاس کی موت کا سبب در وقت تھا۔ وہ تیرہ اور چودہ جنوری کی درمیانی شب اس دافانی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس وقت میری نگاہ کے سامنے الیاس کی قبر کھلی ہوئی تھی لیکن قبر کے اندر اس کی لاش موجود نہیں تھی۔

بابا فیروزہ نے مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! میں نے خاص طور پر دو بندوں کے کھمرے کو پکڑ کر رکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں اس کس میں بہت اہم آدمی ہیں۔“

”تم کتنے دو بندوں کی بات کر رہے ہو فیروزہ؟“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال دروغ کیا۔

”جناب! میں نے ان کا کھرا نکالا ہے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں تو انہیں جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے ان کے نام پتا ہیں۔“

ان کلمات میں میرا ذہن برقی رفتار سے کام کر رہا تھا۔ مجھے بیک وقت کئی زاویوں پر سوچنا پڑ رہا تھا۔ موجودہ صورت حال نے میرے ذہن کو خیالات کا میدان جنگ بنا دیا تھا۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

”تم نے ابھی تک جو کھرا نکالا ہے اس کی تفصیل کیا ہے؟“

”ملک صاحب!“ بابا فیروزہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”دو بندے اس طرف سے پیدل چلتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے۔ پھر وہ صفرائی بی بی کی قبر پر پہنچے۔ انہوں نے قبر کو کھولا اور صفرائی کی لاش کو نکال کر باہر رکھ دیا پھر وہ خاموشی سے چلتے ہوئے الیاس کی قبر کی سمت بڑھے۔ انہوں نے الیاس کی قبر کو کھودا، الیاس کی لاش کو باہر نکالا، قبر کو دوبارہ بند کیا اور لاش کو اٹھا کر قبرستان سے نکل گئے۔“

”ایک منٹ بابا!.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا اور پوچھا۔ ”قبرستان سے نکل کر وہ دونوں بندے کہاں چلے گئے؟ اور تم نے یہ اندازہ کس بات سے قائم کیا کہ انہوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا رکھا تھا؟“

”اس طرف جناب!“ اس نے دوبارہ اسی سمت اشارہ کیا جدھر سے اس نے مذکورہ بندوں کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ ”اور وہ دونوں الیاس کی لاش کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے گئے اس بات کا اندازہ میں نے پاؤں کے دباؤ سے لگایا ہے۔ قبرستان میں آمد صفرائی کی قبر تک رسائی اور الیاس کی قبر تک سفر کے دوران میں ان کے پاؤں کے کھمرے کا جو ساڑھ تھا اس میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب وہ الیاس کی قبر سے چلتے ہوئے قبرستان سے باہر نکلے۔ کھمرے کا ساڑھ بڑھ جانے کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ وزن بھی اٹھا رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کے پاؤں پر اضافی دباؤ

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آتے ہوئے پارل کھر اور واپسی پر وزن اٹھا کر چلنے کا کھرا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں بندوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا کر ایک خاص مقام تک پہنچایا تھا اور۔۔۔۔۔۔“

”اس خاص مقام سے آگے کی کیا کہانی ہے؟“ میں نے فیروزہ کی بات مہل ہونے سے پہلے ہی اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔

”وہ تو آپ کو بتا رہا ہوں ملک صاحب!“ وہ شامی نعرے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے بات تو پوری کرنے دیں۔۔۔۔۔۔“

”خیک ہے ہم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”جس مقام پر پہنچ کر ان دونوں کا کھرا ختم ہو جاتا ہے وہاں سے ایک ناکھرا دیکھنے کو ملتا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بیٹانے لگا۔ ”ایک تیل گاڑی کا کھرا۔۔۔۔۔۔“

”لحائی توقف کر کے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور منتظر نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ٹھٹھکا کر رکھا صاف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے راستے پر مختلف تانگوں اور کھوڑوں کے قدموں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ان دونوں بندوں کا تیل گاڑی کے ساتھ گہرا اعلق ہے کیونکہ ان کے قدموں کا کھرا میں اس مقام پر ختم ہوتا ہے جہاں سے تیل اور تیل گاڑی کے تاروں کا کھرا شروع ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔۔۔۔“ ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے مذکورہ تیل گاڑی کے کھرے کا تعاقب کیا اور نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نہر کے اس مقام پر ایک ہل بھی بنا ہوا ہے جس کے اوپر سے گزرنے والا راستہ سیدھا صورت گھر گاؤں کی طرف جاتا ہے لیکن وہ تیل گاڑی صورت گھر کی سمت نہیں گئی۔۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔۔؟“ میں پوچھتا ہوا رہا۔

اصل میں کھوئی بابا فیروزہ نے اپنے بیان میں اتنا زیادہ سہنس پیدا کر دیا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے بڑی رسائی سے جواب دیا۔

”ملک صاحب! جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ نہر کے متوازی ایک سڑک ہے جس پر اگر مغرب کی سمت سفر کریں تو یہ راستہ سیدھا لاہور کی طرف جاتا ہے اور اگر مسافر کا رخ مشرق کی سمت ہو تو وہ لال پور (موجودہ فیصل آباد) پہنچ جائے گا۔“

”خیک ہے ہم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”جس مقام پر پہنچ کر ان دونوں کا کھرا ختم ہو جاتا ہے وہاں سے ایک ناکھرا دیکھنے کو ملتا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بیٹانے لگا۔ ”ایک تیل گاڑی کا کھرا۔۔۔۔۔۔“

”لحائی توقف کر کے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور منتظر نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ٹھٹھکا کر رکھا صاف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے راستے پر مختلف تانگوں اور کھوڑوں کے قدموں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ان دونوں بندوں کا تیل گاڑی کے ساتھ گہرا اعلق ہے کیونکہ ان کے قدموں کا کھرا میں اس مقام پر ختم ہوتا ہے جہاں سے تیل اور تیل گاڑی کے تاروں کا کھرا شروع ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔۔۔۔“ ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے مذکورہ تیل گاڑی کے کھرے کا تعاقب کیا اور نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نہر کے اس مقام پر ایک ہل بھی بنا ہوا ہے جس کے اوپر سے گزرنے والا راستہ سیدھا صورت گھر گاؤں کی طرف جاتا ہے لیکن وہ تیل گاڑی صورت گھر کی سمت نہیں گئی۔۔۔۔۔۔“

اصل میں کھوئی بابا فیروزہ نے اپنے بیان میں اتنا زیادہ سہنس پیدا کر دیا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے بڑی رسائی سے جواب دیا۔

”ملک صاحب! جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ نہر کے متوازی ایک سڑک ہے جس پر اگر مغرب کی سمت سفر کریں تو یہ راستہ سیدھا لاہور کی طرف جاتا ہے اور اگر مسافر کا رخ مشرق کی سمت ہو تو وہ لال پور (موجودہ فیصل آباد) پہنچ جائے گا۔“

”خیک ہے ہم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”جس مقام پر پہنچ کر ان دونوں کا کھرا ختم ہو جاتا ہے وہاں سے ایک ناکھرا دیکھنے کو ملتا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بیٹانے لگا۔ ”ایک تیل گاڑی کا کھرا۔۔۔۔۔۔“

”لحائی توقف کر کے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور منتظر نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ٹھٹھکا کر رکھا صاف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے راستے پر مختلف تانگوں اور کھوڑوں کے قدموں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ان دونوں بندوں کا تیل گاڑی کے ساتھ گہرا اعلق ہے کیونکہ ان کے قدموں کا کھرا میں اس مقام پر ختم ہوتا ہے جہاں سے تیل اور تیل گاڑی کے تاروں کا کھرا شروع ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔۔۔۔“ ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے مذکورہ تیل گاڑی کے کھرے کا تعاقب کیا اور نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نہر کے اس مقام پر ایک ہل بھی بنا ہوا ہے جس کے اوپر سے گزرنے والا راستہ سیدھا صورت گھر گاؤں کی طرف جاتا ہے لیکن وہ تیل گاڑی صورت گھر کی سمت نہیں گئی۔۔۔۔۔۔“

اصل میں کھوئی بابا فیروزہ نے اپنے بیان میں اتنا زیادہ سہنس پیدا کر دیا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے بڑی رسائی سے جواب دیا۔

اصل میں کھوئی بابا فیروزہ نے اپنے بیان میں اتنا زیادہ سہنس پیدا کر دیا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے بڑی رسائی سے جواب دیا۔

”آپ کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوگی کہ میں آپ کے مطلوبہ بندے کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنی دیر ہوئی ورنہ ہم تو سوچ ڈوبنے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔“

”بدری! لیکن چور اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور اس کی ایسی کون سی وجہ تھی کہ تم لوگوں کو اتنی دیر ہو گئی۔۔۔۔۔۔؟“

”جناب! جس وقت ہم صورت گھر پہنچے، بدری وہاں موجود نہیں تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے اپنے طور پر کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ رات کو اپنے گھر آئے گا ضرور۔ مجھ پر ایک خدمت سوار ہوئی کہ کسی بھی قیمت

”آپ کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوگی کہ میں آپ کے مطلوبہ بندے کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنی دیر ہوئی ورنہ ہم تو سوچ ڈوبنے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔“

”بدری! لیکن چور اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور اس کی ایسی کون سی وجہ تھی کہ تم لوگوں کو اتنی دیر ہو گئی۔۔۔۔۔۔؟“

”جناب! جس وقت ہم صورت گھر پہنچے، بدری وہاں موجود نہیں تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے اپنے طور پر کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ رات کو اپنے گھر آئے گا ضرور۔ مجھ پر ایک خدمت سوار ہوئی کہ کسی بھی قیمت

”آپ کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوگی کہ میں آپ کے مطلوبہ بندے کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنی دیر ہوئی ورنہ ہم تو سوچ ڈوبنے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔“

”بدری! لیکن چور اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور اس کی ایسی کون سی وجہ تھی کہ تم لوگوں کو اتنی دیر ہو گئی۔۔۔۔۔۔؟“

”جناب! جس وقت ہم صورت گھر پہنچے، بدری وہاں موجود نہیں تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے اپنے طور پر کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ رات کو اپنے گھر آئے گا ضرور۔ مجھ پر ایک خدمت سوار ہوئی کہ کسی بھی قیمت

پر میں نے خالی ہاتھ آپ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور صدر واس کے مکان کے نزدیک ہی ایک جگہ پر ڈیر اڈال کر بیٹھ گئے۔ میری معلومات کے مطابق، بدری آٹھ بجے کے قریب لوٹا۔ صدر واس کے تدکاٹھ اور علیہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ سولہ آنے بدری فتن چور ہی ہے۔ بدری کوئی پنجابی گانا گاتے ہوئے آ رہا تھا اور اس کے انداز سے بے پروائی جھلکتی تھی لیکن جیسے ہی وہ ہمارے قریب سے گزرا، میں نے اچانک اس کے سامنے آکر اس کی ساری بے پروائی اڑن چھو کر دی۔ اس وقت وہ حالات کے اندر بند ہے۔

”صغریٰ کی قبر کے حوالے سے بدری سے تمہاری کوئی بات ہوئی؟“ کانٹیل کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”ملک صاحب! بات تو ہوئی لیکن وہ بڑی شد وء کے ساتھ انکار کر رہا ہے۔“ بشارت نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ”اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ ایسے کسی واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ تو بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ پچھلے ایک ماہ سے اس نے ظفر پور میں قدم بھی نہیں رکھا۔“

”تم اسے لے کر میرے پاس آؤ۔“ میں نے

ظہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس کے دعوؤں اور فتوؤں کو اپنے انداز میں چیک کرتا ہوں۔ اگر وہ قبرستان والے واقعے میں کسی بھی زاویے سے ملوث ہے تو میں مار مار کر اس کے بدن کے ایک ایک سوراخ سے اتنا دھواں نکالوں گا کہ وہ زمانہ قدیم کے اشیام انجن کی شکل اختیار کر لے گا۔“

”جئے گیاتے ہے آجیاجی.....!“ کانٹیل لیکھت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کر فٹکی اور خوں خوراری بڑے بڑے مجرموں کا چٹا پانی کر دیتی تھی۔ کرم دادہ بدری کے عقب میں ایک قدم کی دوری پر تن کر کھڑا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ وہ ایک سینڈ سے بھی کم کے نوٹس پر ہر نوعیت کی ہنگامی کارروائی کے لیے تیار تھا۔

بدری کی عرتیں اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گہری سانولی رنگت کا مالک ایک مضبوط اور توانا شخص تھا۔ اس کا بدن کسی گینڈے کے مانند ٹٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے کا ایک فقرہ گل تھا۔ ساری عقلیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں تاہم اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ بدری خاصا کر بہر صورت تھا۔ اس کے ہاتھوں میں آہنی زور نظر آ رہا تھا۔

میں نے بدری کی ”آنکھوں“ میں آنکھیں ڈال کر قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ”سرکاری مہمان خانے میں تمہاری رات کیسی گزری؟“

”ابھی بتاتا ہوں تمہارے دار صاحب.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی۔

اگلے ہی لمحے حوالدار کرم دادہ کے دیکے نے اس کی کوشش کو نام بنادیا۔ ”اوائے کسی نواب صاحب کی نا جائز اولاد.....“ کرم دادہ نے اسے کار سے کھینچ کر سیدھا کھڑا کرتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔ ”یہ تمہاری بے بے کا ڈرانگ روم نہیں ہے۔ الف کی طرح سیدھا کھڑا ہو جا۔ ورنہ ایسا ڈنڈا گھماؤں گا کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم سے پھینا پھینا ہو جاؤ گے۔“

”غلطی ہو گئی سرکار!“ وہ سہی ہوئی نظر سے حوالدار کو دیکھتے ہوئے بولا۔

کرم دادہ نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”یہ غلطی پہلی اور آخری ثابت ہونا چاہیے ورنہ مار مار کر باندر بنادوں گا۔ پھر تمہاری باقی کی ساری زندگی چڑیا گھر کے کسی بنجرے میں چھلانگیں لگاتے گزرے گی۔“ کرم دادہ کی دھمکی کا گر ثابت ہوئی اور بدری خوف زدہ نظر سے مجھے جھٹکے لگا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”ماں باپ نے تمہارا کتنا اچھا نام رکھا تھا..... بدری الدین۔ کبھی ایسے اعمال پر بھی غور کیا ہے؟ کفن چوری کے دھندے نے تمہیں معاشرے میں کتنا ڈنک ورسوا کر کے رکھ دیا ہے اور اب سب تمہیں ”بدری فتن چور“ کے نام سے جانتے ہیں۔“

”مائی باپ.....!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے

نہایت انداز میں بولا۔ ”اس میں میرا کم اور لوگوں کا زیادہ قصور ہے۔“

”اوائے وہ کس طرح؟“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”مردوں کے کفن تم چر اڈا تو ضرور دوسرے لوگوں کا۔ بڑی نرالی منطق لے کر آئے ہو تم.....!“

”سرکار!“ وہ اپنے تئیں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس، ایک دو بار میں نے غلطی سے کفن کیا چوری کر لیا کہ لوگوں نے میرا نام ہی ”کفن چور“ رکھ دیا۔ ایک زمانہ ہوا، میں اس کام سے توبہ کر چکا ہوں اور..... صغریٰ کی قبر سے تو میرا کچھ لینا دینا ہی نہیں۔ میں تو کافی عرصے سے ادھر آیا بھی نہیں.....“

”میں نے تم سے صغریٰ یا اس کی قبر کے بارے میں کچھ پوچھا؟“ میں نے ایک چشم سیاہ رو بدری کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں جی، آپ نے تو نہیں پوچھا۔“ وہ لٹی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آپ کے سپاہی نے تو رات ہی سے صغریٰ کی قبر کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میرا یہ عذاب کر رکھا ہے۔“

”تم نے صرف عذاب کا نام سنا ہے۔“ کرم دادہ نے اس کی گدی پر ایک زوردار دوہتر زد کرتے ہوئے خوں خور انداز میں کہا۔ ”تمہیں بالکل بھی اندازہ نہیں کہ عذاب کس ذہنی اور جسمانی کیفیت کا نام ہے۔ ملک صاحب سے تاریخ و کریم میرے پاس ہی آؤ گے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ذات کس چیز کا نام ہے۔“

”تمہارے دار صاحب! میرا قصور کیا ہے؟“ وہ اپنی آواز میں سکینتی بھر کر مجھ سے مستنصر ہوا۔

”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم جھوٹ بول کر قانون کی

دوں گا اور تمہارے بغیر کھال کے بدن پر شہد کالیپ کر کے بھوکے کتوں کو تم پر چھوڑ دوں گا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں؟“

وہ تو ایک لاش کے چکر میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں نے دوسری لاش کا ذکر نکال لیا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ وحشت بھری ایک چشم سے مجھے اور کبھی حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہارے دار صاحب..... میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا.....“

ادھر بدری کی بات ختم ہوئی، ادھر کرم دادہ کا ایک زنا نے دار چھپر اس کے گال پر بڑا۔ چناخ کی ایک کمراری آواز فضا میں کوئی بھر ایک اور فتن آواز نے طمانچے کی آواز کو گل لیا۔ یہ آواز حوالدار کرم دادہ کی تھی۔

”اوائے ایک آنکھ والے محسوس جن! ہم تو جمونے بندے کو اس کے چہرے ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ سیدھی طرح ملک ہو اور انوں سب سچ سچ بتا دے ورنہ تمہاری دوسری جتنی بھی گل کر دوں گا۔“

بدری خوف کی شدت سے تھر تھرا کانپنے لگا۔ ان لحاظ میں وہ ”نہ پائے رفق، نہ جائے اعداں“ ایسی کیفیت میں گرفتار دکھائی دیتا تھا۔ کھل اس کے کہ وہ حوالدار کی دھمکی کے جواب میں کچھ کہتا، ایک کانٹیل نے اندر آ کر اطلاع دی۔

”ملک صاحب! فیروزہ کھوئی آ گیا ہے۔“

میں نے حوالدار کو بدری کے پاس رکنے کے لیے کہا اور خود اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ بابا فیروزہ برآمدے میں موجود تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر تھانے کے کچن میں آ گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”بابا! کیا ان دونوں لاش چور بندوں کا کھرا تمہارے ذہن میں محفوظ ہے؟“

ایک لمحہ آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”جی ملک صاحب! اپنی طراں محفوظ ہے۔“

”مجھ کو کیا ملک صاحب۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”ایک گھنٹا تو بہت ہے۔ اگر دس منٹ کے اندر ہی بددیہی بدبول پڑا تو میرا نام بھی گرم واہیں۔“

”تم نے اس کے ساتھ جو بھی کرنا ہے وہ کرو۔“

پرچا
نہیں ملتا

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

تھوڑی سی دیر کے بعد کرم داد میرے پاس پہنچ گیا اور کہا: "ابا، اب تو ادب و احترام کے ساتھ بولا۔" "مکمل صاحب!" "ہمیں کچھ ملتا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔ "تم نے ایک شخص کے اندر تیش کی کسوٹی پر ٹھس کر رکھ کر اور کھوٹے کی پہچان کرنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟.....؟" "آپ بے فکر ہو جائیں مکمل صاحب!" وہ بڑے

میں اثبات میں سر ہٹا کر رہ گیا۔
 پایا لیڈر اور اینڈ مینی کوکھڑ پر روانہ کرنے کے بعد میں
 بدری اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔ مجھے یوں
 محسوس ہو رہا تھا کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے
 اس کیس کا اوٹ لازماً کسی کروٹ بیٹھ جائے گا۔ اچانک

”میں بھی اس معاملے کو جلد از غند نشانہا جپتا ہوں
اس لیے بدری کو قہر و جید کی نگرانی میں اپنے ساتھ لے جائے گا
ہو۔“ میں نے غصہ سے ہونے لپچہ میں کہا۔ ”بدری کے
ہاتھوں میں ہتھکڑی اسی طرح لگی رہے گی۔ جیسے ہی جھپٹیں
آئیں گے، وہ جگہ سے اٹھ کر دو یا تین افراد میں سے ایک کا کمر

”ملک صاحب! یہ بات آپ کو بھی معلوم ہوگی کہ بدری کا کوئی باقاعدہ روزگار نہیں ہے۔“ نزاکت نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ”وہ گزر بسر کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف کام کرتا رہتا ہے جن میں اکثر کام اٹلے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں نے آج دن بھر بعض ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے جن کا بدری کے ساتھ میل جول رہتا ہے اور ان سب نے بدری کے حوالے سے مجھے ایک خاص بات بتائی ہے۔“

میں نے فیروزہ کو جانے کی اجازت دی تو وہ امید بھری
 لہجہ میں کہنے لگی: "اگر آپ کی اجازت ہے تو میں
 سیدھا ہوں۔"

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بدری کی جیب عموماً خالی ہی رہتی ہے لیکن ان دنوں وہ اپنے یادداشتوں پر غروب پہے خرچ کر رہا تھا۔ کسی نے اس سے سوچ لیا۔"

ایک دن تک انتظار کرتا ہوگا۔“

”میں کل کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں۔“ وہ اجابت میں لڑون چلائے
 ”اُسی کوئی بات نہیں یار۔“ بدری نے بے پروائی
 سے کہا، ”بس، مجھے عارضی طور پر ایک ایسی نوکری مل گئی
 ہے جس پر مجھے کام کرنا پڑے گا۔“

آیا۔ میں نے اسے بددلی کے حوالے سے سن گن لینے کا کام

سوچا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں جیسے عجیب سی محک نظر آئی تو میں نے سوال کیا۔

”نزاکت! کیا رپورٹ لائے ہو؟“

رپورٹ کافی دلچسپ ہے جناب۔ وہ جیسے
انداز میں بولا۔

”اس دلچسپ رپورٹ کی تفصیلات کیا ہیں؟“

تھا کہ میں ان تھامے داروں میں سے نہیں ہوں جو چودھریوں، خانوں، وڈیروں، رانوں اور اسی ٹائپ کے طاقتور جاگیرداروں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور نظارہ حرکت پر پولیس کے ملازم رہتے ہوئے وہ اپنے ان پرائیویٹ آقاؤں کی جاگرتی میں لگ جاتے ہیں۔

امید پروردگار تو کا جناب۔۔۔

"بالکل!" میں نے اس کے حسبِ نفاذ سرگوشیاں

آگیا۔ اس کے ساتھ تین جاو حاشیہ بردار بھی تھے۔ میں

نے چھوٹے بچوں کو باہر دیک کر ریاض کو اندر بلا لیا۔ اس نے ہنسنے لگا اور کہا:

"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری بات نہ سناؤ گے، اب تم میری بات سن رہے ہو!"

میں نے دبی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ "کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

”نہیں، جناب!“ وہ فحشی میں منہ دی بلاتے ہوئے
 وڑے رانا صاحب لہا ہورے واپس آئے ہیں؟“

اسی کی وقت اس پیارے روپ کو ہم بڑی دیر تک
 کام کرنا ہی ہوگا۔“ میں نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ”انشا اللہ!

بولی۔ "رات کو تو وہ نہیں آئے۔ امید ہے، آج کسی وقت اباجی کل صبح تک یہ کیسے روڑہ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا۔"

”ہمارے کیس کا کیا نتائج؟ کیا صد روٹے کچھ بتایا ہے؟“

”صدر کو تو میں آج کسی دقت چھوڑ دوں گا۔“ میں نے اسے لکھ کر دیا۔ ”مجھے دو غائبہ قصور لگتا ہے۔“

یہ ہے۔ ایک کام کا بندہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ حوالہ دار اس

”نہیں۔۔۔۔۔ آہ بدری۔ کفن چور کی بات تو نہیں کی زبان کا جھنڈا اھول رہا ہے۔“

کر رہے تھے۔ اس نے بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا: "کیا تم نے اس بار بھی اس بات کی تصدیق نہیں کی؟"

کیا ہے۔ آج صبح وہ آپ کے بندوں کے ساتھ ظفر پور کے

قبرستان میں بھی دیکھا گیا ہے۔“

”ابھی بچہ رانا جا۔“

”نہ، اے خوش کرنے کی

جھاندریاس کے چائے سے بعد والد اور میرے پاس آیا۔

کرم داد نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دس منٹ میں بدری کا

غرض سے کہا۔ ”تمہاری سی آئی ڈی تو پولیس ڈیپارٹمنٹ

”بس جی دیکھا کر س۔“ وہ چوڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”گھاؤں چلانے کے لیے ہر معاملے کی خیر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔“

کئے ہیں۔" کے لئے پیش کے اسٹیکل استعمال کرنا پڑیں گے۔

وہ گاؤں کو چلا کے یہ بات اس شخص سر رہا تھا جیسے وہ
 گاؤں نہ ہوا۔ کوئی تہوی مشین ہوگئی جسے وہ کسی آپریٹر کے

انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر رکھا کہ استاد صاحب نے جہاں اشارہ کیا اور ٹیچر سے

مزاج سے بات کر رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں، اس کے دو

بنیادی اسباب تھے۔ اول، برائیاں فاس نے اسے چھایا ہوا۔
 ”اور کچھ نہیں۔ میں اب اس کی زبان کا چتر دکھانے کے

خیال میرا خوشبو کی طرح

☆ ہم نے سمندروں میں پھل کی طرح حیرنا اور نقضوں میں پرندوں کی طرح اڑنا سیکھ لیا مگر آج تک ہمیں زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں آیا۔

☆ ضمیر کی عدالت میں ضرور جانے کیونکہ وہاں غلط فعلے نہیں ہوتے اور نہ ہی دیکھوں کی غیس بھری پڑے گی۔

☆ جب ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو بے حساب مانگتے ہیں لیکن جب عبادت کا وقت آئے تو نواہل بھی گن گرا دیتے ہیں۔

☆ جڑیں سلامت ہوں تو نغمہ مند درختوں پر بھی موسم بدلنے ہی پھول آجاتے ہیں۔

☆ ایک خوب صورت دل ہزار خوب صورت چہروں سے بہتر ہوتا ہے لہذا بہتر لوگ منتخب کریں، جن کے پاس خوب صورت دل ہیں نہ کہ خوب صورت چہرے۔

☆ اگر آپ اپنی زبان سے وعدہ لے لیں کہ وہ صرف ایک معقول بات کرے گی تو آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ آپ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

ٹی وی چینلز

ایلیس کے چند چیلے جب اس کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ چیلوں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، آج کل آپ نے شیطانی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔“ کہیں آپ کی صحت تو نہیں جواب دے گئی؟“

یہ سن کر ایلیس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اس بارے میں تشویش کرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل میں نے اپنا سارا کام ٹی وی چینلز کو سونپ دیا ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

قبرستان تک پہنچے تھے اور پھر اسی تیل گاڑی پر الیاس کی لاش کو ڈال کر نہروالے ہل کے قریب پہنچے تھے۔ یہاں تک تو فیروزہ نے بھی اٹھا کا کھرا نکال لیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی کچھ اسی طرح تھی۔ انہوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا کر نہروالے ہل کے نیچے ایک خفیہ مقام پر چھپا دیا تھا۔ ان دنوں نہروالے اندر پانی بہت کم تھا۔ پانی کی ایک پتلی سی گلیز نہروالے ہل کے قلب میں سست روی سے دریاں دو اٹھتی تھیں ان کے نیچے یہ کارروائی کرنے میں انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تیل گاڑی کے تیل کو کھول کر انہوں نے نہروالے ہل کے صے میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔ نہروالے اس کنارے سے اکثر گائے، بھینسیں اور دیگر مویشی پانی پینے اور غسل کرنے کی غرض سے نہروالے اترتے ہی رہتے تھے لہذا اس صے میں مختلف جانوروں کے قدموں کے لاعداد نشانات ایک دوسرے میں بدگم تھے۔ فیروزہ کا اسی سبب ادھر دھیمان نہیں گیا تھا۔ وہ تو قبرستان سے نہروالے ہل تک تیل گاڑی کے بازوؤں کا کھرا پکڑ کر آیا تھا اور یہی سڑک پر پہنچ کر بازوؤں کا کھرا غائب ہو گیا تھا۔ تیل کے بغیر گاڑی کو ان دونوں نے دھکیل کر سڑک کے کنارے واقع ایک گڑھے میں پیسٹ کر کے آگ لگا دی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ساتھ مٹی کے تیل سے بھری ہوئی ایک بوتل بھی لائے تھے۔ چوٹی گاڑی جل کر راکھ ہو گئی۔ مذکورہ تیل گاڑی انہوں نے اس واقعے سے ایک دن پہلے چرائی تھی۔ ”مال مسروقہ، دل بے رحم“ کے مصداق انہیں گاڑی کے جلنے کا غم تھا اور نہ تیل کے کہیں بھی نکل جانے کا۔۔۔۔۔

کرم داد کی بیان کردہ تفصیل کے کئی گوشے تھکے تھے لہذا جب بدری کو میرے پاس پہنچا یا گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”اس وقت ہم دونوں کے علاوہ یہاں اور کوئی موجود نہیں اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کمرے کی باتیں باہر نہیں جائیں گی لہذا تم نے صرف اور صرف سچ بولنا ہے۔ حوالدار کو تم نے جو کہانی سنائی ہے اس میں بے شمار الجھنیں اور گھماؤ پھراؤ ہے۔ سمجھ لو کہ میں تمہیں جان بچانے کا آخری موقع فراہم کر رہا ہوں۔ جھوٹ بول کر تم اپنی موت کے پردانے پر دستخط کرو گے۔“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو بھی پوچھیں گے اس کا بالکل ٹھیک جواب دوں گا۔“

”یہ خادو نامی بندہ کون ہے جس کے ساتھ مل کر تم نے

حرارت کو رد مان پرورد اور فرحت بخش تمازت کہہ سکتے ہیں۔ حوالدار کرم داد کو بدری کے معاملے میں گزشتہ روز میں سب فری وینڈ دے دیا تھا۔ آج میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ کرم داد میرے پاس آگیا۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش اور آنکھوں میں سچ کی چمک تھی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”گلتے ہم نے بدری کی زبان کا تھل تو ڈالا ہے۔“

”جی ملک صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں نے نقشہ کی روایتی اور آزمودہ کار ترکیب جب بدری پر آزمائیں تو اس کی ساری ہٹ دھرمی اور سخت جاتی دھواں بن کر اڑ گئی۔ اب وہ تیر کی طرح سیدھا ہو چکا ہے اور ہم سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے۔“

”ٹھیک ہے، لے آؤ اسے۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں بھی تو دیکھوں، تم نے اس طبی کو کتنا سیدھا کیا ہے۔ ویسے اس سے نہیں کیا بتایا ہے؟“

”کافی کچھ بتایا ہے اور بہت کچھ چھپا رہا ہے۔“ وہ ذوقی انداز میں بولا۔

”مطلب یہ کہ اس کی زبان کا تالا پوری طرح تم سے کھل نہیں سکا؟“ میں نے سوالیہ نظریں حوالدار کی طرف دیکھا۔

”ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”تالا کثرتی سب کھل چکا ہے۔ اس نے مجھ سے التجا کی ہے کہ چند اہم باتیں وہ صرف آپ سے کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔“

کرم داد کے سامنے بدری نے جو کچھ اگلا تھا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے تھا۔ وہ اور اس کا ساتھی خاور ظفر پور کے قبرستان سے الیاس کی لاش لے آئے تھے۔ الیاس سے ان کی کوئی دشمنی تھی اور نہ ہی کوئی تعلق واسطہ۔ انہیں کسی خاص مقصد کے لیے بس ایک تازہ دفن شدہ لاش کی ضرورت تھی اور انہیں پتا چلا تھا کہ دو روز پہلے ظفر پور کے قبرستان میں دو مچوں کو دفن کیا گیا تھا۔ ظفر پور کے قبرستان میں داخل ہونے کے بعد وہ بوکھلا گئے اور غلطی سے صغریٰ کی قبر کو الیاس کی قبر سمجھ کر کھول لیا لیکن جب کنفن کے اندر بالوں والی ایک عورت کی لاش نظر آئی تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر الیاس کی قبر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ انہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک اچھے عمر مرد کی لاش کی ضرورت تھی اور الیاس کا خردہ ان کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ وہ نہروالے سڑک سے تیل گاڑی پر سوار ہو کر

آزاد چلی ہو۔ اس قسم کی ملازمت تمہارے بس کا کام نہیں۔“

”میں نے کہا تھا یہ عارضی نوکری ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن یہ بھی تو بتاؤ کہ اس نوکری کی نوعیت کیا ہے؟“

”چند ماہ کے بعد انگلش ہونے والے ہیں۔“ بدری نے اس بندے کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں رانا صاحب کی انتظامیہ مہم کا نگران بن گیا ہوں۔ وہ پختی مرتبہ انگلش میں حصہ لے رہے ہیں اس لیے دل کھول کر جیسا خرچ کر رہے ہیں اسی لیے اپنے بھی پیش کئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“

نراکت علی اپنی تحقیقاتی رپورٹ دے کر رخصت ہو گیا تو میں اس نئی صورت حال پر غور کرنے لگا۔ رانا فیاض کی زبان کی سادگی کی ہی بساط کی مجھے خبر ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ رانا منور پختی بار انگلش میں حصہ لے رہا تھا اور وہ بھی اپنے بڑے بھائی رانا مظفر کے خلاف۔ دراصل وہ رانا مظفر کے ایک ویرینہ حریف لطیف چیمبر کے ہاتھوں کا کھلو بن گیا تھا اور لطیف چیمبر کے مقابلے میں وہ رانا مظفر کو ہرانے کے لیے انتخابات میں شریک ہو کر ووٹرز کو تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پرانی رنجشوں اور عداوتوں کے نتیجے میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ دشمنی کی اس انصاف میں سوچا جاسکتا تھا کہ بدری نے رانا منور کے ایما پر صغریٰ کی لاش کے ساتھ وہ بھائی کا مذاق کیا تھا۔ رانا منور اپنی بھالی کے لیے دل میں کوئی ایچھے چنڈ بات نہیں رکھتا تھا لیکن دو سوالات ایسے تھے جو کسی بھی صورت مجھے مبہم نہیں ہو پا رہے تھے۔

سوال نمبر ایک، صغریٰ کی قبر کو کھول کر بدری نے اس کی لاش کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ تو مجھ میں آ رہا تھا لیکن الیاس کے ساتھ بدری کی یا رانا منور کی کیا دشمنی تھی؟ اس بے چارے کی لاش کو کہاں اور کس مقصد کے لیے غائب کیا گیا تھا؟ سوال نمبر دو، اگر بدری واقعی رانا منور کی سیاسی مہم کو چلا رہا تھا تو رانا منور اپنے سیاسی ورکر کی گرفتاری پر مندر میں جھگڑنیاں ڈالنے کیوں بیٹھا تھا؟ بدری پچھلے میں، بائیس مہینے سے پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ رانا منور کو اس کی گرفتاری کی خبر ہی نہ ہو پھر رانا کی اس پراسرار خاموشی کا کیا مطلب تھا؟

ان دونوں سوالات کے جوابات بدری ہی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

اتحادہ جنوری کی صبح خاصی خوشگوار تھی۔ اس روز مطلع صاف تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا تاہم اس کی دھوپ میں وہ تمازت نہیں تھی جو موسم گرما کا خاصہ ہوتی ہے۔ آپ اس

خلف پور کے قبرستان کو ادھر سے لایا ہے؟“
 ”خاور میرا جگر یار ہے جناب۔“ اس نے بتایا۔
 ”اور یہ لطیف چیمہ کا ذرا نمبر ہے۔“
 ”وہی لطیف چیمہ جو رانا مظفر کے مقابلے میں ایکشن
 لڑ رہا ہے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔
میں نے سوال کیا۔ ”تو یہ ساری کارروائی تم لوگوں
نے لطیف چیمبر کے ایما پر کی ہے۔۔۔۔۔ رانا مظفر کو فیل ورسوا
کرنے کے لیے؟“
”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔
”چیمبر صاحب کو تو اس واقعے کی خبر بھی نہیں۔“
میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”پھر
تو یقیناً اس کام کا حکم رانا منور نے دیا ہوگا؟“
اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

میری آنکھوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں بدری سے کہا۔ ”پھر مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم دونوں کا منصوبہ کیا تھا۔ تم نے کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے الیاس کی لاش کو قبر سے نکال کر نہر کے پل کے نیچے چھپا رکھا ہے۔ آخر تم لوگ کرنا کیا چاہتے تھے؟“ یہ منور صاحب کے نکل کا منصوبہ تھا۔ وہ سسٹنی فیئر لہجے میں بتانے لگا۔ ”رانا منور آج یعنی اتھارہ جنوری کو ایک سیاسی جلسہ کرنے والے تھے۔ لطیف چیمہ نے انہیں جلیب گاہ تک پہنچانے کے لیے ڈرائیور سمیت اپنی گاڑی بھیجی تھی۔ اس گاڑی کو نہر کے پل کے قریب سے گزرنا تھا۔ پروگرام کے مطابق.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

”پہلے پہنچ کر خاورد نے گاڑی کو کسی فنی خرابی کا بہانہ کر کے روک لیا تھا۔ اسی وقت میں منہر کے ہلے کے نیچے سے نکل آتا اور ہم دونوں ہل کر رانا منہر کو گھٹکانے لگا دیتے۔ پھر الیاس کی لاش کو ڈرائیونگ سیٹ پر ٹھونس کر گاڑی کو نذر آتش کر دیا جاتا۔ سوختہ گاڑی کے اندر سے بعد ازاں پولیس کو دو لاشوں کے کوئلے ملے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا عقبی نشست پر۔ اس صورت حال میں پولیس اسی نتیجے پر پہنچتی کہ کسی فنی خرابی کے باعث گاڑی کے انجن میں آگ لگ گئی تھی ہوگی اور جھم زدن میں اس آگ نے گاڑی کے بیٹریول ٹینک تک پہنچ کر گاڑی کو ایک دھماکے سے اڑا دیا۔“

چشم فتنہ پرورد باری کو گھوڑا تھا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری غلطی ہے کہ تم نے پوچس کو اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ تم لوگوں کا جو بھی پروگرام تھا اس پر تم عمل نہیں کر سکے۔ تم دونوں سے جو بھی سنگین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کے خوالے سے میں تمہارے لیے مہمکاش نکالنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے بتاؤ کہ اس مہمک منسوبے کا اسٹارٹ کون ہے؟“

”رانا منظر“..... وہ انکشاف آئینہ مجھے میں جولہ۔
 ”اس نے ہم دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا
 تھا۔ ایک ہزار ایدہ دس اور چار ہزار کام مکمل ہونے پر.....“
 ”تمہارا دامغ تو ٹھیک ہے بدری.....؟“ میں شیشہ کر
 رہ گیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارے دار صاحب اور یہ بیان میں عدالت میں کہنے پر جو کچھ دے سکتا ہوں۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولا۔ ”رانا مظفر نے ہم دونوں کو پاچا ہراجا ہراجا میں خریدنا تھا اور ہمارے اس منصوبے کی کسی کو خبر نہیں۔ اس کام کو مکمل کرنے کے بعد خاور کسی اور ضلع میں جا کر نئی زندگی شروع کر دیتا۔ سب یہی سمجھتے کہ رانا منور کے ساتھ لطیف چیمہ کا ذرا بیورو خاور بھی چل رہا۔“

میں نے خون سفید ہو جانے کے بارے میں پڑھا
اور سنا تھا اور بعض اوقات قدرت اس کی عملی مثالیں بھی دکھا
دیتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔
اسی دو پہر میں نے دانا مظفر کو اس کی حویلی سے گرفتار
کر لیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں نے اس پر پکڑا تھا تو ا
ہے تو وہ گردن جھکا کر بولا۔

”ملک صاحب! میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے چاروٹا چارو سب کرنا پڑا۔ میں لطیف چیمہ کے ہاتھوں اپنی ٹھکست کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”پھر تو تمہیں لطیف چیمہ کی زندگی کا چراغ کھل کر دکھایا جائے تھا۔“ میں نے تجھے اعزاز میں کہا۔

وہ عجیب سے لکچر میں بولا۔ ”ہمارے ہوئے جواری
پر ہاتھ اٹھانے کے بجائے اسٹین کے سانپ کا سر پکڑنا زیادہ
ضروری ہوتا ہے۔“
میں نے بھی رانا مظفر کو چاروٹا چاروٹنگی بھر کے لیے
جیل بھجوا دیا۔

(تحریر: خُسام بیٹ)

اکثر اوقات کم عمری کی معصوم دوستی بھی بڑے رنگ دکھائی ہے۔ وہ بھی اپنی چھوٹی سی دوست کی گم شدگی پر بے تحاشا افسردہ تھا اور اسی اداسی نے اس کے دل میں ایک جستجو پیدا کی، جس کی روشنی میں وہ اس گم شدگی کی اصل تہ میں پہنچ گیا۔

تاوانی میں انتہائی دانا کی سے کام لینے والے ایک بچے کی ذہانت

سید شاہ زین رضویان

گم شدہ



اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سفید سایہ لہرایا اور اس نے دیکھا کہ صوفی اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ اکثر اسکول میں ملا کرتے تھے لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب اس سے ملنے آئے گی۔

بلیس جنگل میں گیلی زمین پر بیٹھا جتنی ہوئی موسم جی
 کو دیکھ رہا تھا۔ مکی اپنی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے موسم
 جی کا شعلہ کبھی کبھی بھڑکنے لگتا۔ اس نے احتیاطاً اسے ایک
 سوڑے کی پرانی بوتل میں پھنسا دیا تھا۔ وہ نوسالہ لڑکا وحشی
 دوپہر میں بڑی سے چٹائی سے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک

ماں کے لئے بوائے فریڈ نے نیشکی حالت میں اس کا چھپا کیا تو وہ ڈر کے مارے قریبی جنگل میں جا کر اسی جگہ چھپ گیا جہاں وہ اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں میں سر دیے رو رہا تھا۔ اس لیے اس سات سالہ لڑکی کو نہ دیکھ سکا جو اس کے پیچھے چلتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔ اسے لڑکی کی سوچوگی کا احساس تب ہوا جب اس نے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا لیکن جب اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑا تو ٹیٹس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے تاہم ٹیٹس کے آنسو خشک نہ ہو گئے۔

صوفی اس کے برابر میں اپنے گھنٹوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹیٹس نے دیکھا کہ اس کے سنہری بال کبھی ہو رہے تھے اور پکڑوں پر دھبے لگے ہوئے تھے۔ اسے کھانسی بھی ہو رہی تھی۔

ٹیٹس نے پوچھا: ”تمہیں اپنی جیکٹ دوں؟“

صوفی نے لٹی میں سر ہلایا اور کمزور آواز میں بولی۔

”یہ صوفی کھان سے لی؟“

”فادر گرگوری نے مجھے چرچ میں دی تھی۔“ ٹیٹس نے جھوٹ بولا۔

”کیوں؟“

”شاید وہ میری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دوسری صوفی بتی نکال کر اسے دی۔ یہ صوفی بتیاں اس نے گر جا کے اس کے کمرے سے چرائی تھیں جہاں خبرک چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ”یہ تم رکھ لو۔“

یہ دوسرا صوفی تھا جب اس نے صوفی کو کوئی تھنہ دیا۔ اس سے پہلے وہ اسے پلاسٹک کا تاج دے چکا تھا جو اس نے اپنی ایک گلاس فیلو سے چرایا تھا۔

صوفی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ صوفی بتی پکڑ لی اور اسے یوں دیکھنے لگی جیسے وہ ایسا چیزوں سے ناواقف ہو۔ اس نے پوچھا: ”تم نے چرچ میں ان صوفی بتیوں سے کیا کام لیا؟“

”ہم نے آج گاٹھیک ہونے کی دعا کی۔“

”کیوں؟“

ٹیٹس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ آج سینٹ ٹیٹس کا دن ہے اور وہ صوفی بتی کے ذریعے لوگوں کے گلے کا علاج کرتے تھے۔“

”تمہارا نام بھی تو ٹیٹس ہے۔“

”ہاں۔“ ٹیٹس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں

دکھاتا ہوں۔“

اس نے بول سے اپنی صوفی بتی نکالی اور صوفی سے اس کی صوفی بتی سے گردنوں کو کھینچ کر اس کے گلے کی دونوں جانب رکھ کر بولا۔

”اب دعا مانگو۔“

اس نے کوشش کی کہ پادری نے جو دعا مانگی تھی، وہ اسے یاد آجائے۔ ”ہم سینٹ ٹیٹس سے دعا مانگتے ہیں کہ صوفی کا گلا اورو۔۔۔ اور۔۔۔ اس نے قریب ہو کر دیکھا کہ صوفی کی گردن کے گرد جاسی رنگ کے زخم نظر آیا اس کی ٹیٹس کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔۔۔۔۔“ اسے ہر بیماری اور معیبت سے محفوظ رکھ۔ اس کی حفاظت فرما۔“

اس نے صوفی بتیاں نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پوری دعا ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن یہ اس سے بہت قریب ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے صوفی کی صوفی بتی اسے واپس کر دی۔

”شکریہ۔“ صوفی نے سرگوشی کی۔

”اب تمہارا گلا خراب نہیں ہوگا۔“

اس کی خواہش تھی کہ وہ صوفی کو اپنے گھر نہ لے کر لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں بھی اس پر راضی نہیں ہوگی حالانکہ ان دونوں اس کا کوئی دوست ان کے ساتھ نہیں رہ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صوفی اپنے گھر واپس جائے کیونکہ وہاں کا ماحول اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے والدین کے بارے میں یہ افواہ گرم تھی کہ وہ اپنے گھر میں نشہ آور دوا میٹھ (میٹھا ڈون) تیار کرتے ہیں۔ ٹیٹس کی ماں نے اسے سختی سے وہاں جانے کے لیے منع کیا تھا کیونکہ وہ دوا خطرناک اور مضر صحت تھی۔

اس نے صوفی کی جلد پر پڑے نشان دیکھ کر کہا۔ ”یہ کیسے آئے؟“

صوفی نے اپنا چہرہ نیچے کر لیا اور جواب میں کچھ نہیں بولی۔ چند لمحوں بعد ٹیٹس نے چاروں طرف دیکھ کر محسوس کیا کہ اندر پوری طرح ٹھیک چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ”اب ہمیں گھر جانا چاہیے۔“

صوفی نے اثبات میں سر ہلادیا اور ٹیٹس اس کا ہاتھ پکڑ کر جنگل سے باہر آگیا۔ سڑک پر آنے کے بعد اس نے صوفی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ ٹیٹس اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو وہ بھی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے روز وہ اسکول نہیں آئی۔ ٹیٹس نے کچھ خیال نہیں

کیا لیکن جب وہ مزید دور دراز غیر حاضر رہی تو اسے فکر ہونے لگی اور وہ اس کا چٹا لگانے میں نڈیا۔ اس کی کمر پر اسکول بیک لگا ہوا تھا اور وہ صوفی کے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ بیرونی محسن کے چاروں طرف کافی اونچے زنجیر کی بازلی ہوئی تھی اور ایک کھڑکی کا پیشہ غائب تھا۔ اس کی جگہ پلائی وڈ کے تختے لگے گئے تھے۔ ٹیٹس نے بڑی مشکل سے گیٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اچانک ہی ایک بڑے سرد والا کتا بھونکتا اور غراتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ ٹیٹس اسے دیکھتے ہی والپس ہولیا۔ کتے کی زنجیر کاٹی گئی تھی تاہم اب وہ اس کی تختی سے دور ہو چکا تھا۔ کتے نے مالپس کے عالم میں ایک دردناک چیخ نکالی اور وہیں بیٹھ کر غرائے لگا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے ٹیٹس نے دیکھا کہ مکان کا بیرونی چابی والا دروازہ کھلا اور ایک دروازہ شخص ٹیٹس کے بغیر باہر آیا۔ ”تم کون ہو؟“ اس نے نا کواری سے پوچھا۔ ”اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس کے پورے جسم پر رنگ برنگے ٹیوٹے ہوئے تھے۔ ٹیٹس کی کچھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں سے دیکھنا شروع کرے۔

”بھتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میں نے کتے کی زنجیر کھول دی تو تم دف فٹ کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکو گے۔“

ٹیٹس نے ماتھے پر سے بال ہٹائے اور بولا۔ ”میں صوفی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اسکول نہیں آ رہی۔ ٹیٹس نے اس کا ہوم ورک بھیجا ہے۔“ اس نے آخری جملہ جھوٹ بولا تاکہ اس کے آنے کا جواز بن جائے۔

ایک چھوٹے قد کی سنہرے بالوں والی عورت اس آدمی کے برابر میں آ کر کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”یہ لڑکا کون ہے؟“

”میرا نام ٹیٹس ہے۔ صوفی میرے ساتھ رہتی ہے۔“

”وہ بتا رہے۔“ اس عورت نے جواب دیا۔

”کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں۔“ مرد بولا۔ ”وہ ہوم ورک نہیں کر سکتی۔ اس کی ماں نے ابھی بتایا تو ہے کہ وہ بیمار ہے۔“

ٹیٹس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے ہوم ورک دے کر اس کے دھتھلے لیتے ہیں۔“

”لعنت ہو تم پر۔“ اس آدمی نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ میرا صبر جواب دے جائے، تم اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہیں کسی نے

یہاں نہیں بھیجا۔ تم وہی ہونا جس سے وہ چوری چوری ملنے جاتی ہے۔“

اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں اس جنگل میں کیا کرتے ہو؟ تم مجھے ہو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن میری نظر ہر طرف رہتی ہے۔ تم نے اسے ہاتھ تو لگایا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کیا کرتے رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ مزید آگے بڑھتا، ٹیٹس نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ کچھ دور جا کر اس نے ہلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اس کا زوردار قبضہ سناٹا دیا۔

”جیسے کہ دن وہ اسکول کے دفتر گیا۔ ایڈمنسٹریٹر سز روز نے اسے گھورا۔“ کتا سز جیبر لین نے تمہیں دوبارہ بھیجا ہے؟“ اس کا اشارہ اسکول کی پرنسپل کی طرف تھا۔ ٹیٹس نے لٹی میں سر ہلادیا۔

”پھر کس نے بھیجا ہے؟“

”کسی نے نہیں۔“

”پھر یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر بیمار ہو تو تمہیں اسکول نرس کے پاس جانا چاہیے۔“

”میں نہیں البتہ صوفی بیمار ہے۔“ ٹیٹس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسکول کب آئے گی۔“

”اوہ۔ اب کبھی۔“ سز روز نے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ ہمیں کسی طالب علم کی بیماری کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ چاہے ہمیں پہلے سے معلوم کیوں نہ ہو۔ کاش مجھے۔۔۔۔۔“

”اس کا نام صوفی ہے۔“

”میں اس کا پرانہ نام جانتا چاہوں گی۔“

”کالڈوئل۔۔۔۔۔“ ٹیکہ ٹری نے اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”یہ صوفی کالڈوئل کی بات کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے دو دن پہلے اسے اسکول سے نکال لیا ہے اور وہ اپنے حقیقی باپ کے پاس رہنے چلی گئی ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ سز روز نے ٹیٹس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کم از کم تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ اب وہ بیمار نہیں ہے۔“

”وہ تمہیں نہیں گئی ہوگی۔“ ٹیٹس نے منہ ہی منہ میں کہا۔

”میں کبھی نہیں۔“ سز روز بولی۔

”وہ مجھے بتاتے بغیر نہیں جاسکتی۔“ ٹیٹس نے کہا۔

”اس نے مجھے خدا حافظ نہیں کہا۔“

”معاف کرنا لڑکے۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔“ مسز روز بولی۔ ”ممکن ہے کہ یہ سب اچانک ہوا ہو اور اسے خدا حافظ کہنے کا موقع نہ ملا ہو۔“

”بہنیں ہو سکتا۔“ اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”بہنیں.....!“ مسز روز بولی۔ ”تم مسز جیبر لین کے پاس جاؤ اور اسے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ وہ بارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد بلیس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اسکول کی شارت سے باہر آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ پرنسپل کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ الٹا اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے فی الوقت اس معاملے کو ملتوی کر دیا۔ اسے کچھ وقت درکار تھا لیکن وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنی سائیکل اٹھالی اور وہاں سے چل دیا۔

وہ اپنی سڑک سے گزر کر اس جگہ پہنچا جہاں اس نے آخری بار صوفی کو دیکھا تھا۔ وہ یہ اطمینان کرنے کے لیے رک گیا کہ وہاں کوئی پولیس کار یا کوئی اور شخص تو موجود نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اس جگہ سے ٹھوٹا ہوا جہاں سڑک کے کنارے بکھرے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے، صوفی کے گھر کے نزدیک فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔ اس کی نظر ایک سائیکل پر پڑی جو گھر کے سامنے رکھے ہوئے ڈبوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے رک گیا۔ وہ ایک چھوٹی گلابی رنگ کی سائیکل تھی جس کے پنڈل میں ایک کھٹی کھٹی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ صوفی کی سائیکل تھی۔ پھر کتے نے اسے دیکھ لیا۔ جیسے ہی اس نے بھونکنا شروع کیا، بلیس مڑا اور تیزی سے سائیکل چلائے ہوئے اتنی دور نکل گیا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز اس تک نہ پہنچ سکے۔ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ کر اس نے سانس پر قابو پایا اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس پر یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صوفی اپنی سائیکل چھوڑ کر چلی جائے گی جبکہ اس نے حال ہی میں سائیکل چلانا سیکھی تھی۔ اگر انہوں نے واقعی صوفی کو اس کے باپ کے پاس بھیج دیا تھا تو انہوں نے اس کی سائیکل کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینکتے کے بجائے اس کے ساتھ کیوں نہیں بھیجا؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ صوفی کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرے۔

اس نے جتنے کے روز اسکول انتظامیہ سے جو

نا مناسب رویہ اختیار کیا تھا، اس کی سزا کے طور پر اسے ایک ہفتے کے لیے اسکول آنے سے روک دیا گیا۔ اس طرح اسے اپنے منصوبے کی تیاری کا موقع مل گیا۔ وہ اپنی ماں کی آنکھ بچا کر سر پار کر دیتا جاتا اور وہاں سے گوشت کے پیکٹ چرا کر لے آتا۔ اس نے وہ سارے پیکٹ ایک تھیلے میں جمع کر کے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر رکھ دیے تھے۔

جب وہ صوفی کے گھر پہنچا تو اس کے انتظار میں تھا۔ پہلی رات اس نے گوشت کا پیکٹ اس طرح پھینکا کہ کتا اس تک یہ آسانی پہنچ سکے اور خود تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ دوسری رات جب کتے نے اسے جبکٹ سے گوشت کا پیکٹ نکالتے دیکھا تو بھونکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا پھر وہ اس پر یوں بھینٹ پڑا جیسے اس نے چوئیں کھنٹے سے کچھ نہ کھا ہوا ہو۔ تیسری رات وہ اس راستے پر نظر نہیں بنائے اس کا انتظار کر رہا تھا جہاں سے بلیس آیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اگلے پنجے پہلے ہی سے باڑ پر رکھ لیے تھے۔ گوکہ بلیس کو سائیکل سے اتارنا دیکھ کر اس کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ برآمد ہوئی لیکن وہ بھونکا نہیں۔ بلیس نے گوشت کا ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔ کتے کے خوفناک دانتوں اور اس کی آنکھوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا۔ چوئیں رات بلیس نے گوشت کا ٹکڑا دینے سے پہلے اس کے سر کو چھونے کا خطرہ مول لیا اور حیرت انگیز طور پر کتے نے اس کی اجازت دے دی۔ جب وہ اپنا کھانا ختم کر چکا تو اس نے دیکھا کہ بلیس اب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور آگے پیچھے دم ہلانے لگا۔

بلیس نے اپنا ہاتھ باڑ پر رکھا اور انتظار کرنے لگا۔ کتے نے ناگوں کے بل پر اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور اپنے عین کی آنکھیں اسے دیکھنے لگا پھر اس نے بلیس کی ہتھیلی کو زبان سے چابنی شروع کر دیا۔

بلیس نے مسکراتے ہوئے سرگوٹش کی۔ ”گڈ بوائے ٹوٹی۔“ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کتے کو یہ نام کیوں دیا۔ شاید اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ نام پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ ”تم ایچھے ہو ٹوٹی۔“ اور جب بلیس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ تیزی سے دم ہلانے لگا۔

گھر کے اندر اونچی آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ بلیس نے کسی مرد کو قہقہہ لگتے ہوئے سنا پھر وہ آواز کھاسی میں تبدیل ہوئی۔ پورے گھر میں روشنی تھی جو کونے کے آخری سرے پر تھا اور بالکل اس کے بیڈ روم جیسا لگ رہا تھا۔ اسے

یقین تھا کہ یہی صوفی کا کمرہ ہے۔ اس نے ٹوٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کل آؤں گا۔“

جب وہ اگلی رات وہاں پہنچا تو اس نے ٹوٹی کو اگلے بیچوں سے زمین کھودے اور مٹی کو اوپر اڑھ کر دے دیکھا۔ وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں تک اس کی ذہنی جاکتی تھی۔ بلیس نے باڑ کے قریب پہنچ کر ہلکے سے مٹی کی آواز نکالی۔ کتے نے سر اٹھایا اور اپنا کام چھوڑ کر باڑ کی طرف لپکا۔ بلیس نے اسے اپنے ہاتھوں سے گوشت کھانا شروع کیا اور اس دوران وہ اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتا رہا۔ جب سارا گوشت ختم ہو گیا تو اس نے ایک بار پھر اسے چھٹی دی اور سرگوٹش میں کہا۔ ”گڈ بوائے ٹوٹی۔“ پھر وہ باڑ سے کود کر اندر آ گیا۔ اس نے جبکٹ اتار کر ذہنی پر ڈالی اور صوفی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ کتا اس کے ساتھ ساتھ گیا جہاں تک اس کی ذہنی جاکتی تھی۔ پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر دھب کر بیٹھ گیا۔

بلیس نے جینز کی جیب سے اسکرڈ رائیڈر نکالا اور صوفی کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے مینا نیچے سینٹ کا ایک بلاک رکھا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ صوفی اس کے ذریعے کمرے میں آتی جاتی ہوگی۔ اس بلاک نے اس کا کام آسان کر دیا تھا۔ اس نے بلاک پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں سوائے سنگار میز اور بیڈ کے کچھ نظر نہیں آیا۔ جب اس نے پردے کی زوری دینی تو وہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اب اسکرڈ رائیڈر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لہذا اس نے اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے تیز موسیقی کے ساتھ ساتھ ایک مرد اور عورت کی نشے میں ڈوبی ہوئی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کسی ٹیلی ویژن اور گیسو لین کی بوی بھی محسوس کی۔

اس نے اپنا منہ اور ناک ڈھانپنے کے لیے تھیں اوپر کھینچی لی پھر وہ کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی پھر سرگوٹش میں کہا۔ ”صوفی! کیا تم یہاں ہو؟“

اسی لمحے خطرہ مول لیتے ہوئے اس نے لائٹ روشن کر دی جو اس نے اپنی ماں کی کئی پیمیں سے نکالی تھی اور اس کی روشنی میں کمرہ کا جائزہ لینے لگا۔ بستر، چھوٹی سی سنگار میز، ٹوٹا ہوا آئینہ اور اس کے سامنے رکھی کرسی، سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ فرش پر ایک بالوں کا برش پڑا ہوا تھا جس کے دندانوں میں سنہری بال چپٹے ہوئے تھے۔ کھلی ہوئی الماری

میں اس نے صوفی کے کئی عمدہ جوڑے دیکھے جو بے ترتیبی سے لٹکے ہوئے تھے اور اتنی ہی تعداد میں اس کے کپڑے ایک ڈھیر کی شکل میں گرد آلود فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

بلیس جانتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے اور بالوں کا برش چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے باپ نے اسے نئی چیزیں خرید کر دینے کا وعدہ کیا ہو لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چیز چھوڑ کر نہیں گئی ہوگی۔ اس کے کمرے میں کچھ فریج پر ایسا تھا جہاں وہ اپنی چیزیں چھپا سکتی تھی۔ وہاں کی تلاش لینے کے بعد وہ بیڈ کے نیچے جھک گیا۔ وہاں اسے گتے کا ہنا ہوا جوتوں کا ڈھانچہ آیا۔ اس نے نارنج منہ میں دبا کر اس کا ڈھانکنا دیکھا اور اس میں رہی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے آنکھیں سار کر دو بارہ دیکھا اور ڈھانکنا ڈبے پر دو بارہ رکھ دیا۔

کمرے کا چکر لگاتے ہوئے اس کی نظر سنگار میز پر رکھی ایک ٹوٹی ہوئی رنگین پینل پر پڑی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ وہ بال کے دروازے تک گیا اور اپنے کان اس طرف لگا دیے لیکن موسیقی اور مرد و عورت کی بے ربط باتوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر برآمدے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سفید دیوار پر حلی حرف میں لکھ دیا۔ ”صوفی کہاں ہے؟“

اپنے کام سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس کمرے میں گیا۔ جوتوں کا ڈھانچہ اور کھڑکی سے باہر ہو گیا۔ اسے کمرے سے باہر آنا دیکھ کر ٹوٹی نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور دم آگے پیچھے جمول رہی تھی۔ بلیس اسے نظر انداز کر کے باڑ پر سے کود گیا اور سائیکل پر سوار ہو کر رات کی تاریکی میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ جوتے کا ڈھانچہ اس کی گھٹلیں میں دبا ہوا تھا۔

جینس میں اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے سائیکل سے چھلانگ لگائی اور کھلی زین پر بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر ڈبا کھولا۔ پینل نارنج کی روشنی چلائی کے تاج پر لگی جس میں مصنوعی مولی بڑے ہوئے تھے۔ اس کے برابر ہی ایک سفید موسیقی رہی ہوئی تھی۔

بلیس نے اپنا سر گھٹوں پر رکھا اور زار و قطار رونے لگا۔

☆ ☆ ☆

آوازوں کا شور سن کر اس کی آنکھ کھلی گئی۔ آوازیں بہت قریب آرہی تھیں۔ ایک مرد اور عورت غصہ ناک انداز میں اپنی جڑ اس ناکال رہے تھے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ صوفی کے کمرے میں ہو گیا تھا لیکن پھر ایک تیسری آواز

بھی شامل ہوگئی جس کا لہجہ مذاقناہ تھا۔ وہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ہی بستر پر ہے اور وہ لوگ اس کے گھر میں آکر شور شرابا کر رہے تھے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور لیوٹک روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر وہی طور پر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ وہ مرد اور عورت ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”بھئی ہے وہ۔“ مرد نے اس کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک دن ہمارے گھر کے گرد چکر لگا رہا تھا لیکن میں نے اسے بھگا دیا لیکن گزشتہ شب یہ ہمارے مکان میں داخل ہو گیا اور ہماری دیوار پر ایک عبارت لکھ کر آگیا۔ یہ انتہائی بدگیزلہ کا ہے۔“

”تم میرے بیٹے کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔“ بھیس کی ماں نے جوابی وار کیا۔ ”میں اپنے گھر میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔“

پھر وہ بھیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ جو کہہ رہے ہیں، کیا یہ درست ہے؟ کیا تم گزشتہ شب ان کے گھر گئے تھے؟“

بھیس نے ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صوفی کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اب وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔“ صوفی کی ماں نے کہا۔

”پہنسلوں بات ہے۔“

”بھیس! اس کی ماں نے ڈانٹا۔ ”تم کس طرح بات کر رہے ہو؟“

”وہ وہیں ہے۔“ صوفی کی ماں نے اصرار کیا۔

”اب وہ وہاں نہیں آئے گی۔“

”کم از کم تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔“

مرد نے کہا۔ ”میں پولیس کو فون کرنا نہیں چاہتا البتہ تمہیں اس دفعہ وارنٹک دے رہا ہوں۔“

”جاؤ پولیس کو فون کرو۔“ بھیس نے اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تمہاری پریشانی بڑھ جائے گی۔“

”کنیا کی اولاد۔“ وہ آدمی دانت پیستے ہوئے بولا۔

”مجھے چاہیے تھا کہ اسی وقت تمہاری ہڈی پکلی ایک کر دیتا۔“

”بہت ہو گیا۔“ بھیس کی ماں چلائی۔ ”تم دونوں اسی وقت میرے گھر سے چلے جاؤ۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میرے گھر میں آکر مجھے اور میرے بیٹے کو دھمکیاں دو گے؟“ پھر وہ عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور

تمہیں کس نے میرے گھر میں سرکھٹ پینے کی اجازت دی۔ میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔ اب باقی باتیں ان کے سامنے ہوں گی۔“

صوفی کی ماں نے دروازے کی طرف پیچھے ہٹا شروع کر دیا۔ البتہ مرد ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے باری باری بھیس اور اس کی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں مجھ سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔“

”میں تمہیں دشمن ہی سمجھتا ہوں۔“ بھیس نے کہا۔

”تم جانتے ہو یا میں پولیس کو بلاؤں۔“ بھیس کی ماں نے فون پر انگلیاں مارتے ہوئے کہا۔

وہ شخص دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بھیس سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور تم بھی یہ بات جانتے ہو۔“

ان کے جانے کے بعد بھیس کی طرف مڑا اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ماں نے گلو گیر آواز میں کہا۔ ”بھیس! تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ وہ لوگ گزشتہ شب شاید تمہیں مار ڈالتے۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی؟“

وہ آنکھوں کے بل پیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ پڑا۔ ”تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو بھیس۔ پلیز ایسی اطمینان دہانہ نہ کرو۔ پولو۔۔۔۔۔ آئندہ ایسا نہیں کرو گے؟“

بھیس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح بھوت بولا۔ ”تمہیک ہے ماما۔۔۔۔۔ میں گروں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

”تمہارا خیال ہے کہ صوفی کی ماں اور اس کے دوست نے صوفی کے ساتھ کچھ برا کیا ہے؟“

اسکول ریسورس آفیسر مسٹر آرنلڈ نے بھیس سے پوچھا۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بھیس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟“

”اس کے پڑنے اب بھی نہیں ہیں۔“ بھیس نے یہ نہیں بتایا کہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ مسٹر آرنلڈ نے گھر بھر کے لیے اسے غور سے دیکھا لیکن اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

”تمہیں ہے کہ وہ ان کپڑوں کو ساتھ لے جاتا نہ جانتی ہو۔ شاید اس کا باپ اسے نئے کپڑے خرید کر دے۔ کیا تم

نے یہ بات نہیں سوچی؟“

”وہ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں چھوڑ گئی ہے۔“

”مثلاً؟“

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”کچھ چیزیں جو میں نے اسے دی تھیں۔“

”کیا صوفی تمہاری دوست تھی؟“ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بھیس اس سلسلے میں سسر روز کے پاس بھی گیا تھا۔

بھیس کو اپنا چہرہ گرم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن کے ذریعے وہ صوفی کے بارے میں اپنے محسوسات بیان کر سکتا۔ لہذا کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”یعنی تم نہیں سمجھتے کہ اسے یہ چیزیں یہاں چھوڑنی چاہیے تھیں؟“ بھیس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”اس کے علاوہ تم نے کوئی بات نوٹ کی؟“

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔ ”وہ وہاں منشیات بناتے ہیں۔“

آرنلڈ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ہر کوئی یہ جانتا ہے۔“

آرنلڈ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کیا کروں گا۔ میں صوفی کے باپ کو فون کر کے کہوں گا کہ وہ میری صوفی سے بات کرائے۔ اگر وہ وہاں ہے تو تمہیں اطمینان ہو جائے گا اور تم جان جاؤ گے کہ وہ خیریت سے ہے اور اگر نہیں تو تمہیں گھر کے گھر میں کیا کرنا ہے؟“

”تمہیک ہے۔“ بھیس اس تجویز سے متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہ وہاں نہیں ہوگی۔“

”اس دوران میں تم صوفی کے گھر سے دور رہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔“

”تمہیک ہے۔“ بھیس نے ایک بار پھر رضامندی ظاہر کر دی۔

☆ ☆ ☆

اس رات جب وہ صوفی کے گھر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ یہ کیسلیں کی گواہ نہیں آ رہی تھی۔ موسیقی کی آواز بھی بکلی تھی اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ نوٹی باڈی اس کا انتہار نہیں کر رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ ان لوگوں نے نوٹی سے ناراض ہو کر اس لیے تو جان نہیں چھڑائی کہ اس نے بھیس کو گھر کے اندر آنے دیا۔

وہ باڈی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا غصی محسوس کیا اور خطرہ مول لیتے ہوئے پٹیل نارنج روشن کر کے لان کا جائزہ

لینے لگا۔ نوٹی اپنی جگہ پر نہیں تھا پھر وہ اسے صوفی کی کھڑکی کے نیچے نظر آگیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں بے چین تھیں اور گنزدور جسم لرز رہا تھا۔ اس کی زنجیر جھوٹی ہو کر اتنی رہ گئی تھی کہ وہ محسوس چنداں تک حرکت کر سکے۔

بھیس نے نارنج جھنکی اور اس کے قریب جا کر سر گھوٹی میں بولا۔ ”نوٹی! میں آگیا ہوں۔ ٹکری کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا ڈرنے کو آگیا ہوں۔“

نوٹی نے پھر بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ بھیس نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ زمین سے چند انچ اوپر اٹھی ہوئی ہے اور اس کے سر پر دو تازہ زخم بھی نظر آ رہے تھے۔

بھیس نے اپنی جینٹ اتاری اور اسے باڈی پر پھینکے والا ہی تھا کہ اچانک ہی اپنی جگہ پر جم رہا ہوا۔ صوفی کی کھڑکی کے تار یک ٹھٹھے کے نیچے پکڑے گئے۔ حرکت نظر آئی۔ بھیس نے سوچا کہ یہ ایک جال ہے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ بھیس محسوس مکان میں آجائے۔ کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ خوف سے زیادہ اس پر غصہ غالب آ رہا ہے۔ اس دوزخی جوڑے نے نہ صرف اس کی اکھوتی دوست کو غائب کر دیا تھا بلکہ نوٹی کو بھی بری طرح زخمی کیا اور اب اسے چارے کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ اس نے گوشت کا ٹکڑا باڈی پر نوٹی کی طرف پھینکا اور واپسی کی راہ لی۔

☆ ☆ ☆

”اس نمبر پر صوفی کے باپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔“

آرنلڈ نے وضاحت کرتے ہوئے بھیس کو بتایا۔ ”لہذا میں خود صوفی کی ماں سے بات کرنے گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس مسٹر کالڈویل کا یہی نمبر ہے۔“

وہ دونوں کھیل کے میدان کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے لڑکے کھیل کے دوران انہیں دھتھے دھتھے کن انہیوں سے دیکھ رہے تھے۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔“ پھر اسے ایک خیال آیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم گھر کے اندر گئے تھے؟“

”ہاں۔“ آرنلڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے اندر بلایا تھا۔“

”پھر تم نے گھر کی تلاش کی؟“

”نہیں۔ ہم نے لیوٹک روم میں ہی چند منٹ بات کی۔ میرے پاس مکان کی تلاش لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی سب کچھ تمہیک لگ رہا تھا۔ میں نے وہاں کچھ غلط نہیں دیکھا۔“

☆☆☆
 بیس نے رات کو سونے سے پہلے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ الارم بجے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شرطیہ کہہ سکتا تھا کہ اس وقت صوفی کی ماں اور اس کا دوست گھبرائی نیند سو

جیسے ہی ٹوٹی کو آواز دی کہ، اس نے صحن میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھونک کر خوشی کا اظہار کرتا، بلیس نے دو درگاہت کھول دیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ باجس نکالی۔ عین اسی وقت چمن کی لائٹ

ہمارے گھر کے قریب سے ہی آرہی ہے۔“
واپس جاتے ہوئے وہ یولا۔ ”نہیں ممّا! میں نے کچھ

”اوہ..... میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ”بلیر“ ہوگا۔ اس کا

یہ کھڑکی باہر لان میں کھلی تھی اور کھڑکی کی سیدھ میں ہی سامنے بیرونی پتھر کا چھوٹا کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کا محور و مرکز یہی پتھر تھا۔ کیونکہ آج رات کو کسی بھی وقت اس پتھر میں کسی چوڑکی آمد متوقع تھی اور وہ اس چوڑکی منظر واضح نظر آتا رہے۔

یاگل ممتا

فہمی منسرووس

جیسے کوئی قطرہ قطرہ اپنی دولت جمع کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کے لیے یہ چین رہتا ہے، ممتا کی بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے۔ وہ بھی اپنے بچوں کی محبت میں یاگل تھی مگر صداقتاً اس کی ممتا کی دیوانگی پر اس کے اپنے ہی خون نے یاگل پن کی مہر ثبت کر دی۔۔۔ ایسے میں دل نہ ٹوٹے تو کیا ہو۔

اولاد کے تاراج خانے والی ایک ماں کا یاگل پن



سے نیچے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ آرنلڈ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”اس کا خیال تھا کہ اس سے پولیس والوں کو کچھ دلوے گی کیونکہ میں صوفی کے باپ تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی اس کا اتنا پتا معلوم ہوا۔ اس لیے میں نے ایک تربیت یافتہ کتا منگوانے کے لیے کہا جو زمین میں دفن یا چھپائی گئی لاشوں کا پتہ لیتا ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”اس نے لاش دریافت کر لی۔“

”کیا وہ صوفی کی لاش تھی؟“

”ہاں۔“ آرنلڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ وہ صوفی ہی ہے۔“

”اودھیرے خدا۔“ ہمیں نے دونوں ہاتھوں سے اچانک چہرہ چھپا لیا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صوفی کی ماں اور اس کا آٹھاب باقی ساری زندگی چلی میں گزاریں گے۔“

”لیکن انہوں نے صوفی کو قتل کیوں کیا؟“

”وہ اب بڑی بوری تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دونوں شیشات کے کاروبار میں ملوث ہیں پھر اس نے تم سے بھی ملنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں ڈر ہوا کہ وہ کہیں تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتا دے۔ اس کے بعد ان کے لیے اس کاروبار کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ پہلے انہوں نے کوشش کی کہ اس کا حقیقی باپ اسے آکر لے جائے لیکن جب اس نے کوئی دیکھی خاطر نہیں کی تو انہوں نے صوفی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر تم صوفی کی تلاش میں وہاں نہ جاتے تو کبھی اس کی کشمکش کا معاملہ نہ ہوتا۔“

ہمیں کی آنکھ سے ایک قطرہ پکا اور وہ اپنا کال پوچھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں اس کے کسی کام آسکا۔“

اس رات صوفی کی تدفین کے بعد ہمیں، ٹونی کے ہمراہ دوبارہ قبرستان آیا۔ صوفی کی قبر پر نیا کتبہ لگا دیا گیا جس پر اس کا نام، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج تھی۔

اس نے جو تے کا ڈبا کھول کر دونوں سوم پتیاں نکالیں۔ انہیں الگ الگ سوڈے کی خالی بوتلوں میں رکھا پھر انہیں روشن کر کے قبر کے سر ہانے دونوں طرف رکھ دیا پھر پلاسٹک کا تاج نکال کر تے پر لٹکا دیا۔ جو چیزیں صوفی چھوڑ گئی تھیں، وہ اس نے اس تک پہنچا دیں پھر اس نے صوفی کی قبر کے سر ہانے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ دوست کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔

مطلب تو تم سمجھتے ہو نا۔۔۔ آگ کا بھڑکنا، جیسی آگ آج صبح صوفی کے گھر میں لگی؟“

ہمیں نے کوئی جواب نہیں دیا صرف اپنا منہ ہلکا ہونٹ دیا تاہر ہا۔

”آگ لگانا ایک ایسا جرم ہے جس کا یقین آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں بھی آگ لگے یا لگائی جائے تو اسے پھیلانے کے لیے مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے اور تلاش یا شناخت کرنا بہت آسان ہے۔“

ہمیں نے اس طرح سر ہلایا جیسے اسے کوئی سبق پڑھایا جا رہا ہو۔ آرنلڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ آگ کس نے لگائی ہے کیونکہ جن شہوتوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ آگ میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جیسے انگلیوں کے نشانات اور تیل کا کنسٹر وغیرہ۔ ایک اور مسئلہ شہادتوں کا نہ ملنا ہے یا کم از کم گواہ قابل اعتبار ہوں جیسے صوفی کی ماں اور اس کا دوست۔“

اس بار ہمیں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آرنلڈ نے اپنی نظریں اس پر جمادیں۔ ”انہوں نے میرے آنے سے پہلے یقیناً اپنی چھوٹی سی شیشات کی لیاہارٹری ختم کر دی ہوگی۔ شاید انہیں یہ پریشانی ہو کہ کوئی ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔ میں یقین سے کہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہوگا۔ انہوں نے انتہائی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گندے سامان سے جان چھڑانے کے بجائے الماری میں رکھ دیا۔ آگ بجھانے والا عملہ جب مکان کی تلاش لے رہا تھا تو انہیں وہاں سے یہ چیزیں ملیں۔ انہوں نے پہلے ہی انہیں دیکھ کر پولیس کو فون کر دیا تھا۔ اگر آگ اندر بجھ جاتی تو شاید پوری عمارت ایک دھماکے سے زمین بوس ہو جاتی اور اس کے اثرات پورے علاقے پر ہوتے۔“

ہمیں نے نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آرنلڈ نے کہا۔ ”خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ ورنہ بہت تباہی ہوتی۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”ہاں۔ بالکل میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ہمیں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔“ آرنلڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جس کسی نے بھی آگ لگائی، وہ یقینی صحن کے پٹے ہوئے جسے میں قبر کے کتبے کی طرح ایک نشانی چھوڑ گیا جس پر سفید چاک سے لکھا ہوا تھا۔“ صوفی یہاں ہے۔“ اور حیر

کڑی بھرائی کر رہی تھی۔

کشمالہ جیسے جیسے اگلنے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ لیت کر آکھیں بند کرے اور پاس سوئے ہوئے شوہر کی طرح میٹھی نیند میں کھوجائے۔

مگر نہیں..... آج رات تو اس چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ کے ذلیل کرنا تھا۔ وہ متوقع چور کوئی باہر سے آنے والا شخص نہیں، بلکہ گھر کا ہی ایک فرد تھا۔ وہ مشکوک شخص، اس کے شوہر کی ماں، یعنی اس کی ساس کلثوم تھی۔

اس کی ملازمہ سرسرن اسے کئی مرتبہ انعام کر چکی تھی کہ اس کی ساس گھر میں چھوٹی موٹی وارداتیں کرتی رہتی ہے مگر اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ یقین تو اسے تب آیا جب ایک دن بڑھاپے اپنے گاؤں سے ملنے کے لیے آئی ہوئی اپنی بھانجی کو، فریج سے پورے ایک کلو من کا پیکٹ اٹھا کر اس کے ہمراہ کر دیا۔ اس دن بھی وہ گھر میں موجود نہ تھی اور یہ اطلاع سرسرن نے ہی بہم پہنچائی تھی اور اس نے بڑے سخت لہجے میں اپنی ساس سے گوشت کے اس پیکٹ کی چوری کے حوالے سے باز پرس کی تھی۔

وہ بہو کی جارحانہ جرح کے سامنے زیادہ دیر تک نہ سکی۔ اقبال جرم کرنے میں ہی نجات دکھائی دی اور ساتھ ہی وضاحت بھی کی کہ بہو، میری بھانجی کا بچہ پیار ہے، چھت سے مگر ٹانگ کی ہڈی تڑوا بیٹھا ہے۔ سو چا چار دن چار حصے کر کے بچے کو کھلائے گی تو تھوڑی جان آجائے گی۔

”مگر ماں! آپ میری اجازت کے بغیر کیسے گوشت کا پیکٹ اس کے حوالے کر سکتی ہیں؟“ کشمالہ نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”مگر بہو!..... میرے بچے کا بھی تو گھر ہے نا؟“

کلثوم کے لہجے میں دینا بھری لا چاری سما گئی۔

”ہرگز نہیں ایسے میرا گھر ہے، آپ کے بچے کا نہیں ہے اور میری مرضی کے بنا اس گھر میں کوئی پتا بھی نہیں رہ سکتا۔“ اس نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے معاف کر دو بہو! آئندہ ایسی غلطی بھی نہیں دہراؤ گی۔“ اس کی آواز آئندہ سے بھیج کی اور پھر بیانی کا سارا وقت اپنے کمرے میں جا کر اس بے توقیری اور بے عزتی پر روٹی رہی تھی۔

نذر کا پایا اور بلا خوف و خطر میدان میں کود پڑا۔

نذر کشمالہ کو تھوہر سے اس قدر مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اس نے شوہر کی سرکشی کے جرم کو بھی کلثوم کے کھاتے میں ڈال دیا۔

☆☆☆

اب تو واقعی اسے اس بڑھاپے سے چڑھنے لگی تھی، جو اچانک پتا نہیں کہاں سے آکر اس کے سر پر مسلط ہو گئی تھی۔ اب تو وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ سرسرن نے اطلاع دی تھی کہ آج رات بڑھاپا پھر سے واردات کرنے کی کوشش کرے گی اور اب وہ پوری مستعدی سے، کھڑکی کا پردہ ہٹانے باہر لان میں موجود، تاریک بجلی پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔

وہ انتظار کرتے کرتے اب اویسنے لگی تھی۔ یہ سوچ کر بھرائی کا پروگرام ملتوی کرنے ہی لگی تھی کہ لگتا ہے آج بڑھاپا کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اچانک اس نے ایک سائے کو بچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چونک گئی اور غور سے اس سائے کو دیکھنے لگی۔ باوجود گھٹے اندھیرے کے وہ اپنی ساس کے پیوے کو بے آسانی پہچان چکی تھی۔

اس نے پاس سوئے ہوئے شوہر پر نظر ڈالی جو گہری اور آسودہ خند کے سزے لوٹ رہا تھا۔ ابھی جب اس کی ماں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر، اس کے سامنے پیش کر دی گئی تو پچھارے کا سکون و اطمینان ایک دم سے اڑاں چھو ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہی اس کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے شوہر کو گھونٹا ڈالا۔

”کیا ہوا..... کون سی قیامت آگئی؟“ وہ نیند میں بوجھل آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم فوراً اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔“ وہ بھرتی سے بند سے بچے اتری اور تھوڑا سا زور سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”آخر ہوا کیا ہے، کچھ پتا بھی تو ملے؟“ وہ بھی اب ناگہم لڑکائے، سلیم پر پاؤں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کشمالہ نے پچھلے سے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ اب بچن کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہاں روشنی تھی۔

”ہمارے جانے تک کہیں وہ رو پھر ہی نہ ہو جائے۔“ وہ زہر لب بڑبڑائی اور تھوڑا کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کلثوم دے پاؤں بچن میں داخل ہوئی۔ اندر آنے سے پہلے اس نے ہر طرح کی تسلی کر لی تھی۔ وہ کسی کے سامنے مجرم ثابت نہیں ہوتا جانتی تھی اور اپنے بچے کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اگر تھوڑا گتا جا مل جاتا تو اس کی ماں چور یاں

کرتی ہے، وہ بھی اس کے گھر میں تو بھلا کیا عزت رہ جاتی اس کے سامنے۔

وہ سوچتی جا رہی تھی اور اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ چیز سے چل رہے تھے۔ اس نے اپنا کام پورا کیا۔ مطلوب مال حاصل کر کے، واپس جانے کے لیے رخ پھیرا تو دروازے کے کچھ بہو اور بیٹے کو کھڑا دیکھا۔

بہو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ قفس کر رہی تھی۔ فتح بابی کے احساس سے اس کا چہرہ تنک رہا تھا۔ جبکہ بیٹے کا چہرہ احساسِ ندامت سے دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ کلثوم کے جسم سے جیسے اچانک جان نکل گئی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چادروں کی پلیٹ بیچے ماربل کے فرش پر گر کے پچھتا چور ہو گئی۔ منٹن پلاؤ زمین پر بکھر گیا۔

”میں نے کیا کہا تھا تم سے..... تمہاری ماں چور ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تم نے۔ ساری رات جاگتی ہوں تب کہیں جا کر پکڑا ہے، رگڑے ہاتھوں۔“ اس کے لہجے سے عداوت اور استہزا ایک دقت چمک رہے تھے۔

تھوڑا پچھتی پچھتی کھوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ وہ بیٹے کی ایسی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گزرتی۔

”مجھے معاف کر دو۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیچے اور بہو کے سامنے جوڑ دیے۔ ”آئندہ بھی چوری نہیں کروں گی۔“

☆☆☆

بیچاری کلثوم، سدا کی جھلی اور عاقبت نا اندیش۔ اگر بیانی ہوئی تو اپنی بھری جوانی ان بلاشت بھر کے دو بچوں پر قربان کر دیتی؟ دوسری شادی کر کے گھر جو بسا لیتی۔ بچے خود ہی دل کھل کے مل جاتے مگر نہیں جھلی تھی نا۔ اس نے سوچا کہ میرے بچے در بدر ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب غلام محمد کی میت کھیتوں سے گھر لائی گئی تو بیچاری مارے سکتے کے کھل کے رو بھی نہ سکی۔ اندر اندر ہی سکتی رہی اور دونوں بیٹوں کو سینے سے پیچھے سسکیاں لیتی رہی۔

گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ کھیتوں کو پانی لگا کر ابھی آتا ہوں تم میرا پاشا تیار کرو مگر ناگہان پر چل کر آنے کے بجائے، جا رہی پلٹ کر چار آدمیوں کے کندھے پر سوار ہو کر آیا۔ لوگوں کی زبان پتا چلا کہ کھیتوں کو پانی لگاتے ہوئے کسی زہر لیے سانپ نے ٹانگ پر کاٹ لیا تھا۔

چار آدمی پھر سے اندر آئے اور غلام محمد کو کندھوں پر اٹھا کر چلتے گئے۔ کچھ دن تک کلثوم نے، غلام محمد کی ناگہانی موت کا سوگ منایا پھر اپنے دونوں بیٹوں کو کھینچے ہوئے، ہمت... کی۔ زمین پنے پر سے دی اور خود گھر کے کچن میں بندھی ہوئی چار پانچ بیٹیوں کا دودھ کھچ کر گزر راکھ کر کے لگی۔

اب تو اس کا ایک ہی خواب تھا کہ ان ننھے پوروں کو پال پوس کر بتا دو رخت بنانا ہے۔

بڑا تھوڑا پڑھائی میں بہت لائق فائق تھا جبکہ خور کو تعلیم سے کچھ خاص و کچھ ناگہانی۔ وہ اسکول سے گھر آ کر ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بیٹیوں کو چار ڈالا اور اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے ان کا دودھ بھی دیتا۔

تھوڑے میٹرک کر کے مزید تعلیم کے لیے شہر کا رخ کیا۔ گاؤں کے ماسٹر صاحب نے کالج میں داخلے سے لے کر باطل میں اپنے مشن تک، ہر طرح سے اس کی مدد کی جبکہ کلثوم نے اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی ایک بھوری سمیٹیں بیچ دی۔

تھوڑا پوری دہائی سے تعلیم حاصل کرنے لگا جبکہ خور نے آٹھ ہجرتیں پاس کر کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور ماں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے پٹے پر دی ہوئی اپنی اراضی بھی واپس اپنے ہاتھ میں کر لی اور کھیتی باڑی کر کے زمین سے سونا اگانے لگا۔

خور ابھی بیس سال کا ہوا تو کلثوم کے دل میں بیٹے کے لیے پر سہرا سجانے کا ارمان جاگ اٹھا۔ تھوڑا اس دقت اپنے تعلیمی عداوت کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ کلثوم بیس سالہ خور کے لیے اپنی انیس سال کی بھانجی شہینو کو بیاہ کر لے آئی۔ جب تھوڑا ایم پی اے کر کے ایک اچھی انٹر میڈیٹل فرم میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہوا تو، خور دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اب کلثوم بھی پیار رہنے لگی تھی۔ وہ تھوڑے سر پر بھی سہرا سجانا چاہتی تھی مگر وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

اور پھر ایک دن، اس نے گاؤں میں آکر ماں کو یہ اطلاع دی.... کہ وہ شہر میں کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرے گا۔ نیز یہ کہ لڑکی کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اولاد اور وارث ہے۔

کلثوم کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر یہ کہہ کر دل کو سمجھایا کہ اچھا کیا بیٹے نے اپنی پسند اور معیار کی لڑکی کو چھوڑ لی۔ ورنہ یہاں گاؤں میں اس کے مطلب کی لڑکی کہاں ملنا ہی بھلا۔

کلثوم، اس کا بیٹا خور اور بہو شادی والے دن اپنے شادی ہال میں گئے، جیسے دوسرے مہمان شامل ہوئے تھے۔

وہ دُور چہرہ کر بیٹے کی شادی حسرت سے دیکھتی رہی اور بہو کی بلاتیں لیتی رہی۔

☆☆☆

ماہ و سال گزرتے رہے اور پھر ایک دن خور نے فون پر بتایا کہ وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا ہے۔ اس دن کلثوم نے پورے گاؤں میں دیسی گھی کے لٹوے بانٹے تھے۔ ایک دن تیمور نے فون کیا تو وہ اس کے سامنے بکھر گئی۔ "بیٹا! میں اپنے پوتے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسے گود میں اٹھانا چاہتی ہوں۔ مجھے لے جاؤ، میں ایک دو دن رو کر واپس آ جاؤں گی۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز رندہ گئی تو تیمور کو اس پر ترس آ گیا۔ اگلے ہی دن گاڑی لے کر آیا اور ماں کو اس میں بٹھا کر لے گیا۔

پورا ایک ہفتہ وہ بیٹے کے بلکہ بہو کے گھر میں رہی اور اس ایک ہفتے میں پوتے کو گود میں اٹھانے کا موقع کم ہی ملا۔ جون ہی وہ پوتے کو اٹھانے کی کوشش کرتی، اس کی ماں کو اس کے سونے کا پانفڈ کرانے کا خیال آ جاتا اور چاروٹا چار کلثوم کو وہ محل کو تھسا سا جگر گوشہ واپس کرنا پڑتا۔

وہ پاس اس انتظار میں بیٹھی لپٹائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہتی کہ شاید پھر سے بہو بہر بان ہو جائے اور اس کے پوتے کو اس کے حوالے کر دے مگر یہ حسرت دل میں ہی رہ جاتی۔ بہو بچے کو فیڈ کر کر آ یا کہے حوالے کر دیتی اور ساتھ ہی یہ سمجھتی بھی کرتی کہ اسے کسی کے حوالے نہیں کرنا۔ ایک ہفتے بعد ہی بہو کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر اس نے بیٹے کو واپس چھوڑ آنے کی درخواست کر دی۔

بیٹا تو جیسے پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا کہ ماں کب جانے کا نام لے اور میں اسے چھوڑ کے آؤں کیونکہ ماں کی موجودگی سے، بقول اس کی بہو کی ان کی پرانی بوسہ کی مشاعرہ ہو رہی تھی۔ اب کلثوم سارا سارا دن گاؤں میں پلٹے پلٹے والوں کے سامنے اپنے بیٹے اور اس کے اتنے بڑے گھر کی ڈینگیں مارتی رہتی یا پھر اپنے گول مٹول پوتے کی تصویر پر فر سے سب کو دکھائی اور چوسنے لگتی۔

تیمور نے بیٹے کا نام احتشام رکھا تھا۔ احتشام دو سال کا ہوا تو اس کی ایک پری گھسی بہن بھی دنیا میں آ گئی۔ تیمور نے حسب سابق یہ اطلاع بھی فون پر ہی ماں کو دی۔ ماں پوتی کا سن کر پھر سے چل گئی کیونکہ یہ اس کی چھٹی پوتی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے خور کے بھی دو بیٹے ہی تھے۔ بیٹا پھر سے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔

اب کی بار کلثوم نے پھر سے اپنے چھٹی ہوئے کا ثبوت

دے دیا۔ چھوٹوں جیسی لال گلانی پوتی کو گود میں لیا تو بیٹے سے فرمائش کر دی کہ اس کا نام "آمنہ" رکھا جائے۔

"مگر یہ تو بہت اذلت فیشن کا نام ہے۔ میں یہ نام نہیں رکھ سکتی۔" بہو نے کہا۔ ماں کے کمرے سے جانے کے بعد، تیمور نے بہو کے سامنے انتہائی۔

"اماں کو ایک عرصے سے دل میں حسرت ہے یہ نام رکھنے کی۔ پہلے سوچتی تھی کہ بیٹی ہوئی تو یہ نام رکھوں گی۔ اللہ نے بیٹی نہ دی تو پھر سوچتی تھی کہ پوتی کا رکھوں گی۔ تم تو جاتی ہو خور کے بھی صرف دو بیٹے ہیں، بیٹی نہیں ہے۔ یہ اماں کی پہلی پوتی ہے۔ پلیز مان جاؤ۔ اسے یہی نام رکھئے دو۔" تیمور کے انتہائی پیکچر نے کھال پر خاطر خواہ اثر کیا اور اس نے بیٹی کا نام "آمنہ" رکھ لیا۔ کلثوم کی تو کو یاد ہی مراد بر آئی۔ وہ بہو پر صدمے واری جاری تھی۔ ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد واپس گاؤں گئی تو اب سہراہ آدمی کی تصویر اور حسین یادیں تھیں۔

اب کی بار کلثوم کی شیخیاں اور ڈینگیں اپنے عروج پر تھیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ ایک الزماؤن امیر و کبیر بہو نے اس کی فرمائش پر اپنی بیٹی کا نام آمنہ رکھ دیا تھا۔ اس کی سہیلیاں اس کی باتوں پر سر دھستیں اور اسے دنیا کی خوش نصیب ترین عورت قرار دیتیں۔

وقت کا پینا کھوتا رہا۔ تیمور اب اسے شہر لے جانے کے لیے نہیں آتا تھا، ابھی دو تین ماہ بعد گاؤں کا چکر لگاتا۔ ماں کے پاس چند پٹلی پیٹھت اور چند بڑے نوٹ اس کی گھسی میں دبا کر چلا جاتا اور وہ بڑی حسرت سے جاتے ہوئے بیٹے کی پشت کو تکی رہتی۔

بارہ تیرہ سال گزر گئے۔ کلثوم کو پیار یوں نے وقت سے پہلے یوزر حال اور تحف کر دیا مگر بیٹے اور اس کی اولاد کی محبت آج بھی توانا اور تر تازہ تھی۔ اب بھی بیٹے کا داہنا ہانڈ انداز میں استقبال کرتی۔ اس وقت تیمور ماں کو ملنے آتا تو اسے کلثوم بہت کمزور اور لاغر سی دکھائی دی۔ آنکھیں بھی اندر دھنس چکی تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کلثوم کو شہر لے جائے گا اور وہاں کسی اچھے اور قابل ڈاکٹر سے اس کا علاج کروائے گا۔

"اماں! انہیں تیاری کریں۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دیا یا۔ کلثوم بیٹے کے محبت بھرے اصرار پر مجبور ہو گئی۔

"کہنا بہو نے کہا ہے کہ مجھے لے کر آؤ؟" کلثوم کی خوش گمانیوں پر تیمور کو بڑا ترس آیا۔ اس نے دل تو بڑا مناسب نہ سمجھا۔

"ہاں اماں! اسی نے کہا تھا کہ اب کی بار اماں کو ساتھ

لے کر ہی آنا۔"

"ہائے میں صدمے جاواں! اب کہہ رہے ہوں؟" اس کے دل نے اتنی بڑی جہد کی کہ ماں نے اسے انکار کر دیا۔

"ہاں اماں! اب آپ کو کیسے یقین دلاؤں بھلا۔" اور پھر کلثوم نے تیاری پکڑنے میں صرف چھ منٹ ہی لگائے۔ دو لپٹے پکڑے پیک کرتے ہوئے بھی چھوٹی بہو کے کانوں تک اپنی اہمیت اور بڑی بہو کی بڑائی اور عظمت کے گیت پہنچا رہی تھی۔

راستے بھر وہ تیمور کے کان کھاتی آئی۔ بچوں سے متعلق سوالات کرتی رہی۔ تیمور بوڑھی ماں کے بچکانہ سوالات پر سوائے مسکرائے اور ہوں ہاں کے اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

ایک گھنٹے کا سفر کلثوم کی معصومانہ باتوں میں کیسے مگرا پتا ہی نہ چلا۔ کلثوم نے بھی زبان کو بریک اس وقت لگا یا جب تیمور کی گاڑی کو بریک لگا۔

اب تیمور اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکے، ہارن بجار ہاتھ چوکیدار نے ہارن کی آواز سن کر مستعدی سے گیٹ کھولا اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے صاحب کو سلام کیا۔ گاڑی پورچ میں رکی تو کلثوم جھنجکی ہوئی گاڑی سے اتری۔ طائرانہ نگاہ سے اطراف کا جائزہ لیا تو نظران میں کھلتے ہوئے پوتا پتی پر جا بکھری۔ دل میں امدنی ہوئی محبت نے جوش مارا اور پیدھی ان کی طرف لپکی۔

سارے راستے ان کی باتیں کرنے والی دیوانی اپنے جگر گوشوں کو سامنے دیکھ کر خرو پر قابو نہ رکھ سکی۔ احتشام اور آمنہ درمیان میں ٹیٹ کھڑا کیے بیٹھ منتظر کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

چھٹی کلثوم نے فٹل اعلازی کر کے سارا موڈ کر کر دیا۔ وہ مارے حیرت کے منہ کھولے اس ٹیٹ و نزار بڑھیا کی دیدہ دلیری ملاحظہ کر رہے تھے۔ جو شاید بھیک مانگنے کے لیے آئی تھی اور بجائے گیٹ پر کھڑی ہو کر، اہل خانہ کی حفاظت کا انتظار کرتی، سیدھی منہ اٹھائے ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

"اے بڑھیا! یہاں کہاں چلی آ رہی ہو؟" احتشام عرف شانی نے جھڑک کر کلثوم سہم کر دیں دگ گئی۔

تیمور کی پوری توجہ ادھر ہی تھی اور وہ اس صورت حال کی توقع پہلے سے ہی کر رہا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پاس آیا۔

"بچو! شاید تم لوگوں نے پچھا نہیں۔ یہ تمہاری دادی

جان ہیں۔" اس نے گرجوٹی سے اپنی ماں کا تعارف کروایا۔ بچے ہاتھ میں ریکٹ پکڑے، حیران نظروں سے اس باتوں و خبروں کا جائزہ لینے لگے جس کے چہرے کی جھریوں سے حسرت اور لا چاری پک رہی تھی۔

"اوہ تو پاپا! ابو تین گریڈ مدر؟" احتشام بے زاری سے کرا رہا۔

"میں مائی سن! آگے آؤ دادی سے ملو۔ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔" تیمور نے دونوں بچوں سے گویا درخواست کی۔

پچھلے سال احتشام اور تیرہ سالہ آمنہ کو دادی کی غیر متوقع آمد کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی اور یہ بھی وہ لوگ جس سوسائٹی کا حصہ تھے وہاں کوئی بھی مہمان بغیر اطلاع دیے نہیں آتا تھا۔

یہ مہذب معاشرے کا ایک مہذب اصول تھا مگر کلثوم کو بھلا ایسے اصول کون سمجھاتا۔ اسے تو بیٹے نے اپنے ساتھ آنے کی آفر کی اور وہ سارے اصول و ضوابط پس پشت ڈال کر، پوتا۔ بولی کی محبت سے سرشار ڈاڑی پٹلی آئی۔

کلثوم محبت پاش نظروں سے دونوں کے پاس آنے کی منتظر تھی۔ دونوں بہن بھائی چہروں پر ناگواری بجائے قریب آئے۔ کلثوم نے احتشام کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور دعا دی مگر آمنہ کو اس قدر قریب دیکھ کر وہ بالائی کی ہوئی۔ اسے سچ کر بیٹے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ آمنہ کو اس کے وجود سے گور سے ملنے جلتی ہوئی اور اس کے ہاتھ چوسنے پر بہت کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی پیشانی کو زور سے رگڑ کر کلثوم کی مہر محبت کو مٹانا چاہا۔

کلثوم نے دونوں ہاتھوں کے پیلے میں، آمنہ کا صبیح چہرہ پھر کر پوچھا۔

"میری گھٹی پری "آمنہ" کیسی ہے؟" "واٹ ریش..... دادی! میرا نام آپ نے "آمنہ" کیوں رکھا تھا؟" وہ کڑے تیموروں سے کلثوم سے پوچھ رہی تھی۔

"میری دھی! میں نے یہ نام بڑے چاہ سے رکھا تھا۔" کلثوم نے سید بھلائے ہوئے تعارف سے جواب دیا۔

"آپ کو اس سے زیادہ بورنگ اور اذیت نام نہیں ملا تھا کیا؟" اس کے لہجے سے ناگواری چمک رہی تھی اور کیوں نہ چمکتی بھلا۔ کلثوم کا جرم اتنا معمولی بھی نہ تھا۔ ایک الزماؤن ماؤرن بچی کو اتنا پرانا نام زیادہ اذیت نہیں کرتا تھا۔ نام بدلنا اس کے بس سے باہر تھا مگر اس نے اپنے نام آمنہ کو لائی

سے بدل لیا۔
اب ہر کوئی اسے "ایک" کے نام سے مخاطب کرنے لگا۔ پکارنے کی حد تک اس نے اس نام سے راہنما حاصل کر لی تھی۔

"ایک! یہ کس لمحے میں اپنی دادی سے بات کر رہی ہو؟" تیمور ہاڑا تو ابی شہلہ بارگاہوں سے دونوں ماں بیٹے کو گھورتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے شانی بھی لپکا۔
"سوری اماں! کوئی بات دل پر نہ لگانا۔ بیچ پوچھیں تو کشمالہ نے بچوں کی تربیت میں بڑی فطرت برتی ہے۔" تیمور شرمندہ شرمندہ سامان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم کیوں نامور ہو رہے ہو۔ بچے ہیں، نادان ہیں ابھی۔ بڑے ہوں گے تب دیکھا، میری کسی قدر کریں گے۔" وہ مسکرائی۔

"چلیں اماں! اندر چلیں۔" اس نے ماں کا بازو پکڑا اور اندرونی دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

کلیٹوم، تیمور کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلی نظر لاؤنج میں رکھے آرام دہ صوفے پر دھنسی ہوئی بہو پر پڑی۔ وہ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ چڑھا کر، بیل فون کا ن سے لگے کسی سے بات کر رہی تھی۔ کلیٹوم اور تیمور اس کے سامنے والے صوفے پر ٹپک گئے۔ اس نے اپنی ہوئی نظر ساس اور شوہر پر ڈالی۔۔۔ مگر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر، ساس کی غیرت دور یافت کرنا ضروری نہ سمجھا۔

وہ سامنے بیٹھی فون پر باتوں کی جھلجھلیاں چھوڑتی رہی۔ کلیٹوم کو اس کی دیگر باتوں کی تو کچھ بھد آئی مگر ایک لفظ جو بہودور این گھٹکوبہ کثرت استعمال کر رہی تھی اس کی سمجھ کلیٹوم کو بخوبی آ رہی تھی اور اس لفظ کی معنی اور رنگینی سے بھی بخوبی واقف تھی۔

کشمالہ نے جب پہلی بار "یار" کہا تو کلیٹوم نے چونک کر پہلے اسے اور پھر تیمور کی جانب دیکھا مگر جب بیٹے کو اخبار کے مطالعے میں مشغول پایا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ بقیہ تیمور نے اپنی بیوی کے متعلق کسی غیر مرد کے لیے لفظ "یار" نہیں سنا، بس پھر کیا تھا۔ کلیٹوم نے پوری توجہ بہو کی طرف مبذول کر دی اور یہ لفظ بار بار بتاتی رہی۔

جب بہو نے اپنی گھٹکوبہ بھنے ہوئے الودائی کلمات ادا کرتے ہوئے "سی یو اینڈ ایک کیئر رانی" کہا تو کلیٹوم کی جان میں جان آئی کہ وہ لفظ "یار" کسی باہر کے لیے نہیں بلکہ اپنی کسی پہیلی کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

"میں بھی کہوں، تیمور جتنا مرضی شہری بابو میں جائے، اتنا

بے غیرت کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ اپنی کج فہمی پر دل ہی دل میں مسکراتے لگی۔ کشمالہ کا ل منتقل کر کے اب استغناء سے نظروں سے تیمور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے آنکھوں سے، کلیٹوم کی آمد کا متعجب ہو چھ رہی ہو۔ تیمور بھی اس کی نظروں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ گھٹکوبہ کا کرتا نہ لگا۔

"اماں کی طبعیت آج کل کچھ نامسا ز رہتی ہے۔ اس لیے ساتھ لے آیا۔ کچھ دن ہمارے ہاں ہی رہیں گی۔ ڈاکٹر صدیقی سے ان کا چیک اپ کروائیں گے۔" اس کا وضاحت بھرا جواب بھی کشمالہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔

"کیسی ہو بہو؟" کلیٹوم نے شہدائیں لہجے سے بہو کے منہ کی کڑواہٹ کم کرنے کی کوشش کی۔

"اچھی ہوں۔ آپ کب سے بیمار ہیں؟" اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ "تیمور نے آپ کا علاج معالجہ کیوں نہیں کروایا۔ تیمور کے جسم کی زمین بھی سنبھالے بیٹھے مگر ایک ماں نہیں سنبھال سکتی اس سے۔" بہو کی فشر زنی سے گھبرا کر وہ تیمور کو مد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"تیمور اماں کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ بس میں اپنے اطمینان کے لیے اماں کو شہر لایا ہوں۔ اچھے ڈاکٹر سے اماں کا علاج کراؤں گا۔" اب کی بار تیمور کا لہجہ قدرے سختی لیے ہوئے تھا۔

کشمالہ نے مزید بحث نہ کی اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

رات کو کھانے کے بعد وہ پھر سے اینٹوں کے درمیان اجنبی بنی بیٹھی تھی۔ سب لاؤنج میں بیٹھے کوئی ٹی وی ڈراما دکھ رہے تھے۔

۔۔۔۔۔ کلیٹوم نے فرمائش کی۔۔۔۔۔ "جہاں اللہ کا گھر نظر آتا ہے، اس جھیل پر لگا یا جائے۔"

"دادی! پلیز شور نہ کریں۔ یہ میرا فیورٹ ڈراما ہے۔" ایک نے احتجاج کیا تو پھر کلیٹوم کو دوبارہ منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد ایک نیا ڈراما شروع ہو گیا اور اس ڈرامے کا نام تھا۔۔۔۔۔ کلیٹوم کو کہاں سلا یا جائے؟" یہ سوال اپنی تمام تر تعبیرات کے ساتھ، سب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اسنے بڑے گھر کے اسنے ڈھیر سارے کمرے ہونے کے باوجود یہ مسئلہ خاصی پیچیدگی اختیار کر گیا۔ اوپر ہی منزل پر چار بیڈروم تھے مگر کلیٹوم گھٹنوں کے درمی وچ سے بیڑھیاں چڑھنے اترنے سے قاصر تھی۔

اب تیمور نے ایک کی طرف ملتجیہ نظروں سے گزارش

کی مگر، فوراً اس کی نظروں کا مفہوم جان کر بول اٹھی۔
"نوپا! آپ تو جانتے ہیں۔ میرے ایگر اسز چل رہے ہیں آج کل۔ رات گئے تک پڑھتی رہتی ہوں اور ویسے بھی مجھے اپنی پرائیویسی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے سوری۔"

بیٹی کی مدلل تقریر سن کر کشمالہ کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔

"مجھے یقین ہے مجھ سے کوئی اس طرح کی بے سگی فرمائش نہیں کرے گا اور دوسری بات میں لڑکا ہوں اور دادی ایک لڑکی، اس لیے یہ جواز۔۔۔ بالکل نہیں جتا۔ ہے نادادی؟" اس نے ایک آنکھ کچ کر دادی سے پوچھا تو دادی اس کی بات کی تک پیچھے بنائی، اس کے ساتھ دل کرشنے لگی۔

"بد معاش کہیں کا، اپنی دادی کو آنکھ مار رہا ہے۔" "اب تو صرف ایک ہی صورت بچتی ہے۔" کشمالہ بولی تو تیمور اس کی طرف امید افزا نظر سے دیکھنے لگا۔

"اماں! سرین کے سرورٹ کوادرٹ میں سو جایا کریں۔ ویسے بھی وہ بیڈ پر سونے کی عادی نہیں ہیں، وہاں سرین چار پائی بچھا دے گی، اپنی چار پائی کے ساتھ۔ خوب اچھی نیند آئے گی۔"

کشمالہ کی بات سن کر کلیٹوم خوش ہو گئی جبکہ تیمور مارے حد سے کے ٹپک رہ گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو کشمالہ۔۔۔۔۔ میری ماں سرورٹ کوادرٹ میں سو یا کرے گی؟"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے یار! اس کے اس طرح سب کے سامنے بار کینے پر کلیٹوم نہ صرف خیالات محسوس کر رہی تھی بلکہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئی کہ لفظ "یار" بہو کا حکم کلام ہے۔

"دیکھو ڈیز! گاؤں میں اماں جس قسم کے گھر میں رہتی ہیں، ہمارا سرورٹ کوادرٹ اس سے بڑا درجے بہتر ہے اور پھر سرین پاس ہوگی ان کی دیکھ بھال کے لیے۔ بیمار بندے کو رات کو اکیلا نہیں سوتا چاہیے۔"

"بہو ٹھیک کہتی ہے تیمور۔۔۔۔۔ سرین کے ساتھ میرا اچھا وقت گزار کرے گا۔"

اور یوں یہ سمجھ مسئلہ کشمالہ کی فہم و فراست سے چکیوں میں حل ہو گیا۔ وہ الگ بات کہ سرین کو بھی کلیٹوم کا یوں اپنی غمازی میں کل ہوتا اچھا نہ لگا مگر وہ دوسروں کی طرح، اپنی تاپندہ بیٹی کا اہتمام کھلم کھلا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ گھر کی گھر کی ملازم۔

اسے کلیٹوم سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی

اور مل سوچنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن ہی تیمور اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر صدیقی کے کلینک جا پہنچا۔ ڈاکٹر نے کچھ ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے جن کی رپورٹس نے بتا دیا کہ کلیٹوم شوگر اور ہپاٹائٹس جیسے موذی امراض کے خفے میں جکڑی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ ہدایات اور کچھ ادویات کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

گھر آ کر تیمور نے کشمالہ اور سرین دونوں کو تاکید کی کہ اماں کو چاول کم سے کم دینے ہیں اور وہ بھی تازہ حالت میں۔ باقی چاول ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

جبکہ چاول کلیٹوم کی کمزوری تھے۔ اس کی شروع سے یہ عادت رہی تھی کہ جب بھی گھر میں چاول پکائی، رات کو کھائی اور دن کو ناشتا بھی چاولوں پر ہی ڈال کر کرتی۔ اب چاولوں پر پابندی لگی تو جیسے زندگی ایک دم سے بد مزہ اور بھکی بھکی سی لگنے لگی۔

رات کو ڈاکٹر نے کلینک میں چاولوں کی ڈش کی طرف ہاتھ لگایا تو تیمور نے روک دیا۔

"اماں! آپ کو ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ہے۔" اس نے بڑھا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ بے دلی سے روٹی کے چند نوالے زہر مار کے اور اٹھ کر اپنے کوادرٹ میں چلی گئی۔ تیمور کے دل پر گھونسا سا لگا۔

☆☆☆

نیم غنڈی کا عالم تھا جب اس کی چار پائی پر آ کر کوئی دھیرے سے بیٹھ گیا اور نرم ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں دبائے لگا۔ کلیٹوم نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو تیمور کو اپنی ٹانگیں دباتے پایا۔

"رہنے دے پتر! کیوں تکلیف کرتا ہے؟ میں اچھی پہلی تو ہوں۔" اسے بیٹے پر بے طرح پیارا آیا۔

"اماں! میں بہت برا ہوں۔ تمہاری خدمت نہیں کر سکتا۔ تمہیں سرورٹ کوادرٹ میں ٹھہرنے سے نہیں روک سکتا۔" وہ سسکتے لگا۔

"ارے رو کیوں رہے ہو پتر؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ دہلیز ماں کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور وہ اتنا بھرا اس اگلیوں میں سو کر اس کے بالوں میں پھیرنے لگی۔ یہ تو شکر ہوا کہ سرین ابھی سونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ ورنہ ماں بیٹے کا یہ جذباتی منظر خوب چٹارے لے کر کشمالہ کے گوش گزار رہتی۔

☆☆☆

رات کا نہالے کون سا پہر تھا جب نسرین کی اچانک کسی کھٹکے سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھ کی دوز سے، ساتھ والی چار پائی پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔
بڑی بی بی یعنی کلثوم اپنی چار پائی پر اتنی پالتی مارے بیٹھی جادل کھا رہی تھی۔ تنگیا اندھا ہونے کے باوجود نسرین نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ وہ مڑ پلاؤ پر وہی کارخانہ ڈالے، بڑی رغبت سے کھا رہی ہے۔

کلثوم نے نوالہ دست میں ڈال کر ایک احتیاطی نگاہ نسرین پر ڈالی تو نسرین نے فوراً آنکھیں میچ لیں۔

چاولوں کی پلیٹ ختم کر کے کلثوم دبے پاؤں اٹھی اور خالی برتن اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نسرین سمجھ گئی کہ خالی برتن واپس کچن میں رکھنے گئی ہے۔ اس کے لب مسکراتے تھے۔ کشمالہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے اچھا خاصا نوچپ ہوا ہاتھ آتا تھا۔

انگے دن جیسے ہی کلثوم نے دو پہر کا کھانا کھا کر کوادر کا رخ کیا، نسرین بڑے رازدارانہ انداز میں، کشمالہ کو رات والی صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ کشمالہ بھی حیران رہ گئی۔

”بڑھیا کو لگتا ہے اپنی جان سے کوئی پکار نہیں۔ جس چیز کو کھانے سے ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے، وہ رات کو سب سے چھپ چھپ کر کھانا کھا لیں کی ٹھنڈی ہے بھلا؟“

”بات صرف چھپ چھپ کر کھانے کی نہیں ہے بیگم صاحبہ! بات چوری کر کے کھانے کی ہے۔ وہ آپ کے گھر میں چوری کر کے کھانا کھاتی ہے اور چوری تو چوری ہی ہوتی ہے۔ چاہے کھانے کی ہی کیوں نہ ہو۔“

نسرین کے آخری فقرے نے کشمالہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

دو تین دن بعد کلاس سے کلثوم کی بھانجی اپنے میاں اور دس سالہ بچے سمیت کلثوم سے ملنے چلی آئی۔ اس کا چنا چھت سے کر کر اپنی پتلی کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا۔ اسی کو ہڈی جوڑ کے اسپیشلسٹ کو دکھانے کے لیے دونوں میاں بوی شہر چلے آئے تھے۔ شہر آئے تو سوچا حالہ کلثوم کی خبر بھی لیتے چلیں۔

مہمانوں کی آمد پر پہلے تو وہی طرح بوکھا مٹی مٹا اگلے ہی لمحے جب یہ بات ذہن میں آئی کہ آج ہوا اپنی سہیلیوں کے ساتھ کہیں چنگ مٹانے گئی ہے اور شام سے پہلے اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تو اس نے پرتچاک انداز میں ان کا استقبال کیا۔ انہیں لاؤنج کے نرم صوفوں پر بٹھا کر، بڑی بارعب آواز میں نسرین کو پکارا۔ بھانجی نے حالہ کے یہ غماز

بات دیکھ کر دانتوں میں انگلی داب لی۔

”خالہ! تم واقعی بڑی خوش قسمت ہو۔ اسے امیر بیٹے کی ماں ہونا کوئی فداق..... بات تمھاری ہے۔“ وہ گھر کی شان و شوکت اور آرائشی اشیا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں مرحوب دیکھ کر کلثوم چھوٹی نہ رہی تھی۔

”ہاں! آج کتنی ہو ٹھیکہ! میں واقعی بہت ہی خوش نصیب ہوں۔ ابھی تو میری بھوگھر میں نہیں ہے۔۔۔ وہ ہوتی تو تم دیکھتیں کہ وہ کیسے تم لوگوں کی خدمت کرتی۔ سچ کہہ رہی ہوں! مہمانوں کو دیکھ کر جوش چڑھ جاتا ہے۔“

نسرین اس کی بارعب آواز سن کر بھی پورے چندو منٹ بعد، چہرے پر بے زاری حائے سامنے آئی۔

”نسرین! تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟ جاؤ جلدی سے مہمانوں کے لیے جوس لے کر آؤ۔“ کلثوم نے مالگن بننے کی پوری پینٹنگ کی۔

وہ منہ پھلایے گئی اور سرے میں تین گلاس جینکو جوس لے کر آ گئی۔ نرے میز پر رکھ کر پلٹنے لگی تو کلثوم نے نیا آرڈر جاری کیا۔

”نسرین! تم ایسا کرو، فرنیچ سے ایک پیکٹ مٹن کا ٹکال کر مٹن پلاؤ بناؤ جلدی سے۔ مہمان کھانا کھا کر جا لیں گے۔“

”نہیں جی! میں کشمالہ بی بی کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بنا سکتی۔“ اس نے اگلے کچے میں جواب دیا تو کلثوم کو مہمانوں کے سامنے بڑی سبکی محسوس ہوئی۔

اس نے اپنی آواز میں پہلے سے بھی زیادہ رعب اور وید بید پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نسرین! امت بھولو کہ میں بھی اس گھر کی مالگن ہوں بلکہ بڑی مالگن ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھیکہ کی شخصیت سے انھیں دے دیکھا۔ جہاں اس وقت کلثوم کی شخصیت سے مرحومیت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر مرغوبیت کا یہ ٹکال اگلے ہی لمحے زمیں بوس ہو گیا جب نسرین نے دو نوک لہجے میں کلثوم کا کوئی بھی حتم ماننے سے انکار کر دیا۔

نسرین پاؤں تلختے ہوئے چلی گئی تو کلثوم نے خفت مٹانے کی خاطر بیان بدل دیا۔

”یہ تم بخت تو بالکل ہی باؤلی ہے۔ آنے دو ہو کو ذرا، دیکھنا کیسے چوٹی سے پکا کر گھر سے باہر پھوگوانی ہوں اسے۔ ٹھیکہ میری بچی تم ایسا کرو، خود ہی پلاؤ پکالو۔ میں تمھیں گوشت اور دوسری چیزیں دیتی ہوں اور ویسے بھی تم اس لمبوعی سے تو اچھا ہی بناؤ گی۔“

”رہنے دو خالہ! بھابی آئیں گی تو اعتراض کریں گی اور ایسے بھی جیس بھوک بالکل نہیں ہے۔“

”کس کی جرأت ہے اعتراض کرنے کی۔ یہ میرے بچے کا گھر ہے اور میری بھوگھی بہت اچھی ہے۔“ کلثوم کے بے حد صبر کرنے پر، ٹھیکہ مٹن پلاؤ پکانے پر راضی ہو گئی۔ ٹھیکہ نے پلاؤ پکایا اور کلثوم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ٹھیکہ کے شوہر اور بچے نے بھی مزے سے کھایا۔

وقت رخصت، کلثوم نے فرنیچ سے ایک پیکٹ مٹن کا مزید ٹکال اور ٹھیکہ کو شاپر میں یہ کہہ کر دے دیا کہ بچے کو چار پانچ دن ٹھوڑا تھوڑا کر کے کھانا، طاقبت ملے گی تو بڑی جلدی جڑ جائے گی۔

☆☆☆

اس سے اگلے دن وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کشمالہ کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی سن مایوں اور ہٹ دھری کی ساری رپورٹ نسرین نے رات کو ہی کشمالہ کے سامنے پیش کر دی تھی اور وہ بھی پوری رنگ آمیزی کے ساتھ۔

”میں پوچھتی ہوں آپ کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ آپ مالکانہ حقوق استعمال کرتے ہوئے اپنے مہمانوں کی تواضع کرتی رہیں۔ مت بھولیں کہ یہ گھر میرا ہے اس کی ہر شے میری ملکیت ہے۔“

”مگر بھو! وہ مہمان تھے۔ مہمانوں کی تواضع کرنا تو سنت ہوئی ہے۔“ وہ کنبہ سے میں کھڑے کسی طزم کی طرح اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے تو اتنا پتا ہے کہ آپ نے میری اجازت کے بغیر میرے گھر کی چیزیں استعمال نہیں اور گوشت کا پیکٹ اپنی اس بھانجی کے ہمراہ بھی کر دیا کہ لو بھی اگر یہاں من نہیں بھرا تو گھر جا کر پھر سے پکا کر کھا لیتا۔ حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی بھی۔“ وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی۔

چونکہ بیورو اور بچے گھر سے جا چکے تھے اس لیے اسے اس وقت روکے روکے والا کوئی نہ تھا۔ کلثوم مکمل طور پر کشمالہ اور نسرین کے نرم و کرم پر تھی۔ یہو کی جالی کی سن کر کھینچا چھلنی ہو رہا تھا۔

”معاف کر دو بھو! آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی اور یہ بات بھی ذہن میں رکھوں گی کہ یہ گھر اور اس میں موجود ہر چیز کی مالک صرف تم ہو۔“ اس کی آواز رندہ گئی۔ وہ اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔

دو چار دن گزرے تو جھلی کلثوم نے سر جھک کر سب

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت

شمارہ اکتوبر 2018ء

کی جھلکیاں

مرگ مرگ

اس شاعر نے مثل کا زندگی نامہ جس کی شاعری لہور لاتی تھی مگر اسے ہی ہمیں ہنسا دیا گیا

شوق پرواز

تاریخ سے نالبد ہوائی جہاز کو مغرب کا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن ہوا میں اڑنے کا مظاہرہ کئی صدی قبل معروف مسلم سائنسدان نے کیا تھا

آگ کا دریا

تاریخ کے صفحات میں مدفون ایک جنگجو کے کشت خون کا تذکرہ

آل راؤنڈ

اس پاکستانی سپر اسٹار کی داستان جسے کوئی چانس دینے پر تیار نہ تھا

الکلی علی علی

بھی بہت سی بچی داستانیں، سچے قصے اور دلچسپ سچ جانیال

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر نیا شمارہ پیش کرالیں

اکتوبر 2018ء

161

کچھ نظر انداز کر دیا۔ بلکہ بیٹے کی محبت نے سب بھلانے پر مجبور کر دیا۔ کیا ہوا کچھ توڑی سخت مزاج ہے تو، بیٹا تو جان چھڑکتا ہے نا مجھ پر۔ اسے مطمئن ہونے کے لیے استاخیال ہی کافی تھا۔

”سستی بار کہا ہے مجھے اس نام سے مت پکارا کریں۔ میں ایسی ہوں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ہونے کہا۔

ہو جائے ماں کو چور کہنے والے سے الجھنے لگتا ہے۔ کھمال بھی اس کے سامنے اس کی ماں کو چور کہہ رہی تھی اور وہ تازہ کھارہا تھا۔ بھلا اتنا کھانا الزام کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بنائی کھمال کو برا بھلا کہنے لگا۔

جڑے ہوئے ہاتھ الگ کیے اور ان چوری کرنے والے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

پھر سکتا ہے، غیر شادی شدہ نوجوان اپنے والدین کی رضامندی سے شوق و محبت کر سکتے ہیں لیکن جب بات کاروبار کی آتی ہے تو وہ نہایت کمزور بن جاتے ہیں۔

”تم دھوکے باز ہو۔“ وہ فنڈ لے کے بھاگ کر بولا۔ ”میں تمہیں گرفتار کرادوں گا۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔“ یہ صورت حال فنڈ لے کے لیے برداشت سے باہر تھی۔

”تم مجھے جیل نہیں بھیج دو گے۔“ فنڈ لے آپے سے باہر ہوتے ہوئے چیخا اور اشتعال کے عالم میں اپنے سامنے میز پر پڑا ہوا لفافہ چاک کرنے والا اسٹیل کا تیز دھار باریک نوک والا چاقو اٹھا یا اور بورگ کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس خطرناک قسمے میں بورگ کو اس حرکت سے روکنے کے لیے اسے بکلی واحد راستہ بھانپ کر رہا تھا۔

بورگ ایک دردناک گراہ کے ساتھ فرش پر پچھے ہوئے قالین پر لٹکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ خون آلود چاقو بدستور فنڈ لے کی گرفت میں تھا۔

اسنے میں نیچے سڑک پر رات کے سناٹے میں کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ فنڈ لے چاقو بدستور ہاتھ میں تھامے کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس نے جھانک کر نیچے کی طرف دیکھا۔

دو آدمی ایک پولیس میٹرول کار سے نیچے اتر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بورگ نے پولیس کو طلب کرنے کے بارے میں اسے جھوٹی دھونس دی تھی۔

ان دو آدمیوں میں سے ایک عمارت کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا جبکہ دوسرا شخص دوڑتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔

فنڈ لے کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس پر پہچانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ راہ فرار اختیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا مگر لفٹ کے ذریعے نیچے نہیں جاسکتا تھا۔ اتنی رات گئے صرف ایک لفٹ ہی چل رہی تھی اور پولیس مین اسی لفٹ سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ آگ سے بھاؤ والے راستے کی میز جیوں سے دوڑتے ہوئے فون منزل نیچے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو نیچے موجود پولیس مین کی ہاتھوں میں پھنچ جاتا۔

اب صرف ایک ہی صورت باقی تھی۔ وہ بکلی ظاہر کرے گا کہ وہ بھی ابھی ابھی یہاں پہنچا ہے اور اس جرم کو دریافت کیا ہے۔

اس کے لیے اسے آؤٹ لک سے نجات حاصل کرنا ہوگی

فرار ہوا ہے۔

اسے چاقو کو چھپانے کے لیے کوئی جگہ بھانپنی نہیں دی۔ وہ اسے نہیں بھی چھپاتا تو جلد یا بدیر اسے حلاش کر لیا جاتا۔ نہ ہی وہ اس چاقو کو کھڑکی سے باہر نیچے سڑک پر اچھال سکتا تھا۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشننگ اور تمام کھڑکیاں تیل شدہ تھیں۔

لیکن چاقو کو تو غائب کرنا تھا۔

اس کی پریشان نگاہیں بے تابی سے دفتر کا جائزہ لینے لگیں۔ بورگ کی میز پر ایک جانب کاروباری لفافوں کا ایک ڈیڑھ سو جود تھا جس پر فرم کے نام ”بورگ اینڈ فنڈ لے“ کے ساتھ جوابی پتا بھی چھپا ہوا تھا۔ ان جوابی لفافوں پر ڈاک کا ٹکٹ چپکانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

فنڈ لے، بورگ کی لاش پر جھک گیا اور اس کے خون آلود کوٹ کے دامن سے چاقو کے پھل پر گئے خون کو صاف کرنے کے بعد اس نے ایک چھپا ہوا جوابی لفافہ اٹھا یا اور باریک پھل دار لفافہ چاک کرنے والا اسٹیل کا چاقو اس لفافے میں ڈال دیا۔ لفافہ چاقو کے مین سائز کے مطابق تھا۔ اس نے لفافے کے فلیپ پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے گوند کو گولیا کیا اور لفافہ بند کر دیا۔

پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر کا ریڈور میں آ گیا۔ لفٹ کے اوپر آنے کی آواز نہ دیک آئی جارہی تھی۔ فنڈ لے نے بند لفافہ ڈاک نیچے ٹپک لے جانے والی پھسلواؤں ڈھلوان میں ڈال دیا پھر پلٹ گیا۔

تب اس کی نگاہ بے ساختہ بورگ پر پڑی جو ابھی مرا نہیں تھا۔

وہ فرش پر کھسکا ہوا دروازے کی دہلیز پر آ گیا تھا۔ اس کا آدھا دھڑا ہوا ہارڈری میں تھا اور اس کی پھرتی ہوئی آنکھیں فنڈ لے پر جمی ہوئی تھیں۔

اسنے میں لفٹ کا دروازہ کھلا اور پولیس مین نے راہداری میں قدم رکھتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ فنڈ لے کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔ ”میں فنڈ لے ہوں۔ میں ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ میرا پارٹنر ڈھکی ہے۔“

پولیس مین فرش پر پڑے بورگ کی جانب لپکا اور اس کے خون آلود لباس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ چاقو زنی کا واقعہ لگتا ہے۔ چاقو کہاں ہے؟“

بورگ نے اپنی کپکپاتی آنکھ اٹھا کر فنڈ لے کی جانب قصوروار نظروں سے گزرا۔ ”میرا پارٹنر ڈھکی ہے۔“

اس کے حلق سے کھڑکھڑائی آواز نکلی۔ ”بریف کیس!“

فنڈ لے کمرے سے باہر نکلتے وقت اپنا بریف کیس ساتھ اٹھا لیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ خود بھی ابھی یہاں پہنچا ہے۔ وہ حیران نظروں سے بورگ کو دیکھنے لگا۔ یہ کیا بیڑ بڑا رہا ہے؟ اس معاملے سے اس کے بریف کیس کا تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ مرتے ہوئے بورگ کا دماغ بالکل بھی کام نہیں کر رہا ہے۔

پھر بورگ کے حلق سے خون کی قفل کی سی آوازیں آنے لگیں اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”یہ مجھے دے دو۔“ پولیس مین نے فنڈ لے سے کہا۔ فنڈ لے نے مسکینے کے ساتھ اپنا بریف کیس پولیس مین کی جانب بڑھا دیا۔

”اندر چلو۔“ پولیس مین نے دفتر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر جانے کے بعد فنڈ لے.... دفتر میں بیٹھ گیا اور پولیس مین فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مشتوں میں مزید پولیس کی نفی بھی آگئی۔ ان کے ساتھ ایک ایسی ہیٹس بھی تھی۔ ایسی ہیٹس کے ڈاکٹر نے بورگ کا معائنہ کرنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ اسنے میں پولیس انسپکٹر میک لین بھی آگیا اور اس نے تحقیقات کا چارج سنبھال لیا۔

پولیس کی تحویل میں موجود فنڈ لے کے بریف کیس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد.... اس میں سے کوئی کارآمد شے برآمد نہیں ہوئی۔ چند اہم کاروباری کاغذات کے سوا بریف کیس میں اور کچھ نہیں تھا۔ پھر پولیس نے پورا دفتر کھنگال لیا لیکن آؤٹ لک تلاش کرنے میں ناکام رہی۔

”لگتا ہے کہ قاتل اس آؤٹ لک کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“ انسپکٹر میک لین نے سر ہلاتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو سٹر فنڈ لے!“

☆☆☆☆

فنڈ لے نے سوچا کہ ڈاک کو لے جانے اور پھر اس لفافے کے ڈاک سے داخلے میں چوبیس گھنٹے کا وقت لگ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ڈاک کا نظام قطعی غیر یقینی ہے۔

البتہ ایک بار جب لفافہ چاک کرنے والا چاقو ڈاک کے ذریعے دائیں اس کے پاس پہنچ جائے گا تو پھر وہ اطمینان کے ساتھ اسے اپنی مرتی سے ٹکانے لگا دے گا۔

اگلے روز وہ اپنے دفتر چلا گیا۔ اب سلور ویئر کا پورا کاروبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ اس

کاروبار سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ دفتر کے دروازے کا فلا کھولنے سے پہلے اس نے ڈاک کا تھملا جواس کے دروازے پر رکھا ہوا تھا، اٹھا لیا اور تالاکھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے ڈاک کا تھملا اپنی میز پر رکھ دیا۔ وہ اپنی ڈاک جھانٹنے لگا۔

تب اس کی نظروں میں وہ جوابی لفافہ آگیا جس میں اس نے لفافہ چاک کرنے والا چاقو چھپایا تھا۔ اس نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ لفافے میں موجود چاقو کے خاکے کو محسوس کرتے ہوئے اسے قہقہے اطمینان ہونے لگا۔ پھر اس نے لفافے کا فلیپ کھولا چاہا۔

اسنے میں اس کے دفتر کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور پولیس انسپکٹر میک لین اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ کرحش چہرے اور کرسی جسم والا ایک پولیس افسر بھی تھا جو فنڈ لے کو کینتو تو نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ میں لے رہا ہوں۔“ انسپکٹر میک لین نے فنڈ لے کے ہاتھ سے لفافہ جھٹکے ہوئے کہا۔

اس دوران لفافے کا فلیپ کھل چکا تھا اور لفافہ چاک کرنے والے چاقو کا پھل نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ ”تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے، فنڈ لے۔“ انسپکٹر میک لین نے کہا۔ ”اور میں تمہیں مستحب کر رہا ہوں کہ....“

فنڈ لے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن..... لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”بورگ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ تم نے چاقو کے ساتھ کیا، کیا ہے البتہ مجھے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ مرتے دم اس نے اپنی آخری سانسوں کے وقت کیا الفاظ ادا کیے تھے۔“

”اس نے تو صرف بریف کیس کہا تھا، صرف بریف کیس!“ فنڈ لے نے بورگ کے آخری الفاظ دہرائے۔

”ہاں۔ اس نے یہ الفاظ اپنی ماوری زبان میں ادا کیے تھے۔ گزشتہ شب جب میں اپنے ایک ڈیٹش دوست سے ڈیٹش زبان کا درس لے رہا تھا تو تب میری سمجھ میں آیا کہ تم نے آؤٹ لک ڈاک نیچے پہنچانے والی ڈھلان سے کھسکا دیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فنڈ لے نے حیرت سے پوچھا۔

”بورگ نے حقیقت میں بریف کیس نہیں کہا تھا۔ اس نے اپنی ماوری زبان میں ”brevkasse“ کہا تھا اور ڈنمارک کی زبان میں یہ لفظ ”لیٹر بکس“ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“

☆☆☆☆

مہفل شہر و سخن

محمد ہمایوں تنولی..... اسلام آباد
جن کے پروں میں قوت پرواز ہی نہیں
تقید کر رہے ہیں وہ مری اڑان پر
عبدالجبار رومی انصاری..... پورے والا
یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چیتے ہیں، لہو رلاوتے ہیں
نازش خان..... پشاور
اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہنا



آذین رضوان..... کورنگی، کراچی
آسمانوں کی کشش کبھی رہتی ہے مگر
خاک سے پاؤں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے
تم نے چاہا بھی تو کس حال میں چاہا ہے ہمیں
جب ہمیں وقت بدلتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
کبھی بن سنور کے جو آگے تو بہار حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
محمد شفیق حسین..... سندھی ہونٹ، نیو کراچی
میرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
میں سے سن لیا ہوگا یہ دنیا چار دن کی ہے

ریاض بٹ..... حسن ابدال
ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے
کرن عمران..... گلشن اقبال، کراچی
اک ایسی بزم سجائی گئی ہے غلوٹ میں
سٹ گیا ہے زمانہ خود اپنی وسعت میں
وہ کارواں جو تری رہ گزر سے لوٹ آئے
اٹے ہوئے ہیں ابھی تک غبار وحشت میں



ناہید یوسف..... اسلام آباد
رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چوڑے رات گئی بات گئی

محمد آریز ملک..... کراچی
جرم الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
کیسے ناداں ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

غزیرین احمد..... ملتان
تیرے بغیر اگر زندگی کی خواہش ہو
خدا کرے مجھے وہ زندگی نہ رہا آئے

نوشین جاوید..... گلشن معمار
اس کی زد پر وہ بھی خود بھی تو آسکتے ہیں
کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے
کون تعبیر کی سوچے کہ سبھی نقل ہوئے
موسم خواب کی تفصیل بتانے والے

محمد یعقوب..... رحیم یار خان
میرے دیران درجوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ میرے گھر کے دروہام سجانے آئے

شہزاد خان..... کوئٹہ
تیرے ہی بھلے کو چاہتا ہوں
میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں

دروہ ملک..... کراچی
اب اس سے بڑھ کے محبت کا قلم کیا ہوگا
سب انہی ہیں یہاں رم دروہا ہوتے ہوئے
مجھے اچالے کا لالچ دیا گیا اور پھر
میں دیکھتا رہا دن کو سیاہ ہوتے ہوئے

جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ہر جانب بارود بچھا ہے قدموں میں
اور خلقت دیوانی بڑھتی جاتی ہے
خاموشی سے ظلم سے جاتے ہیں لوگ
کتنی تن آسانی بڑھتی جاتی ہے

عامر شہزاد..... نیکانہ صاحب
بظاہر تو محبت تھی حقیقت میں مجبور رہا
اسے شہرت کی ہم سے وہ لوگوں میں مفرد رہا

انعم کمال..... حیدر آباد
جن خوابوں کی تعبیر پہ اصرار ہے تم کو
اُن خوابوں کی تعبیر بتانے کی نہیں ہے
اس بھیڑ میں سائے سے بچھڑتا ہوا سایہ
کہتا ہے یہاں ساتھ بھانے کی نہیں ہے

رمضان پاشا..... گلشن اقبال
غیب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

مہتاب احمد..... حیدر آباد
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی

عالیہ بھٹی..... سرگودھا
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لفظ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

غلام محمد..... پڑمیدون
جب چاک مگیاں کا مزہ ہے دل نالاں
جب اک نفس اکیلا ہوا ہر تار میں آوے
ظہیر احمد..... سکھر

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم میرے لیے ہوتے
میری قسمت میں رقم مگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اختیار احمد..... منڈی بہاؤ الدین
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے ہر اک
ہماری جیب کو اب حاجت رُو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریختے ہو جو اب راکھ جیتو کیا ہے

اسلم علی..... نواب شاہ
تغافل دوست ہوں میرا داغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تھی کیجیے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سہو بیگانہ خالی ہے

نواز رشید..... میر پور خاص
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ کسی
اتصال اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ کسی

عامر خان..... کراچی
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

زویب احمد ملک..... کراچی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے خوشگلی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

ذریبان سلطان..... اردو بازار، کراچی
ہمارے ہجر کے قصے سیمو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک
تمہارے حسن کے جلوے نے رنگوں میں ڈھالیں گے
ہمیں کچھ ہوش تو آئے نہیں تصویر کرنے تک

محمد عظیم..... جھنگ
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اسے جذبہ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بہتے

چشم دید

محمد طاہر عسیر

جرائم کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک طاقت ور اپنے گھمنڈ میں بڑے سے بڑا جرم کرتا چلا جاتا ہے مگر... بدقسمتی سے ایک چھوٹی سی چالاکی پر پکڑا جاتا ہے کیونکہ... قدرت اسے مزید مواقع دینے سے انکاری ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا شکار تھا اور معاملات کی نوعیت پر حیران بھی۔



مشری دنیا میں جرائم کے ارتکاب میں ہر دم مجبور کرنے والا ایک کار مجرم

”میرنا! تمہارے مشروم اور دودھ کی بوتل میں فرنیج میں رکھ رہا ہوں۔“ اس نے یہ آواز بلند کیا اور دونوں چیزیں فرنیج میں رکھ دیں۔ شاہنگ بیگ میں سے دو کھربا کس نکال کر وہ لاؤنج کی طرف آیا۔

”دوڑی اور میڈی کے کھربا کس بھی لے آیا ہوں۔“

افوہ..... میرنا! کیا تم لی دی کی آواز کم کرو گی؟“ وہ یہ کہتے

میکس گھر کا صدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خاکی رنگ کا شاہنگ بیگ تھا۔ بائیں جانب سے لاؤنج میں سے لی دی چلنے کی بلند آواز آرہی تھی جہاں تیس بال کا بچہ لگا ہوا تھا۔ وہ حیدر خاں کی جانب بے چکن کی طرف آیا اور شاہنگ بیگ کو آتشنگ نہیں پر رکھ کر اس میں سے سامان نکالنے لگا۔

میونہ عزیز..... لاہور

ہم اہل خواب کی مجبوریاں سمجھتے ہیں سو ہم نے کچھ نہیں سوچا ترے خیال کے بعد

نازش ریحان..... لیہ

رکا ہوا تھا ہر سانس میرے سینے میں اسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مرجاتا

اولیس خان..... بہاولنگر

عشق وہ حیرت و دانائی کا موسم ہے جہاں کام آتی ہی نہیں دانش دنیا ہرے دل

احسن آفریدی..... میانوالی

سانس لینے سے بھی بھرتا نہیں سینے کا خلا جانے کیا شے ہے جو بے دخل ہوئی ہے مجھ میں

فیاض احمد..... اداکارہ

اک نئی آگ بھر میں ایسی بھڑک اٹھی کہ پھر سارے ہی رنگ اتر گئے رنگ وصال کے سوا

عاصم علی..... بٹنڈوالہ پیار

کبھی خوشی سے ہار کس نے مانی ہے؟ آخر دنیا کیوں ہم کو تسلیم کرے

شریئل خان..... لاہور

ہر اختیار پر بے اختیار قابض ہیں ہر اقتدار پر قبضہ ہے عاصبانہ وی

رضا احمد..... فیصل آباد

جانے کس لہر میں تھا کوزہ گر خاک ہوئی رہی ادھر سے ادھر

شاہانہ فیض..... چنیوٹ

عشق مگر ایسا عشق ہے آنکھوں سے بہنے دو لبو زیت مگر ایسی زیت ہے اپنا تو کام ہو چکا

اسما خان..... خانیوال

عمر بھر حادثے ہی کرتے رہے استقبال وقت ایسا تھا کہ سینے سے لگائے گئے ہم

منیر..... دیپاڑی

مرتے مرتے دیکھنے کی آندہ رہ جائے گی دوائے ناکامی کہ اس کافر کا پتھر تیز ہے

پرویر علی خان..... آزاد کشمیر

سنبھلے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دلمان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نمر علی..... کراچی

خواہشوں کے سچ میں اور سازشوں کے درمیاں لکھ رہا ہے آسماں بھی اک عجیب داستان

زینب خواجہ..... ناظم آباد، کراچی

اک عمر گزاری رستوں میں، ماحول وہی ہے کل جو تھا نہ جانے کیسی گردش میں وہ گھیاں اور چہارے تھے

سنبھل..... کراچی

جب بھی انسانوں کو رکھا، مجھ کو یہ احساس ہوا تن میں ان کا زہر بھرا ہے، نامن میں کیا رکھا ہے

نورین علی..... واہ کینٹ

وہ خوش جمال کتھا، رہتا تھا بدگماں سا باتوں میں کچھ چلن سی، آنکھوں میں کچھ دھواں سا

وزیر احمد..... جامشورو

اک بکھرے خواب کی صورت ہے وہ دور سنہرے بچپن کا اب یاد ہیں قصے بھوتوں کے، پریوں کی کہانی بھول گئی

ماقب کمال..... کراچی

کوئی نہ اپنا ساتھی ہو تو سنگت کس سے ہم جوڑیں چاروں سمت ہو ویرانی تو راہ کو اپنی کیا سوڑیں

ممتاز علی..... حسن ابدال

اب کے جو مسافت ہمیں درپیش ہے اس میں کچھ بھی تو سراپوں کے حوالے نہیں کرنا

ارم کا شرف..... نویدیک سنگھ

سائے سے سایہ گزرتا ہوا محسوس ہوا اک عجب خواب کی حیرت میں ملے ہیں تجھ سے

مختل شعر و سخن

کوین
برائے
شمارہ
نومبر
2018

نام :
پتا :

کچھ نہیں۔ اور یہ بات تو عدالت میں بھی ثابت ہو چکی ہے لہذا اس موضوع کو نہ پھینچا جائے تو بہتر ہے۔

”اسٹیٹ میں انڈر ولڈ کی برصغیر ہوتی سرگرمیوں کے متعلق آپ نے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے؟“

”میں چھوٹی پمپلیوں کے بجائے بڑی پمپلیوں کو پکڑوں گا اور میں نے جو لائحہ عمل بنایا ہے اس پر عمل کر کے میں چند ماہ میں اسٹیٹ کو کرائم فری زون بنا کر دکھاؤں گا۔“ اس کے جواب پر ہال کمراتیوں سے گونج اٹھا۔ اس نے وقت سے ایک فائدہ اٹھا کر پھر سے ایک گھنٹ پانی پیا۔

”کیا بڑی پمپلی سے آپ کا مطلب ڈان کارلوں سے ہے؟“

”ولیم کارلوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہے ہی نہیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے اسے دیکھا ہے؟ یا کسی کے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟“ ڈان ولیم کارلوں ایک نقاب ہے اور اس نقاب کے پیچھے جو کوئی بھی ہے، وہ قانون کی نظر میں ایک مجرم کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے جواب پر بھی نے اثبات میں سر ہلا دیے جیسے وہ اس سے متفق ہوں اور اس کے ساتھ ہی پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔

☆☆☆

مسلا دھار بارش میں وہ جھپٹتے ہوئے میکس کے گھر میں داخل ہوئے۔ جون نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا ہیٹ اور رین کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر ڈال دیا۔ وہاں اس کے ڈیپارٹمنٹ کے کئی ماہرین موجود تھے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اسے گرم کافیا کا کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”ایک لاش فی وی لاؤنج میں ہے جبکہ تین لاشیں باہر سوئٹنگ پول میں ہیں۔“

”بڑا خوبصورت گھر ہے۔“ اینڈریو نے تبصرہ کیا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہو چکے تھے۔ سرخ قالین پر میکس کی قابلِ محبت لاش پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھرا چاقو سے وار کیے گئے تھے۔ پیٹ کی آستیں باہر نکل آئی تھیں۔ اینڈریو نے فوراً ناک پر درمال رکھ لیا جبکہ جون جھپک کر لاش کو دیکھنے لگا۔ میکس کے چہرے پر خوف اور تکلیف کے تاثرات نمود ہو چکے تھے۔ اس کی ادھمکی آنکھوں میں اب کوئی تازہ نہیں تھا۔

”کچھ ملا؟“ اس نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا۔

”کچھ انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ لاشوں کے قریب سے کچھ نہیں ملا۔ اسے چاقو سے مارا گیا ہے اور چاقو اسی سوئٹنگ پول میں سے ملا ہے جہاں اس کی بیوی اور بچوں کے اشیاء بھی تھیں۔“

حالت بہتر ہے۔ لوٹ مار کا کس نہیں لگتا، کسی نے ذاتی دشمنی نکالی ہے۔“

”یاد رہے قتل کرنے والے ہر بار ایک معمار کیوں بنا دیتے ہیں؟“ اینڈریو منہ بنا کر بولا۔

”تا کہ تم جیسے لوگ مفت کی تنخواہ پر گزارہ نہ کریں۔“ جون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر شیشے کی دیوار کی طرف آگیا جس کے پار لان اور سوئٹنگ پول کا منظر تھا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ پول میں ایک عورت اور تین بچوں کی لاشیں حیر رہی تھیں۔ اس کے سامنے ان لاشوں کو باہر نکلانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

”کیوں مسٹر جیمس! تم کیا کہتے ہو اس قتل کے بارے میں؟“ جون نے اینڈریو سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ قاتل کوئی لوگوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میکس گھر پر نہیں تھا اس نے میکس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی اور بچوں کو مارا اور پھر پیٹنگ میکس کا انتظار کیا اور اس دوران اس نے مشروب سے اپنا دل بھی بہلایا جیسے ہی میکس اندر داخل ہوا اس نے میکس کو چاقو سے ہلاک کر دیا۔ قاتل کی دشمنی صرف میکس سے تھی اس کی فیملی سے نہیں۔“ اینڈریو نے اس بار تجویز کی سے کہا تو جون اسے دیکھتا ہوا رہ گیا۔

”یہ تمہارا اندازہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے ابھی ابھی قاتل کا فون آیا تھا۔“ اینڈریو نے کہا تو جون کے ماتھے پر شکنیں ابھرا گئیں۔

”اوہ جون! میں غلط کر رہا تھا۔ دیکھو مذاق کر لیتا چاہیے ایک چھوٹی سی بستی سے ہماری اتنی مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔“ اینڈریو اسے غصے میں استاد کچھ کر بولا۔

”مجھے اس طرح کا مذاق پسند نہیں۔ خاص طور پر ایک ایسے گھر میں جہاں چار انسانوں کا قتل ہوا ہو۔“ جون نے ناگوار سی سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

”دیکھو یہاں کا منظر وہی کہہ رہا ہے جو میں نے بتایا۔ عورت اور بچوں کی لاشیں پھول چکی ہیں اور یہ بتاتی ہیں انہیں قتل کیے ہوئے زیادہ دیر ہو چکی ہے اور میکس کو بعد میں مارا گیا ہے۔ وہاں ایک شاٹنگ بیگ بھی پڑا ہے جس میں کچھ سامان ہے۔ میکس اسے لپٹے باہر گیا ہوگا جب قاتل اندر داخل ہوئے۔ یہاں کئی افراد کی موجودگی تو جیسے بھی محسوس ہو رہی ہے اور اس جھوٹے کے پاس موجود چاقی پر رکھے مشروب اور پتلی ہوئی برف سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاتل نے میکس کا انتظار کرنے کے دوران دو پیگ لیے۔ رہی بات دشمنی کی تو یقیناً آواز، فحاشیا، کبیر سے کونکھ قاتل نے میکس کو اذیت

دے کر مارا ہے۔“ اینڈریو نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”بہت اچھے قسم نے ٹھیک وہی اندازہ لگایا ہے جو یہاں موجود بھی افراد لگا چکے ہیں۔“ اس نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور تم..... تمہارا کیا خیال ہے جون کیا یہ غلط ہے؟“

”سنو مسٹر جیمس! تم اور ان سب نے جو اندازے لگائے ہیں وہ اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن سراغ رسانی سامنے کی صورت حال کا اندازہ لگانے کا کام نہیں بلکہ سامنے کی صورت حال سے آگے کا اندازہ لگانے کا نام ہے۔“ جون نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ قاتل اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں گاڑنی سے باہر جا رہا ہوگا یا پھر ٹرانکٹ میں بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا ہوگا یا پھر..... یا پھر وہ اپنے اگلے قتل کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو اس طرح کے اندازے لگانے سے کیا ہوگا؟“ ڈراگھے بتا سکتے ہو۔“ اینڈریو استہزائیہ انداز میں بولا۔

جون خاموشی سے شیشے کے پار دیکھتا رہا۔

”اچھا تم بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“ اینڈریو نے پوچھا۔

”یہ قتل ڈان ولیم کارلوں نے کیے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے۔“ جون نے اینڈریو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اینڈریو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”تمام لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور یہاں موجود ہر اس چیز کو قبضے میں لے لو جس پر انگلیوں کے نشانات ہو سکتے ہیں۔“ جون نے اپنا رین کوٹ پہنتے ہوئے کہا اور اپنا ہیٹ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

مسٹر مائیکل آج کل اپنی انگلیوں کیمن میں مصروف تھے اسی سلسلے میں وہ آج عام لوگوں کی طرح ایک بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ بھی انگلیوں کی کمپانی اور عوام کی توجہ حاصل کرنے کا ایک نسخہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ عوامی ہوا جائے۔ دس منٹ بعد بس آ کر رکی تو وہ بس میں سوار ہو گئے۔ ایک سیٹ پر بیٹھے ہی انہوں نے سر پر رکھا سفید ہیٹ اتار دیا تو لوگوں نے انہیں پہچان لیا اور بے اختیار خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

”نی وی بریرسوں آپ نے جو تقریر کی میں اس سے

لفظ لفظ موتی

☆ کچھ باتوں کا جواب صرف خاموشی ہوتی ہے اور خاموشی بہت خوب صورت جواب ہے۔
☆ کچھ لوگ قسمت کی طرح ہوتے ہیں جو دعا سے ملتے ہیں اور کچھ لوگ دعا کی طرح ہوتے ہیں جو قسمت بدل دیتے ہیں۔
☆ جب غلطی ثابت ہو جائے تو عقل مند اپنے آپ کو درست کر لیتا ہے اور جاہل مند اڑ جاتا ہے۔
☆ کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا جائے لیکن عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔
☆ شکست کھانا بڑی بات نہیں شکست کھا کر ہمت ہار جانا بڑی بات ہے۔
☆☆☆

بہت اتفاق کرتا ہوں۔ ہمیں دوسروں کے گھروں میں دخل دینے کے بجائے اپنا گھر پہلے صاف کرنا ہوگا۔“ ایک مسافر بولا۔
”میرے خیال میں وقت آگیا ہے کہ پہلے خود کو سدھار لیا جائے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
”اسٹیٹ کے متعلق جوئے قوانین بتائے گئے ہیں کیا ان کے ذریعے عوام کی حق ٹیلی ویژن کی؟“ ایک اور شخص نے پوچھا۔
”میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اگر خود کو بہتر بنانا ہے تو کچھ حدود متعین کرنا ہوں لیکن یہ صرف میرا ذاتی خیال ہے اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون عوام کی حق ٹیلی کر رہے ہیں تو میں اس معاملے میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“ مائیکل نے ڈیوٹی چیک جواب دیتے ہوئے کہا جس پر ساری بس نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔
”ہمیں ایسا ہی گورنر چاہیے۔“ ایک جانب سے آواز آئی۔
”بالکل۔ مسٹر مائیکل ہمارے پسندیدہ فرد ہیں۔ یہ ہماری بات سمجھتے ہیں۔“ ایک بوڑھی خاتون بھی بولی تو مائیکل مسکرا دیا۔
”آپ سب لوگوں کا شکر ہے۔ آج رات نو بجے میرا پروگرام ختم دیکھیں گے۔“ میرا اندر دبو ہے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے

اپنے اسٹاپ پر اتر گئے۔ بس والوں نے انہیں ہاتھ پلا کر رخصت کیا۔ وہ اسٹاپ سے پیڈل ایک جانب بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دور ایک گلی میں ان کا شوٹر ان کی مرسیڈز پر لیے انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

”میں یہ کیس نہیں لے سکتا۔“ جون نے کہا۔
”یہ فیصلہ تم نے نہیں مجھے کرنا ہے۔“ سینئر آفسر ایڈم نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کیس کو تمہیں ہی سنبھالنا ہوگا۔ یہاں کوئی اور سینئر بندہ نہیں ہے۔“

”میں تمہارے فیصلوں کی پابندی سے آزاد ہو چکا ہوں۔ آج شام پانچ بجے میری ڈیوٹی ختم ہوتے ہی میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گا۔ اور تم اس سسٹم ٹیکس پر میرا سامنا نہیں کر لیتے۔ یہ بہت اچھا سراغ رساں ثابت ہوگا۔ خاص طور پر تمہارے لیے یہ بہت فرامیغ اور دی دکھا سکتا ہے۔“ جون نے ایک طرف کھڑے اینڈر یو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”دراصل اسی نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے۔“ ایڈم نے کہا۔
”اوہ۔ تم جب دوسروں کے مشورے ماننے لگے ایڈم۔ یہ اچھا سراغ رساں ہے، میری بات کا یقین کرو۔“ جون جانے کے لیے پلٹا۔

”کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ یہ لاکا ڈان ولیم کارلوں کو گرفتار کر سکتا ہے؟“ ایڈم نے اونچی آواز میں کہا تو جون رک گیا ایڈم اس کے قریب آیا۔

”کارلوں کو پکڑنے کا یہ تمہارے پاس آخری چانس ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اس میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے علاوہ یہاں اور کون یہ کام کر سکتا ہے؟“

جون باہر نکل کر اپنے کمپن میں گیا اور کیپیڈر کی میز پر ہاتھ دکا کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دو تصویریں تھیں جن کے درمیان ایک سوالیہ نشان والا کاغذ چسپاں تھا۔
”دیکھیے۔ یہ میری خواہش تھی کہ یہ کیس آپ حل کریں اور میں آپ کو اسٹسٹ کروں۔ لیکن اگر آپ نہیں چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔“ اینڈر یو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔
”لیکن کیا ایک سینئر ہونے کے ناتے آپ اپنے جونیئر کی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ میرا پہلا کیس ہے اور ہے بھی ڈان ولیم کارلوں کے بارے میں..... جسے آج تک نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر ہمارے پاس ہے۔ یہ کیس میرا کیریئر بچا بھی سکتا ہے اور مایوسی سکتا ہے۔“

جان، کیم، رفا، مو، کھڑا اور باہر بولا۔

”اگھوں کے نشانات ملے؟“

”نہیں۔ قاتل نے پتہ نہ ڈالتا ہے بہن رکھے تھے۔“

”میں پوسٹ مارٹم رپورٹس دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جون نے کہا۔

اینڈر یو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر ایک فائل نکال کر اسے حمادی۔ جون نے جیب سے عینک نکال کر لکائی اور رپورٹس دیکھنے لگا۔

”ہوں..... میکس کو تین بار چاقو مارا گیا اور باقی تینوں کی موت پیٹ میں پانی بھر جانے کی وجہ سے ہوئی اور انہیں میکس سے آدھا گھٹنا پہلے قتل کیا گیا۔ کسی کے جسم پر انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔“

”یہ کچھ اور کاغذ بھی ملے ہیں میکس کے گھر سے۔“ اینڈر یو نے فوراً ہی ایک اور فائل اسے حمادی۔ جون کچھ دیر ان کاغذوں کو بھی دیکھنے لگا۔

”میکس نے اپنی آنکھوں کی انشورنس کر دئی تھی۔“ جون نے آنکھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں لیکن چونکہ اس حادثے میں اس کی آنکھیں محفوظ رہی تھیں اس لیے یہ انشورنس کیٹل ہوئی۔ میری انشورنس کمپنی سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں میکس کی بائیں آنکھ کا کارہ ہوئی تھی۔ آپریشن کے ذریعے اسے نئی آنکھ لگا دی گئی تھی اس لیے اس نے اپنی آنکھوں کی انشورنس کر دئی۔“

”یہاں لکھا ہے کہ اس نے اپنی دونوں آنکھوں کی ٹیچہ ٹیچہ انشورنس کر دئی؟“ اس نے عینک کے اوپر سے اینڈر یو دیکھا۔

”ہے نکمال کی بات؟ لیکن اس کی ضرورت کیا تھی، یہ مجھے علم نہیں۔ کیا آپ کچھ کہہ سکتے ہیں؟“

”کیا میکس کو کوئی وصیت نامہ ملا ہے؟“ جون نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”گھر سے تو بس یہی کچھ ملا ہے۔ آج اس کے بینک لاکر کا سامان ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ شاید اس میں ہو۔“ جون نے فائل بند کرتے ہوئے عینک اتار کر جیب میں رکھی۔

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟ آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا یا کہ میکس کے قتل میں ڈان ولیم کارلوں ملوث ہے۔“ اینڈر یو نے پوچھا۔

جون نے خاموشی سے اپنی بیوی اور بچے کی تصویریں اتار کر اسے سالانہ میں منتقل کیں اور پھر اینڈر یو کی طرف

مڑا۔ کچھ دیر وہ اینڈر یو کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک اپنی ٹھیکس ہتھوں سے باہر کھینچ کر اوپر اٹھائی۔ اینڈر یو نے دیکھا اس کے پیٹ پر زخم کے دو نشان تھے۔ شاید خنجر یا چاقو کے۔
اینڈر یو دم بخود رہ گیا۔

☆☆☆

قبرستان میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بظاہر اس سناں جگہ پر دونوں موجود تھے۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کدائیں تھیں اور وہ ایک قبر کی کھدائی کر رہے تھے۔ اس سناں میں کدالوں کے چٹلے کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں ایک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ اچانک ایک کی کدال سخت شے سے ٹکرائی تو انہوں نے کھدائی روک دی۔ گڑھے کے اندر بچھری ایک سل نظر آ رہی تھی۔ کدالوں کو رکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس سل کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اندر ایک لکڑی کا تابوت نظر آ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکن کھولنے ہی ایک ہاتھ کا قاتل برداشت ہو اطراف میں پھیل گئی۔

”تم باہر دھیان رکھو۔ میں کام شروع کرنے لگا ہوں۔“ ایک بندے نے لاش پر جھنجھتے ہوئے کہا تو دوسرا بندہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اندر والا بندہ باہر نکل آیا۔

”ہو گیا؟“ پہلے والے نے پوچھا۔
”ہاں۔ اب کھلو یہاں سے۔“ دوسرے نے گھبرائے ہوئے سہجے میں کہا۔

”قبر کو بھرتا نہیں ہے؟“ پہلے والا بولا۔
”چھوڑو اسے۔ نکلو یہاں سے۔“ دوسرا تیز تیز چلتے ہوئے بولا تو پہلے والا کندھے اچکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☆☆☆

”ڈان ولیم کارلوں کی شخصیت ہمیشہ سے بڑی پراسرار رہی۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح مخفی رکھا کہ کوئی اس تک پہنچنا تو درکنار اسے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسری جانب اس کا سیٹ اپ انتہا قوتور تھا کہ اس نے پوری اسٹیٹ میں جہاں جہاں اس کے مخالف تھے، سب کو ختم کر دیا اور اس طرح ختم کیا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ کارلوں کو کون لے، کہاں رہتا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ کسی کے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میں ایک عرصے سے کارلوں کے پیچھے تھا لیکن مجھے بھی کامیابی نہیں ملی۔ پھر ایک دن مجھے ایک ایسا آدمی ملا جس نے کارلوں سے غداری کی بھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس آدمی سے کچھ حاصل کر سکتا، وہ قتل کر دیا گیا۔ بالکل اسی

طرح جس طرح میکس اپنی ٹھیکس سے قتل ہوا ہے۔“ جون اور اینڈر یو اس وقت ایک اوپن ایر ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

”بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ ایک رات جب میں گھر لوٹا تو وہاں ڈان ولیم کارلوں اپنے ساتھیوں سمیت خود موجود تھا۔ میرے پیڑروم کی چھت سے میری بیوی اور پانچ سالہ بیٹی کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ ڈان کارلوں ایک نقاب میں تھا اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے ذاتی دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے خوش محسوس کرتا ہے اس لیے اس نے اس خنڈار کو اپنے ہاتھوں سے مارا اور میری بیٹی بھی اسی لیے ماری گئی ہے کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے پیٹ میں اس طرح چاقو مارے کہ میں صرف زخمی ہوا۔ جانے کیوں اس نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ پچھلے کافی عرصے سے ڈان اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں ہر طرح کی خبریں اور جرائم کے تذکرے سنائی دیے بند ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ یہاں سے کہیں چلا گیا ہے لیکن میکس کے گھر میں موجود مظہر کچھ کرسی میں کچھ کیا کہ یہ کام ڈان ولیم کارلوں کا ہے۔ وہ واپس آ گیا ہے۔ لیکن میری بات پر یقین کون کرتا ہے؟ یہاں سب مانتے ہیں کہ ولیم کارلوں صرف ایک نقاب ہے۔ وہ اصل میں ہے ہی نہیں انڈر ورلڈ کے ایک پورے گروپ کا نام ہی ڈان ولیم کارلوں ہے لیکن... میں جانتا ہوں ولیم کارلوں ایک آدمی ہے۔ ایک انڈر ورلڈ ڈان اور ایک بے رحم قاتل اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی گرفتاری میرے ہاتھوں ہوگی۔“ جون نے اسے تفصیل بتائی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم ولیم کارلوں سے مل چکے ہو۔ وہ بے شک نقاب میں تھا لیکن اس کا قہوداقت تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔“ اینڈر یو دھچکی سے بولا۔

”ہاں۔ وہ ایک ہماری جسم کا مالک ہے۔ اس کے شانے چوڑے تھے آواز ہماری اور گرجت۔“ جون نے کہا اور پھر چونک کر سامنے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہوشیار ہو جاؤ۔ وہ مسٹر مائیکل ہیں۔ گورنر کا الیکشن لڑنے والے ہیں۔ ہماری طرف ہی آرہے ہیں۔“

اینڈر یو نے پلٹ کر دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے مائیکل اس ریسٹورنٹ میں لوگوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔

”انہیں میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ یہ تو بہت بڑے بزنس مین ہیں۔“ اینڈر یو نے کہا۔

”ہاں اور اس وقت اپنی الیکشن کمپن میں مصروف

”کب تک یہ مطلب..... یہ کیسے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ ڈان اصل میں ہے کون۔“ اس نے پوچھ لیا کہ اس میں موجود ویڈیو آن کر دی۔ اگلے ہی لمبے وہاں موجود بھی افراد حیرت زدہ رہ گئے۔

ایڈیٹر بوتو بے اختیار چلا اٹھا۔

”مسٹر ہائیگل۔“

جوان نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک توقف کے بعد بولا۔

فیصلہ کر لیا۔ دوسرا چور اگر شخص گورنر بن جاتا تو ساری اسٹیٹ میں اس کا راجح ہوتا۔ جرائم سے لے کر بزنس تک سب میں اسی کا حکم چلتا لیکن گورنر بننے سے پہلے اس نے ان لوگوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کی بطور ڈان ویم کارلوں کی شخصیت سے آگاہ تھے۔ اس نے اپنے بے حد قریبی لوگوں کو کٹ کر دانا شروع کر دیا۔ سوائے تین چار لوگوں کے، باقی سب مارے گئے۔ یہ تین چار لوگ بطور ڈان اس کی شکل سے آشنا نہیں تھے۔ ان کا رابطہ صرف ڈان سے فون پر تھا۔ جب وہ تمام لوگ مارے گئے جو بطور ڈان اس کی شکل سے آگاہ تھے تو اسے معلوم ہوا کہ کافی عرصہ میں اس کا ایک اسسٹنٹ میکس جو

☆☆☆
ایڈیٹور اور جون آپریشن روم میں ایک مشین کے
سامنے بیٹھے تھے دونوں کے کانوں پر ہیڈ فون چڑھے ہوئے
تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔
”تمہیں رقم مل گئی ہے۔ اب بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟“
”تم نے میرے ساتھ کوئی گھڑ بڑھیں کی لہذا میں بھی
نہیں کروں گا۔ تمہارے گھر کے سامنے والے خالی گھر کے
لیٹر باکس میں ایک لفافہ تمہارا منتظر ہے۔ اور سنو، مجھے امید
ہے کہ تم میری تلاش میں وقت ضائع نہیں کرو گے۔ جو ہو گیا
اسے بھول جاؤ۔“ بلیک میلر کی آواز سنائی دی اور اس کے
بعد کال منقطع ہو گئی۔

جلدی سے بولا تو آپ میٹر نے اسے شہر کے جنوبی مضافات میں بے ایک ہیجے کا چٹا بتادیا۔ جون اور اینڈریو ایک ساتھ ہی اٹھے۔

”خیمہ تیار ہے؟“ جون نے اینڈریو سے پوچھا۔

جون نے ایک طرف موجود کمپیوٹر آن کیا۔
 ”آخر اس میں سے کیا؟“ اینڈرو بو ہولا۔

”جی! فوری طور پر دس ملین ڈالر کا بندوبست کرو۔“

جی سر ہلا کر باہر چلا گیا تو اسمتھ مشروب کے گھونٹ لینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بلیک میلر کون ہو سکتا ہے؟ آج صبح ہی کوئی اس کے لیٹر باکس میں ایک لفافہ رکھ گیا تھا جسے کھولنے پر اس کے اندر سے ایسی تصویر نکلی کہ وہ بری طرح چونک گیا۔ اسی وہ اس تصویر کا جائزہ ہی لے رہا تھا جب اس کے فون پر تیل بجی۔ یہ تصویر بیچنے والے آدمی کی کال تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ تصویر شخص ایک فریڈ ہے اس کے پاس پوری فلم ہے۔ اسمتھ نے پوچھا کہ وہ اس کے بدلے میں کیا چاہتا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اسمتھ شام تک دس ملین ڈالر تکس کا بندوبست کرے۔ اس نے شام چار بجے کا وقت دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جی پیسوں سے بھرا بیگ اٹھا لیا۔ اب اسے چار بجتے کا انتظار تھا۔ عام حالات میں شاید وہ اس بلیک میلر کوئی اہمیت نہ دیتا لیکن آج کل حالات کچھ اور شرح کے تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ٹھیک چار بجے سامنے تپائی پر رکھا فون بج اٹھا۔ اسمتھ نے ریموڈر اٹھایا۔

دوسرے دن میں پارک کا چار نمبر ٹوائٹ خرابی کی بنا پر بند ہے اس کے بجائے روشنی ان کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اس روشنی ان کے اندر رقم کا بیگ چھینک دو۔ رقم ہتھے میں جھپٹیں فون کر

نے پوچھا۔
"کل رات کسی نے میکس کی قبر کھودی اور لاش کی
دونوں آنکھیں نکال لیں۔" اینڈریو نے کہا تو جون چونک گیا۔
"کیا مطلب؟" جون نے پوچھا۔
"اودہ میرے خدا اتم نے میکس کا وصیت نامہ نہیں پڑھا
ہوگا۔ وہ مجھے کل رات ہی ملا تھا۔ جانتے ہو اس میں کیا لکھا
تھا؟" اینڈریو نے کہا۔

”کمال ہے۔ میس نے ایسا کیوں کیا؟“
 ”تو میس ہی بتا سکتا ہے لیکن وہ تو.....“ ایڈورڈ
 مذاق کرتے کرتے رک گیا۔
 ”یہ آنکھوں کا کیا چکر نکل پڑا۔ ہمیں اس کی قبر کھود کر
 آنکھیں نکالنے والے کو ڈھونڈنا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ پولیس
 اسٹیشن جا کر معلوم کرو کہ پولیس نے اب تک آنکھیں چور کر
 کرنے والوں کو گرفتار کیا ہے یا نہیں۔ میں جب تک اس
 ڈاکٹر سے مل لوں جس نے میس کی آنکھوں کا آپریشن
 تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کوئی نہ کوئی کلیہ ضرور ملے گا۔
 ایڈورڈ یوسر جا کر ایک طرف چلا گیا جب کہ جون پولیس اسٹیشن
 کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆
اسی طرح ایک بے قد کا مالک فحش تھا۔ چوڑے جیز۔
لو، شاندار، ایک اترتے مال۔ ایک کان میں سنہری پا

احسان مند

نازیہ نور

ایک اچھا انسان اگر اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دے تو اتنا احساس نہیں ہوتا مگر جب برا انسان اچھائی کرے تو ہر ایک چونک جاتا ہے۔ وہ جو اس کی جان کا دشمن تھا ایک چھوٹے سے احسان نے اسے اس کا محسن بنا دیا۔

ایک قاتل کے ضمیر کا بوجھ جسے وہ اتارنے کے لیے بہیمان تھا



جیسے وہ شامک کے لیے نکلا ہو، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے لیے گھر سے نکلا تھا چونکہ وہ پیشہ ور قاتل تھا، اس لیے اس کی پچاس ڈھال حرکات و سکنات میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ اس وقت وہ ایک غیر معروف سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ اچانک قریب گھڑی ہوئی ایک کار میں خوفناک دھماکا ہوا۔ گارڈز زمین سے کئی فٹ اوپر اچھلا، شیشے اور لوہے کے ٹکڑے آؤ کر اس

آج صبح سے مطلع صاف نہیں تھا۔ آسمان پر بکے تیز ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے فضا میں کھنسی سی آئی تھی۔ گارڈز قلعہ نہایت اطمینان سے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس کے دائیں کندھے پر گیسٹر الٹک رہا تھا جو سیاہ رنگ کے کیس میں محفوظ تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا خوبصورت اور مضبوط بدن والا مرد تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی سفاکی و درندگی یا کھچاؤ نہیں تھا۔ ایسا معصوم ہوتا تھا

پہلے پولیس والے بلیک میٹر تک اس آدمی کے ذریعے پہنچ گئے تھے جس کے ساتھ مل کر اس نے قبر کھودی تھی۔ پولیس کے ذریعے ہمیں اطلاع ملی تو ہم نے بلیک میٹر کی نگرانی شروع کر دادی جس کی وجہ سے بلیک میٹر اور اسٹھ دونوں کا ٹیلیفونک رابطہ ہماری نظروں میں آ گیا۔ بلیک میٹر بھی گرفتار ہو گیا اور اسٹھ وغیرہ بھی۔ باقی ویڈیو کے ذریعے مسٹر ہائیکل عرف ڈان ولیم بھی پکڑے گئے۔ یہ بھی ساری کہانی۔ جون نے کہانی مکمل کی تو اینڈر یو ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”ایک بات تو ہے ہاں۔۔۔ سینئر سیکرٹری ہوتا ہے۔ اس کیس میں سب اندازوں کا مکمل تھا اور کمال کی بات ہے کہ تمہارے سارے اندازے درست ثابت ہوئے۔ تم نے بالکل سچ کہا تھا کہ ایک سرائخ رساں کا کام سامنے دیکھنا نہیں بلکہ سامنے سے ذرا آگے دیکھنا ہے۔“

”جانتے ہوا اینڈر یو، اپنے چالیس سالہ دور میں، میں نے ڈان ولیم کارلوس کو پکڑنے کے لیے ایسی ایسی منصوبہ بندی کی تھی کہ جن سے اس کا پچنا ناممکن تھا لیکن وہ بچا رہا۔ وہ قانون اور مجھ سے تو بچتا رہا لیکن قدرت کی لالچی بے آواز ہوئی ہے۔ اس سارے کیس میں ہمارا آدھا کام قدرت نے کیا ہے کیونکہ جب قدرت ڈان ولیم جیسے لوگوں کی رسی کھینچتی ہے تو ایک چھوٹا سا بہانہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ڈان ولیم کارلوس کی رسی کھینچ لی گئی اس لیے وہ ایسے قتل کے الزام میں گرفتار ہوا جس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈان ولیم اس طرح پوری دنیا میں اس جب وہ گورنر کا انکیشن لڑے جا رہا تھا۔ اس طرح پوری دنیا میں اس کی تہلیل ہو کر رہ گئی۔ اور یہ بات انڈر ورلڈ ڈانز سے لے کر سیاست دانوں تک کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دے گی۔“ جون نے کہا۔

”اب کیس تو ختم ہو گیا جون۔ آگے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب کیا اب تم کوئی کاروبار کرو گے؟ ویسے شنگ کا کام بہت اچھا ہے۔ میرے اکل پیکام کرتے ہیں اور بڑے کامیاب ہیں۔ بس تم کو بروقت سمندر کی ٹھیکن فضا میں رہنا ہوگا۔“

”کاروبار میرے بس کی بات نہیں۔ میں فورس کا آدمی ہوں، صرف و ریٹائرڈ ہوا ہوں۔ اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اب پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہوں لیکن ہوں تو سرائخ رساں۔ ویسے بھی ابھی تم اس سفر میں کچے ہو۔ تمہیں بہت کچھ سکھانا باقی ہے۔۔۔ تو کیا مسٹر ہائیکل تم تیار ہو؟“ جون نے مسکراتے ہوئے کہا تو اینڈر یو نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

ایک لڑکی سے شادی کرنے کے بعد اس سے غداری کر کے روپوش ہو گیا تھا، وہ وہاں اسی اسٹیٹ میں آ گیا ہے تو اس نے اسے بھی مارنے کی گھائی۔ میکس اپنی بیوی کے اصرار پر واپس آیا تھا۔ دراصل میکس کا چہرہ ایک کارڈیکیشنٹ میں بچہ دہشی ہو گیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی اور چہرہ بری طرح جھلس گیا تھا۔ سرجری کے بعد اس کا چہرہ کافی بدل چکا تھا اور ایک آنکھ بھی مصنوعی لگا لی گئی۔ اسے امید تھی کہ کوئی اسے پہچان نہیں پائے گا لیکن ڈان کے آدمیوں نے اسے پہچان لیا۔ اس لیے وہ بچا رہا اپنی بیوی بچوں سمیت مارا گیا لیکن ایک چیز تھی جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا سکا۔ میکس نے نہ صرف اپنی دونوں آنکھوں کی اشورنس کروا رکھی تھی بلکہ اپنی وصیت میں بھی اسے عطیہ کرنے کی خواہش کر رکھی تھی اور یہ سب کچھ۔۔۔ بڑا بچہ نہیں تھا۔ میکس کی مصنوعی آنکھ صرف آنکھ نہیں بلکہ ایک جدید کیمرا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جاپانی سائنسدانوں نے ایسی مصنوعی آنکھ بنائی تھی جس سے نہ صرف دیکھنا اور دیکھ سکے تھے بلکہ اس سے ویڈیو بھی بنی جاتی تھی تاکہ خوبصورت اور یادگار مناظر محفوظ کیے جاسکیں۔ میکس نے اسی لیے اپنی آنکھوں کی اشورنس اور انہیں عطیہ کرنے کی خواہش کی تھی کہ کل کو اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو تو اس کی ویڈیو کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو جائے جیسے کہ ہمیں معلوم ہو گیا۔ مجھے اس مصنوعی الیکٹرونک آنکھ کے بارے میں اس ڈاکٹر نے بتایا تھا جس نے میکس کا آپریشن کیا تھا۔ اسی لیے میں سمجھ گیا کہ میکس کی اس الیکٹرونک آنکھ میں یقیناً اس کے قتل کی ویڈیو بھی ہوگی اور اس سے پہلے میں یہ اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ میکس قاتل ڈان ولیم نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اب آتے ہیں آنکھ چور کی جانب جو دراصل بلیک میٹر بھی تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس سے میکس نے یہ الیکٹرونک آنکھ خریدی تھی۔۔۔ اس نے اخبار میں میکس کے قتل کی خبر پڑھی تو اس کے دل میں یہی خیال آیا کہ قتل کی ویڈیو اس آنکھ کے کیمرے میں محفوظ ہوگی۔ لہذا اس نے ایک آدمی کے ساتھ مل کر میکس کی قبر کھود کر یہ آنکھ حاصل کر لی۔ جب اس نے ویڈیو دیکھی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اس کی توقع کے خلاف زیادہ خطرناک ہے۔ اس نے ڈان کے خاص آدمی اسٹھ کو کال کی اور بتایا کہ اس کے پاس ایک ایسی ویڈیو ہے جو ڈان کو بھائی تک لے جاسکتی ہے۔ بدلے میں اس نے دس ملین ڈالرز مانگے۔ اسٹھ وغیرہ کو ویڈیو کی اہمیت کا صحیح طور پر نہیں تھا۔ وہ اسے ایک عام سائیکل میٹک اسٹف سمجھتے رہے۔ انہوں نے بلیک میٹر کی بات مان کر اسے پیسے دے کر ویڈیو حاصل کی لیکن اس سے

کے جسم سے نکلے۔ دوبارہ مرکز پر گرنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک صاف ستھرے کمرے کے بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ کمرے میں دو اداؤں کی بوچھلی ہوئی تھی۔ بستر کے قریب ایک لڑکی کھڑی تھی جس کی انگلیاں کلاڑی کی نبض پر تھیں۔ کلاڑی کو لڑکی کا چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ”مم..... میں کہاں ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ وہ نرس تھی اور اسپتال کے سفید پونڈار میں تھی۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ کلاڑی نے پوچھا اور کچھ یاد کرنے کے لیے دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔

”تم ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔“ نرس نے آہستگی سے کہا۔ ”ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو، تمہارے لیے زیادہ بولنا بھی مناسب نہیں ہے۔“ نرس نے اسے ہدایت کی، فائل پر کچھ اندراجات کیے اور جانے کے لیے مڑی۔

”سنو!“ کلاڑی کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”میرا کیمرا کس کہاں ہے؟“

”تمہاری ہر چیز محفوظ ہے۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”کیمرا تمہارے کپڑوں کے ساتھ الماری میں رکھا ہے۔ بے فکر ہو کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا۔“ کلاڑی نے اطمینان کی سانس لی، اس کے کیمرا کیس میں کمرے کے علاوہ چھوٹا سا بے آواز ریکارڈر، چاقو اور ایک لمبی اسٹیک کی سوئی تھی۔ یہ تمام اشیاء کیمرا کیس کے خفیہ خانے میں رکھی تھیں۔

”میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“ کلاڑی نے دریافت کیا۔

”ایک کار دھماکے سے اڑ گئی تھی۔ تم اس کار کے قریب سے گزر رہے تھے اسی لیے زخمی ہو گئے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں زیادہ زخمیں نہیں آئیں۔“

”کار کے اندر کوئی شخص موجود تھا؟“

”ہاں۔“ نرس نے بتایا۔ ”بم ایجنٹس سوچے سے مشکوک تھا۔ جیسے ہی مسٹر اسکاٹ نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے ایجنٹس میں چابی گھمائی، کار کے ساتھ ساتھ ان کے بھی پرچے اڑ گئے۔“

”مسٹر اسکاٹ؟“ کلاڑی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ ایک مشہور بزنس مین تھے۔ امریکا میں ان کی کاروباری ساکھ بڑھ رہی تھی۔“

”اوہ..... افسوس ہوا۔“ کلاڑی نے دھیرے سے کہا اور اپنی دائیں آنکھ پر آہستگی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

”میری اس آنکھ میں سخت جھپٹن ہو رہی ہے۔“

”آنکھ کھولو۔ میں دیکھتی ہوں۔“ نرس نے نرمی سے اس کی آنکھ کے ہونے کو اٹھا کر دیکھا، چند لمحوں تک وہ غور سے دیکھتی رہی پھر مدد کے غر مند ہی سے بولی۔

”شاید شیشے کا کوئی ریزہ آنکھ میں چلا گیا ہے۔ میں آنکھوں کے ڈاکٹر کو اطلاع کرتی ہوں۔ جب تک اس آنکھ کو بند رکھو اور اسے ملنا بالکل نہیں، ورنہ آنکھ زخمی ہو جائے گی۔“

اتنا کہہ کر نرس تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کلاڑی آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ اسے جانسن سے مقررہ مدت میں توسیع کے لیے کہا پڑے گا۔ موجودہ حالت میں وہ آئندہ دو تین دن کے اندر کام مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ جانسن سیاہ فام تھا۔ کلاڑی کو اس کی رفاقت بڑی گراں گزرتی تھی مگر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانسن کو برداشت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ اس کے ذریعے سے ہی اسے کام ملتا تھا، دولت ملتی تھی اور زندگی کی آسائشیں حاصل کرنے کے لیے کلاڑی کو ہر وقت دولت کی ضرورت رہتی تھی۔

دور دراز کل کلاڑی جانسن سے ایک ریستوران میں ملا تھا۔ جانسن اسے دیکھتے ہی مسکرایا۔ ”ہیلو..... مسٹر کلاڑی! کافی عرصے بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔“

”ہاں بالکل کافی عرصہ ہو چکا ہے۔“ کلاڑی نے اس سے اتفاق کیا اور جلدی سے اصل بات پر آیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں کام کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ بتاؤ اس بار مجھے کس کواد پر بھیجنا ہوگا اور پارٹی نے کتنے معاوضے کی پیشکش کی ہے؟“

”خاصی فراخ دلانہ پیشکش ہے۔“ جانسن سنجیدگی سے بولا۔

”تم ہر مرتبہ یہی کہتے ہو۔“ کلاڑی نے منہ بتاتے ہوئے اس کی بات کائی۔

”میں نے ہر مرتبہ تمہیں کام کی مناسبت سے معقول معاوضہ دیا ہے۔“ جانسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ذریعے سے تمہیں کام ملتا ہے۔ پارٹیوں سے معاملات میں طے کرتا ہوں۔ پارٹی کو تو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی ناپسندیدہ شخصیت کو عدم کے سفر پر روانہ کرنے والا کون ہے اور اسی طرح تم بھی ان کے متعلق نہیں جانتے۔ اس طرح پارٹی مطمئن رہتی ہے کہ اسے بعد میں بھی بلیک میل نہیں کیا جائے گا اور تمہارے لیے بھی کوئی رسک نہیں ہے۔ تمہیں پیسے بھائے کام مل جاتا ہے۔ اس تمام سلسلے میں اگر میں کچھ کمیشن رکھتا ہوں تو یہ میرا حق بنتا ہے۔“

”درست کہہ رہے ہو کمیشن رکھنے کا تم حق رکھتے ہو۔“ کلاڑی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”لیکن، تمہیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ تم میرے معاوضے کی نصف رقم کمیشن کے نام پر رکھو۔“

”کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟“ جانسن غرایا۔

”میں انڈیا کے معاوضے میں تم نے مجھے جو معاوضہ دیا تھا وہ اصل رقم سے نصف تھا جو تم نے پارٹی سے وصول کیا تھا۔“ کلاڑی غصے سے بولے لہجے میں بولا۔

”اچھا.....“ جانسن نے جھجھکیں سیکھتے ہوئے اسے گھورا۔ ”اس کا مطلب ہے تم بعد میں چھان بین کرتے ہو۔“

”مجھے اتفاقاً معلوم ہو گیا تھا۔“

”کیسے..... معلوم ہو گیا کلاڑی؟“ جانسن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”یہ پارٹی میں فروخت ہونے والی اشیاء کے نرخ نہیں ہیں کہ تمہیں اتفاقاً معلوم ہو جائیں۔ یقیناً تم کام مکمل کرنے کے بعد تقشیر کرتے ہو اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، اس بات کو بھول جاؤ۔“ کلاڑی نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نرمی سے پوچھا۔ ”موجودہ بزنس کی بات کرو۔ پارٹی نے کتنی رقم کی پیشکش کی ہے؟“

”میں ہزار ڈالرز“ جانسن نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”بہت خوب۔“ کلاڑی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”معاوضہ طے سمجھو، اب اس کا نام اور پتا بتاؤ جسے ٹھکانے لگانا ہے۔“

جانسن کے چہرے پر اب بھی برہمی کے تاثرات تھے مگر اس نے خاموشی سے کاغذ کا ایک پرزہ کلاڑی کی جانب بڑھا دیا جس پر نام اور پتا تحریر تھا۔ ”اسٹیون جانسن 112 تھرڈ ایویو۔“ کلاڑی نے نام اور پتا ذہن نشین کرنے کے بعد کاغذ کا پرزہ بھاڑ دیا۔ ”مطمئن رہو کام ہو جائے گا۔ دسویں وقت کی کوئی پابندی تو نہیں ہے نا؟“

”وقت کی پابندی ہے۔“ جانسن بولا۔ ”ہمارا موکل جلدی کام کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس سے تین دن کی حد مقرر کی ہے۔“

”ٹھیک ہے، تین دن کافی ہیں۔“ کلاڑی نے ہائی بھر لی۔

جانسن نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ کلاڑی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آدمی رقم ہے، باقی حسب معمول کام کی تکمیل کے بعد ملے گی۔“

کلاڑی نے لفافہ جیب میں ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ خیالات کا سلسلہ آنکھ میں ہونے والی تکلیف کی شدت سے ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نرس واپس آئی اور اس

کے بیڈ کو چھلکی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ معائنے کا کمرہ تھا۔ دس منٹ کے بعد ایک خوش مزاج اور دہلا پتلا ڈاکٹر اس کی آنکھ کا معائنہ کرنے آیا۔ ڈاکٹر کی عمر پچاس برس کے قریب لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور حسانت بانی جاتی تھی جو اس کے کام میں مہارت ظاہر کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے کلاڑی کی آنکھ کا معائنہ کیا۔ ”تمہاری آنکھ میں شیشے کے دو ذرے نظر آ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”ایک ذرہ پتلی میں ہے اور دوسری جھپٹن زیادہ تکلیف پہنچا رہا ہے کیونکہ پتلی آنکھ کا نازک ترین حصہ ہے۔ دوسرا ذرہ کنارے پر ہے۔“

”ڈاکٹر۔“ کلاڑی نے گھبرا کر کہا۔ ”میری آنکھ خراب نہیں ہو جائے گی؟“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے اس کا کندھا سہجے چھاتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میں کچھ دیر کے اندر دونوں ذرے نکال دوں گا اور ایک فٹے کے بعد تمہیں یاد بھی نہیں ہوگا کہ کچھ ہوا تھا۔“

”آپ ابھی یہ ذرے نکال دیں گے؟“ کلاڑی نے پوچھا۔

”ہاں صرف آدھے گھنٹے کے اندر۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا پھر وہ نرس سے مخاطب ہوا۔ ”اسے آپریشن ٹیمیز لے چلو۔“ اور پھر ڈاکٹر نے آدھا گھنٹہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھ سے دونوں ذرات نکال دیے۔ ایک ذرہ کچھ گہرا چلا گیا تھا، اس کے لیے ڈاکٹر کو ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا۔ اس جگہ پر اس نے چند ناکے لگا دیے۔

”اب تمہیں درد تو محسوس نہیں ہو رہا؟“ ڈاکٹر نے کام ختم کرنے کے بعد پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ کلاڑی کے لہجے میں شکر گزری تھی۔ ”قدرت نے آپ کے ہاتھوں کو سببانی بخشی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا ہے۔ کوئی بھی آنکھوں کا سرجن یہ کام اسی طرح کر سکتا ہے۔“

کلاڑی نے قدرے فکر سے پوچھا۔ ”میری آنکھ..... بالکل ٹھیک ہو جائے گی نا۔ پہلے کی طرح۔“

”ارے..... پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”تم بالکل ٹھیک رہو، میں نے آنکھ کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے۔ اب اس میں کوئی خرابی نہیں ہوگی۔ تمہیں پانچ روز کے بعد صرف ایک مرتبہ میرے پاس آنا پڑے گا۔“

”مجھے اسی اسپتال میں آنا ہوگا؟“

”صرف میرے لیے؟“ کلا رک حیران رہ گیا۔

”اوہ..... اس کا مطلب ہے آپ کو خاصی میس بھی دینا پڑے گی؟“

”اس کی وجہ؟“ کلارک نے تجسس سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ کلارک کے چہرے پر ابھرنے لگی نظر آنے لگی۔ ”فیس نہ لے کر کس طرح کا فائدہ؟ مجھے..... کچھ

”میں اپنے بچے سے صرف مادی فائدہ حاصل نہیں رکھا اور نرم انداز میں بولا۔

اور ہر عطا کیا ہے تو اس سے صرف مجھے ہی نہیں انسانیت کو بھی فائدہ پہنچنا چاہیے اور جہاں تک فیس کا معاملہ ہے تو میں یہ

مکمل طور پر رضا کارانہ طور پر وقت کر دی ہیں۔ یہاں جب بھی میری ضرورت ہوتی ہے، مجھے بلوالیا جاتا ہے۔“

آزاد گردا میں فرشتہ صفت لوگ بھی رہتے ہیں جو مادی قائلہ کو
زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کھارک جیسے جلا و صفت قائل کا دل بھی

”میرے کینک کا پتا ہے۔ 112 تھریڈ ایویئر۔ تم

یہ آسانی تو ہاں پہنچ سکتے ہوں۔

پیشین ڈائجسٹ

”حق..... نہیں۔“ کلارک نے جواب دیتے ہوئے مسکرا نے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔

”میں آ جاؤں گا۔“ کلارک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

حادثے میں زیادہ زخم نہیں آئے تھے۔ اگلے دن اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا وہ اسپتال سے ذہن پر بھاری


نہایت شریف النفس اور ہمدرد انسان بھی تھا۔ یہ جانے اس کی مسجائی نے کتنے لوگوں کو چنائی کی روشنی بخشی تھی۔ کلارک

ہونے دیا لیکن اب..... اسے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مسئلہ اصول اور سادگی کا تھا۔

رہم وصول.... کرنے کے بعد اسے واپس کرنا کلارک کے اصول کے تحت خلاف تھا۔ اس الجھن سے نجات کا کوئی

اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ”تمہاری آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تمہیں یہ چرٹ کیسے آئی؟“ جانسن نے پوچھا۔ ”کیس

تم اپنے کام میں ناکام تو نہیں ہو گئے؟“
 ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ کھارک


 اکتوبر 2018ء

..... تشویش سے بچ چھا۔
 ”کیا تم ایک آنکھ سے محروم ہو گئے ہو؟“ جانسن نے

ٹانگے کال دیے جائیں گے۔" بات کرتے وقت کھارک کی
نکاحوں میں ذاکٹر اسٹیون جانز کا پُر شفقت چہرہ گھومنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ حادثے نے تمہارے حافظے پر بھی اثر ڈالا ہے۔“ جانسن نے مذاق اڑایا۔

کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ دماغ پر یا جسم پر کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ میں..... میں بس احتیاطاً نام پوچھ رہا ہوں۔“

”کیا تم اس شخص کا نام بتا سکتے ہو جو اسے نقل کرانے کے لیے اتنا معقول معاوضہ دے رہا ہے؟“

اپنے موکلوں کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ میرے کام کرنے کے کچھ اصول ہیں، چتا نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

حالت میں مقررہ مدت کے اندر کام مکمل نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ہفتے کی مدت چاہیے۔“

نہیں کرے گا۔" جاسن نے اٹھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔

ایک طرف اصول سنا سکھ اور تیس ہزار ڈالر کی رقم بھی تو دوسری طرف ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ اسے کچھ لگاؤ سا ہو گیا۔

تھا۔ کلارک نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں...

جملہ اشتہارات ایک جہتی سے مفت شائع کیے جاتے ہیں۔ البتہ کاغذ، روشنی وغیرہ کے سلسلے میں فی اشتہار مبلغ پانچ سو روپے کی مختصر رقم طوعاً کرہاً قبول کی جاتی ہے۔ مفلوک الحال پارٹیوں سے آسمان قسطوں میں بھی وصولی کی جاتی ہے۔ البتہ قسط ٹوٹنے کی صورت میں ادا شدہ رقم بھی واپس لا دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ یقیناً آجاتی ہے لیکن سولی چڑھنے کے بعد اسے ابھی نیند بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابھی نیند اور ابھی شہرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ ابھی شہرت بھی کسی قسم کار کے لیے ابھی نیند ہی کا باہان بنتی ہے۔

(مظفر اقبال کی کتاب وال دلیہ سے اقتباس)

نوجوان ادیب (ایڈیٹر سے)۔ "میں آپ کے
رہے میں شائع کرانے کے لیے ایک کہانی لایا ہوں۔"

ایڈیٹر۔ ”کہانی پڑھ کر سنائیے۔“
نوجوان اورب نے کہانی پڑھ کر سنائی پھر بولا۔

”مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟“

دو ماہ قید کی سزا سناتا کیونکہ تم نے اپنا اور میرا وقت برباد

انٹرویو لینے والے نے ایک سفارشی ٹرک سے
نوکری کے لیے یہ سوال کیا۔ ”جتاؤ، لیلیٰ مجھوں کو
تھیں؟“

یہی سوال دوسرے لڑکے سے (جس کی سفارش
میں تھی) کیا ہو گیا۔

”لیکلی بچوں کے گھر کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ.....؟“

اكتوبر 2018ء

خواتین وہ جذباتی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر کا تو کام ہی علاج کرنا ہے۔

مجھے اس کا اتنا احسان مند نہیں ہونا چاہیے، میرے لیے ہمیشہ کی طرح معاہدہ اہم ہوتا چاہیے۔ واقعی... ڈاکٹر کا کام ہی علاج کرنا ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر یا سرجن اپنے پیشے کے آغاز میں حلف اٹھاتا ہے کہ جہاں اور جس طرح بھی ممکن ہو گا وہ انسانی زندگی کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔ ڈاکٹر اسٹیون نے بھی یہی کام کیا ہے۔ کلاؤرک نے پرسکون ہو کر خود کو مختلف دلیلوں سے مطمئن کیا اور حادثے کے پانچویں روز ڈاکٹر اسٹیون کے کلینک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ نرم انداز میں خیریت پوچھی پھر اسے اندرونی روم میں لے جا کر ایک لمبی میز پر لٹا دیا اور بٹی کھول کر نائے نکالنے لگا۔ کلاؤرک اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ ڈاکٹر اسٹیون کی آنکھوں میں حسب معمول شفقت ہمدردی، متانت اور خود اعتمادی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا کام دس منٹ میں ختم کیا اور ناخنوں والی جگہ پر کوئی نشان ملا۔ ”اب تمہاری آنکھ پہلے پیسے بلکہ پہلے سے بھی اچھی ہوگئی ہے“ ڈاکٹر نے کہا اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت شکریہ ڈاکٹر“۔ کلاؤرک اٹھ گیا اور جیب سے پانچ سو ڈالر نکال کر ڈاکٹر کی جانب بڑھائے۔ ”یہ آپ کی نہیں“۔

”ارے نہیں“۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کام کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے اور میں نے بھی اپنا اصول نہیں توڑا۔“

”لیکن ڈاکٹر! میں آپ کا احسان نہیں لیتا چاہتا۔“

”کیسا احسان؟“۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، صرف اپنے اصولوں کی پابندی کی ہے۔“

”لیکن... آپ“۔ کلاؤرک کچھ کہنا چاہ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹی۔

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے مجھے انسانیت کے لیے کام کرنا ہے، تم اسے احسان مت سمجھو۔“

”شکریہ ہے ڈاکٹر“۔ کلاؤرک نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ نے احسان نہیں کیا، تو میں بھی کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔“

کلاؤرک کلینک سے باہر نکلا اور آس پاس دیکھ کر اپنی آنکھ کی صلاحیت کا اندازہ کرنے لگا۔ وہاں گیا کہ ڈاکٹر نے جھپک کہا تھا، اس کی نظر پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ کلاؤرک کا

ارادہ ایک بار پھر ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

☆☆☆

کلاؤرک ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ وہ اس کام میں... نوآموز نہیں تھا کہ کام کرتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار ہو کر ہیکل بار یہ ہو رہا تھا کہ وہ معاہدے کی شطرنجی رقم لے کر اپنا کام انجام دینے سے ہٹ چکا رہا تھا۔ کافی سوچ بچار اور چھان بین کے بعد آخر کار اس نے اپنا کام مکمل کر ہی لیا۔ اگلی صبح اس نے جاسن کو فون کیا اور اسی مخصوص ریسٹوران میں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”کیا خبر لائے ہو کلاؤرک؟“ جاسن نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

”کام ہو گیا ہے۔“ کلاؤرک سکون سے بولا۔

”خوب! مجھے معلوم تھا کہ تم کام نہیں ہو گے، اب مکمل کیا کام؟“ جاسن نے پوچھا۔

”گزشتہ رات“۔ کلاؤرک نے مختصر جواب دیا۔

”اس کے ثبوت اپنے ساتھ لائے ہو؟“ جاسن نے

وضاحت چاہی۔

”کیوں نہیں؟“ کلاؤرک نے اپنے کمرے سے

اتاری ہوئی دو تصویریں جاسن کی طرف بڑھادیں۔ تصویر

میں ایک شخص اندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ تصویر کو غور سے

دیکھتے ہوئے جاسن نے پوچھا۔ ”تم نے اسے کسی گیراج

میں مل کیا ہے؟“

”ہاں یہ اپنی گاڑی نکال رہا تھا، میں اسی وقت مجھے

اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا۔ اچانک حرکت قلب بند

ہونے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔“

”کیا؟... حرکت قلب بند ہونے کے باعث...

مطلب کیا تم نے قتل نہیں کیا؟“ جاسن کے چہرے پر حیرت

کا تاثر عیاں ہو گیا۔

”میں نے ہی اسے قتل کیا ہے۔“ کلاؤرک نے مسکراتے

ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اس کی موت کا سبب حرکت قلب

بند ہونا ہی بنایا جائے گا اور اصل میں... اس کی موت دماغ

کی رگیں پھٹ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ جاسن اٹھتے ہوئے

لہجے میں بولا۔ ”حکمت قلب... دماغ کی رگیں... مکمل کر

بناؤ، آخر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

کلاؤرک نے جاسن کے قریب جھکتے ہوئے ڈرامائی

انداز میں سرگوشی کی۔ ”میں نے اس کی آنکھ کے کونے میں

چھانچ لپی... پتلی سوئی داخل کر دی تھی۔ یہ کام میں نے

نہایت صفائی سے کیا۔ سوئی اس کی آنکھ کے اندرونی کونے میں داخل ہو کر دماغ میں پہنچ گئی تھی۔ جب میں نے سوئی نکالی تو آنکھ پر ختم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے، ڈاکٹر اس کی موت کا سبب نہیں جان سکیں گے۔“

”کیا بات ہے کلاؤرک۔ تم نے مجھے واقعی متاثر کر ڈالا ہے، سچ میں یہ طریقہ بہت صاف ستھرا ہے۔“ جاسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تصویریں میں اپنے موکل کو دکھانے کے لیے لے جا رہا ہوں، ہل بلیہ رقم تمہیں اسی جگہ مل جائے گی۔ اسی دوران میرا موکل تمہارے کام کی تصدیق بھی کرے گا۔“

کلاؤرک نے اثبات میں سر ہلایا۔ جاسن نے تصویریں جیب میں ڈالیں اور ریسٹوران سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ کلاؤرک جھپک وقت پر ریسٹوران پہنچ گیا۔ خلاف معمول جاسن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر سخت غصیلے تاثرات تھے۔ کلاؤرک اس کے سامنے کرسی صاف کر چکا تھا۔ ”میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ جاسن کی آواز غصے سے لرز رہی تھی مگر اس نے اپنی آواز بلند نہیں ہونے دی۔

”میں تو مقررہ وقت پر پہنچا ہوں، کیا مجھے یہاں آنے میں تاخیر ہوگئی ہے؟“ کلاؤرک نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ جاسن غراہا۔ ”تم طے شدہ وقت پر پہنچے

ہو، لیکن اس مرتبہ تم سے غلطی ہوگئی ہے۔“

”کیسی غلطی؟“ کلاؤرک نے تعجب سے جاسن کی

جانب دیکھا۔

”تم نے غلط شخص کو قتل کر دیا ہے۔“

”کیا؟...“ کلاؤرک نے کہا۔

”ہاں تم سے غلطی ہوگئی ہے کلاؤرک۔“ جاسن دانست

جیس کر بولا۔ ”میں تو پہلے ہی اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ

حادثے نے تمہارے حواس پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔“

”میرا خیال ہے تم مذاق کر رہے ہو۔“ کلاؤرک غصے

سے بولا۔ ”میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں اس میدان میں

نوآموز نہیں ہوں! مسٹر جاسن! لہذا فضول باتوں سے گریز

کر ڈلو! میری بقیہ رقم۔“

”میرا رقم نہیں لایا۔“ جاسن نے رکھائی سے جواب دیا۔

”کیون کیا وہ حیرت کاٹی نہیں ہے؟“

”شیرت۔“ جاسن نے استغناء لہجے میں کہا۔ ”اس سے

صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم نے ایک شخص کو قتل کیا ہے اور بس۔“

”میں بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا مسٹر جاسن!“ کلاؤرک نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”میں نے قتل نہیں کیا ہے اور جس کی تصویر تمہیں دی ہے وہ ڈاکٹر اسٹیون جانلزی ہے اور یہ بات سو فیصد درست ہے۔“

”یقیناً تم نے ڈاکٹر جانلزی کو قتل کیا ہے مگر یہ وہ نہیں تھا جس کا ہم نے معاہدہ کیا تھا۔“ جاسن ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم نے ڈاکٹر ویسٹرن جانلزی کو قتل کر دیا ہے۔“

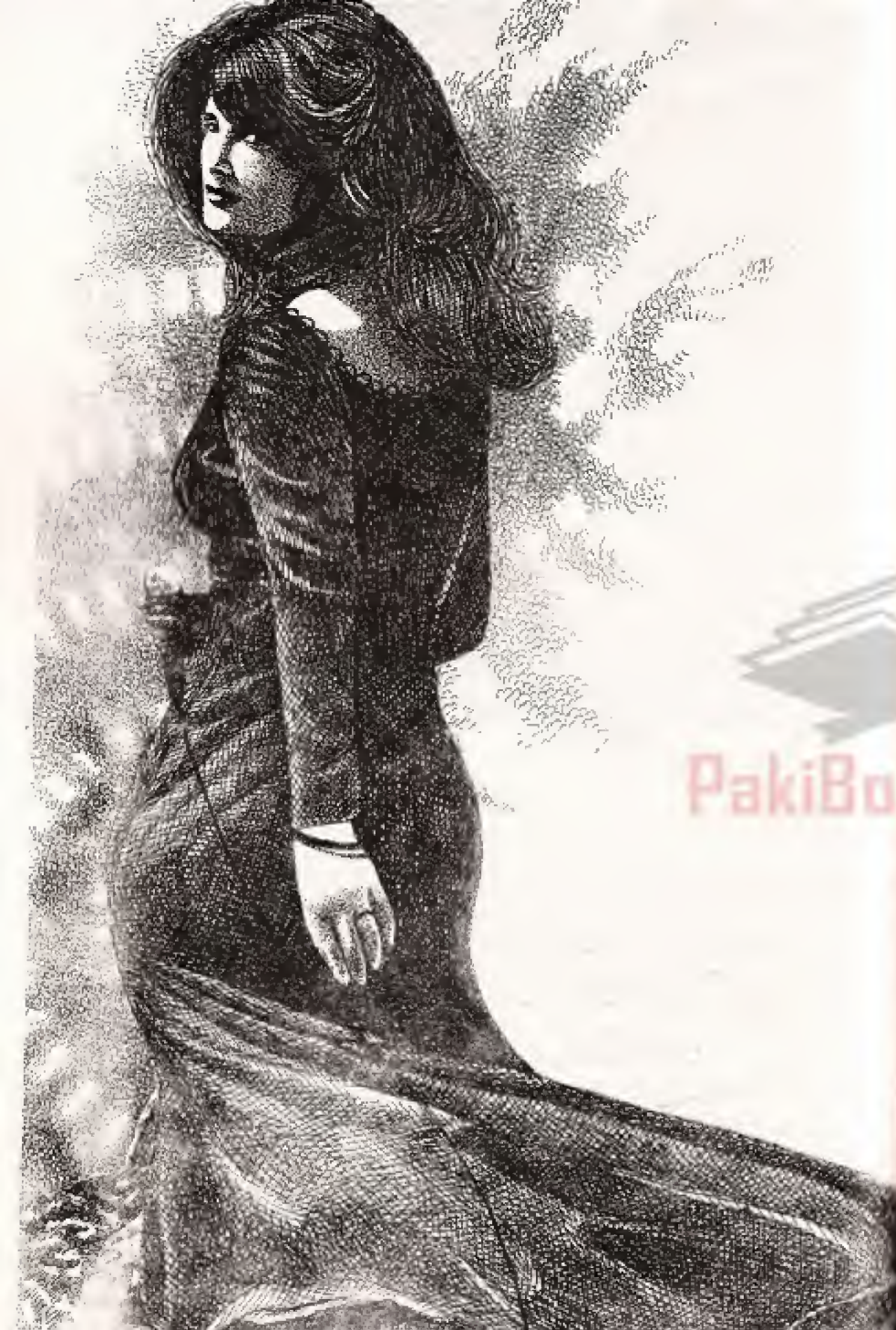
”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو ایڈریس مجھے دیا ہے وہاں دو ڈاکٹر جانلزی رہتے تھے؟“ کلاؤرک نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ایک ڈاکٹر اسٹیون جانلزی کا بھتیجا تھا۔ دونوں آنکھوں کے ڈاکٹر تھے اور ساتھ کام کرتے تھے۔ اب کچھ میں آیا کچھ کہ تم سے تفتی بڑی غلطی مرزد ہوگئی ہے۔ تم نے کچھ کو قتل کرنے کے بجائے کچھ کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے جس شخص کو قتل کیا ہے وہی تو ہمارا موکل تھا۔ اس کی اپنے بچاؤ ڈاکٹر اسٹیون جانلزی کو قتل کرانے کے لیے میں رقم دے رہی تھی۔“

کلاؤرک نے سختی خیز انداز میں سر کو جنبش دی جو بات جاسن بتا رہا تھا وہ اسے پہلے ہی معلوم تھی۔ اس نے پوری تحقیق کے بعد ہی نو جوان ڈاکٹر ویسٹرن جانلزی کو قتل کیا تھا۔ خاصی چھان بین کے بعد کلاؤرک کو یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ ڈاکٹر ویسٹرن جانلزی اپنے چچا ڈاکٹر اسٹیون جانلزی کو قتل کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی جائداد اور کلینک پر قبضہ کر سکے۔ ”اب ظاہر ہے تمہیں بقیہ نصف رقم نہیں مل سکتی۔“ جاسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ جس سے رقم ملنے کی امید تھی تم غلطی سے اسے ہی قتل کر بیٹھے ہو۔“

”اوہ... میرے خدا یا۔ مجھ سے اتنی بڑی حماقت کیسے مرزد ہوگئی۔“ کلاؤرک نے سر قمام لیا۔

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ حادثے نے تمہارے اعصاب متاثر کیے ہیں۔ تمہیں اب بھی آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ اب اگلا معاہدہ میں تب لاؤں گا، جب تمہاری طبیعت میں بہتری واقع ہو جائے گی۔... اوکے بائے۔“ جاسن نے تاسف سے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی کلاؤرک کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ مکمل ہوگئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کو قتل کر کے اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے محسن ڈاکٹر اسٹیون جانلزی کی جان بچائی تھی اور یہ موقع اسے ناموں کی ممانعت سے مل گیا تھا۔



قت بادشاہ اور کائنات کی پرشے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور

نہ بھی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر

سازن اُن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

جس بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں

کسی کو بادشاہت سے نوازا ہے اور کسی کو زمین

کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن

اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور

موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان

اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی

سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی

محبت بن کر پوٹھوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور

کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں

گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام

نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں

کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا

نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پیٹے کو دو بوند

پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر

اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاۓ قدموں

سے بے رحم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی

طرف بھرا، یکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی

مہربان ہے۔ اسے کھتا ہے... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے

وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات

میں چارے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور اہلیوں کا حسین

امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 19

وقت

حسام

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در باطلویل داستان

اس کا نام اسد علی رکھا جائے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے سنہ ۱۱۸۰ کو خود کو علی سلطان کی محمد داشت میں پایا۔ علی سلطان نکلیس (امریکا) کا ایک مستعمر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وسیلہ چیز تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا ٹیکڈالین سے طلاق ہو چکی تھی۔ وقت و فرصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی کیتی کو اپنے ساتھ لے کر تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک نیک وقتی ملازمرہ بھی بولی تھی اور جیسے جہاں تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد لایا رہا تاؤ کرنا تھا جو اسے اکل کتب تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں پیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی ملی بڑھ کر جواں ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے من و مرئی اکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر دوبارہ قصص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے مال دیا۔ یہ علی کی تعلیم کے محسوس کوہ اور تھی کچھ پڑھنے کے طور پر اس کا ذہن بے سبب سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہا تھا تاہم علاقہ انگلستان میں واقع "سرکل اسے" نامی ایک اسٹور پر جو ترقی ملازمت کر رہی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکلو می میں پتھر ڈگری حاصل کر لی تو جس نے بنگا سے اس کے تعاقب میں مل گئے۔ ایک روز وہ سائیکلو می کے ڈھلوان کی نیت سے "سرکل اسے" میں قصص آئے تمام پیش گوئی کے بعد وہ ڈیکٹ علی کے ساتھ موجود سائیکلو می نگار کو ٹھٹھ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں سائیکلو می ڈیکٹ کو بھی (ایری ڈونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ایک "جینکس (نیکلیس) میں تھا جینکس علی سلطان کی رہائش ہے بی (نیکلیس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور ایک جینکس کے اسٹور میں جس میں اس کا آتا جانا لگا رہتا تھا۔ "ڈونی لاؤج" نامی ایک ریسٹورنٹ میں سپائری و ڈیزیز شادو اپنے نیکلیس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے درہل پر دیکھ دی تو اس کی ذہنی میں ہمارا ترقی آئی۔ ایک رات ڈونی لاؤج میں جب لیو تارڈو نامی ایک سائیکلو می سے اور اس کے خوار یوں نے شادو سے تفریق کی کوشش کی تو علی جیسے کچھ ہو کر پڑا۔ اس رات نامی کو ایک اسیر و کبیر آتشیں لائیڈ ڈیفینس نے بڑی دھمکی سے دیکھا اور تارڈو نے ٹینگ کا ڈر علی کو کھما کر رخصت ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد کوہ پالید تارڈو سے علی کی خوشی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیو تارڈو نے اپنی بڑبڑت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو گارنٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ ڈونی لاؤج والے نے شادو کو ارادے کی بنا پر علی نے شادو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھوڑا کر اسے اکل سلطان کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ ایک روز جب شادو اسٹیشن اسٹور سے گھر گری خریدنے کے لیے نکلا تو لیو تارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں مدت نہ ہاری اور شادو کو کوڑھنڈ تارڈو یا خرابک رات لیو تارڈو کا ایک قریبی ساتھی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے پیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو ہاروا کر دیا۔ آئندہ روز چیلو کے گل کی خبر ایک جینکس اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جینکس میں قریب قریب ثابت ہو سکتا تھا تاہم علی نے اکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک جینکس سے پوچھ لی گئی۔ اس نے جینکس صورت حال میں علی نے ڈیفینس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیفینس نے علی کی کھتاہنے کے بعد کیا کہ اگر وہ بہتر ٹینگ تک پہنچ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر ٹینگوں میں بہر ملی پر بہر توں کا ایک یارو اور ہتار با۔ ڈیفینس بہت اونچی تھی لیکن ایک ایک پر اسر لائیڈ تھی۔ اس نے اپنا ڈرونگ استعمال کر کے علی کو چیلو مر ڈیکس سے اس طرح نکال لیا جیسے مچھن سے بال۔ علاوہ ازیں ڈیفینس نے ٹھوس جوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیو تارڈو و شادو کو اغوا کر کے کوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادو کو عصمت فروشی کے جہنم میں بھونکے گا اور وہ رکھتا ہے۔ ڈیفینس نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر ٹینگ پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیفینس کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پرستین ہالو والے اس بیٹھے میں ڈیفینس کی نکتہ میں گزرنے والے وہ عظیم ہوش رہا بہتر ٹینگ بڑے ٹینگ، ٹینگ، دو دان پرور اور دانہ قاتل ٹینگ تھے۔ ڈیفینس کی شخصیت کسی سنے سے کم نہ تھی۔ اس پر مستزاد ڈیفینس نے اپنے ہی ایسی دو پر اسر شخصیات رہی آؤنگ بارون لاؤ اور براہی نام سے علی کی ملاقات بھی کرادی۔ سب علی پر یہ اعتقاد ہوا کہ وہ تمام افراد بیورو یوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوائی "اسکل اینڈ یوز" سے متعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ لیو خود کو جیتی خدا سمجھتے تھے۔ انھیں علی کے ہم عمر ایک ایسے جوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انھیں شک تھا کہ علی وہی جوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیفینس کی تمنا تھی کہ علی کی شرانکھ برادری سے ہوئے "اسکل اینڈ یوز" کی تربیت حاصل کرنے پر آدوگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیفینس کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیکس سے بے غی اپنے اکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کر دت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے در پید اور بہتر راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انھیں سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نوب یارک (امریکا) مرزا عامریک کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامریک علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک کاروبار کی حیثیت سے انھیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں منیم ایک نیک خاتون برادری کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ دم آتا بند ہو گیا تھی جس سے مرزا عامریک نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کایا کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا اور آنکھوں کی
بڑبڑاہٹ ہوئی تھی۔ اس ندری کی غلیانی دیکھنے سے تعلق
نہیں اس کا بدن ایک خوف ناک طوفان کی زد پر تھا۔
لوگوں ہوتا تھا جیسے اس کے وجود میں کوئی آتش فشاں
ہے خراب ہو۔
اس کیفیت سے پہلے کایا نے بڑے حسرت بھرے
میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ”کاش! میرے اندر
دھو بھی جاگ اٹھنے تاکہ میں بھی اپنے دشمن کو ایک
دور مہیا تک موت مار سکوں۔“
میں نے متعدد بار اس سے سوال کیا تھا کہ مجھے اپنے
کا نام بتاؤ لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا اور مسلسل
چلنی جاری تھی۔ جب انسان کسی کے رونے کا سبب
نہ ہو اور اس رونے والے کو کچھ بھی نہ سکنا ہو تو پھر دل
کی کجی عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔ ان لحاظ میں، میں
مجھ اس نوعیت کے حالات سے دو در تھا۔
میں نے کایا کو رونے دیا۔ میں غم نفسیات کا طالب

سے متناہی لہریں خارج ہو رہی تھیں۔ مجھے اس کے دیکھنے سے بے چینی محسوس ہونے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو.....؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ صاف نالکئی۔

میں نے بھی زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ ناشائستہ ہو چکا تھا اور وہ بھی ایک دم فریض لگ رہی تھی۔ میں اسے اصل موضوع کی طرف لے آیا۔

”کایا اتنے مجھے سوسائٹی کی کسی اہم مینٹگ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔“ میں نے غہبرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”میں تمہیں اپنے بھائی رافٹن کی موت کے بارے میں بتا رہی تھی۔“ وہ ایک پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”اس خاص مینٹگ میں تمام شرکا کو ایسی ریڈ وائن سرود کی جاتی ہے جس کے اندر انسانی خون کی آمیزش ہوتی ہے اور یہ راز اس وقت کسی بھی جونیئر ممبر کے علم میں نہیں ہوتا۔ اس ”برادر ہڈ“ سے تعلق رکھنے والے افراد جب ترقی کرتے ہوئے ایک خاص ڈگری تک پہنچ جاتے ہیں تب انہیں ایسے مکروہ رازوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ خیر، میں تمہیں رافٹن کے ساتھ جیش آنے والے افسوس ناک واقعے کا احوال سنا رہی تھی۔“

وہ تھوڑی دیر کو سانس ہموار کرنے کے لیے حتمی ٹوئیں اس کی فراہم کردہ معلومات پر غور کرنے لگا اور اس ”غور“ کے نتیجے میں مجھے اپنا جی ملتا سا محسوس ہوا۔ اب اس سوسائٹی کے شیطان ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ان لحاظ میں، میں نے تجویز کر لیا کہ مرثا، مرچاؤں کا مگر کسی اس برادر ہڈ کا حصہ نہیں ہوں گا۔

”جب یہ اہم مینٹگ پر رخصت ہوتی ہے تو تمام ممبرز کو وہاں سے رخصت ہونا پڑتا ہے۔“ کایا نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ”صرف ان افراد کو روک لیا جاتا ہے جن کی وفاداری پر شک کا دائرہ لگ چکا ہو۔ تین سال پہلے رافٹن کو بھی روک لیا گیا تھا۔ رافٹن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ سوسائٹی کے سینئر ڈیڑھ کے بھائی کو بڑی بیگانگی جان لیوا سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔“

مجھے بھر کو خاموش ہو کر اس نے ایک خوف ناک جھرجھری لی۔

میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا موزوں نہ جانا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر پھنساتے ہوئے مجھے مزید بتانے لگی۔

”اس واقعے کے بارے میں مجھے چند ماہ پہلے ہی پتا چلا ہے۔ اگر رافٹن کی موت کے وقت میں اس سے آگاہ ہو چکی ہوتی تو یا تو میں خود کو ختم کر دیتی یا پھر آسکر کو لین اب میں حتیٰ فیصلہ کر چکی ہوں کہ مجھے تمہاری دوستی میں ایک شاندار زندگی گزارنا ہے اور..... آسکر کو.....“

مجھے محسوس ہوا کہ جذبات کی شدت ایک مرتبہ پھر اس کے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کر فوراً اس کی طرف بڑھایا پھر پڑھن غلوں انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں کایا، تمہارے اندر انتقام کا الاؤ روشن ہے اور اس کیفیت کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ میں خود بھی اس آگ میں برسوں جلا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں قدم بہ قدم تمہارے ساتھ ہوں۔ آسکر یہاں آنے والا ہے۔ اسے تمہارے من پسند انجام تک پہنچانے کے لیے میں تمہاری پھر پور مدد کروں گا۔ مجھے بتاؤ، آسکر نے رافٹن کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

وہ شراب نوشی کی عادی تھی۔ میری قربت کی چاہت نے اس کی یہ عادت چھڑا دی تھی۔ ان جذباتی لحاظ میں اسے کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر دو تین گھرے کش لیے پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”سوسائٹی والے معاشرے کے ذہین ترین اور کسی فن میں یرغولی رکھنے والے افراد کو ختم کرتے ہیں اور اگر کسی کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے تو اسے عبرت ناک موت بھی ملتی ہے اور اگر وہ معتوب بندہ ان کی دسترس میں ہوتا ہے تو اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس کی تمام ذہانت اور ہنر کو ایک مکروہ تکنیک کے ذریعے اس کے اندر سے نکال لیا جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی نارمل پانی پیا ہے؟“

اس نے ایک غیر متعلق اور عجیب و غریب سوال پر اپنی بات کو ختم کیا تو میں نے کہا۔ ”ہاں، کئی بار پیا ہے۔“

”نارمل پینے والا نارمل کے اندر سوراخ کر کے اس کے اندر ایک اسٹرا ڈالنا ہے پھر اپنے کسٹر کی طرف بڑھا دیا جاتا ہے۔“ وہ مجھ پر انداز میں بولی۔ ”سوسائٹی کے سینئر ڈیڑھ اسی تکنیک کے ذریعے بد نصیب میر کی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو نکال لیتے ہیں۔“

”کیا کہنا چاہ رہی ہو.....؟“ میں نے حیرت اور الجھن کے طے جلتے تاثرات کے ساتھ کایا کی طرف دیکھا۔

”معتوب انسان کو ایک خاص قسم کا انجیکشن دیا جاتا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ”اس انجیکشن کے اثر سے بندہ اشل ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اس کے جسم پر قانچ کرتا ہے اور وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہتا البتہ اس کا دماغ بیدار رہتا ہے۔ یہ مصنوعی قانچ اس کے دماغ کو متاثر نہیں کرتا۔ اس کے بعد ڈرل مشین کی مدد سے اس کے پس منطوق شخص کی کھوپڑی میں سوراخ کیا جاتا ہے اور اس سوراخ کے اندر جوس والا اسٹرا ڈال کر اس کا بھیجا سڑک لیا جاتا ہے۔ رافٹن کو بھی یہی سزا دی گئی تھی اور وہ بھی آسکر کے ہاتھوں۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ جو شخص میرے بھائی کا بھیجا لگے بیٹھا ہو، میرے دل میں اس کے لیے کس درجے کی نفرت ہوگی.....؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا پھر سانس لیے بغیر کش پر کش لگا کر سارا سگریٹ پھونک ڈالا۔ ان لحاظ میں مجھے اس دکھائی داری پر بڑا اثر آ رہا تھا۔ میں نے سنگین لہجے میں کہا۔

”کایا! تمہارے سوال کا جواب الفاظ میں نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لیے مجھے عملی مظاہرہ کر کے دکھانا ہوگا۔“

وہ میرے الفاظ کی سٹاک کو محسوس کرتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ ”میں بھی کتنی بد بخت ہوں کہ اکثر میری ڈیوٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ لگا دی جاتی ہے جسے دیکھ کر میرا جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ میں آسکر کی ناپاک سنگت کو کس دل سے برداشت کرتی ہوں یہ صرف میں جانتی ہوں یا پھر جہودا جانتا ہے۔“

اب میں اسے مزید سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا لہذا اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے میں میدان عمل میں اتر آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری آغوش میں گئی۔ میں کافی دیر تک اسے پیار کرتا رہا۔ اس دوران میں ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

”میں نے سن رکھا ہے کہ افریقا کے خطرناک جنگلات میں بعض ایسے قبائل بھی آباد ہیں جو اپنے ہتھے چڑھنے والے انسان کا بھیجا نکال کر اسے فرانی کرتے ہیں اور پھر بڑے مزے سے کھا جاتے ہیں۔“ میں نے مستحل انداز میں کہا۔ ”یہ لوگ سانپ کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ کی ایک انگلی میں سانپ کی شبیہ والی انگوٹھی بھی ہوتی ہے۔ بعض باہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ سانپ کی نسل سے ہیں مگر مجھے تو یہ عقیدہ انتہائی فضول اور دواہیات لگتا ہے۔“

”جسمیں ان کے عقیدے پر یقین ہو یا نہ ہو لیکن میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ آسکر سانپ کی نہیں

بلکہ شیطان کی اولاد ہے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”صرف چار دن کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھو۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں جولائی کی صبح آسکر یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں لینے آ رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی موت کا فرشتہ بھی اس ہٹ تک پہنچے گا پھر تم میری مدد سے اپنے من کی آگ کو ٹھنڈا کر دو گی۔ آسکر کو اتنی اذیت ناک موت آنے کی کتنی چٹخیز خان کی بیگانگی موت کے منظر کو بھی بھول جاؤ گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اب تم سیکرٹ سوسائٹی کے قتل پر نہیں ہو بلکہ میری دوستی کے دھ پر سوار ہو۔ مالک نے تمہاری جتنی بھی سائنس لکھ رکھی ہیں وہ تم میری دوستی میں بڑی آن، بان اور شان سے جوگی۔“

وہ میری بغل میں گھسی ہوئی تھی۔ میرا ایک بازو اس کے چہرے کے قریب سے گزرتا تھا۔ وہ میری کلائی میں دانت کڑاتے ہوئے غور لہجے میں مستغرق ہوئی۔

”علی! مجھے تھوڑا تو نہیں طے جاؤ گے؟“

”ڈراؤ تو نہیں.....!“ میں نے ذہنی انداز میں کہا۔

”میں نے کیا ڈرایا ہے؟“

”تم نے جس طرح میری کلائی میں اپنے دانت گاڑ رکھے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تمہارا تعلق بھی کسی آدم خور قبیلے ہی سے ہے۔“ میں نے مصنوعی شجیرگی سے کہا۔

”اوہ سوری!“ وہ جلدی سے اپنے منہ کو میری کلائی پر سے ہٹاتے ہوئے محذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”میں تو تمہیں پیاد کر رہی تھی۔“

میں نے اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے مستی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جیادایہ تھوڑی کرتے ہیں۔“

”پھر کیسے کرتے ہیں؟“ اس نے مصیبت بھرے انداز میں پوچھا۔

”ایسے.....“ میں نے اس کے گلاب ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

وہ پورا دن ہم نے سوکر گزارا۔ رات بھی اپنی مخصوص رفتار سے گزر گئی۔ ہمارے بیچ استوار ہونے والا دوستی کا رشتہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گہرے سے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس بندھن کی گہرائی ہماری قربت کو بڑھا دے رہی تھی۔ کایا نے تو گویا میری کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔



ظہیر بکھاؤں اور انہیں سلسلوں سے مرعہ خیر 2018 کا دل خوش کن شمار.....

پاکیزہ

شیریں حیدر، رفعت سراج، حیا بخاری کی دلکش سلسلے دار کہانیاں

دردانہ نوشین خان کے زیرک خیالات کا مظہر.....

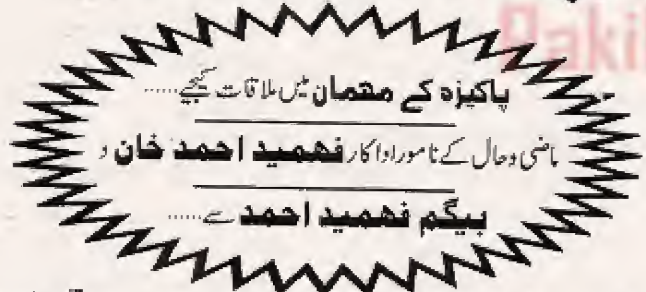
ایک یادگار متاثر کن مٹی ناول..... صفحہ کی نئی قسط.....

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُر بصیرت مضمون

عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے نزہت جبین ضیاء اکمل ناول..... دل کی بساط پر

شمع ہدایت کے سلسلے میں اختر شجاعت کی تحریر.....

سخاوت..... نامور اسکالر و علمائے دین کی مستند کتابوں سے لی گئی تحقیق کا انچور



ماضی و حال کے نامور اداکار فہمید احمد خان و

بیگم فہمید احمد سے.....

اسما قادری، ناہیدہ فاطمہ حسنین، نفیسہ سعید کے مشاق قلم کے کرشمے

(اس کی جلاوطنی)

پڑھیے ہماری سینئر اور جونیئر رازنڈ کی پُر لطف و دلچسپ تحریریں جن میں ڈاکٹر زاہدہ بیروین،

سلمیٰ غزل، نظیر فاطمہ، منعم ملک، دیگر شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا استخراج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

ظہیر بکھاؤں نے لکھے میں بولی۔ "تم ان کے ذیل ڈول اور صورت شکل کی مصویت تو دیکھ رہے ہو لیکن ان کی چوڑی کی خطرناکی تمہاری نظر سے پوشیدہ ہے۔ یہ بد معاش اپنے شکار کرنے کے لیے ایک دم ظالم اور سفاک بن جاتے ہیں جیسا کہ چنگیز خان کے معاملے میں تم بن گئے تھے..... یہ اپنی چوڑی کی بدد سے قابو آئے ہوئے شکار کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ سینگل، اسکو اور بعض سبیل تو ان کو دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں اور گوشت ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔"

"اگر یہ چینگون اتنے ہی باصلاحیت ہیں تو میں ان کے ٹینٹ کو ضرور آڑ ماؤں گا۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لکھے میں کہا۔ "اور بہت جلد..... انشا اللہ!" "اگر تم نے چینگون کا تماشہ دیکھ لیا ہو تو واپس ہٹ میں چلے ہیں۔" اس نے عام سے لکھے میں کہا۔ "اتنا تو چلے گا۔ ضرور کیوں نہیں۔" میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دونوں چمپل قیدی کرتے ہوئے ہٹ میں آ گئے۔

انسان کا جسم کسی گھڑی کے مانند ہے۔ جس طرح کسی گھڑی میں وقت سیٹ کیا جاتا ہے بالکل ویسے ہی انسان کا بدن بھی اپنے ماحول میں سیٹ ہو جاتا ہے۔ میرے جسم نے بھی ان دنوں میں آغاز کوکچا کی سردی کو کافی حد تک برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ پہلے روز مجھے یہاں جس قدر سردی محسوس ہوئی تھی، اب ویسی کیفیت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اتھارنیں جولائی کی صبح میں نے کایا سے کہا۔ "آج ناشتے میں کچھ تھکا ضرور بنانا۔ آج کا دن میرے لیے بہت اکتیش ہے۔"

"تحریریت!" اس نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ "آج میرا تو بڑھدے نہیں ہے۔ کیا تمہارا ہے؟" "نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "آج ایک بہت ہی خاص انعام تھاوار ہے۔"

وہ پوچھے بناندر وہی۔ "کیسا تھاوار؟" "جس طرح تم لوگ ایسٹ کو چھوٹی عید اور کرسس کو بڑی عید کے طور پر مناتے ہو ایسے ہی ہمارے ہاں میں چھوٹی اور بڑی عید ہوتی ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "چھوٹی عید یعنی عید الفطر کو ہم منشی عید اور بڑی عید یعنی عید الاضحیٰ کو ہم چنگین عید یا عید قرباں کہتے ہیں۔ آج عید الفطر ہے۔"

ستائیس جولائی کی صبح ہمارے ماحول میں تھوڑی تہہ ملی دیکھنے کو ملی۔ ہم سو کر اٹھے تو ہٹ کے قرب و جوار میں بچے بچے مشابہ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔ وہ میری آنکھوں میں موجود سوال کو پڑھ کر اس کے جواب میں بولی۔

"چینگون ہیں۔" "میں نے حیرت بھرے لکھے میں دہرایا۔ "لیکن میں نے اتنے دنوں میں اس ہٹ کے آس پاس تو ایک چینگون بھی نہیں دیکھا۔"

"میں اس کی وجہ سمجھ سکتی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "آؤ، باہر چل کر دیکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، چلو۔" میں نے کایا کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے وہ وجوہ بتا دو جس کا ابھی تم نے ذکر کیا ہے؟" "دور روز پہلے اس خطے میں گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی جو آوازیں سنیں انہوں نے ماحول کے درجہ حرارت کو کافی حد تک بڑھا دیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "جس کے سبب کئی ایک مقامات سے برف کی ابھی خاصی مقدار پھیل گئی تھی۔ یہ کوئی زیر برف انہی تجربہ تمہارے فضا میں اچانک شامل ہو جانے والی تباہ کاری، اس سے بحث نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں، تہہ ملی کے اسی محل میں یہاں آس پاس کی بریلی زمین میں کسی جگہ کوئی ایسی دراڑ پڑ گئی ہے کہ اس کے نیچے کا پانی محل کر سامنے آ گیا ہے۔ چینگون عموماً ان برفانی مقامات پر قیام کرنا پسند کرتے ہیں جہاں سے انہیں یہ آسانی پانی کے اندر چھلانگ لگانے کا موقع مل سکے۔ ان کی خوراک کا زیادہ تر حصہ مختلف آبی جانور ہیں۔"

ہم نے ہٹ سے باہر نکل کر قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی تو کایا کی بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ سوگز کی دوری پر مجھے نصف درجن چینگون کھیل کود میں مصروف دکھائی دیے۔ میں نے چینگون کو پانی کے اندر پرواڑ کرتے ہوئے اپنی باطنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اب میں اپنی ظاہری آنکھوں سے انہیں برف پر تیرتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ انتہائی چھوٹی ٹانگوں اور انتہائی موٹے پیٹ کے ساتھ چینگون کے جسم کی ہر حرکت دلچسپی کی حامل تھی، خاص طور پر ان کا پانی کے اندر غوطہ کھانا تو مسرور نگاہ رہتا تھا۔ "دیکھو تو، کتنے معصوم جانور ہیں۔" میں نے کایا سے کہا۔

"تمہیں چینگون، سرکار سے ملے، غلطی کا ہے غلطی۔" وہ

”اوہ..... گریٹ!“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
 ”تو آج تمہاری بیٹی عید ہے۔“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ہم اس وقت دنپاکے جس منظر پر قیام پزیر ہیں اس کا مقامی وقت بتی ایمنی سے بارہ گھنٹے آگے ہے۔ یعنی اس وقت انگلینڈ میں سٹائیکس جولا کی شام ہے اور پاکستان میں ابھی انھیں جولا کی کا آغاز ہوا ہے۔ یعنی وہاں ابھی رات کے ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا مگر اس آئی لینڈ پر عید انظر کی صبح ہو چکی ہے۔“

”ٹھیک ہے علی! میں اس ہٹ میں تمہارے لیے کوئی لذیذ کیک تو تیار نہیں کر سکتی لیکن ایک سویت ڈش ضرور بنا دوں گی۔ اپنی ماؤ..... چکی عید ڈالے!“

کایا نے مجھے دس کیا تو بہت اچھا لگا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”خیر مبارک ایڈ تھیک یوسج۔“

وہ چند لمحات تک پروسج انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”علی! عید چونی ہو یا بڑی یا کوئی بھی خوشی کا تہوار ہوا سے منانے کا مزہ تو انہوں کے سچ ہی آتا ہے نا..... تمہارا کیا خیال ہے؟“

کایا کے اس سادہ سے سوال نے میرے دھیان کو دینا اور شاد کی طرف پھیر دیا تھا لیکن میں نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کایا! میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت کسی اپنے کے ساتھ ہی ہوں۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا؟“

وہ میرے جوابی سوال سے گڑبڑا گئی، جلدی سے بولی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے قریب چار مہینے داروں کے حوالے سے بات کی تھی۔“

”میرے والدین اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ میں اکلوتا ہوں۔ میرا تو کوئی بھائی ہے اور نہ ہی بہن۔“

میں نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ ”والدین کے بعد میں جسے اپنا سمجھتا تھا وہ اگلے علی سلطان تھے جنہوں نے انیس سال تک میری پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، یہ اگلے سلطان کی پر خلوص محنت کا ثمر ہے لیکن انھوں نے چند روز پہلے وہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ باقی جہاں تک دوست احباب کا معاملہ ہے تو میرا ایک سادہ دوست عظیم کچھو کراچی، پاکستان میں ہے۔ جتنا کوسو ساکی والوں نے سیریلین، آسٹریلیا میں رکھا ہوا ہے، شاد کو یوریا، جزی، میرا بقا اس وقت میری واحد دوست تم ہو جو میرے

قریب ہو۔“

”میں ہمیشہ اسی طرح تمہارے قریب رہوں گی۔“ وہ محبت پاش نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔“

”میں نے سوچا تھا، یہ عید اپنی ماں کے ساتھ اسکا میں مناؤں گا۔“ میں نے پھل آواز میں کہا۔ ”لیکن مالک کو کچھ اور ہی منظور تھا.....“

”میں ہر حال میں مالک کے فیصلوں کو قبول کرنا چاہیے۔“ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اسی میں ہماری بھلائی چھپی ہوئی ہے۔“

”بے شک!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”تم فریض ہو جاؤ۔“ وہ اپنا ہاتھ بھرے لہجہ میں بولی۔ ”میں عید کی صبح کے ناشے کا اہتمام کرتی ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر پورا دن یہ عید کا دن سلیمینٹ کریں گے۔“

سچ تو یہ ہے کہ اس دن ماں مجھے بے طرح یاد آ رہی تھیں۔ میں برسوں ان کی جدائی میں تڑپا تھا لیکن ہمارا ملن بہت مختصر اور ناپائیدار ثابت ہوا تھا۔ اس سیرانی نے میری

نفسی کو اور بڑھا دیا تھا خاص طور پر ان کی جدائی کا منظر میرے لیے جگر پاش اور دلدرد تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں جان دی تھی اور میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔

وقت بعض اوقات انسان کو اتنا بے بس اور لاچار کر دیتا ہے کہ وہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی کبھی کو بھی اڑانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی چیز کا نام تقدیر ہے جس کے سامنے انسان کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

وقت کے ہاتھوں میں انسان ایک کھلونے کا مانند ہے۔ اس نے دن کے پہلو میں رات کو بٹھا رکھا ہے اور خوشی کے تعاقب میں غم کو گدھا رکھا ہے۔ پاگل سورج، چاند کی ڈھونڈ

میں نظر آتا ہے اور سویرا شام کو گھٹا پھر جاتا ہے۔ کایا پورا دن میری دلجوئی اور دلدرداری نہیں لگی رہی۔ اس کی ایک ایک اداسے خلوص اور اپنائیت مجھے تسکین تھی۔ وہ اپنی محبت میں اس طرح ٹوٹ کر مجھ پر بری کر میں نہال ہو کر رہ گیا۔

عورت اور مرد کی چاہت میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ عورت کسی ایک مرد کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا کر مطمئن ہو جاتی ہے جبکہ مرد کو ہر عورت اپنی اپنی لگتی ہے اور عورت ہی کو شش کر کے وہ اس عورت کے اندر جتنی محبت کر

وقت

بھی تلاش کر لیتا ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ میں کوالا پور سے بیٹنگ جانے کے لیے ملائیشین انٹرنیشنل کے ہونگ طیارے 777 پر سوار ہوتا ہوں۔

ملائیشین انٹرنیشنل اس فلائٹ MH370 پر میرے علاوہ دوسرے چھ مسافر اور بھی سوار ہیں یعنی MH370 پر مسافروں کی کل تعداد دوسو ستائیس ہے۔ جہاز کے عملے کے بارہ افراد کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو بیٹنگ 777 پر انسانوں کی تعداد دوسو انتالیس ہو جاتی ہے۔ طیارہ اپنے

مقررہ وقت پر لنکا میں بلند ہو کر تاک کی سیدھ میں کوالا پور سے بیٹنگ کی سمت بڑھنے لگتا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد طیارے کا کنٹرول ٹاور سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پائلٹ بھی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ پائلٹ سمیت طیارے کے پورے عملے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، MH370 کسی پراسرار

نہیں قوت کے زیر اثر نا معلوم منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ ان نادر لمحات میں، میرے ذہن میں پٹ پٹ کے گانے ”سکیت اسٹار ٹینڈ“ کی یہ لائسنز روشن ہو جاتی ہیں۔

”لو علی، تو فریض بہت قار داؤس آف تو ملا ٹیشیا۔ تو پاسپورٹس، تھری ٹینڈر ٹو کنٹریز دن ڈے.....“

پٹ پٹ نے دو سال پہلے اس گانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ایک دن دو افراد آسٹریا اور انٹی سے چرائے گئے دو پاسپورٹس کو استعمال کر کے ملائیشین انٹرنیشنل کے طیارے پر سوار ہوں گے۔ ان کے لیے یہ ایک پسندیدہ مکمل ہوگا جو دو ملکوں ملائیشیا اور بنگام کے تین معروف شہروں کے سچ کھلیا جائے گا جس کے نتیجے میں فلائٹ MH370 بھی، کہیں بھی لینڈ نہیں کر سکے گی۔

گانے کے بول اور موجودہ صورت حال نے مجھے حواس باندھ کر دیا تھا۔ میری طرح دوسرے مسافر بھی خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کافی دیر تک اسی غیر یقینی کیفیت میں گرفتار رہنے کے بعد طیارے کو ایک زوردار جھکاؤ اور یوں محسوس ہوا، وہ ایک موحتی ڈگری پر گھوم گیا ہے۔ یہ جھکاؤ اتنا خوف ناک اور دل دہلا دینے والا تھا کہ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔

دن اپنی ڈگری پر طیارے کے گھومنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ واپسی کے سفر کے رخ پر آگیا تھا۔ پھر اس کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ بھی ہو گیا۔ ٹیکسی اعتبار سے ایسا ہونا

ممکن نہیں تھا۔ آٹھ نو سو کو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے بحیرہ واز کوئی ہونگ یکا یک یوٹرن نہیں لے سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ کسی بھی سبب ایسا ہو گیا تھا تو پھر اگلے ہی لمحے طیارے کو کریش ہو جانا چاہیے تھا۔ اس رفتار پر کسی طیارے کا دن اپنی ڈگری پر گھوم جانا، ایک لمحے میں اسے اکثرت ٹکروں میں تقسیم کر دیتا ہے لیکن فلائٹ MH370 کسی پراسرار غیر مرئی قوت کے زیر اثر واپسی کی سمت میں گامزن

تھی اور اس کے اندر موجود دوسو ستالیس انسان بھی محفوظ تھے۔

اصولی طور پر اس واپسی کے نتیجے میں طیارے کو کوالا پور کے انٹرنیٹ پر لینڈ کر لینا چاہیے تھا لیکن اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ، یہ یوٹرنل ہونگ 777 کس انتہائی منزل کی سمت رواں دواں تھا۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد خطرناک کیٹا بٹنگ (Katabatic winds) میں پھنسنے کے بعد طیارے کی رفتار میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی۔ مسافروں نے ایک بار پھر چٹنا چلاتا

شروع کر دیا تھا۔

کسی کی آہ دینا اور دافریا کا طیارے کے ”موڈ“ پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ انتہائی جنوب میں پرواز کرتے ہوئے بہت تیزی سے نیچے آیا۔ یہ منظر اور صورت حال بہت ہی ہولناک اور روٹنے پھرنے کے ذریعے والی تھی۔ ہونگ 777 کی پرواز MH370 ایک زوردار دھماکے کے ساتھ برف کے ایک عظیم الجثہ پہاڑ سے ٹکرانی پھر وہ طیارہ سر کے مل برف کے اندر اس طرح اترتا چلا گیا جیسے مین کے اندر چھری اترتی ہے..... میں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں اس وقت ہٹ کے اندر بیڈروم میں تھا۔ کایا سکڑی سہمی اپنا منہ میری پسلیوں میں گھسائے دھجے سروں میں خراٹے لے رہی تھی۔ جس طرح میں رفتہ رفتہ راس آئی لینڈ کے شدید موسم کا عادی ہوتا جا رہا تھا بالکل ویسے ہی دھیرے دھیرے میری سماعت نے بھی کایا کے خراٹوں کے ساتھ کچھو مان کر لیا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، آٹیس جولا کی صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں بستر چھوڑ کر کچن میں آگیا۔

ان لمحات میں میرا ذہن مسلسل فلائٹ MH370 کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ میں کافی تیار کرتے ہوئے اپنے خواب کے تجزیے میں مصروف ہو گیا۔ میں علم نفسیات کا طالب علم ہوں اس لیے انسانی فطرت، اس کی نفسیات اور خوابوں کا بھی مجھے وسیع علم حاصل ہے۔ انسان کو حالت نیند

میں دکھائی دینے والے اکثر خواب اس کی روزمرہ زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ صرف ایک فیصد سے تین فیصد تک کے خوابوں کو سچا خواب کہا جاسکتا ہے اور ایسے خواب عموماً سچے لوگ ہی دیکھتے ہیں۔ قدرت خواب کی صورت انہیں مختلف معاملات کی بشارت دیتی ہے اور ایسے معاملات کا تعلق زیادہ تر مستقبل قریب کے دور سے ہوتا ہے۔

جن رات ہم نے دھماکوں اور خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز سنی تھی اس سے اگلی صبح میں سے ہٹ کے باہر دیو پیکل گلی میں چوٹی پر کسی طیارے کی دم سے مشابہ کوئی شے دیکھی تھی۔ کایا نے اسے میرا وہم اور نظر کا دھوکا قرار دیا تھا، پھر اسی روز دو پہر میں وحشی جنگلیوں نے مجھے اٹھا کر کسی جہاز کی طرف لے جانے کی کوشش کی مگر اور کایا کی قاتلنگ نے ان کی کوشش کو نام نہاد بنا دیا تھا۔ دور دراز جہاں کایا پٹیل کا گانا "میٹ اٹ اسٹار لینڈ" سن رہی تھی تب ہی ہمارے سچے ملازمین انٹر لائنز کے طیارے کی پراسرار گمشدگی اور پٹیل کی جیش گونیوں پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ساری باتیں میرے ذہن کے کسی گوشے میں جمع ہو کر خواب کی صورت مجھے ایک کہانی کی شکل میں نظر آئیں۔

پاتی جہاں تک پٹیل کی جیش گونیوں کا معاملہ ہے تو اس نے دو سال پہلے مذکورہ گانے میں ناٹم اسکوار، نام کروڑ، جلی، فریڈریک، ملازمین انٹر لائنز، ٹوپا سپورٹس، تھری سٹیز، نوکسٹریز کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ پورا ہوا تھا۔ جب کوئی معاملہ پراسرار انداز میں معما بن جائے تو انسانی ذہن فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے اسباب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ کوشش لاشعوری ہو تو اس کا عکس خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ میرا یہ خواب بھی کسی ایسی ہی لاشعوری سعی کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

کایا بہت اداس اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ آج اس کا کسی چیز میں من نہیں لگ رہا تھا۔ میں بھی سمجھ رہا تھا کہ اسے رائن (ryan) یاد آ رہا ہے۔ بہنوں کے لیے بھائی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے بلکہ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ پھر جس انداز میں رائن کی موت واقع ہوئی تھی وہ دیکھنے کو ڈاکر دینے والا نہیں تھا۔ سیکرٹ سوسائٹی کے انٹرنل سسٹم کی زندگی نے میری طبیعت کمزور کر دی تھی۔ انکل مل سلطان نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور میں نے خود بھی اسٹڈی کیا تھا لیکن ان میں زیادہ تر باتیں مجھے

افسانوی یا پروپیگنڈا لگی تھیں پھر ان لوگوں سے میرا ڈائریکٹ واسطہ پڑ گیا تھا۔ تب مجھے پتا چلا تھا کہ اس سوسائٹی کے ممبرز کتنے با اختیار ہیں اور اب کایا کی زبانی تو تحیر آمیز اور ناقابل یقین باتیں پتا چل رہی تھیں۔ میں نے صدیقی دل سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بھی قیمت پر ان کے برابر بڑا جھگڑ نہیں بنوں گا۔

شام ہوئی تو میں نے کایا سے پوچھا۔ "کہاں تم ہو؟"

"میں تو یہیں پر ہوں، تمہارے پاس!"

"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" میں نے نٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارا دماغ کہیں اور ہے۔"

"بس، میں مجبوری سے جتنی محسوس کر رہی ہوں۔"

وہ ابھین زدہ انداز میں بولی۔ "ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"بس، ایک رات کی بات ہے۔ جو بھی ہوتا ہے، پھر ہو ہی جائے گا اور..... اس ہونے سے تمہارا من ہلکا اور تن شانت ہو جائے گا۔"

"ہاں..... ضرور!" وہ بوجھل آواز میں بولی۔

"واقعی، میں اپنے اعصاب پر بہت دباؤ محسوس کر رہی ہوں۔"

"ایک بات سچ جانتاؤ گی؟"

"تم سے بھوت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"تم نے وہ خاص انٹیمسٹینگ معنی مرتبہ انٹینڈی ہے جس میں ریڈوائن کے اندر انسانی خون کو ملا کر سرو کیا جاتا ہے؟"

"ایک بار بھی نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "اس کا کوئی خاص سبب..... کیا تم ابھی اس مقام پر پہنچ چکی ہو جس کے بعد اس میٹنگ میں مدعو کیا جاتا ہے؟"

"جتنی بات تو یہ کہ سوسائٹی والے فیملیو ممبرز کو اسپورٹس، میڈیکل اور شو بزنس کے مختلف شعبوں میں مصروف رکھتے ہیں خصوصاً میوزک انڈسٹری میں اور..... اس میٹنگ میں عموماً مرد ہی شرکت کرتے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور دوسری بات یہ کہ میں سوسائٹی میں ابھی

وقت

بہت جونیئر ہوں۔ ممکن ہے، میں ابھی اس درجے پر نہ ہوں جو ایسی خفیہ میٹنگ کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر تم پوریت محسوس نہیں کر رہے تو میں جہیں خودی تفصیل بتاتی ہوں....."

"ضرور!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہر تن گوش ہوں۔ تم بولی جاؤ۔"

"ابتدائی ٹریینگ میل اور فی میل کی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔" وہ شروع ہو گئی۔ "یہ سوسائٹی ایک قدیم ترین سوسائٹی ہے۔ ابتدا میں اس کا نام "برادر ہڈ آف ڈیٹھ" تھا پھر یہ صرف "برادر ہڈ" رہ گئی۔ اس کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ کسی ممبر نے آپ کی سفارش کی ہو۔ بعض اوقات تو ایک سے زیادہ ممبرز کی سفارشات کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور....."

"ایک منٹ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بننا چاہتا اور نہ ہی کسی ممبر نے میری سفارش کی ہے پھر یہ لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟"

"اس موضوع کے حوالے سے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔" وہ بڑی رसान سے جواب دیتے ہوئے بولی۔ "ایک وہ جو اپنی خواہش سے سوسائٹی جو ان کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے افراد کے لیے بنیادی شرائط میں چند چیزیں شامل ہیں مثلاً ممبر شپ کا خواہش مند شخص پیدا ر مغز اور زندگی کے..... کسی شے کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہونا چاہیے اور وہ دنیا کے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو یعنی وہ ایک خدا کو ماننے والا ہو۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر اس کے پاس سوسائٹی کے کسی ممبر کی سفارش بھی ہو تو اسے ممبر شپ مل جاتی ہے اور دوسری قسم کے لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں....." لٹانی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ایسے افراد، سوسائٹی جن کو ممبر بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ جن کے اندر سوسائٹی کو کوئی انوکھی اور منفرد خفیہ صلاحیت نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس کا دل جیتنے اور اسے اپنا بنانے کے لیے جتن کرتے رہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے تمہیں چکنیز خان کا حقد یاد دلاتا تھا کہ تم اپنے اندر روشن انتقام کی آگ کو غضب کر سکو۔ تم اگر اپنے طور پر ساری زندگی بھی کوشش کرتے رہتے تو اپنے اس دشمن تہرون تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی سے بولی۔

"ایسے افراد، سوسائٹی جن کو ممبر بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ جن کے اندر سوسائٹی کو کوئی انوکھی اور منفرد خفیہ صلاحیت نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس کا دل جیتنے اور اسے اپنا بنانے کے لیے جتن کرتے رہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے تمہیں چکنیز خان کا حقد یاد دلاتا تھا کہ تم اپنے اندر روشن انتقام کی آگ کو غضب کر سکو۔ تم اگر اپنے طور پر ساری زندگی بھی کوشش کرتے رہتے تو اپنے اس دشمن تہرون تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

"میں نے سنا ہے، اس سوسائٹی کے ممبر ان میں تینتیس ڈگری کو سب سے ہائی سمجھا جاتا ہے۔" میں نے اپنی معلومات سے کایا کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اور ڈیٹھیا کے پاس کون سی ڈگری ہے؟"

"میڈم ڈیٹھیا کے بارے میں تو میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتی۔" وہ بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، یہ درست ہے کہ تینتیس ڈگری کو بہت ہی اہم سمجھا جاتا ہے۔ تھری تھری ڈگری کا مطلب ہے، شرف یافتہ..... اس درجے کی ڈگری عموماً سربراہان مملکت کے

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
 ”ویسے ایک بات ماننا پڑے گی کہ جتنا تمہیں بڑی شدت سے چاہتی ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حتیٰ خیز لہجے میں بولی۔ ”نیوزی لینڈ کی طرح امریکا کا بھی ”ای۔ پاسپورٹ“ ہے۔ اس بائیومیٹرک الیکٹرونک پاسپورٹ کے اندر جو چپ لگی ہوئی ہے اس کے ذریعے پاسپورٹ ہولڈر کو یہ آسانی ٹریک کیا جاسکتا ہے۔ جتنا نے تمہیں میڈم ڈیلعینا سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہارے پاسپورٹ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ جتنا کی محبت کا ثبوت ہے لیکن افسوس کہ اس کی ترکیب بے اثر ثابت ہوئی۔ میڈم ڈیلعینا نے تم دونوں کو چھاپ لیا پھر ایک کو آسٹریلیا میں اور دوسرے کو انٹارکٹیکا میں لاپتہ کیا۔“

”جتنا اور شارو تمہاری طرح میری اچھی دوست ہیں اور میری خاطر وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن افسوس کہ میری یہ دونوں دوست سوسائٹی والوں کی کسٹڈی میں ہیں۔“
 ”زیادہ افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں علی!“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ ”ایک مرتبہ ہم دونوں غائب ہو جائیں پھر ان دونوں کو سوسائٹی کی کسٹڈی سے نکالنے کے لیے ہم سر دھڑکی بازی لگا دیں گے۔“
 مجھے کایا کی حوصلے سے بھری ہوئی جی دارانہ باتیں بہت اچھی لگیں۔ وہ میرے لیے بڑی پرجوش اور پرجزم دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس کی وفاداری اور جاں نثاری پر ذرا ساجھی شک نہیں تھا۔ اس کی بات کے جواب میں، میں نے پوچھ لیا۔

”کیا تم جاوودغیرہ بھی جانتی ہو؟“
 میرے استفسار میں اس قدر مصہوبیت بھری ہوئی تھی کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی اور اضطرابی لہجے میں بولی۔ ”نہیں تو!“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے غائب ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو میں سمجھا۔“

”میرا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں بہت دور چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اسی سلسلے میں، میں تمہیں اپنا پلان بتا رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے، بتاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔“
 ”یہ ساری تفصیل میں تمہیں اس لیے ذہن نشین کروا رہی ہوں کہ کرائسٹ چرچ پہنچنے کے بعد میں چند گھنٹوں کے

کروں گی۔“
 ”تم نہ بھی پوچھو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر دل و جان سے سوسائٹی چھوڑ دی ہے اور یہ میرا حتیٰ فیصلہ ہے۔ جب میں کرائسٹ چرچ کی زمین پر قدم رکھوں گی تو عملہ بھی سوسائٹی کو چھوڑ چکی ہوں گی۔ تم میرا ساتھ دو گے نا؟“
 ”بے شک دوں گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
 ”میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”کرائسٹ چرچ انٹرپورٹ سے ہم الگ الگ ”نیو برائنس“ پہنچیں گے۔ نیو برائنس، ساؤتھ آئی لینڈ کا ایک خوب صورت ساحلی علاقہ ہے۔“
 ”ساؤتھ آئی لینڈ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری الجھن کا سبب سمجھتے ہوئے بولی۔ ”نیوزی لینڈ دراصل دو آئی لینڈز پر مشتمل ہے۔ تاتھ آئی لینڈ اور ساؤتھ آئی لینڈ۔ کیا بھی تمہیں نیوزی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا ہے؟“

”چند سال پہلے میں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا وزٹ کیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن نیوزی لینڈ میں صرف آک لینڈ اور ویلنگٹن تک محدود رہا تھا اور تمہارے بتائے ہوئے ساؤتھ آئی لینڈ کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔“
 ”تم تو اب ایس سٹیزن ہو۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تمہارا پاسپورٹ بھی ساتھ ہے؟“

ابتدا میں کایا کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ الحمد للہ! مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر بہت فخر ہے۔ میری پیدائش کراچی کی ہے لیکن ایک سال کی عمر سے اب تک میرے ساتھ مختلف حالات پیش آتے رہے ہیں۔ جب کایا کے ساتھ میری بے تکلفی بڑھی اور اس نے بتایا کہ وہ سوسائٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو پھر میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اس کے موجودہ سوال کے جواب میں، میں نے اسے جتنا کی کارگزاری سے آگاہ کیا پھر کہا۔

”اب میرے پاس صرف میں ہی ہوں۔“
 نو پاسپورٹ، نو ویزا اینڈ نو گٹ۔“

”اب تمہارے پاس میں بھی ہوں۔“ وہ سرزنش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور اس جتنی جاگتی حقیقت کو بھی بھولنا نہیں روز تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ مجھ گئے نا؟“

میں نے پوچھا۔ ”اس کا کیا مطلب ہوا؟“
 ”میں تین ڈگری تک کی ٹریٹنگ مکمل کر چکی تھی۔ بس، ایک امتحان دینا باقی تھا جس کے بعد میں تھرڈ ڈگری ہولڈر بن جاتی لیکن میں اس امتحان میں ٹل ہو گئی۔“
 لحاظی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”میں تیسری ڈگری حاصل نہ کر سکی جو کہ ”یونیٹریڈ ماسٹر ڈگری“ کہلاتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے تاسف بھری نظر سے کایا کی طرف دیکھا پھر گہری ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا یہ امتحان بہت مشکل تھا؟“

”مشکل نہیں، کڑا تھا۔“ وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اتنا کڑا کہ میں نوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔“

”دو ری سیڈ“ میں یہی سمجھا کہ اس کے امتحان کا رائن سے کوئی تعلق تھا۔ ”تمہاری ناکامی کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔“

”اور اس ناکامی کے ذمے دار تم ہو۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔ ”مگر میں اپنی ناکامی پر بہت خوش ہوں۔“

”کایا! پلیز، پہیلیاں نہیں بچھاؤ۔“ میں نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”میرا ٹائٹل یہ تھا کہ میں اس آئی لینڈ کے اس ہٹ پر تمہارے ساتھ چند دن گزاروں اور تمہارا بہت زیادہ خیال رکھوں اور وہ بھی اس طرح کہ تمہیں میری کسی بات، کسی حرکت پر کوئی شک نہ ہو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر تم قدم قدم پر میری چالوں کو ایکسپوز کرتے چلے گئے اور بالآخر میرے دل کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب میں سوسائٹی کی غدار ہوں، ان کی نظر میں، میں تھرڈ ڈگری کی نہیں، موت کی حق دار ہوں۔“

”اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں میرا کیئر ٹیکر اور مجھ پر نگران مقرر کیا گیا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی تمہیں کسی کو رپورٹ کرتے نہیں دیکھا۔“

”مجھے کرائسٹ چرچ پہنچنے کے بعد اپنے متعلقہ سٹیز ممبر کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ گرتا تھی لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔“ اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ”میں نہیں پوچھوں گا کہ تم ایسا کیوں نہیں

پاس ہوتی ہے اور وہ بھی ایسے طاقتور ممالک کے سربراہ جن میں سوسائٹی کی اپنی دلچسپی ہوتی ہے اور جہاں تک میری ڈگری کا معاملہ ہے تو تم جانتے ہو، میں سوسائٹی سے بغاوت کر چکی ہوں۔ اب میرے پاس نہ تو کوئی ڈگری ہے اور نہ ہی میرا سوسائٹی سے کسی قسم کا کوئی تعلق رہتا ہے۔“
 ”جب تم نے بغاوت نہیں کی تھی۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرید کا مکمل جاری رکھا۔ ”اس وقت تم کسی ڈگری پر فائز نہیں؟“

”دوسری اور تیسری ڈگری کے بیچ میں تھی۔“ اس نے بتایا۔ پہلی ڈگری کو اپر پنس شپ کی ڈگری سمجھو۔ اس دوران میں ممبرز کو سوسائٹی کے تمام قواعد و ضوابط بتائے جاتے ہیں اور اپنے علم و ہنر کو استعمال کرنے کے پر اسرار طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ دوسری ڈگری ”فلڈ کرائسٹ“ کہلاتی ہے۔ یہ انٹرمیڈیٹ ٹائپ کی ڈگری ہے جس میں ممبرز کی برین گرومنگ کی جاتی ہے اور انہیں ایسے علوم کے بارے میں تعارفی معلومات فراہم کی جاتی ہیں جن کے حصول کے بعد انسان، دوسرے انسانوں پر حکمرانی کا ہنر جان جاتا ہے۔ ممبرز کو بتایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے تیسری ڈگری کا امتحان پاس کر لیا تو پھر انہیں یہ علم سکھائے بھی جائیں گے۔ اصل میں ابتدائی ڈگریوں میں تیسری ڈگری بہت اہمیت کی حامل ہوتی، جس طرح دوسری تعلیم میں میٹرک یا او۔ لیول کی کلیدی حیثیت ہے کیونکہ تیسری ڈگری حاصل کرنے کے بعد ممبر سوسائٹی کی خفیہ مینٹکو میں شرکت کا اہل ہو جاتا ہے یعنی سوسائٹی اس پر بھروسہ کر لیتی ہے۔ رائن یا نیچس ڈگری پر تھا لیکن جیسے ہی اس کی وفاداری پر سوسائٹی کو شک ہوا، انہوں نے اسے سزا دے دی۔ سزا دینے کے معاملات میں یہ لوگ دنیا کے طاقتور صدور کو بھی نہیں چھوڑتے۔ ان کے نزدیک جھوٹ، دھوکا اور بے وفائی، ناقابلِ صفائی اور ناقابلِ معافی جرائم ہیں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر کو راکر اس نے ایک بوہل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”سوسائٹی میں ممبر شپ کا عمل ہر سال موسم بہار میں شروع کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی ممبرز کی آپس میں مینٹکو ہفتے میں دو بار جمعرات اور اتوار کو لازمی ہوتی ہیں۔ ممبرز، دوسرے اپنی ممبرز کو پہچاننے کے لیے ہاتھ کے مختلف اشاروں سے مدد لیتے ہیں۔ سوسائٹی کی خفیہ مینٹکو میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے راز رکھا جاتا ہے۔“

”تم دوسری اور تیسری ڈگری کے بیچ میں تھیں۔“

”نہیں!“ کا یا نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔
 ”میری دوست تاجرہ آئی لینڈ شفٹ ہوگئی ہے اور یہ دلا اس
 نے فروخت کرنا ہے۔ اپنی ہاؤس اس وقت دلا خالی پڑا ہے
 اور اس کی ایک چابی میرے پاس ہے۔ چند روز تک ہم
 بحفاظت اس دلا میں قیام کر سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے کسی بھی
 ممبر کو اس دلا کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں ہے۔“
 ”گڈ!“ میں نے پرسوج انداز میں کہا پھر پوچھا۔
 ”کیا تمہاری اس دوست کو معلوم ہے کہ تم کسی سیکرینٹ
 سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہو۔ مطلب..... تم کونسی تھیں؟“
 ”بالکل نہیں!“ وہ پورے یقین سے بولی۔
 میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی
 اور پوچھا۔ ”اگر میں ان پورٹ سے ڈائریکٹ ڈیوری
 (Durey) روڈ چلا کر یا اسٹیٹ ہائی وے چوہتر
 (Sh74) لے کر نئی اسٹریٹ آجاؤں تو اس میں کوئی
 قباحت ہے کیا؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر اس بات
 کی تصدیق کی کہ ”قباحت“ ہے۔ ”میں دراصل، دلا بیچنے تک
 کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی جس سے تمہارے لیے
 مشکلات کمزری ہو جائیں.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے
 ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے
 بولی۔

”آسکر کی رہائش نیو براؤنٹن کے علاقے میں ہے
 لہذا آسکر کے روپ میں تمہیں ان پورٹ سے نکل کر سیدھا
 نیو براؤنٹن کا رخ کرنا چاہیے تاکہ کسی ناویدہ آکھ کو کسی قسم کا
 کوئی شک نہ ہو۔ میں ان پورٹ سے باہر آنے کے بعد مل
 مورٹن (Hillmorton) اسپتال جاؤں گی پھر چند
 ضروری کام نمٹانے کے بعد میں تمہاری طرف آجاؤں گی۔“
 کا یا نے مجھے بتا رکھا تھا کہ وہ کرائسٹ چرچ کے ”مل
 مورٹن“ اسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ یہ اسپتال
 انیکس (Annex) روڈ پر واقع تھا۔

”تم نے اپنے پروفیشن کے حوالے سے تو مجھے تفصیلاً
 آگاہ کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا بتاؤ تو، یہ مردود یعنی
 شخص آسکر کا بیٹا ہے؟“

”آسکر پیٹھ کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر ہے اور
 ریسرچ وغیرہ کے کام کرتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تم اسے
 کیونک چلانے والا ڈاکٹر نہیں سمجھتا.....“

”نہیں سمجھوں گا۔ آگے بولو.....!“
 ”اسکاٹ میں اور اس آئی لینڈ دراصل نیوزی لینڈ

لے تم سے پھر جاؤں گی اور تمہیں اسکے ہی نیو براؤنٹن تک
 جانا ہوگا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے مجھے اپنی پلاننگ سے آگاہ
 کرنے لگی۔ ”کرائسٹ چرچ ان پورٹ سے نیو براؤنٹن کسی
 بھی نیکی یا اوپر کار سے صرف بیس منٹ میں پہنچا جاسکتا ہے
 لیکن تم یہ اٹھارہ انیس کلومیٹر کا فاصلہ بس کے ذریعے طے کرو
 گے تاکہ تمہارا وقت آسانی سے گزر جائے۔ ان پورٹ سے
 لکل کر تم ڈیوری روڈ سے بس چلا لینا جو گھوٹے تھکتے تمہیں
 سوا گھنٹے میں نیو براؤنٹن کے علاقے میں پہنچا دے گی۔ تم
 نے نیو براؤنٹن لائبریری کے اسٹاپ پر اتر کر میرین پریڈ پر
 پیدل ہی جنوب کی سمت سفر شروع کر دینا ہے۔ میرین پریڈ
 کافی کشادہ سڑک ہے۔ تم اس کے کنارے پر مزے سے
 ڈانگ کر سکتے ہو۔“

”مجھے پیدل کتنی دور تک جانا ہوگا؟“ وہ ذرا دیر کے
 لیے رکی تو میں نے پوچھ لیا۔
 ”گھبراؤ نہیں، میں تم سے زیادہ مشقت نہیں کراؤں
 گی۔“ وہ ذریعہ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نیو براؤنٹن سے
 جنوب کی سمت میرین پریڈ پر ساڑھے تین کلومیٹر کا سفر طے
 کریں تو بیٹنی اسٹریٹ (Beatty Street) آجاتی ہے
 اور اگر میرین پریڈ (Marine Parade) کے بجائے
 تم اسٹیٹ ہائی وے چوہتر لگے تو یہ فاصلہ پانچ کلومیٹر تک
 جا پہنچے گا لیکن بہر حال، تمہیں میرین پریڈ ہی کے کنارے
 ڈانگ کرنا ہے۔ موسم خاصا خوشگوار ہوگا۔ یہ نیوزی میں
 ونٹریزن ہے۔ درجہ حرارت پانچ سے دس ڈگری سینٹی گریڈ
 کے بیچ ہوگا۔ تمہیں واک کرنے میں بہت لطف محسوس ہوگا
 اور ویسے بھی میں تمہیں ساڑھے تین کلومیٹر پیدل چلانے
 والی نہیں ہوں۔ نیو براؤنٹن (New Brighton) اور
 بیٹنی اسٹریٹ کے بیچ میں کسی بھی وقت میں تمہیں میرین پریڈ
 سے پک کر لوں گی۔“

”تمہاری باتوں سے یہ لگتا ہے کہ تم نے بیٹنی اسٹریٹ
 کے نزدیک ہی نہیں قیام کا پروگرام بنا رکھا ہے۔“ میں نے
 پرسوج انداز میں کہا۔ ”کیا میرا اندازہ درست ہے؟“
 ”سینٹ پریسینٹ درست ہے۔“ وہ قدرتی لہجہ سے
 مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بیٹنی اسٹریٹ اور میرین پریڈ کے
 سنگم پر میری ایک دوست کا ایک خوب صورت دلا ہے۔ میں
 چند روز وہاں رک کر سکوں سے آگے کا پروگرام ترتیب دینا
 چاہتی ہوں۔“
 ”کیا اس دلا میں تمہاری دوست بھی رہتی ہے؟“
 میں نے ایک اہم سوال کیا۔

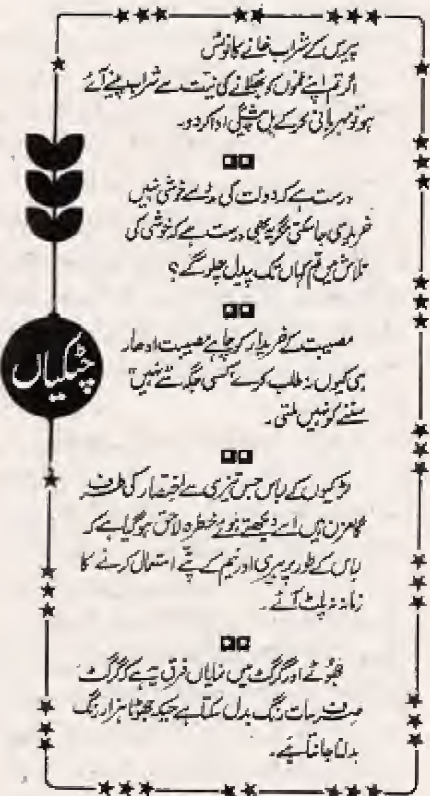
کی ملکیت میں آتا ہے۔ تم اسے نیوزی لینڈ کا ریسرچ سینٹر
 سمجھ لو۔“ اس نے بتایا۔ ”آسکر یعنی تم اپنی کسی ریسرچ کے
 سلسلے میں کرائسٹ چرچ سے اسکاٹ میں آئے تھے اور اب
 وہیں جا رہے ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو.....؟“
 ”مجھے طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے یقین دلانے
 والے انداز میں کہا۔

”تم نے اسکاٹ میں سے کرائسٹ چرچ تک آسکر
 کی بھرپور اداکاری کرنا ہے۔“ وہ میرے چہرے پر نگاہ
 جاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہیں آسکر کے حوالے سے
 ہر قسم کی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ آسکر کے پاسپورٹ
 میں تمہارا سا کام کرنا باقی ہے۔ وہ میں اسکاٹ میں پہنچ کر ہی
 کروں گی کیونکہ اس کا سارا سامان اور وہی ایک کمرے میں
 پڑا ہے۔ مجھے امید ہے، تم اچھی پر فارمنس دو گے۔“
 ”اچھی اور بری پر فارمنس کا فیصلہ تو آنے والا وقت
 ہی کرے گا۔“ میں نے غصے لہجے میں کہا۔ ”میں فی الحال
 انتہائی کمزور ہوں کہ میری کارکردگی سے تمہیں کوئی مایوسی
 نہیں ہوگی۔“
 ”گڈ بوائے.....!“ وہ سانس لیجے میں بولی۔

”تم نے بتایا ہے کہ اسکاٹ میں نیوزی لینڈ کا
 ریسرچ سینٹر ہے جیسا کہ امریکا کا ریسرچ اسٹیشن میکروڈو
 ہے اور یہ دونوں سینٹر ذرا اس آئی لینڈ پر ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”کیا یہ سارے تحقیقاتی پروگرامز انٹارکٹیکا والوں کی مرضی
 سے ہو رہے ہیں؟“

”انٹارکٹیکا والے..... خاصا مسکندہ خیال ہے۔“ وہ
 مسی خیز انداز میں بولی۔ ”انٹارکٹیکا درحقیقت برف کا ایک
 صحرا ہے جہاں پر انسان باقاعدہ آباد نہیں ہیں لہذا یہاں پر
 کوئی گورنمنٹ ٹاؤن کی چیز بھی نہیں پائی جاتی۔ دنیا کے
 سات مہذب ملک اس برف زار کے سگنٹریز
 (Signatories) ہیں جنہوں نے اپنے دستخطوں سے
 ایک ٹریٹی (Treaty) تیار کر رکھا ہے۔ اس معاہدے کی
 رو سے یہ ممالک مشترکہ طور پر براعظم انٹارکٹیکا کے مالک
 ہیں۔ اسی لیے ان ممالک نے یہاں اپنے ریسرچ سینٹر
 قائم کر رکھے ہیں۔ یہ سات ممالک اس طرح سے ہیں.....
 نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، ناروے، فرانس، برطانیہ، چلی اور
 ارجنٹائن۔“

”مگر ان سات ممالک میں امریکا کو تو شامل نہیں
 ہے۔“ میں نے حیرت بھری نظر سے کا یا کی طرف دیکھا۔
 ”جبکہ اس کا سب سے بڑا ریسرچ اسٹیشن میکروڈو اس آئی



لینڈ پر قائم دو اہم ہے۔“
 ”چلی اور ارجنٹائن جنوبی امریکا کے ممالک
 ہیں.....“ اس نے مجھ سے تفریق لینے کی کوشش کی۔
 ”میں ”نیو ایس“ کی بات کر رہا ہوں۔“ میں
 نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”امریکا بہادر کا
 نام تمہارے بتائے ہوئے سات ملکوں کی فہرست میں مجھے
 کہیں نظر نہیں آ رہا.....؟“

”امریکا بہادر تو اس دنیا کا سب سے طاقتور ممالک ہے
 علی!“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے
 بولی۔ ”اس کے آگے بھلا لوں دم مار سکتا ہے۔ وہ اگرچہ اس
 ٹریٹی کا سگنٹری نہیں ہے مگر درحقیقت وہ یہاں کے
 معاملات میں پوری طرح دخل ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ وہ
 انٹارکٹیکا کا دادا ابوبکا ہوا ہے۔ یہ بات تم سے زیادہ اور کون
 جان سکتا ہے۔“

کایا نے اسریکا بھادر کے لیے "گرینڈ پا" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اس کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔
"اگر یہ.....!"

☆☆☆

تیس جولائی کی صبح میں سوکر اٹھا تو کایا بیڈروم میں موجود نہیں تھی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ حوائج ضروریہ کے لیے ہٹ سے باہر گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں، میں نے بھی بستر چھوڑ دیا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اسٹور روم کی طرف سے کھڑ پڑکی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں میں پہلا خیال یہی آیا کہ کایا وہاں کسی کارروائی میں مصروف ہے۔

چنگیز خان کے واصل جنم ہو جانے کے بعد میں نے اسٹور روم کے دروازے پر سے تالا ہٹا دیا تھا۔ میں اسٹور روم میں پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ کایا وہاں موجود تھی۔ میں نے کھٹکھٹا کر اسے متوجہ کیا پھر پوچھا۔
"صبح ہی صبح کیا ہو رہا ہے.....؟"

"تیاری!" اس نے سیاٹ آواز میں جواب دیا۔
"تم نے اپنے مہمان پذیروں کی اچھی خاطر تواضع کی تھی۔ میں بھی اپنے مہمان آسکر کو مایوس نہیں کروں گی۔ سمجھ لو کہ میں اس وقت اس کے ناشتے کے انتظام میں لگی ہوئی ہوں۔"
"گلتا ہے تمہارے اندر کا درندہ بیدار ہو گیا ہے۔"
"کوئی ایسا ویسا بیدار....." وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔ "تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ کارروائی شروع کرنے سے پہلے ہمیں ناشتے سے غمٹنا ہے۔ یہ اس ہٹ پر ہمارا آخری کھانا ہوگا۔"

"اوکے....." میں یہ کہتے ہوئے ہٹ سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں فریش ہو چکا تو ہم دونوں نے مل کر ناشتا کیا۔ اس نے مجھے تھوڑی، آئینہ کی پانچ انچ لمبی ٹکیوں، تیز دھار والی چھری اور ایک مضبوط رسی دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہنس ان چیزوں سے میرا کام چل جائے گا۔"
"تم آسکر کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

میں نے پوچھا۔
"جب کچپوں گی تو تمہیں پتا چل جائے گا.....!"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم جو کچھ بھی کرو گی، میرے سامنے نہیں کرو گی۔" میں نے انہیں زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم اس کارروائی میں میری مدد نہیں لیتا چاہتی

ہو.....؟"

"تمہاری مدد بہت ضروری ہے۔" اس نے بڑی رساں سے کہا۔ "آسکر کو زیر کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ ابتدائی مرحلے پر تم اسے قایم کر کے میرے حوالے کر دو گے۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتی اور تعذیب طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم اپنا کام مجھ سے چھپا کر کرنا چاہتی ہو.....؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" وہ حتی لچے میں بولی۔

ادھر کایا کی بات ختم ہوئی، ادھر ہٹ کے باہر کسی سوئر کے انجن کی آواز ابھری۔ میں نے رست واضح پر نگاہ دوڑائی۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ وہ مخصوص آواز لہجہ بہ لہجہ ہٹ کے قریب آ رہی تھی۔
کایا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "گلتا ہے، میرا شکار آ گیا.....!"

اگلے ہی لمحے کایا کی بات کی تصدیق بھی ہوئی۔ سوئر کے انجن کی وہ آواز ہٹ کے باہر ایک جگہ رک گئی تھی یعنی اب وہ ہتھرتھ سرف میں نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنی سواری کو ایک مقام پر ٹھہرا لیا تھا۔

"کایا....." فضا میں ایک مردانہ آواز بلند ہوئی۔
"تم کہاں ہو کایا..... ہم کافی دنوں سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اگر میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے تو پھر جواب دو۔"
"یہ آسکر ہے۔" کایا نے سرسراہٹ ہوئے لچے میں کہا۔

"تم بیڈروم میں جاؤ۔" میں نے اپنے لباس کے اندر میٹم 44 ریلوادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں، تم باہر نہیں آؤ گی۔"
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے ہٹ سے باہر نکل کر دیکھا۔ سامنے چند گز کے فاصلے پر مجھے اپنی ہی جسامت اور قد قامت کا ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے مخصوص گرم برافانی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جیوی شوز تھے اور آنکھوں پر سوئنگ گگلز ٹاپ کا چشمہ۔ ہڈی نے اس کے آدھے سے زیادہ چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی گرم دستانے دکھائی دیے تھے۔ میں نے سینڈل کے دسویں حصے

وقت

کیمپ میں کایا کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "تم کایا کو باہر پہنچ دو۔"
"کایا سو رہی ہے۔" میں نے غصے سے بولے لچے میں کہا۔ "تم اندر آ جاؤ۔ میں اسے جگاتا ہوں۔"
ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے ہٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

ہٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اسے اندر داخل ہونے کی جگہ دی۔ وہ بے فکر سے آگے بڑھا۔ اب میں اس کی پشت پر تھا۔ میں نے ہٹ کا داخلی دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ جیسے ہی وہ کچن کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچا، میں نے عقب سے اس کی کمر پر ایک طوفانی گنگ بڑا دی۔

وہ مجھ سے کسی ایسے ہنگامی اقدام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ میری گنگ کھا کر وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے کچن کے اسٹود والے سلیب سے ٹکرا کر پھرنش پر جا گرا۔

اس ایک سینکڑی ناقابل فہم صورت حال میں آسکر نے کمال کی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ زمین پر ڈھیر ہونے سے قبل اس نے میکائی انداز میں اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ اپنے لباس میں سے کوئی مہلک ہتھیار نکال کر مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر میں اسے ایسا کوئی موقع فراہم کر دیتا تو پھر مجھ سے زیادہ بے وقوف اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے ہاتھ نے بجلی کی سی سرعت سے حرکت کی اور میں نے اس کے درکنگ شولڈر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ اپنا کونڈا اسے نکلنے والی گولی نے آسکر کے جیکٹ کے اندر گھسے ہوئے ہاتھ کا فیوز اڑا دیا۔ میٹم 44 کے فائر کی رعب دار..... آواز کے ساتھ ہی آسکر کی ورد میں ڈوبی ہوئی گنگ بھی بلند ہوئی۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اس کے کندھے کو چھید ڈالا تھا۔

میں اس کی جیکٹ کے اندر ہی رہ گئی اور وہ خون آلود زخمی بازو کو جھٹکتے ہوئے تیزی سے میری سمت بڑھا اور غراہٹ آمیز لچے میں بولا۔
"ہائٹ.....!"

آسکر کی چار انچ لمبی زبان سے خارج ہونے والی گالی کا جواب میٹم 44 کی چار انچ لمبی نال سے خارج ہونے والی گولیوں نے دیا۔ میں نے اس کے گھٹنوں کا

میں یہ اندازہ لگا لیا کہ اگر میں بھی مکمل طور پر آسکر کے پیناؤں میں آ جاؤں تو اس گیت اپ میں میرے اور آسکر کے بیچ میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔
"کیا بات ہے مسز!" میں نے آسکر کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "تم کون ہو اور کس کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

آسکر نے تھوڑے فاصلے پر وہ آؤٹریج بھی موجود تھی، تھوڑی دیر پہلے ہٹ کے اندر ہم نے جس کے انجن کی آواز سنی تھی۔ آسکر نے گنگ کا انجن آن ہی رہنے دیا تھا جیسے ڈر ہو کر اس برف زار کی ٹھنڈی بجلی جہاز کو رکھ دے گی۔ میں نے آؤٹریج (Auto Sledge) کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ "ٹو بارنگ" سے گاڑیاں اٹھانے والے ٹریلیک پولیس والوں کے کارلٹر (Car Lifter) سے مشابہ تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں برف کو کاٹنے اور ہٹانے والا بیڈ بھی لگا ہوا تھا جو اس وقت اوپر کھڑا ہوا تھا یعنی فی الحال برف کو کاٹنے یا راستے سے ہٹانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آؤٹریج برف پر پھسل کر نہیں بلکہ اپنے "پاؤں" پر چل کر ہمارے ہٹ تک پہنچی تھی اور یہ پاؤں جیوی سفاری نائز تھے۔

"میرا نام آسکر ہے۔" آسکر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "میں اپنی ایک ساتھی کایا کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔ ہم ہم جہاز پر ہیں۔ چند روز پہلے کایا برافانی طوفان میں ہم سے بچھڑ گئی تھی۔ کیا تم نے اسے نہیں دیکھا ہے؟"

میں آسکر کی جانب بھی متوجہ تھا اور اس کے عقب میں موجود آؤٹریج کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اسی برف گاڑی پر سات آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اسکاٹ میں تنگ جانا تھا۔ اس چیدہ بیج کو دیکھ کر گلتا تھا کہ آؤٹو موٹائل سائنس روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

"تم اس لڑکی کی بات تو نہیں کر رہے.....؟" میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کسی بچے کے قد کا اشارہ کرتے ہوئے آسکر سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی....." وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اس پست قامت لڑکی کا نام کایا ہے۔"

"وہ اندر ہٹ میں ہے۔" میں نے آسکر کو نوید مسرت سنائی پھر انہیں زدہ نظر سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اس نے تو بتایا تھا کہ ان کی چار افراد کی ٹیم تھی اور تم تو اکیلے ہی ہو....."
"ہمارے باقی کے دو ساتھی آئیلا اور اولیور ہیں

نشانہ لے کر کے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ اس دھواں دھار فائرنگ نے اس کے کھنٹوں کی ہڈیوں کو چھٹا چور کر دیا۔ وہ مغلظات کہتے ہوئے اوندھے منہ مین کے فرش پر گرا۔ میں نے مزید ایک فائر کیا اور اس کے سلامت کندھے کو بھی ناکارہ کر دیا۔

میں نے بقول کئے، آسکر کے چاروں خانوں کو لولا لنگڑا کر کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ نہ تو اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکتا تھا اور نہ ہی اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل رہا تھا۔ اس کے کندھوں اور ٹانگوں سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ مجھے آسکر کی اس سہمی پر ذرا سامجی ترس نہ آیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ کسی خون آشام بھیڑیے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے اسے اس کے بد حال پر چھوڑا اور کایا کو خوش خبری سنائی۔

”کایا!.....!“ میں نے پے آواز بلند اسے پکارا۔ ”باہر آ جاؤ۔“

اگلے ہی لمحے وہ بیڈروم سے نکل کر کچن میں آگئی۔ ان لمحات میں کایا کے چہرے پر بڑے خوف ناک تاثرات تھے۔ وہ ایک دم بدلی ہوئی کایا نظر آتی تھی۔ میں نے آسکر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پتھر سے بولے لہجے میں کہا۔

”کایا! میں نے تمہارے شکار کو زیر کر دیا۔ اب یہ تمہارے سامنے زبر ہونے کی پوزیشن میں کھڑا ہے۔ تم جیسے چاہو اس کے ساتھ پیش آ سکتی ہو۔“

اس نے بغور آسکر کا جائزہ لیا پھر میری جانب دیکھے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”علی! ام بیڈروم میں جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں، تم باہر نہیں نکلو گے۔“

”اوکے!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی اور بیڈروم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

میں لگ بھگ آدھا گھنٹا بیڈروم کے اندر بند رہا۔ میں کایا کو کچن میں چھوڑ آیا تھا لیکن میرا حسیان مسلسل اسی میں لگا ہوا تھا۔ اگر کسی بھی مرحلے پر اسے میری مدد کی ضرورت پیش آتی تو میں ایک جھپٹتے میں بیڈروم سے کچن میں پہنچ سکتا تھا لیکن ایسی کوئی ہنگامی صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ کایا کے اندر کا درندہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ مجھے وقفے وقفے سے کایا کی غرائشیں اور چٹکتاؤں سنائی دے رہی تھیں اور اس کے جواب میں آسکر کی اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخیں بھی ہٹ کی فضا میں گردش کر رہی تھیں۔ میں کایا سے کہے ہوئے وعدے کا پابند تھا اس لیے میرا گزارہ صرف آڈیو سے ہو رہا تھا۔ میں کچن میں جا کر یہ لائیو شو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

آسکر کا جو کردار رہا تھا اس کے پیش نظر وہ بدترین سلوک کا مستحق تھا۔ چاہے سوسائٹی کے سسٹم کے تحت ہی سہی لیکن اس نے کایا کے بڑے بھائی رائن کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔ میں جب بھی اس واقعے کے بارے میں سوچتا تو میرا جی متلائے لگتا تھا۔ رائن کی موت کا منظر انسانی دردی کی انتہا تھی۔

اچانک کچن کی طرف سے آسکر کی چیخیں بلند ہونا بند ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ کایا نے آسکر کا کام تمام کر دیا ہے اور اب وہ مجھے دعوت گزار دے گی تاکہ میں اس کی کارکردگی کو سراہ سکوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

چند لمحات تک کچن کی جانب خاموشی چھائی رہی پھر ایسی آوازیں ابھرنے لگیں جیسے کڑیوں کے کسی گھڑ کو زمین پر کھینچا جا رہا ہو۔ میں نے پوری توجہ ان آوازوں پر لگا دی۔ پر گزرتے لمحے کے ساتھ مذکورہ آوازیں مجھ سے دور ہو رہی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آوازیں معدوم ہو گئیں۔ ہٹ کے اندر سناٹا چھا گیا تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”یہ اللہ کی بندی اپنے شکار کو کہاں لے گئی ہے.....؟“ ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آئی کہ مجھے باہر جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے لیکن پھر میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ان لمحات میں کایا جن جذباتی منازل سے گزر رہی تھی اس میں ضروری تھا کہ اسے اس کام مکمل کرنے دیا جائے تاکہ اس کے اندر بیدار درندہ حکم سیر ہو کر دوبارہ گہری نیند سو جائے۔ اگر اس درندے کی چپٹ پوجا میں کوئی رخنہ ڈال دیا جاتا تو رد عمل کے طور پر وہ کایا کی نفسیات کے ساتھ کوئی کھلاؤ کر سکتا تھا اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہذا میں چپ چاپ بیڈروم میں بیٹھ کر کایا کی داچکی کا انتظار کرنے لگا۔

چند رہے میں منٹ کے انتظار کے بعد مجھے ہٹ کے اندر کسی کی آمد کی آواز سنائی دی۔ پھر اگلے ہی لمحے بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کایا ہی تھی۔ اس نے دستک کے بعد پے آواز بلند مجھے پکارا۔ ”علی! باہر آ جاؤ۔“

میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ کایا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے گہرا سکون اور اطمینان نظر آیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”تم اسے کہاں چھپک آئی ہو؟“

وقت

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آوازیں بولی۔

”علی! تم پیگٹون کو بہت معصوم سمجھتے ہو۔ آؤ، میں تمہیں دکھاؤں کہ یہ برقیانی جانور کتنے ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ ہٹ سے باہر جانے کے لیے بڑے اعتماد سے قدم اٹھانے لگی۔ میں نے اس کی تھلید میں چلنے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم نے آسکر کو پیگٹون کے سپرد کر دیا ہے؟“ اس نے ایک مرتبہ پھر میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔

”تم نے کہا تھا کہ تم پیگٹون کے ٹیلنٹ کو آزمانا چاہتے ہو۔“ وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے عزم کے ساتھ بولی۔ ”میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ دیکھو، پیگٹونز اپنے ٹیلنٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“

یہ وہی مقام تھا جہاں مرکز شہر روز میں نے نصف درجن پیگٹونز کو مونجہ مستی کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہاں پیگٹونز کی ایک جماعت اپنے کام میں مصروف تھی لیکن اب کی بار ان کی مونجہ مستی کا مرکز دھور آسکر تھا جو عرف کے اوپر چت پڑا تھا اور پیگٹون اس کا تیاپا نچا کرنے میں مصروف تھے۔

میں نیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ عقب میں مجھے کایا کی آواز سنائی دی۔

”ان کے زیادہ نزدیک نہیں جانا۔ اس وقت شاندار دعوت اڑاتے ہوئے یہ بہت وحشی ہو رہے ہیں۔ اگر انہیں ذرا سامجی شبہ ہو گیا کہ تم ان کی خوراک چھیننے کے لیے آئے ہو تو یہ تم پر حملہ کر دیں گے اور میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”اوکے!“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”میں محتاط رہوں گا۔“

”میں ضروری سامان کو آؤٹسٹج پر لوڈ کر رہی ہوں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”جب تم پیگٹون کا تشاؤ دیکھ چکو تو واپس آ جانا۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔“

میں نے ”اوکے“ کہنے پر اکتفا کیا اور محدود فاصلہ رکھ کر پیگٹونز کی کارروائی دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے مجھے سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آسکر کے چاروں خانوں کو کایا نے برقیانی زمین کے ساتھ فکس کر دیا تھا، وہ اس طرح

کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں اسٹیل کی لمبی کلیں بیوست تھیں۔ آسکر کی کھوپڑی میں بھی مجھے بہت ساری اسٹیل کی کلیں بیوست نظر آئیں جو کسی اینٹیٹانک کے مانند اس کی کھوپڑی پر استادہ تھیں۔ آسکر کی دونوں کلائیوں کے نزدیک ہی برقیانی زمین پر مجھے خون بھرا اور پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کایا نے آسکر کو برقیانی زمین پر فکس کرنے سے پہلے اس کی دونوں کلائیوں پر واقع کلیں کاٹ ڈالی تھیں۔ یہ خون وہیں سے خارج ہو کر سفید زمین کو سرخ کر گیا تھا۔

میں زیادہ دیر تک اس خوشحالا وحشت ناک منظر کو نہ دیکھ سکا۔ میرا جی متلائے لگتا تھا۔ پیگٹون کی برہمت بھری حرکات سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصے سے بھوکے پیٹے تھے۔ وہ آسکر کی لاش کو اپنی خطرناک پانچوں کی مدد سے بھجھوڑ رہے تھے۔

پیگٹون کی فطرت اور فطرت کے بارے میں کایا نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔ یہ میری خوش فہمی تھی کہ میں اس برقیانی برندے کو بہت معصوم سمجھتا تھا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جب کسی بھی جاندار کی بقا کا معاملہ درجوش ہو تو وہ خوراک حاصل کرنے کے لیے کسی بھی نوعیت کی وحشت اور جنون کا مظاہرہ کر سکتا ہے لہذا پیگٹون سے کوئی شکوہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”علی! آ جاؤ۔“ کایا کی آواز سہمت سے نکرائی۔ ”ہمارے رخصت ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔“

کایا کے لہجے سے ایک عجیب سی آسودگی نکلتی تھی۔ اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ کافی عرصے سے رائن کی المناک موت کا دکھ اٹھائے جی رہی تھی۔ یہ دکھ کسی خار کے مانند اس کے دل و جگر میں بیوست تھا اور ہر لمحے اسے ایک نئی لذیت سے روشناس کرتا رہتا تھا اور..... اس وقت اس اذیت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا جب اسے آسکر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ آج کایا کے من کا کاغذی نکل گیا تھا۔ اس نے آسکر کو کرب ناک موت دے کر رائن کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب بے باقی کر دیا تھا۔

میں آؤٹسٹج کے پاس پہنچا تو کایا نے کہا۔ ”اوپر آ جاؤ۔ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رہنا چاہیے۔“

”کایا! ابھی ایک کام باقی ہے۔“ میں نے ہٹ کی سمت نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک منٹ روکو۔ میں ابھی آیا۔“

”اب کون سا کام رہ گیا ہے؟“ اس نے الجھن زدہ

لجے میں استفسار کیا۔

”ہوسکتا ہے، بیٹنگن، آسکر کے بچے کچے پارچے کا باربی کیو بنانا چاہتے ہوں۔“ میں نے ہٹ کی قدم بڑھاتے ہوئے سختی خیز انداز میں کہا۔ ”بچن۔“

”مذہب مختلف سالانہ جات تو رکھے ہیں مگر ان معصوم بچوں کو آگ جلانا نہیں آتی۔ تم سچ کے انجیل کو آن رکھو۔ میں بیٹنگن کے لیے ”کوئلے دھکا“ کرا تا ہوں۔“

پھر میں ہٹ کے اندر پہنچا۔ وہاں پر کیرولین آگل کا اچھا خاصا اسٹاک موجود تھا۔ اسٹور روم میں مختلف گنوا اور ان کے ڈنڈز کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ پڑا تھا۔ میں نے ہٹ کے گڑھے گڑھے میں مٹی کا تیل چھڑک دیا پھر ہٹ سے باہر نکل آیا۔ بقول شخصے، میں نے اس ہٹ کو کیرولین آگل سے حاصل دے دیا تھا۔ اب صرف ماچس دکھانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد آگ اس چوٹی ہٹ کو اتنی ہی دھشت اور سفاکی سے نکل جاتی جتنی بے دردی اور بربریت سے بیٹنگن آسکر کی لاش کو نچنے میں مصروف تھے۔

میں نے محدود فاصلے پر جا کر ماچس جلائی پھر اس روشن تیلی کو مٹی کے تیل میں بے ہٹ کی سمت پھینک دیا۔ اگلے ہی لمحے آگ نے پورے ہٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے آٹو بیج پر سوار ہو گیا۔

کابانے سلج کو آگے بڑھا دیا۔ میں نے پلٹ کر نذر آتش ہٹ کو دیکھا۔ آگ نے بڑی تیز رفتاری سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ میں نے ایک نظر اس آئی لینڈ کے برف زار پر ڈالی۔ ٹھنڈی ٹھار برفیلی زمین غضب ناک ہو کر ہم سے پوچھ رہی تھی۔

”تم کس قسم کے لوگ ہو۔۔۔۔۔ اتنے دن سے اپنے بدن جلا کر مجھے پھلالتے رہے ہو اور اب۔۔۔۔۔ آشیانہ جلا کر مجھے ڈر رہے ہو۔۔۔۔۔!“

☆☆☆

ہم سہ پہر تین بجے بخیر و عافیت اسکاٹ میں پہنچ گئے۔

اسکاٹ میں کوہ ایبریس (Mount Erebus) کے نزدیک چٹانوں کے اوپر قائم کیا گیا ہے۔ اس آئی لینڈ کے بعض مقامات خصوصاً اسکاٹ میں اور سیکرڈو پر برفیلی زمین کے بیچوں بیچ چٹانیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں ریسرچ اسٹیشن ایسے ہی چٹانی علاقوں میں بنائے گئے ہیں۔۔۔۔۔ ان مقامات پر عموماً برف زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی

جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ زیر زمین اور زمین کے اوپر واقع لیبارٹریز میں جو سائنسی ریسرچ کی جاتی ہے اس سے کافی مقدار میں توانائی خارج ہوتی ہے جو وہاں کی زمین کے درجہ حرارت کو کسی حد تک بڑھا دیتی ہے۔ دوسرا سبب بالکل قدرتی ہے اور وہ یہ کہ یہ چٹانیں اپنے اندر بھی بہت زیادہ گرما خزن رکھتی ہیں۔

اسکاٹ میں ہر مختلف سائز کے چھوٹے بڑے کمرے اور ہال تعمیر کیے گئے ہیں جن پر ہلکا سبز رنگ کیا گیا ہے۔ چھوٹے کمرے پر ہاتھس کے لیے ہیں اور یہ کینٹینز پر مشتمل ہیں یعنی کینٹینز کو بغور کرا استعمال کیا جا رہا ہے لیکن بڑے ہالز کو باقاعدہ تعمیر کیا گیا ہے اور ان کی چھتوں کو بھی کافی بلند رکھا گیا ہے جیسا کہ چوٹی کینٹینز کی چھتوں کے ہالز ہوتے ہیں۔ ہم اس آئی لینڈ کے جس حصے سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے وہاں کی بہ نسبت اسکاٹ میں کا علاقہ مجھے خاصا روشن اور آباد نظر آیا۔

اس وقت اسکاٹ میں کی فضا کا درجہ حرارت منفی پینتیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا لیکن جب ہم اپنے کمرے (کینٹینز) میں داخل ہوئے تو خاصی خوشگواریت کا احساس ہوا کیونکہ اس کینٹینز کا اندرونی درجہ حرارت روم ٹمبریچر پر سیٹ کیا گیا تھا اور یہ سب بندوبست، انٹیلیجنٹ ہیٹنگ سسٹم کے تحت کیا گیا تھا۔ کایانے مجھے بتایا کہ اسکاٹ میں پر بجلی کی پیداوار کے لیے چوٹی جزیرہ نصیب کیے گئے ہیں۔

”ہمیں کینٹینز میں آئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر کایا کی طرف دیکھا۔ اس نے اطمینان سے گردن ہلاتی اور بولی۔

”شاید کوئی بیج کی چابی لینے آیا ہے۔“

پھر وہ اندر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی واپسی تک میں سش وینج میں جپلا رہا۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ہاتھ باہر نکالا اور بیج کی چابی کسی کو تھما دی۔ جب اس کا ہاتھ اندر آیا تو میں نے اس میں ایک لفافہ دیکھا۔ کایا دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا۔

”دے دی چابی؟“

”ہاں۔“ اس نے آشیانہ میں سر ہلایا اور لفافے کو کھولتے ہوئے بولی۔ ”اگر سچ کھلی فضا میں کھڑی رہتی تو پھر اس کا انجن برفیلے موسم کے باعث سیز ہو جاتا۔ اسٹاف کا ایک آدمی اسے گرم گیراج میں پاک کر دے گا۔“

”اس پیچے میں کیا لکھا ہے؟“ میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے مذکورہ لفافہ کھول لیا تھا۔

”کچھ اہم اطلاعات ہیں۔“ اس نے سرسری انداز میں بتایا۔

میں پوچھے ”تاہمیں رو سکا۔“ ”کیسی اطلاعات؟“

”پریشانی والی کوئی بات نہیں ملی۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”ہمیں بتایا گیا ہے کہ واپسی کے سفر کے لیے ہمارا طیارہ بدل گیا ہے۔“

”مطلب۔۔۔۔۔ ہم یونٹ 17 - C نہیں نہیں جا رہے؟“

”ہاں، اس کا بھی مطلب ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”گلوب ماسٹر 17-C میں کوئی تکنیکی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ اگلے دو دن تک پرواز کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”تو کیا ہمیں مزید دو دن تک اسکاٹ میں پر قیام کرنا ہوگا؟“ میرے لہجے میں الجھن عیاں تھی۔

”نہیں؟“ وہ بڑی رمان سے بولی۔ ”ہمارے لیے متبادل طیارے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کل صبح چھ بجے ایک یونٹ طیارہ 757 میکرو ڈاسٹیشن سے کراٹ چرچ کے لیے پرواز کرے گا۔ ہمیں ٹھیک پانچ بجے سیکرڈو پہنچنا ہوگا۔ اسٹاف نے ہمارے لیے ایک سینٹری ٹینڈر چپ کا انتظام کر دیا ہے جو ہمیں یہاں سے سیکرڈو لے جائے گی۔“

”گڈ۔۔۔۔۔!“ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی۔

”اسٹاف کا ایک آدمی تھوڑی دیر میں ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان دینے آئے گا جو ہمارے لیے، ڈنڈ اور بریک فاسٹ کے لیے کافی ہوگا۔“ کایانے بتایا۔ ”جب دروازے پر دستک ہو تو تم جا کر اس سے وہ سامان لے لینا

چونکہ اس کینٹینز میں ہمارا قیام بالکل نارمل نظر آئے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بندہ تم سے کوئی سوال جواب نہیں کرے گا اور پھر اس کے بعد کل صبح تک اور کوئی نہیں آئے گا۔ ہمیں یہ تمام وقت اسی کینٹینز کے اندر گزارنا ہوگا۔ تم چاہو تو چند گھنٹے کی نیند لے لینا۔ مجھے تو بہت سا کام کرنا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے کینٹینز کے اندر رکتے ہوئے سامان میں سے ایک سفری بیگ اٹھالیا۔ یہ وہ بیگ نہیں تھا جس کے ساتھ وہ میرے پاس ہٹ میں آئی تھی۔ وہ

سینٹ

ایک درخت کے نیچے پانچ لڑکے بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی وہاں سے گزرا۔ اس نے کہا۔ ”بتاؤ تم میں سے کون سب سے زیادہ ست ہے؟ میں اسے انعام دوں گا۔“ اس پر تمام لڑکوں نے ہاتھ اٹھا لیا مگر ایک نے نہیں اٹھا یا۔ اس آدمی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ہی سب سے زیادہ ست ہو۔ یہ تو تمہارا انعام پانچ روپے۔“

اس پر لڑکے نے کہا۔ ”اگر اوکرم آگے بڑھ کر میری جیب میں ڈال دیں۔“

ڈبل روٹی

”کامپ۔“ تمہاری ٹیکری کی ڈبل روٹی بہت خراب ہوتی ہے۔“

”کادار۔“ میں اس وقت سے ڈبل روٹی بنا رہا ہوں جب آپ پیدا ہوئی تھی۔“

”کامپ۔“ ٹھیک ہے، مگر خیال کرو بھائی اس وقت کی ڈبل روٹی اب ہمیں ٹوٹ نکپو۔“

گانے

ایک دن ملازمین الدین چند دوستوں کے ساتھ جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک گانے کی آواز آئی۔ ملاجی کے دوستوں نے انہیں پھینرتے ہوئے پوچھا۔

”ملاجی ایسا گانے آپ سے کیا کہہ رہی ہے؟“

ملاجی نے جواب دیا۔ ”یہ کہہ رہی ہے کہ آپ کن گدھوں کے ساتھ پھر رہے ہیں۔“

مرسلہ۔ راحیلہ شفیق، نیکرانی

خیالات

ایڈیٹر، رائٹر سے۔ ”کیا یہ وہی کہانی ہے جسے ایک سال پہلے میں نے ناقابل اشاعت قرار دیا تھا؟“

رائٹر۔ ”جی ہاں۔“

ایڈیٹر۔ ”تو پھر آپ اسے دوبارہ کیوں لے آئے؟“

رائٹر۔ ”یہ سوچ کر لے آیا ہوں کہ شاید اب آپ کے خیالات بدل گئے ہوں۔“

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

کینٹینر اندر سے ایک سٹنگ کم بیڈروم کی لک دیتا تھا۔ اس میں سونے کے لیے دوسلپٹنگ بنگلے کے علاوہ نیکل چیئرز کا بھی بندوبست تھا اور سامان وغیرہ رکھنے کے لیے کینٹینر کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیٹ بھی بنے ہوئے تھے۔

”اگر تمہیں جاگ کر کوئی کام کرنا ہے تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ میں نے حتیٰ لچھے میں کہا۔

”ذرا پتا چلے کہ مجھے سلا کر تم کون سا ضروری کام کرنے والی ہو۔“

کاپا نے بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھا لیکن میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان لمحات میں وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ ادھر ہٹ کے اندر اور باہر اس نے آسکر کے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ سب ان واقعات کا اثر ہے۔ میں نے اس کی سنجیدگی کو تو ذکر اس کے اعصاب کو سکون پہنچانے کا فیصلہ کر لیا اور قریب جا کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

وہ ذرا سا کسمکسا ہی تاہم اس نے میری کارروائی کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ سچ بتانے سے اس خوشگوار حرارت والے ماحول میں بچنے کی بجائے ایک متناہی کرنٹ دوڑنے لگا تھا جس نے رگوں میں خون کی گردش کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا، نتیجتاً جذبات بھی متناہی پر اتر آئے تھے۔ ان حالات میں انسان کی نیت کو پھسلنے میں دیر نہیں لگتی۔

چند لمحات اسی کیف آؤر اور نشاط انگیز کیفیت میں گزر گئے پھر اس نے مجھے خود سے الگ کرنے کے لیے زور لگایا تو میں نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے انھیں زدہ انداز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے کیا۔ تم مجھے کچھ ڈسٹرب نظر آ رہی ہو؟“

”یہ کام کا پریشر ہے۔“ وہ دوبارہ ہج کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم پریشان نہیں ہو۔ جیسے ہی کام ختم ہوگا، میں ریٹیکس ہو جاؤں گی۔“

”ایسا کون سا کام ہے جس نے تمہارے حواس اور اعصاب کو اپنی لٹکی میں جکڑ رکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے آسکر کے بلیک پاسپورٹ پر تھوڑا سا ٹیکنیکل کام کرنا ہے تاکہ کسی بھی مرحلے پر تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی اور ہیک کے اندر سے ایک جدید لیپ ٹاپ اور دیگر ٹیکنیکل سامان نکال کر نیکل پر جانے لگی۔ ”میں جب تک یہ کام مکمل نہیں کر لوں گی، مجھے

اطمینان حاصل نہیں ہوگا۔“ کاپا کی وضاحت کے بعد میں چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔

اس نے لیپ ٹاپ کو آن کر لیا پھر دوسرے سامان کو سیٹ کرنے لگی۔ اس ٹیکنیکل سامان میں ایک ڈیجیٹل کیمرا، اسکاچ ٹیپ کے ہولڈر کی شکل کی دو ڈیوائس، مختلف سائز اور رنگ کے پٹی کے تار اور کپیرڈ کینٹیلو، بیجی، کنز اور ای نوعیت کی اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ جب وہ ان اشیاء کو آپس میں منسلک کرنے میں مصروف تھی تو میں نے اس کی کارروائی کو گہری توجہ سے ملاحظہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”تھوڑی دیر پہلے جو بندہ سچ کی چابی لینے اور تمہیں لفاظی دینے آیا تھا اس کے لیے تم نے ”اسٹاف“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ کیا اس سے تمہاری مراد اسکاٹ میں کا ریسرچ اسٹاف ہے؟“

”جب ہم اسکاٹ میں کے ایک کینٹینر میں قیام پذیر ہیں تو ظاہر ہے، وہ بندہ اسی میں کا اسٹاف ہوا!“ وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بولی اور بتانے لگی۔ ”اس آئی لینڈ کی کل آبادی انہی ریسرچ کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ یہاں پر غیر متعلقہ افراد مستقل قیام نہیں کرتے کیونکہ اتنے شدید موسم میں زیادہ دنوں تک زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ ہم چوکی کے لیے ادھر کا رخ کرنے والے افراد کو وہ سہولیات میسر نہیں ہوتیں جو ریسرچ اسٹیشن کے اسٹاف کو حاصل ہوتی ہیں۔ پھر بھی۔۔۔۔۔۔“ لفظی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”موسم سرما اور موسم گرما میں ان ریسرچ اسٹیشن پر اسٹاف کی تعداد میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ انٹارکٹیکا کی موسم گرما کی کل آبادی پانچ ہزار نفوس اور موسم سرما کی ایک ہزار نفوس ہے۔ صرف اس آئی لینڈ کی بات کریں تو موسم گرما ایک ہزار اور موسم سرما ڈیڑھ سو۔ اگر صرف میگر ڈوکو دیکھیں تو سمریزن میں نو سو افراد اور وینر سیزن میں ایک سو افراد جبکہ اسکاٹ میں ہر سمریزن میں نوے افراد اور وینر سیزن میں پچاس افراد موجود ہیں۔ اگر ہمیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد بارہ ہو جائے گی۔“

”کیا تمہارا اور آسکر کا شمار بھی اسکاٹ میں کے اسٹاف میں ہوتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ قطعیت سے بولی۔

”پھر یہ لوگ تمہیں ایسا پر دو ٹوکوں کیوں دے رہے ہیں؟“

”اس وقت ہمارے لیے یہاں کے اسٹاف کی

حیثیت سہولت کا رجحان ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ہمارا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

آخری جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میں واقفیدہا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈیجیٹل کیمرے سے میری دو تین تصاویر بنائیں پھر دوبارہ لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہوئی۔ میں نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتا تھا ہوں کہ جب یہاں کے اسٹاف کا تم۔۔۔ لوگوں سے ڈائریکٹ کوئی تعلق نہیں تو پھر یہ سہولت کاری میں کیوں لگے ہوئے ہیں؟“

”ایسا کرنے کے لیے ان کے بڑوں نے انہیں حکم دے رکھا ہے۔“ کاپا نے اس کی میری جانب کھسکاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور ان کے بڑوں کو سوسائٹی کی جانب سے احکامات دیے گئے ہیں۔ تم اپنے دونوں ہاتھ اسٹیشن پر رکھ دو۔“

میں نے کسی معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد جدید ترین اسکیئر کی مدد سے میرا مکمل بائو میٹرنگ کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور اسکیٹنگ ڈیوائس کو استعمال کر کے میری آنکھ کے ریشٹنا (Retina) کو کچھ کیا پھر اس کے رزلٹ کو اپنے لیپ ٹاپ میں منتقل کر دیا۔

”جس طرح ڈپلومیٹ پاسپورٹ ہولڈرز کو امیگریشن پروسس سے نہیں گزرنا پڑتا بالکل ویسے ہی کراٹھ جیج کے انٹرویوٹ پر ہمیں بہت سی ٹھکر جاتی سہولیات حاصل ہوں گی۔“ وہ آسکر کے پاسپورٹ کو کھولتے ہوئے بولی۔

”لیکن میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں وہ فقط باقاعدہ طور پر ہے تاکہ تم ہرز اوے سے آسکر بن جاؤ۔“

”اگر میں آسکر بن گیا تو پھر کہیں تم میرے ساتھ بھی وہ سلوک تو نہیں کرو گی؟“ میں نے اسے چیخنے کی غرض سے کہا۔

”بہنی مذاق بعد میں علی!“ وہ منہ پرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”پہلے ضروری کام۔۔۔۔۔“

اس کے بعد میں نے کاپا کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموش بیٹھا اس کی کارروائی کو دیکھتا رہا۔ اس نے آسکر کا مائی نیوزی لینڈر بلیک پاسپورٹ کھول رکھا تھا۔ اس پاسپورٹ کے صفحات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی ضخامت کی وجہ سے اسے مائی (Mighty) کہا جاتا ہے۔ کاپا نے آسکر کے پاسپورٹ کا مین پیج اسکرین کیا پھر اسے لیپ ٹاپ میں منتقل کرنے کے بعد وہ اسے ایڈٹ

کرتے لگی۔

سب سے پہلے اس نے میری تصویر کے ہیک گراؤنڈ کو دبائے کیا پھر اسے بیٹا لیس ضرب بیٹنٹس کی میٹر کے سائز میں کاٹ کر آسکر کی تصویر کے اوپر پیسٹ کر دیا۔ اس کے بعد وہ سیکورٹی نیچرز والے بیٹونی فونو کے ساتھ کھاتی رہی۔ آخر میں اس نے مائیکرو چپ کے ساتھ تھوڑی سی چیئر چھانڈی کی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر کر رہی تھی۔ جب اس کا کام مکمل ہوا تو وہ پھر غور آن کرتے ہوئے بولی۔

”میرے پاس کچھ ایسی آپٹیکل شیئر اور سافٹ ویئر ہیں جن کی مدد سے میں نے تمہیں آسکر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ آپٹیکل شیئر اور سافٹ ویئر عارضی طور پر ہمارا مسئلہ حل کر دیں گے۔ مجھے آسکر کے پاسپورٹ پر تمہارا فونو تبدیل کرنا ہے۔ سیکورٹی نیچرز کو آپٹکس لٹ کرنا ہے۔ وہ ایسا اور فنگر پرنٹس کو بدلنا ہے۔ باقی سب کچھ وہی رہے گا جو پاسپورٹ پر درج ہے اور ان مندرجات کو تم ابھی طرح یاد کر لو گے۔“

اس کے بعد اس نے پرنٹ میں سے ایک پرائیمریٹ جلی نما پرنٹ لیا جس پر میری تصویر اور سیکورٹی نیچرز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے مذکورہ پرنٹ کو نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ایک پیپر پر رکھ دیا۔ پھر اس نے آسکر کے پاسپورٹ کے مین پیج پر کوئی امپرے کرنے کے بعد اس ٹرائیمریٹ پرنٹ آؤٹ کو اس طرح پیسٹ کر دیا کہ آسکر کے فونو پر میرا فونو اور اس کے سیکورٹی نیچرز پر میرے سیکورٹی نیچرز بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اس نے میٹنگ رن کی مدد سے اس پیج کی کوٹنگ کو نرم کیلا پیردو بارہا امپرے کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے سارا سامان سمیٹا اور پاسپورٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولی۔ ”لوہہ لنگھو۔۔۔۔۔“

میں نے دیکھا۔ کاپا نے بڑی مہارت اور نفاست کے ساتھ اس پاسپورٹ پر بڑا امین کام کیا تھا۔ بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس پیج کے ساتھ کوئی چیئر جھاڑ کی گئی ہے۔ اس اور لیپ پیٹنگ سے صرف فونو اور سیکورٹی نیچرز تبدیل ہوئے تھے۔ باقی تمام مندرجات ویسے کے ویسے ہی تھے حتیٰ کہ مشین ریڈیبل زون کو بھی جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔ اب یہ میرا پاسپورٹ تھا جس کے مطابق میرا نام آسکر براؤنگ تھا۔ براؤنگ میرا سرنام تھا اور اس کے مطابق اس وقت میں تیس سال کا تھا۔

میں نے سنا ہی نظر سے کاپا کی طرف دیکھا اور کہا۔

خارزار

محمد الیاس

بعض اوقات گھر کو آگ لگتی ہے گھر کے چراغ سے۔ وہ دیار غیر میں اپنوں سے دور اپنوں کے تصور اور محبت میں ڈوبا زندگی گزار رہا ہے اور جب اپنی مٹی کی خوشبو اسے دور سے کھینچ کر لاتی تو اپنوں کا اپنا پن ناپ تولی میں پڑ کر خون کی رنگت ہی بدل گیا اور اس ... بدلاؤ پر اپنوں پرانے سب حیران رہ گئے۔

ایک دل برداشتہ معشر بی حسیت کی ایساں
پر پختگی کا دلچسپ انداز

مطابق عمایا اور حجاب سے اپنے بدن اور چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ ان کے دل جوش اور جذبے سے لبریز ہو گئے۔ تینوں ... یعنی بیوی اپنے شوہر اور بیٹیاں اپنے باپ کے آبا کی وطن کی زمین پر چل رہی تھیں، جس کے بارے میں طارق محمود

جہاز سے اتر کر طارق محمود اس کی بیوی، ماضی کی کیترن اور حال کی آمنہ ان کی آٹھ سالہ بیٹی آنکھ اور دس سالہ حسنہ نے اپنے خوابوں کی سرزمین پر بسم اللہ پڑھ کر قدم رکھے اور کھڑے شکر ادا کیا۔ ماں بیٹیوں نے عین شریعت کے

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس اسٹیشن کے اندرونی حصوں کی سیر کرتا۔ ہم جس جیب میں میکر ڈوپینچے تھے اس نے ہمیں بونگ 757 کے نزدیک لاکری چھوڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام کارروائی بخیر و خوبی منٹ مکی اور ہم جہاز کے اندر سیٹل ہو گئے۔ ٹھیک چھ بجے بونگ طیارے نے انٹارکٹیکا کی ٹھنڈی ٹھار دھند آلود فضا میں اڑا ان بھری اور آٹھ گھنٹے کی نان اسٹاپ فلائٹ کے بعد ہم پٹنگون کی ٹھری سے نکل کر کیوی کے دیس میں پہنچ گئے۔

موسم سرما میں اس آئی لینڈ اور نیوزی لینڈ کا مقامی وقت ایک جیسا ہے لہذا اگر اسٹ چرچ پہنچ کر مجھے اپنی ٹھری کا ٹائم سیٹ نہیں کرنا پڑا۔ بونگ طیارے نے دوپہر میں کرائسٹ چرچ ائر پورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ میں اور کیا جہاز سے باہر نکلے ہی الگ ہو گئے تھے۔ ائر پورٹ سے نکلنے کے لیے مجھے صرف ایک کاؤنٹر کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اپنا پاسپورٹ آفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

”ڈاکٹر آسکر! آپ اس آئی لینڈ سے آ رہے ہیں؟“ آفیسر نے اپنے نسٹم کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”جی!“ وہ بد دستور چند لمحات تک اپنے نسٹم سے کھیل رہا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستغرق ہوا۔ ”آپ کا پرز آف وزٹ کیا تھا؟“

”بزنس ٹرانزیکٹ“ میں نے ٹھوس لہجے میں بتایا۔ ”ایڈیشنل ریسرچ ڈیڑھ سلاٹ میں، رائس آئی لینڈ۔“ میں نے ”بزنس ٹرانزیکٹ“ کی غرض اس لیے استعمال کی تھی کہ اس موضوع پر میں پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔

آفیسر نے اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلائی اور ”انٹری“ کی اسٹیمپ کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اسی لمحے آفیسر کے پاس رکے ہوئے نوٹ کی صفحہ پانچ تھی۔ اس نے کال انٹینڈ کی۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ خشک بھری نظر سے مجھ دیکھنے لگا۔

میں کا ایک سناٹے میں آ گیا.....!

امینگوں حوصلوں اور آغوں کے بیچ رلائی۔ کہیں جھپٹوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات آجے ماہ ملاحظہ کریں

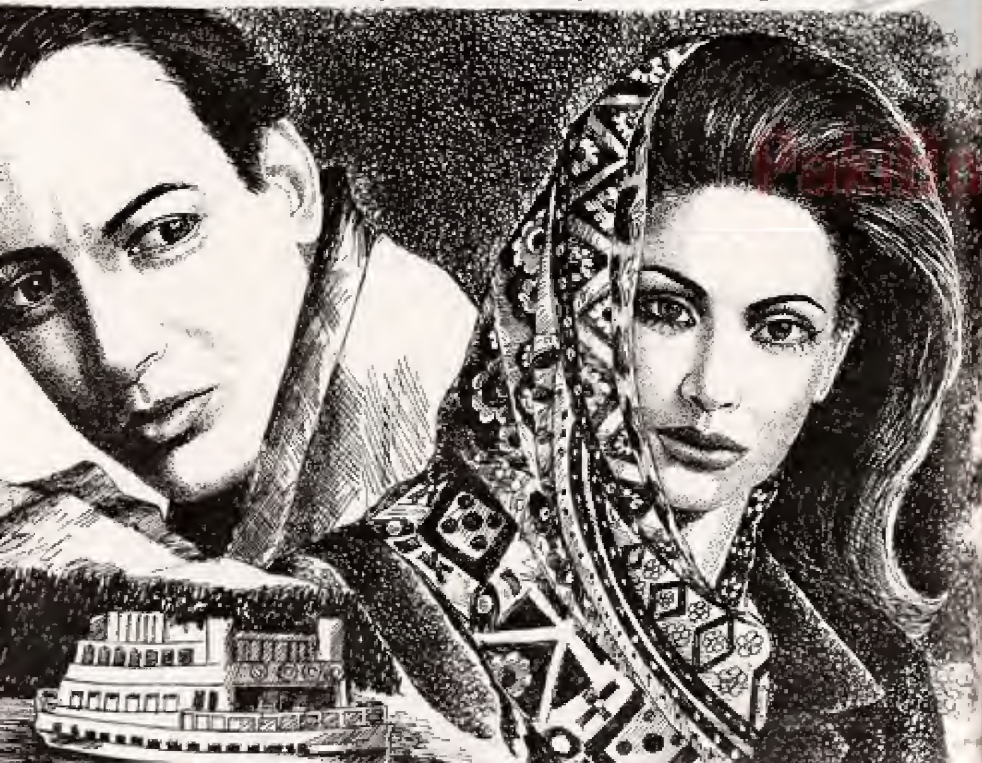
”تم تو کافی کارنگر ہو.....!“ ”میرے پاس ایسی ٹیکنیکس تھیں کہ جنہیں استعمال کر کے میں نے اس پاسپورٹ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ تم ... یہ آسانی ائر پورٹ کر اس کر لو گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”فی الحال اس سے زیادہ کی تمہیں ضرورت بھی نہیں۔ تم نیوزی لینڈ کے ایک معزز ڈاکٹر ہو اور اپنے وطن واپس لوٹ رہے ہو لہذا اگر وہ ریٹائی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا.....؟“

”سمجھ گیا۔“ میں نے بڑے اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”ابھی کوئی نہیں؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے ٹکی میں گردن ہلا دی۔ اگلی صبح لگ بھگ ساڑھے چار بجے ایک سینٹرل ہیڈڈ جیب میں لیے آ گئی۔ اس رات ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہیں لگائی تھی اور یہی طے ہوا تھا کہ نیند کا سارا کونا بونگ 757 کی آرام دہ سیٹوں پر پورا کیا جائے گا۔ اس خوش آمد نیاں کے ساتھ وہ رات ہم جاگتی آنکھوں سے ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ طلوع و فروب کا یہ عمل ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر باریا اور پہلے سے زیادہ پر لطف محسوس ہوتا ہے۔

اسکاٹ میں سے میکر ڈولگ بھگ تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جیب کے ذریعے یہ مسافت ہم نے سات منٹ میں طے کی۔ اسکاٹ میں اور میکر ڈولگ اسٹیشن کے درمیان آمدورفت کے لیے برف کی سخت سطح کے اوپر باقاعدہ ایک سڑک سی بنائی گئی ہے جس کی دونوں جانب مضبوط آہنی ریلنگ بھی لگائی گئی ہے۔ ہم نے سٹیجے اندر میرے میں یہ سفر طے کیا لیکن جیسے ہی ہم میکر ڈوپینچے وہاں ہمیں اچھی خاصی رونق دیکھنے کو ملی۔

یہ اسکاٹ میں کی بہ نسبت کافی بڑا ریسرچ سینٹر تھا اور خاصے بڑے رستے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس وسیع و عریض ریسرچ اسٹیشن کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس خطے میں کوئی عظیم الشان تعمیراتی منصوبہ شروع ہے اور اس ہائڈرو سبب کیٹ (Cat) کمپنی کی مصنوعات تھیں۔ کیٹ یعنی کٹر پلر (Caterpillar) کمپنی کی بیوی مشینری میکر ڈولگ ریسرچ اسٹیشن پر بڑی دریاوی سے استعمال ہو رہی تھی۔ اس اسٹیشن پر چاروں جانب ہر سڑک کے کناروں پر بجلی کے کھمبے بھی استادہ دکھائی دیے۔ مطلب، امریکا کے سب سے بڑے ریسرچ سینٹر پر توانائی کا کوئی بحران نہیں تھا۔



کی زبانی اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ یہاں آکر اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایمان کی روشنی میں یہ باور کر لیا تھا کہ پاک سرزمین پر ہی وہ صحیح معنوں میں دین میں پر عمل پیرا رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے لاؤنج اور باہر پارکنگ میں مقامی خواتین میں سے بیشتر کو جدید لباس پہننے دیکھ کر ماں بیٹیوں کو حیرت ہوئی۔ آنکھ نے ایسے لباس پہننے دیکھ کر ماں کہ ہماری ان مسلم بہنوں کو کسی نے کیوں نہیں بتایا کہ عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم ہے۔ بچی کو روک روک قطعی آئینہ جواب دینے کے بجائے، طارق محمود تاویلیں جوش کرنے لگا کہ کس طرح بعض لوگ نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ اسلامی ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی شریعت پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ یہ ان کی بد قسمتی ہے اور سچے مومن کا بھائی امتحان ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں بھی دامن بچا کر چلے۔ جیسے آپ کی والدہ، مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد پوری کی پوری دین حق میں داخل ہوئیں، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ جس کا باطن منور ہو جائے، اُس کو تاریکی میں بھی راستہ بھانپ کر دینے لگتا ہے اور خارزار سے دامن بچا کر نفلے میں دشواری نہیں ہوتی۔ آپ دونوں بہنوں نے زندگی بھر اپنی والدہ محترمہ کے کردار عمل کی پیروی کرتی ہے۔

پندرہ برس پہلے یا بار غیر میں طارق محمود اور کیتھرین کی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ طارق کی مہذب گفتگو، شرافت اور کردار کی مضبوطی نے کیتھرین کو بہت متاثر کیا۔ وہ ان دنوں نہیں چوبیس سالہ انتہائی پرکشش اور بھرپور جوان لڑکی تھی، طارق سے عمر میں صرف ایک ڈیڑھ سال چھوٹی۔ اس عام سے قول صورت مرو کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ ہر قیمت پر شریک حیات بننے کی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔ اس کے ہم وطن دوستوں اور خصوصاً والدین نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ ماں نے سوال کیا کہ اُسے ایک غیر مذہب ایشیائی میں ایسی کون سی خوبی نظر آگئی۔ ایک عام سے تارک وطن کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑنا دردست نہیں۔ کیتھرین نے ماں سے کہا تھا کہ اس نے طارق کی آنکھوں میں جو حیا دیکھی ہے، وہ آج تک کسی مرد میں نظر نہیں آئی اور انسان کی آنکھیں ایسا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں اس کے باطن کا صحیح عکس دکھائی دے جاتا ہے۔

طارق نے کیتھرین کو مزید چند بیٹیوں کی مہلت دے دی اور اُس کو مشورہ دیا کہ وہ اس عمر سے ماں کی طرح سوچ لے۔

مذہب تبدیل کرنے کے ساتھ ہی خود کو کسر بد لانا پڑے گا، جو اتنا آسان نہیں ہوتا۔ شریعت، حدیث، سیرت اور اللہ کی کتاب کے ساتھ انگریزی تراجم پر مشتمل کل چار کتب بھی مطالعے کے لیے دیں، جو اُس نے بعد شوق گھر یہ گئے ساتھ قبول کر لیں اور بغور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔

پہلی ملاقات کے ٹھیک دس مہینے اور تیرہ دن کے بعد کیتھرین نے نئے مذہب اور نئے نام کی شناخت سے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق کٹ کر لیا۔ اس نے طارق کے تجویز کردہ مختلف اسلامی ناموں میں سے اپنے لیے ”آمنہ“ ہی پسند کیا تھا۔ آمنہ نے پوری نیک نیتی سے دین اسلام کو قبول کیا اور پوری کی پوری اس میں ڈھل گئی۔ عربی صرف اتنی ہی سیکھ سکی کہ کٹے، نماز اور چند آیات خوب یاد کر لیں۔ البتہ مذہب کا مطالعہ انگریزی کتب کے ذریعے بدستور ذوق و شوق سے کرتی رہی۔ نکاح سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دی اور صحیح معنوں میں خانقاہی خانہ بن کر رہ گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس قابل ہوئی کہ روزمرہ کی گفتگو شوہر کی مادری زبان اردو میں کرنے لگی۔ پہلی اور پھر دوسری بچی پیدا ہوئی۔ دونوں کی تربیت مین اسلامی تقاضوں کے مطابق کی۔

میاں بیوی نے خوب غور و خوض کے بعد باہمی مشاورت سے فیصلہ کر لیا کہ بیٹیوں کو شہور کی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اس مادر پدر آزاد معاشرے سے نکال لیا جائے۔ وہاں، جہاں شرم و حیا کے تقاضوں کو کوئی خاطر رکھنے کا جتن ہے تاکہ ان کو آنکھ کی زندگی، شریعت کے تابع رہ کر گزارنے کے لیے سازگار ماحول مہیا آسکے۔

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں طارق محمود چند ایک باری مختصر عرصے کے لیے وطن آسکا تھا۔ تاہم بیرون ملک سے بیٹی ہوئی رقوم کے عوض، دونوں بڑے بھائیوں نے آبا کی شہر کے چھوٹے پڑاویں ایک کنال کے پلاٹ پر کوئی قیر کر دیکھی تھی اور ٹیکس فری زون میں قائم انڈسٹریل اسٹیٹ میں ٹیکسری لگا کر ہے تھے۔ کوئی اس کے نام بھی لیکن اس کی اجازت سے دونوں بھائی مع اہل و عیال اس میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم ٹیکسری میں طے شدہ معاہدے کے مطابق نصف کا مالک طارق اور باقی کے نصف میں دونوں بڑے بھائی برابر کے شراکت دار قرار پائے تھے۔

طارق اور آمنہ اس اطمینان قلب کے ساتھ وطن لوٹ رہے تھے کہ بڑے کو کسادہ پڑا آسائش گھر ہے اور پانچ چھ بیٹیوں تک ٹیکس فری سے بھی حصول آمدنی ہونے لگی۔ بیٹیوں کو اہل

تعلیم دلا دیں گے۔ یہاں اُن کے لیے مناسب رشتے ملنے کا بھی مسئلہ نہیں بنے گا۔ باقی کی زندگی دونوں میاں بیوی آرام سے بسر کریں گے۔ جاری تعلیمی سال اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ دونوں بیٹیوں کو یونیورسٹی بہت نزدیک پڑتی تھی۔ انم اے کے اختتام دیتے ہی اُن کی رخصتی ہو جاتی۔ دونوں کئے رخصتی کے فوراً بعد کوئی خالی کر کے اپنے آبائی گھر میں شفقت ہو جائیں گے اور یہ کوئی طارق محمود کے لیے کافی رہے گی۔

ایئرپورٹ پر ٹیکسی اور زبیر بھائی انہیں لینے کے لیے بڑی آرام دہ گاڑی لائے ہوئے تھے، جس میں سارا سامان آسانی سے سہا گیا۔ قیمتی سامان والا ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں تو باقی کا ادھر رکھا گیا۔ چاروں آسودہ ہو کر بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی نے فرنیٹ سیٹ سنبھالی اور بھلا، زبیر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ قانون کا احترام کرنا شروع سے ہی طارق محمود کے مزاج کا فطری خاصہ رہا تھا۔ قواعد و ضوابط کی بھی خلاف ورزی نہ کی اور حق بات پر مضبوطی سے ڈٹ جایا کرتا۔ طارق کا دل جلتے لگتا کہ اپنے ملک کے لوگ اخلاقی طور پر بد دلایا ہو گئے ہیں۔ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال کمانے کے لیے ہر ممکنہ آزمائش پر ہر دم تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔

ان دنوں ملک کے زیادہ تر حصے سرشام ہی دھند کی لپیٹ میں آ جاتے اور جوں جوں رات ڈھلتی، اس میں اتنی شدت آتی کہ چند گز آگے تک کا منظر صحیح طور پر دکھائی نہ دیتا۔ جی ٹی روڈ پر احتیاط سے سفر جاری رہا۔ مہمان مسافر جلد ہی گاڑی میں ہو گئے۔ بڑا بونگ بچے اور طارق کی بیٹی سے رو پوا اور کی بی بی بیٹاں۔ چھوٹے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی جی ٹی روڈ کے ایک پرانے خر دوک ویران گھر سے پر لاکر روک دی گئی تھی۔ آمنہ بڑا کر جاگ اٹھی اور شوہر کو اس کی زد پر دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ پیچھے بیٹھی دونوں بچیاں رونے لگیں۔ ایک بہن برادر لگی سیٹ کا دروازہ کھولے یا سیدان پر کھڑا نظر آیا اور تیسرے نے ہو ہو اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر زبیر کی گردن پر بہن کی تال دیکھی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین بندوں نے سارا سامان اتار کر پیچھے کھڑی چمک آپ میں رکھ لیا۔ طارق کی بیٹھیں خالی کیں اور تینوں ماں بیٹیوں کے وینڈ بیڈ بھی چھین کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے کوئی مظلوم سے چبڑے چپار کھے تھے اور اُن کے سروں پر پولیس کی ٹوپیاں تھیں۔ جاتے ہوئے گاڑی کے اگلے دائیں بازو کو کوئی مار کر پھاڑ گئے۔

بڑے ارمانوں سے نئے وطن کو اپنانے کی غرض سے آنے والی ماں بیٹیوں کو اس صدمے نے دھلا کر رکھ دیا۔

طارق نے گاڑی کا ہانڈ بڈلے ہی بھائیوں سے تھانے چلنے کو کہا۔ وہ سمجھانے لگے کہ رپورٹ درج کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ مزید بانی بوجھ پڑنے کا امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں نے پولیس کی جعلی روپیاں ہمکن رکھی ہوں۔ گویا اُن کے اصل ڈاکو اور اصل پولیس اہل کار ہونے کے امکانات برابر برابر ہیں۔ لہذا بہتر ہوگا کہ اس مالی نقصان کو برداشت کر لیا جائے لیکن طارق محمود مانا اور وہ تھا پتا قافلہ تھانے پہنچ گیا۔

ڈیوٹی پر موجود ہیڈ کانسٹیبل نے طارق سے شروع میں چند سوالات کیے لیکن فوراً ہی ساری تحقیق اور تفتیش کا رُخ دونوں بھائیوں کی طرف موڑ دیا۔ طارق کو حیرت ہونے لگی۔ ظہیر، ہیڈ کانسٹیبل سے اُلجھ پڑا اور کہا کہ وہ ایسے سوال کر رہا ہے، جیسے ہم نے ہی اپنے بھائی کو لٹا ہے۔ زبیر نے ہیڈ کانسٹیبل کے اس سوال کے جواب میں کہ رات کے وقت، مخصوص پولیس ناکوں کے علاوہ ویران جگہ پر گاڑی کھڑی ہی کیوں کی تو جواب دیا۔ ”ڈاکوؤں کی چمک آپ بالکل پولیس سوبائل جیسی لگی اور وہ تقریباً آدھی سڑک روک کے کھڑی تھی۔ تین وردی پوشوں نے گاڑی کے آگے آ کر تار چوں سے روشنی ڈالی اور زکے کا اشارہ دیا تو میں نے بریک لگا دیا۔“

ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا کہ اُن دونوں بھائیوں سے ڈاکوؤں نے کیا پوچھا؟ زبیر اور ظہیر دونوں نے کہا کہ جو بھی گفتگو تھی، وہ انہوں نے نہ لی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے خود اٹھ کر دونوں کی پوری طرح جامہ تلاشی کی اور دو اہل کاروں کو ہمراہ لے باہر آ گیا۔ گاڑی کو اندر سے دیکھا اور اگلی دونوں نشستوں کے پیچھے جھانکا۔ میٹ اٹھا کر چھوڑا سادتی شوہر امد کر لیا، جس میں نقد رقم کے علاوہ دونوں بھائیوں کے شناختی کارڈ، زبیر کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کی رجسٹریشن بک بھی تھی۔ وہ بولکھار متعداد بیان دیتے لگے کہ زیادہ رقم دونوں کی بیٹیوں میں تھی، جو ڈاکوؤں نے نکال لی۔ پرس میں ضروری کاغذات اور دو تین ہزار روپے ڈال کر گھر سے نفلے ہی احتیاطاً میٹ کے نیچے چھپا دیے تھے، جن کے بارے میں بتانا یاد نہ رہا۔

تفتیش کے دوران ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ طارق محمود کا سر چکر گیا۔ اُس کو اعتبار نہ آیا کہ بڑے بھائی ہی اس کے خلاف کسی سازش کے مرکزی کردار ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں اس سے شکوہ کرنے لگے کہ اسی لیے پولیس اسٹیشن آنے سے منع کیا تھا۔ یہاں اُنکا مظلوم کو ہی عالم بنا دیا جاتا ہے۔ ظہیر نے ایک طرف فیصلہ کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ ”محوالدار صاحب! ہم نے رپورٹ درج ہی نہیں کر دلی۔ آج خود مجھ پر کہ

کے دیکھ لیا۔ پہلے صرف سنا کرتے تھے کہ ہماری پولیس مقتول کے گھر والوں کو ہی شامل تفتیش کر لیتی ہے، تاکہ مال بنایا جاسکے۔۔۔۔۔

حوالدار کچھ زیادہ ہی دنگ شخصیت ثابت ہوا۔ بول پڑا۔ ”بالکل سچ سننے رہے ہو۔ گھر سے ہی قاتل ثابت بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسی روٹیں دیے فرشتے۔ جیسے عوام ویسی پولیس۔ یہاں اس ملک میں سنگے باپ اپنے پردیس گئے بیٹوں کو لوٹنے سے باز نہ آئے، تم دونوں تو بھائی ہو اور وہ بھی محبت کو تو رہے ہوئے پھر درج نہ کروانے کی بجائیں ہزار روپے فیس دینا ہوگی۔ پولیس وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوئی۔ اس کو بہت کام کرنے ہوتا ہے۔ میں مکی رپورٹ لکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔“

وہ برا دراست طارق سے مخاطب ہوا اور کہا۔ ”ہم معصوم بچپن اور ان کی والدہ کو زیادہ دیر نہیں روکنا چاہتے۔ تینوں باپردہ ہیں۔ اتنا لبا ستر اور پھر شاک۔ انہیں فوراً گھر لے کر جائیں۔۔۔۔۔“ پھر ظہیر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ بطور خنانت ہمارے پاس رہے گا۔ اس کا بھائی ہماری فیس لے آئے اور اس کو لے جائے۔ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، نقصان برداشت کرنا چاہیں تو میں کوئی اعتراض نہ دوں گا۔ ویسے یہ دونوں بھائی ڈرائنگ روم میں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ساری کہانی بتا دیں گے۔ لہذا آپ کے حق میں بھی بہتر ہے کہ رپورٹ درج کروائیں۔“ حوالدار نے اطمینان کے ساتھ سفید کاغذ لگا کر اپر قلم رکھا اور طارق کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”درخواست لکھیں، بخدمت جناب ایس ایچ او صاحب۔۔۔۔۔ میں مختصراً لکھواتا ہوں۔۔۔۔۔“

طویل سفر کی ٹھکن اور صدمے سے نڈھال ماں بیٹیاں، نیند پوری نہ ہونے سے اُدھ موٹی ہوئی جاری تھیں۔ گھر پہنچ کر ناشتا کرتے ہی سو گئیں۔ طارق کے بزرگوں میں صرف سگی پھوپھی ہی رہی تھیں۔ بیوہ اور نادار خاتون، جس کو طارق ہی باقاعدگی سے خرچ بھیجتا رہا تھا۔ اُس نے ایسا انکشاف کیا کہ بیٹے کو ہلا کر رکھ دیا۔ کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے اتنے بڑے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بات ایسے ہی نہیں اُڑی کہ گوشت اور ٹیکسٹری دونوں بھائیوں نے اپنے نام لگاوا رکھی ہے۔ دفتر والے کارپازڈ چیک کرواؤ۔ خود گواہی کا اعتبار نہ کرنا۔ تم نے دونوں خاتونوں کو مختار نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا میرا پھیری کی ہے۔ ان کی اولاد بھی علی الاعلان کہتی پھرتی ہے کہ کون جانا؟ کونسی اور ٹیکسٹری ہماری ہے۔ گوری سے شادی کر لی۔ اب گوروں کے دیس میں رہے، یہاں کیا لینے آئے گا؟“

بات کھٹے پر آئی تو سال سینے یا دن نہیں گئے، گھنٹوں میں کھٹکی جلی گئی۔ دونوں بھائیاں جوان بیٹیوں کے ہمراہ آکر ایک لحاظ سے حملہ آور ہو گئیں۔ خذر تراش لیا کہ اس نے آتے ہی دونوں بھائیوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کی۔ وہ تو قسمت اچھی رہی کہ پولیس کو رشوت دے کر عزت بچائی۔

شہر کے ترقیاتی ادارے اور انڈسٹریل ایسٹ کے ریکارڈ میں سرے سے طارق کا نام ہی نہیں تھا۔ وہ تھانے گیا تاکہ باقاعدہ رپورٹ درج کروائے۔ چھوٹے بڑے حملے نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ شوخرا برا کر کے ایس ایچ او سے ملا لیکن اُس نے یہ کہہ کر رخا دیا کہ گھر پہلے جھگڑوں میں پولیس کو الجھانے کے بجائے، آپس میں مل جینے کے معاملات سنبھال کیے جائیں۔

طارق محمود کی قوت ایمانی بروئے کار آگئی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ بن گیا کہ تمام تر دستاویزات، خواہ وہ جعلی تھیں یا اصلی، لوٹنے گئے سامان میں چلی گئیں۔ پاسپورٹ، رپورٹ، پاؤنڈ اور سب کچھ۔ لباس بھی صرف وہی رہ گئے، جوتن پر تھے۔ پرکھنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ بھائی کل کر سامنے آ گئے اور صاف کہہ دیا کہ اُس نے دونوں کو تھانے میں ڈھیل کر دیا، لہذا وہ ایک روپیہ بھی دینے کے روادار نہ ہوں گے۔ اس مشکل گھڑی میں بہنوئی، محمد سلیمان ساتھ چل پڑا۔ اگلیوں بہن کا شریک حیات، شہر کی سیاسی بساط کا انکم مہرہ اور موجودہ چیز میں زکوٰۃ کیٹی۔ گوکہ بہن کی اپنے شوہر سے بھی نہ تھی۔ بھائی کو دیے لفظوں میں سچ کے رہنے کی تلقین کر رہی لیکن اس کی بھجوری بھی کر کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ تھا۔ سلیمان سے امداد رقم پکڑ لی تاکہ روزمرہ کا خرچ جیب میں ہو۔ اسی کی مدد سے ایس ایس پی کو حوالا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن کے حوالے سے ساری ذمہ داریاں مقرر کر ڈالی۔

ایف آئی آر درج کر لی گئی اور ایس ایس پی نے اس کیس کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تفتیش ایک اچھی شہرت کے حامل سب انسپکٹر کے سپرد کر کے کہنے لگا۔ ”اور سب پاکستانی کی جائداد ہرپ کرنے کا سنگین جرم ہوا ہے۔ اس کی تو مسلم بیوی نے ہم لوگوں کے بارے میں بہت برا تاثر لیا ہوگا۔ ڈاکے کی اصلیت سمجھنے سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ کیس ہمارے لیے چٹخے سے کم نہیں۔۔۔۔۔“

دونوں بڑے بھائیوں نے خواتین کو روٹی تھیں، تاہم انہیں شامل تفتیش کر لیا گیا۔ طارق نے ایک وکیل کے ذریعے ہول عدالت میں کوئی اور ٹیکسٹری کی بازیابی کا دعویٰ

بھی دائر کر دیا۔ اُس نے تمام رقوم قانونی طریقے سے بذریعہ بینک بھیجی ہوئی تھیں۔ صرف یہی ایک ثبوت تھا جو متعلقہ برانچ سے بہ آسانی حاصل ہو گیا۔ سچ سے ظہیر اور زہیر سے دونوں کہا۔ ”انکم ٹیکس کارپیکارڈ لے آؤ۔ ہم دونوں کی آمدن ثابت ہوگئی تو ٹھیک ورنہ عدالت ایک دو بیٹیوں میں فیصلہ دے دے گی۔“ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اور تفتیشی افسر نے ڈاکے کے اصل کروا کر غار کر لیے جن میں ٹیکسز کے تین موزوں، ایک کلرک اور دو سیکرٹری گاڑ ڈھال تھے۔ کچھ سامان، انجینیئرس، وٹنیک اور پاسپورٹ بھی برآمد ہو گئے۔ تاہم زہیر، پکڑوں اور فاران کرکھی میں سے کچھ نہ ملا۔ دونوں بھائیوں کی خواتین مسخوخ ہو گئیں اور ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ طارق محمود بظاہر جتنا مضبوط عقیدے کا حامل دکھائی دیتا رہا، حقیقت میں ایسا ثابت نہ ہوا۔ اسی روز گھر آیا اور دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔

ظہیر اور زہیر کے سسرال والے میدان میں آ گئے۔ ساتھ میں ان دونوں کی بیٹیوں کے گھبر کو پڑے۔ قرضہ حنہ دینے کے حوالے سے بیان ملنے لکھنے گئے اور جائداد ہرپ کرنے کی نیت سے وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی ہوئے تھے۔ آٹمن کو پیغام پہنچایا گیا کہ میریم کوٹ تک مقدمہ بازی چلے گی۔ دوران تفتیش، مظہیر زیادہ سختی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے قبول دیا تھا کہ ڈاکا اس لیے ڈھلایا تاکہ جعلی دستاویزات ضائع ہو جائیں اور جعل سازی کا کس نہ بنے۔ علاوہ ازیں اپنے تئیں یہ باور کر لیا تھا کہ ایسی سنگین واردات سے دوچار ہونے پر بیٹیاں اور بیوی خوفزدہ ہو کر طارق کو فوری واپسی کے لیے رخصت سفر باندھنے پر آمادہ کر لیں گی۔ اُن کے پاسپورٹ اسی لیے محفوظ رکھے تھے کہ موقع پا کر کسی رات گھر کے کچن میں پیچک دیں گے۔

آمنہ اپنے تمام تر معاملات کا حل، دینی احکامات کی روشنی میں تلاش کرتی۔ جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا، مرحوم شوہر کیادی ہوئی کتابوں اور قرآن پاک سے رجوع کرنا اس کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ بیٹیوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر مگر مند ضرور رہی۔ ذریعہ آمدن عمارتوں سے نوبت فائدہ کی تک آگئی۔ بڑی خوار کے بعد ایک اکیڑی میں انتہائی کم معاوضے پر کام مل گیا، جہاں نو جوان لڑکیوں کو روزمرہ کی انگریزی بول چال میں ماہر کرنے کا فریضہ رہا۔ لیکن اس عورت کا پردے کے شرعی احکامات پر سختی سے کاربند رہنا نہ صرف زکاوت بن گیا بلکہ اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا۔ مقدمے کی پیروی بھی اسی لیے نہ کر سکی کہ بے پردگی ہوتی ہے اور مالی دسائل نہ ہونے کے

برابر تھے۔

گلی محلے کے لوگوں کو اس بے سروسامان اور منفرد مزاج کی بیوہ اور بیٹیم بچوں سے دلی ہمدردی ہوگئی۔ انڈوں پر ڈس کوئٹر رہی کہ ماں بیٹیاں صبح کے وقت انتہائی معمولی ناشتا کر کے شام کے کھانے تک بھوکی رہتی ہیں۔ ایک تو اس آبادی کے زیادہ تر لوگ بھی کچی دست تھے، دوسرا اس عورت کی آنا آڑے آ جاتی۔ قرض لیکن نہ خیرات قبول کرتی۔ اکیڑی سے ملنے والے حقیر معاوضے پر گزارہ چلا رہا۔ رمضان المبارک کی آمد سے پہلے سلیمان ملنے آ گیا۔ اس نے پردے میں رہتے ہوئے دروازے کے پیچھے سے آنے کا سبب پوچھا تو وہ بولا۔ ”بھائی صاحب! ہمارے دین میں اتنی سختی نہیں تھی آپ نے اپنے اوپر روا رکھی ہوئی ہے۔“

وہ بولی۔ ”مئی! اہم کو پتا ہے، دین میں سختی بالکل نہیں۔ ہم کو خود اس سے بہت خوشی ملا ہے۔“

وہ کہنے لگا۔ ”آپ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس میں بے شک دیکھ لیں کہ زکوٰۃ پر آپ کا جائز حق پتا ہے۔ میں زکوٰۃ کیٹی کا چیز میں ہوں۔ قانون یہ ہے کہ سختی فرد کو بذریعہ چیک ادا کی جاتی ہے۔ مگر میرے صوابدیدی اختیارات بھی ہیں۔ کیٹی کے بھران کی مختصر منظوری سے زیادہ ضرورت مند کو نقد ادا کی جاسکتا ہوں۔“

”بہت مہربانی بھائی صاحب!“ آمنہ نے سلیمان کو ٹوک دیا اور بولی۔ ”ابھی ہم اکیڑی جاتے گا۔ واپسی پر زکوٰۃ کو اچھی طرح پڑھ لیں گا۔ آپ آنے کا تکلیف مت کرو، فون پر پوچھ لو۔ اللہ کے حکم کو ہم ضرور مانے گا۔“

محمد سلیمان نے کہا۔ ”ایک اور بات کہنا چاہوں گا کہ زکوٰۃ فنڈ کی رقم آپ کو نقد مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بہت سے اہل ثروت ہماری کیٹی کے ذریعے امداد تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں رمضان کی بیٹیج بنا ہوتا ہے۔ مئی، آنا، پچینی، والیس وغیرہ، بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی لے آؤں گا۔ اس میں لینے اور دینے والے کسی کا اجر کم نہیں ہوتا۔“

وہ جواب میں بولی۔ ”جی بھائی صاحب! اللہ بہت رحیم ہے، اس کا ہم کو پتا ہے۔“

اکیڑی سے واپسی پر آمنہ نے بڑی توجہ سے زکوٰۃ کے احکامات کا مطالعہ کیا اور پوری طرح مطمئن ہوئی کہ وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کو قبول کرنے میں کسی قسم کی قیاحت نہیں۔ سلیمان کی فون کال آنے پر اس امر کی تصدیق کر دی اور کہا کہ وہ جس شکل میں چاہے، امداد لے آئے۔ فون بند کرنے سے پہلے آخری جملہ بولی، اُس کا منہم کچھ اس

طرح کا تھا۔ ”بھائی صاحب! یہ کارخیز جو آپ کرنے جا رہے ہیں، اس کا اجر صرف اللہ پاک سے مانگ لیں گے۔“

سلیمان اپنی ذاتی کار میں اچھا خاصا سامان رکھ کر لے آیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھلوادیا۔ ڈکی سے آئے کا ایک تھیلا نکال کر خود اندر رکھا۔ اس کے بعد تین کارشن باری باری اٹھا کر اندر لایا۔ آخر میں ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا اٹھائے ہوئے آگیا۔ آمنت پوری طرح پروے میں تھی اور کوئے میں لگی کھڑی دیکھتی رہی۔ اس نے چند ایک بار شکر یہ کے الفاظ ادا کر دیے۔

سلیمان نے آخری تھیلا کارشن پر رکھتے ہوئے بتایا کہ اس میں بکٹ، بٹائی، بکجوریں اور کچھ خشک میوہ جات ہیں۔ باقی کے تینوں کارشنوں میں چاول، دالیں، چینی، پتی، گھی اور دودھ ہے۔ انشاء اللہ کوئی کمی نہیں آئے گی۔ میں ایک فون کال پر ہر وقت حاضر ہوں۔

جب سے نہ کیے ہوئے ہزار روپے مالیت کے چند فوٹ نکالے ہوئے سلیمان نے تین چار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور آمنت کے قریب آگیا۔ دایاں ہاتھ جس میں رقم تمام رکھی تھی، اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”یہ لیجیے۔۔۔۔۔ اور جب بھی ضرورت پڑے، صرف اشارہ کر دیجیے گا۔“ سلیمان کی آواز میں لرزش آگئی تاہم اس نے آمنت دہانہ ہاتھ آگے بڑھا رکھی تھی۔ نہ جانے کیا غصہ کی کارخانوں کو فٹ پلانے کے بجائے بائیں ہاتھ سے اس کا بڑا ہوا ہاتھ تمام لیا اور دم تھیل پر رکھتے ہی اپنی تھیلی اس پر مبادی۔ فوراً جڈ بات سے لرزتی آواز میں بول پڑا۔ ”اسلام میں اتنی سختی نہیں، جتنی آپ نے اپنے دماغ پر سوار کر رکھی ہے۔“ ساتھ ہی اس کے سر پر اوپر سے پچھنیک بڑی بھرپور فریفتہ نگاہ ڈالی۔ لبوں سے کچھ اس طرح کی سسکاری برآمد ہوئی، جس کے بارے میں شاید خود بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ بے ساختہ جی کا شعور کی کوشش کا شاخسانہ۔

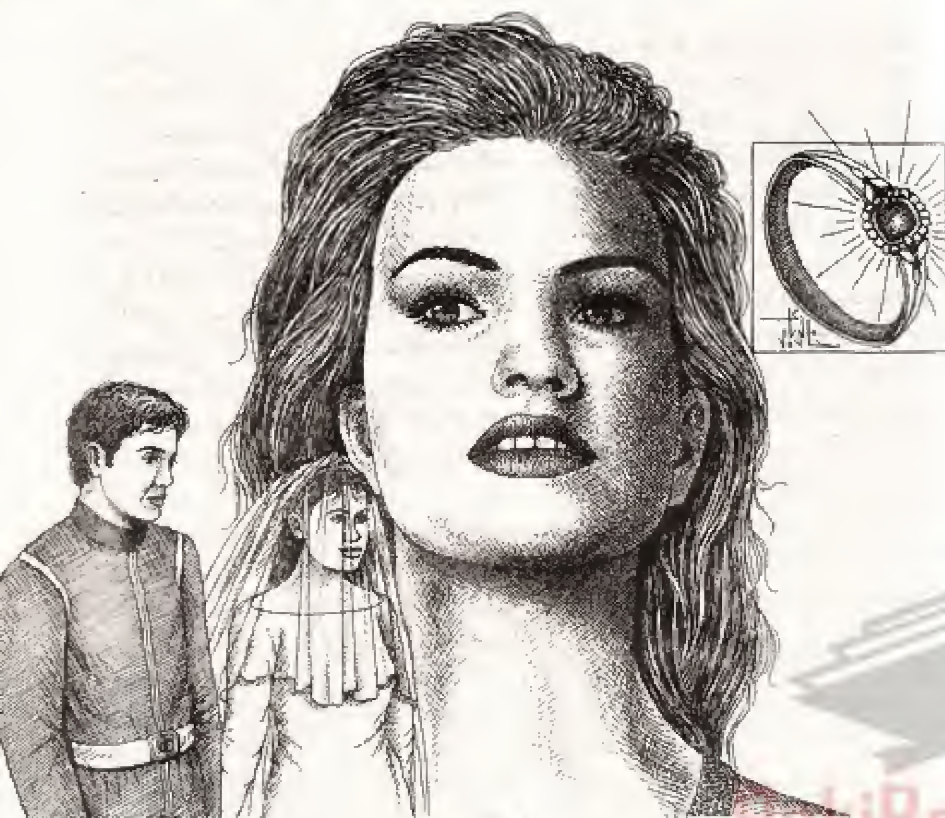
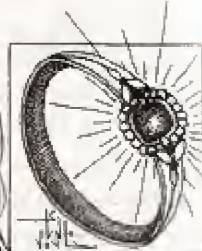
منت بنی کھڑی خاتون ذرا بھی مشتعل نہ ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس صفائی سے صاف کیا کہ کئی فوٹ سلیمان کی بائیں تھیلی پر دھرے رہ گئے۔ ایک لفظ بولے بغیر آگے بڑھی۔ اٹلے ہاتھ میں ڈرائی فروٹ والا تھیلا اٹھایا اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ایک کارشن کے گرد لپٹے اسٹریپ میں پھنسا کر اٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں چیزیں دروازے سے باہر رکھ دیں۔ اسی لمحے سامنے والے گھر سے بڑھن اور اس کا جواں بیٹا نکل آیا۔ وہ دونوں اپنے گھر کی کھڑکی کا پردہ ہرکار ڈیوڑھی کا منظر دیکھتے رہے تھے۔ سلیمان گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ اس نے آمنت سے آنے والا تھیلا بھی فرش پر گھسیٹتے ہوئے گلی میں لا ڈالا۔

بڑوں نے بیٹے سے دونوں کارشن اٹھا کر باہر رکھنے کو کہا۔ اس نے فوراً تعمیل کر دی۔ سلیمان گنگ کر بولا۔ ”آمنت بہن! ایسا مت کرو۔ یہ اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں۔۔۔۔۔“ اس اثنا میں وہ خود بھی باہر گلی میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اڑبڑ پڑوں کے چند اور مرد و خواتین بھی نزدیک آگئے۔ آمنت کچھ نہ بولی اور دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں۔

اگلے روز صبح نو بجے ہی اہلکاروں سے بھری پولیس موبائل کے ساتھ ایک لینڈ کروزر آن کھڑی ہوئی، جس سے آمنت کے آبائی وطن کے سفارتی مشن کی خاتون کو آڈیٹر نکلی۔ اس کے ساتھ آئے محلے کے دو اہلکار گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ہر عمر کے مرد و خواتین سے گلی بھر گئی۔ محلے کے معزز بزرگ حاجی ذکا اللہ کی معیت میں دو اویسز خواتین اور دو بوڑھے مرد، آمنت سے ملنے آگئے۔ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ وطن واپس جا رہی ہے۔

حاجی ذکا اللہ دل گرفتہ سے ہوئے بول پڑے۔ ”بیٹی! ہم تمہارے مجرم ہیں۔ بڑی کوتاہی ہوگئی۔ مرحوم طارق محمود کے ساتھ سر اسر ظلم ہوا۔ ہمیں ہر حالت میں اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ گلی محلے کے لوگ شرمندہ ہیں اور نقصا سوگوار ہوگئی ہے۔ تم واپس مت جاؤ۔ ہم تمہاری فیکٹری اور مکان کا مقدمہ جیت کے دکھائیں گے۔ طارق مرحوم اپنی بیٹیوں کو جس خراب ماحول سے نکال لایا، اس میں ان معصوموں کو واپس مت لے جاؤ۔“

آمنت نے بڑے غم سے بات سنی اور کہا۔ ”جن بھائیوں نے مکان اور فیکٹری کے واسطے ایمان خراب کر لیا، ان سے یہ چیز مت چھینو۔ انہوں نے بہت زیادہ قیمت دے دیا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور ادھر ہمارے وطن میں بیٹی کو خطرہ نہیں۔ ادھر بیٹی اور ہم کو بھی خطرہ ہے۔ وہاں جب عورت خود خرابی مانگتا، اس کو برابر مل جاتا۔ یہاں جو عورت خرابی نہیں مانگتا، اس کو بھی بہت لوگ زبردستی خرابی دیتا۔ ہم نے شادی سے پہلے طارق محمود کا آنکھ دیکھا۔ خوب جان گیا، نیکی والا اچھا آنکھ کیا ہوتا۔ ادھر آئیڈلی کا اوزر۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور بہت زیادہ لوگ۔۔۔۔۔ اپنا بیک سیل اسٹوڈنٹس کا آنکھ دیکھا۔۔۔۔۔ سب نہیں، جموڑا بہت عورت کو خرابی دینے کے واسطے دیکھتا۔۔۔۔۔ اچھا نہیں۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔ سب اچھا ہو گیا۔ ہم کو ”خدا حافظ“ کا کینٹ دے دو۔۔۔۔۔ اور فی۔۔۔۔۔ فی امان اللہ“ کا کینٹ ہم بھی دیتا، آپ کو۔“



چور

شرعیاس

روپ بدلتی اس دنیا میں انسان بناوٹ کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ نہ تو اپنا اصل ظاہر ہونے دیتا ہے اور نہ ہی دوسرے کی حقیقت جان پاتا ہے مگر۔۔۔ اس کے باوجود جب دوسرے کی اصلیت کا پردہ چاک ہوتا ہے تو صرف دوسرے پر ہی غصہ آتا ہے، اسی پر افسوس ہوتا ہے مگر اس وقت بھی وہ اپنے بدلے روپ کی ظاہر نہیں ہونے دیتا، البتہ دل میں ایک کسک سی حسرت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک چور کا دوسرے چور سے ملاپ اور جہان کی کانگوا ماجرا

اثر ازم دے رہا تھا اور وجہ تلاش کر رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بالکل اس جاسوسی کہانی کی طرح جس کے ہر کردار پر قائل ہونے کا شبہ ہو۔ میری جو ہماری اینڈ گرل ہوا کرتی تھی، اس کا خیال تھا

تیس سال بعد بھی ہم اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ہم نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے اور کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، ورنہ ہمارے بارے میں غلط تاثر قائم ہوتا تاہم ہر کوئی پیٹھ پیچھے کسی اور کو

کہ یہ حرکت جین نے کی ہوگی جسے ہم جین دی برین کہا کرتے تھے۔

”وہ ہمیشہ بین لوپ سے ملتی تھی جس کے پاس اس کے مقابلے میں بہت کچھ تھا۔ وہ خوب صورتی، ذہانت اور امارت میں جین سے آگے تھی۔“ میری نے کہا۔ اس کے آباؤ اجداد جرمنی سے جنوبی افریقا آئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ بین لوپ کے پاس وہ سب کچھ تھا جس سے جین محروم تھی۔ وہ باکی اور ہیرا کی، مٹی بہت اچھی کھلاڑی ہونے کے علاوہ ٹینس کی کپتان بھی تھی۔ یہاں تک کہ وہ راولپنڈی میں بہت اچھا کھلتی تھی۔ اس کا قد لائبا، سیاہ کھنکھرائے بال، خواہدہ براؤن آنکھیں، ٹائٹ جلد اور خوبصورت ہونٹ اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ جب نرم اور شائستہ لہجے میں کسی کو مخاطب کرتی تو لگتا کہ اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ وہ سب کی دوست تھی۔ ہر ایک سے ہنسی مذاق کرتی اور کھلے دل کی مالک تھی۔

دوسروں کی رائے تھی کہ یہ میری کی حرکت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس نے بچپن میں بڑی سختیاں جھیلی تھیں اور اس وجہ سے وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے پولیس کو بلانے کی مخالفت کی تھی۔

کچھ لوگ شلا کو بھی مورد الزام ٹھہراتے تھے جو بالآخر جنوبی افریقا سے ہجرت کر کے امریکا چلی گئی۔ اس پر الزام لگنے کی وجہ یہ تھی کہ جب اس نے اسکول میں ہونے والے ڈانس فنکشن میں بین لوپ کو خوب صورت سفید لباس میں دیکھا تو اسے اس پر رشک آنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ شلا کا کہنا تھا کہ اسے اس لیے رونا آیا کہ جین لوپ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

اس ڈانس فنکشن میں بین لوپ نے سفید لباس پہنا تھا جس کے سامنے والے ہنرے پر گلابی پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس نے میری کو بتایا کہ یہ لباس اس کی ماں نے لندن کے ہیر وڈز اسٹور سے خریدا تھا۔ میری اس وقت بیڈ گرل تھی اور ہم سب پر رحم چلائی تھی۔ اس نے اپنی خوبصورت اور نازک گردن میں جھپٹتے ہوئے سوجنوں کا بارنگی بھنک رکھا تھا۔

”بہت خوبصورت.....“ جین نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھ کا ہاتھ ہوا معمولی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کی موٹی گردن میں سے موتیوں کی مالا بہت ٹنگ لگ رہی تھی۔ بین لوپ کے خوبصورت لباس میں اس

کی پتلی کمر اور گداز شانے پوری طرح نمایاں تھے۔ وہ جب ایک چنڈم نو جوان کے ساتھ ڈانس فلور پر آئی اور اس نے ایک پھول کی طرح بازو پھیلا کر.... دائرے کی شکل میں ناچنا شروع کیا تو کوئی دیکھنے والے دل تھام کر رہ گئے۔ شلا سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے ہمیشہ سے رونے کی عادت تھی۔ چاہے خوشی کا موقع ہو یا غم کا..... اس کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ ”تمہیں یاد نہیں کہ جب وہ چلی بارگر چاکی اور اس نے دل کی بات کہتے ہوئے جو اعتراضات کیے تو وہ بری طرح رو رہی تھی۔“ جولیا نے کہا جو لائبنی زبان میں ہمیشہ اچھے نمبر لے کر آتی تھی۔

ہم میں سے کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کا واقعہ ہمارے ساتھ کیوں پیش آیا۔ ہماری کلاس کے بچپن گزرتے نام سے بچائی جاتی تھی۔ جب ہم گرجا میں عبادت کرتے تو اس وقت ہمیں یہ بات شدت سے محسوس ہوتی کہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ یہ واقعہ کیسے پیش آ سکتا ہے جنہوں نے ہمیشہ یہی سیکھا کہ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں۔

ہم سب لڑکیاں ایٹھلیکن بورڈنگ اسکول میں کئی سالوں سے رہ رہی تھیں۔ اسے اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی دو غیر شادی شدہ عورتوں نے قائم کیا تھا جو بیسویں صدی کے شروع میں عیسائیت کی تبلیغ اور تعلیمات کا پرچار کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے جو کام شروع کیا، اس میں چالیس اور پچاس کی دہائی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

بین لوپ نے ہمارے ساتھ ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس نے انگریزی اور تاریخ میں امتیازی نمبر حاصل کیے مگر اس کی جین کی طرح فرسٹ پوزیشن نہیں آ سکی جس کے تمام مضامین بالخصوص حساب میں اچھے نمبر آئے۔ گوکہ وہ ہماری کلاس کی سب سے خوبصورت اور امیر ترین لڑکی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ اس کا باپ مرچا ہے اور اس کی ماں کے لیے دو چمروں دولت چھوڑ گیا ہے۔ اس کے باوجود اسے کلاس میں سب سے ہوشیار طالب علم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بہت زیادہ اسٹارٹ ہونا کوئی اثاثہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کی کوئی قدر نہیں تھی۔ جین دی برین بھی لڑکی اپنا بیشتر وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتی لیکن وہ کھیلوں میں اچھی نہیں تھی جبکہ اسپورٹس کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

اسکول میں روزانہ دوپہر میں ٹیچ کے بعد دو گھنٹے کوئی نہ کوئی کھیل کھیلا جاتا تھا۔ باکی، ٹینس اور تیراکی وغیرہ تھی۔

اگر کبھی بارش ہو رہی ہوتی جو بہت کم ہوا کرتی تھی تو ہم کوئی ان ڈور گیم مثلاً ٹیبل ٹینس، کیرم بورڈ یا ڈرافٹ کھیلا کرتے۔ ہمیں روزانہ دوک کے لیے میدان میں لے جایا جاتا۔

ہمارا خیال تھا کہ سوئی گردن اور چشمہ لگانے والی جین کی کبھی شادی نہیں ہوگی اور وہ اسکول ٹیچر یا لائبریرین جیسی فصول ملازمت کر کے زندگی کے دن گزارے گی کیونکہ ان دنوں ہمارے ملک میں ذہین عورتوں کو اسی طرح کی ملازمت مل سکتی تھی۔

ہم نے اسکول چھوڑنے کے بعد کافی عرصے تک بین لوپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی۔ البتہ شلا جو بعد میں مصنفہ بن گئی، وہ بین لوپ کے گھر کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ بین لوپ کی ماں نے اپنا بڑا گھر اور باغ فروخت کر دیا ہے اور ایک نسبتاً معمولی علاقے کے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی گئی ہے۔

بین لوپ اور اس کی ماں ایک بہت بڑے پارٹمنٹ میں رہتی تھیں جس میں ایک وسیع دیریش باغ، ٹینس کورٹ، روزگارڈن اور بہت بڑا سونگ پول بھی تھا۔ ہم میں سے اکثر لڑکیوں کو اتوار کے دن وہاں مدعو کیا جاتا تھا جہاں ہم پول کے کنارے سفید چھتریوں کے سامنے میں اس کے باورچی کے بنائے ہوئے چکن روٹ اور فروٹ سلاڈ کا مزہ لیتے۔ دھوپ کی قحازت سے ہمارے چہرے سرخ ہو رہے ہوتے اور ہم ہی تان کر سوجاتے۔ بین لوپ کی ماں بڑے مکملے دل کی عورت تھی۔ وہ اکثر ہڈیوں میں طالب علموں کو اپنے گھر مدعو کرتی جو اپنے گھروں سے بہت دور تھے۔ وہ خاص طور پر جین کو مدعو کرتی تھیں اور وہ ہمیں لایا جاتا تھا۔

”اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اسے بڑے گھر میں وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔“ یہ بات ہمیں شلا نے بتائی جو سائیکالوجی پڑھ رہی تھی۔ ”لگتا تھا کہ وہ اپنے لوگوں میں جاہ چاہ رہی تھی۔“ شلا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ شادی سے پہلے بین لوپ کی ماں غریب بستی میں رہنے والی غریب لڑکی تھی۔ بین لوپ کا باپ بہت امیر آدمی تھا اور وہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہم میں سے زیادہ تر لڑکیاں wits (بزنس اسکول) یا کیپ ٹاؤن یونیورسٹی کی ٹیچنگ بین لوپ ایک سالہ اطالوی زبان کا کورس کرنے کے لیے فلورنس چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے کہا۔ ”اطالوی زبان بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں یہ زبان سیکھنا چاہتی ہوں تاکہ دانستے کو پڑھ سکوں۔“ اس اسکول کو

چلانے والی ہمارے ہی اسکول کی ایک سابق ٹیچر تھی جس سے بین لوپ کی ماں کی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اکثر فلاحی کاموں میں اس کی مدد کرتی رہتی تھی۔

پھر ہم نے میری کی زبانی سنا کہ بین لوپ کی شادی ہو رہی ہے۔ شاید وہ سب سے زیادہ اس کے قریب تھی۔ گوکہ بین لوپ ہم سب کو کبھی پسند کرتی تھی لیکن میری اس سے رابطے میں تھی اور ان کے درمیان خط کتابت ہوتی رہتی تھی اور خط کے ذریعے ہی میری کو اس کی شادی کی اطلاع ملی۔

”اس کی شادی ہو رہی ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا ہونے والا شو پر کون ہے؟“ میری نے ہم سے پوچھا لیکن ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کیونکہ وہ ابھی بہت کم عمر کی تھی جلدی اس کی شادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم اس کے ہونے والے ڈنہا کے بارے میں کوئی قیاس آرائی نہ کر سکتے۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کوئی اطالوی شہزادہ ہوگا۔ اس کا تعلق ایک قدیم ترین اطالوی خاندان سے ہے اور وہ روم کے قریب ایک بہت بڑے خوبصورت ولا میں رہتا ہے۔“

اس وقت بین لوپ کی عمر یہ مشکل انیس برس ہوگی اور اس کی شادی ہو رہی تھی، وہ بھی ایک شہزادے سے۔ ہمیں بین لوپ کی قسمت پر رشک آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے لیے حسد کا جذبہ بھی سراٹھانے لگا۔ جب میری نے تعلیمات بتائیں تو ہم سب حیران رہ گئے۔ لیکن جی نہیں آ رہا تھا کہ وہ شادی کے بعد روم کے مصافحات میں داخل اس ولا میں رہے گی جس کا نقشہ کسی نامور اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا۔ میری نے یہ بھی بتایا کہ اس ولا کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ کسی زمانے میں اسے پوپ اور چرنلوں کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔

ہمیں یاد تھا کہ بین لوپ محض دکھاوے کی خاطر آئینے کے سامنے ایک مخصوص قسم کے رقص کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جس میں ایک ایک کر کے تمام کپڑے اتار دے جاتے ہیں اور جسم کے مخصوص حصوں کو چھپانے کے لیے ان کے گرد ایک کپڑا لپیٹ لیا جاتا ہے۔ اس رقص کے دوران وہ آئینے کے سامنے چکر لگا کر ایک خاص انداز میں اپنے جسم کے کچھ حصوں کو حرکت دیتی تھی اور ہم سب تالیاں بجا کر اسے داد دیا کرتے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ کیا بین لوپ نے شہزادے کو بھانے کے لیے اس کے سامنے یہی رقص کیا ہوگا؟

وہ کوئی شرمیلی لڑکی نہیں تھی اور اس نے کئی بار اس

خواب میں کا بر ملا اٹھارہ کیا کہ وہ ادا کارہ بننا چاہتی ہے۔ وہ کلاس میں نظمیں پڑھتی اور گانے سناتی۔ گوکہ اس کی زبان میں بگلی سی تلاپتھی لیکن وہ اپنی آوازوں سے اس کا بعدہ دیتی تھی۔ جب وہ دونوں بازو پھیلا کر جسم کو مخصوص انداز میں حرکت دیتی تو ہم سب بے اختیار تالیاں بجاتے پر مجبور ہو جاتے۔ اس نے اسکول کے ڈراما کپٹی ٹیشن میں بھی پہلا انعام حاصل کیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں جولیا اور شلا میں جو آخری نمبر پر رہیں کیونکہ وہ اپنی لائیں بھول گئی تھیں۔

کچھ دنوں بعد ہمیں اس کی ماں کی جانب سے ویڈنگ شاور، میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ تقریب لڑکی کی شادی سے پہلے منعقد ہوتی ہے اور اس میں دوست، رشتے دار لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق تحفے دیتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شہزادے کی حیثیت کے پیش نظر یہ تقریب کسی ہوگی یا مال میں ہوگی لیکن بین لوپ کی ماں نے بتایا کہ انہوں نے بہت کم لوگوں کو بلایا ہے۔ اس لیے یہ تقریب گارڈن اپارٹمنٹ کے کپاؤنڈ میں رقصی مٹی ہے۔ ہم سب کو اس موقع پر بین لوپ کے لیے تحائف خریدنا تھے جس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی کہ اسے کیا تحفہ دیا جائے۔ روایتی طور پر کوئی چھوٹا تحفہ ہی دیا جاتا ہے، بالخصوص ایسی اشیاء جو بچپن میں استعمال ہوتی ہوں لیکن شہزادے کو کیا دیا جائے؟ اس نے تو شاید کبھی بچپن کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ سب لوگ مختلف چیزوں کے نام جوڑ کر رہے تھے لیکن کبھی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”تم کیا پہنو گی؟ کیا ہمیں ہیٹ بھی پہننا ہوگا؟“ جولیا نے میری سے پوچھا۔

اسکول میں ہم سب ایک جیسا لباس پہنتے تھے۔ گریسوں میں آجی آستین کا سفید بلاؤز اور سر دیوں میں پوری آستینوں کا نیلے رنگ کا بلاؤز اور ٹائی جبکہ گرجا میں جانے کے لیے پائنا ماہیٹ پہنا جاتا تھا۔ ہم ہر روز صبح کے وقت کلاس شروع ہونے سے پہلے گرجا جاتے تھے۔ ہمارے بیروں میں تسوں والے ہماری جوتے ہوتے اور ہمیں زیور پہننے یا میک اپ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ ہم شام کو چھیلنے اور غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر سکتے تھے۔

رات کو ہم طویل خواب گاہ میں قطار میں گئے ہوئے حالت بستر پر سوتے اور ہمارے کالوں میں رات والے چوکیدار کے قدموں کی آواز گونجتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے سیٹی بھی بجاتا۔ اسے

دوسروں کی نیند خراب ہونے کی بالکل پروا نہیں تھی۔ ہم ایک بہت ہی سخت اور منظم زندگی گزار رہے تھے۔ ہمیں ایک جیسے قوانین پر عمل کرنا ہوتا۔ ہم ایک ہی انداز میں سو جتے اور ایک ہی طرح محسوس کرتے۔ ہمیں کسی لڑکے سے بات کرنے اور اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمیں اسکول اور چرچ میں یہی بتایا جاتا تھا کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ہمارا اس بات سے یقین اٹھ گیا۔

بین لوپ کی ماں کی طرف سے دی گئی پارٹی میں ہمیں اس بات پر شبہ ہونے لگا کہ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ایسا بالکل نہیں ہے اور خدا نے سب انسانوں کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف بنایا ہے۔ ہم سب برابر راست اس دروازے میں داخل نہیں ہوں گے اور اپنی زندگی کی طرف جاتا ہے۔

بین لوپ کی ماں نے اپنے گراؤنڈ فلور اپارٹمنٹ کے دروازے پر ہمارا گرم جوش سے استقبال کیا۔ اس نے کاسنی رنگ کا چمکدار لباس پہن رکھا تھا اور اپنی عمر سے کافی کم نظر آ رہی تھی۔ بعد میں ہم سرگوشیوں میں اس پر تبصرہ کرنے رہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود وہ اپنے چہرے اور جلد کی جھریاں چھپانے میں ناکام رہی۔ گوکہ اس کی عمر پینچل ساٹھ سال ہوگی۔

وہ ہمیں ایک چھوٹے سے تاریک ہال سے گزار کر ملحقہ صحن میں لے گئی جو رشتہ داروں میں جھگڑا رہا تھا۔ شلا بیچہ کچھ جاننے کی جستجو میں رہتی تھی۔ اس نے سرگوشی میں ہم سے کہا کہ بین لوپ کہاں ہے اور یہ کہ کیا ہم شہزادے سے مل سکیں گے؟ وہ فلیٹ کے دوسرے حصے بھی دیکھنا چاہ رہی تھی۔

اس صحن میں چھوٹی لوپ کی میزیں لگائی گئی تھیں جس پر غریب صورت گلابی رنگ کے میز پوش بچھائے گئے تھے۔ ان میزوں پر زرد اور دوسرے بھولوں سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے ایک خاص ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر میز پر شیشے کی بازک پلیٹوں میں سینڈویچ، کیک، مختلف اقسام کے بسکٹ اور تلی ہوئی پھلی پہلے سے رکھ دی گئی تھی۔ چائے کی پیالیاں، گلاس، اور مشروب کی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ یہ ساری تیاری اس لیے کی گئی تھی کہ ہم خود ہر چیز لے سکیں کیونکہ وہاں ہماری خدمت کے لیے کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔

”میں چاہتی تھی کہ اس تقریب میں صرف بین لوپ کی قریبی سہیلیاں ہی شریک ہوں۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”مجھے زیادہ لوگوں کو جمع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ تم لوگ آرام سے بیٹھو اور تقریب کا انتظار کے بغیر کھانا چٹا شروع کر دو۔“ ہمیں یہ اہتمام دیکھ کر اسکول میں ملنے والا کھانا یاد آیا۔ ہمیں وہاں ناشتے اور کھانے میں دلیا، گوشت کے چند ٹکڑے اور خوب کچی ہوئی سبزیاں ملتی تھیں۔ ہمیں وہ پھر کے کھانے کے بعد صرف دو تالیاں کھانے کی اجازت تھی اور اس دوران بھی ہماری نگرانی ہوتی رہتی تھی جبکہ اس پارٹی میں ہمارے سامنے جو کچھ رکھا ہوا تھا، اس کا تو ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

گوکہ وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ اس طرح کے تبصرے کیے جاتے کیونکہ یہ ایک بدشگونی ہوتی اس لیے ہم نے بعد میں اس پر غصہ کیا۔ البتہ اس وقت ہم اس تقریب میں شرکت کر کے بہت خوش تھے اور دوسرے دن اس کی شادی میں آنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

ہم نے اس تقریب میں شرکت کے لیے چمکے رنگوں کے لباس منتخب کیے تھے اور چند ایک نے تو ہیٹ اور سوئی وستا نے بھی پہن رکھے تھے البتہ جین کا لباس سب سے مختلف اور معمولی تھا۔ اس نے لینن کی چٹلون اور سفید تھیں پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر پیالہ رکھ کر چاروں طرف سے اس کے بال کاٹ دیے ہوں۔ ہم امید کر رہے تھے کہ شاید اس موقع پر ہم پرس سے ملاقات کر سکیں۔

ابتداء میں تو صرف بین لوپ کی ماں ہی وہاں تھی۔ وہ مسلسل ہمارے گرد و نفل لاری تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ ہم کھانے میں کوئی تکلف نہ کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہماری پلیٹوں میں تمام چیزیں موجود ہوں اور گلاس مشروب سے بھرے ہوئے ہوں۔

ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ شراب پی اور خوش گپیاں کرتے رہے جب تک کہ بین لوپ خود وہاں نہ آگئی۔ وہ بغیر آستینوں والے گلابی لباس میں بہت خوبصورت اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھائی ہوئی تھی جس سے اس کا حسن اور گھمراہا تھا۔

وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور تمام میزوں پر جا کر ہر ایک سے فردا فردا گلے لگتی اور..... بوسہ لینے ہوئے بولی۔ ”تمہاری آمد کا شکریہ.....“ یہ الفاظ اس نے اطالوی زبان میں ادا کیے اور ہمیں یوں لگا جیسے وہ کسی ادبیرا میں۔ نگاری ہو پھر اس نے ایک سینڈویچ اور مشروب کا گلاس اٹھایا اور کھڑے کھڑے اس کے گھونٹ لینے لگی۔

کچھ دیر بعد پرس بھی آگیا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ سیاہ بال، دہلا پتلا اور درمیانہ قد..... وہ بالکل سیدھا اور باوقار انداز میں چل رہا تھا اس لیے اپنے اصلی قد سے کچھ زیادہ ہی نظر آیا۔ وہ جب صحن پار کر کے ہمارے پاس آیا تو یوں لگا کہ وہ رقص کر رہا ہو لیکن اس کے چلنے کا انداز ہی ایسا تھا۔

جین نے شلا سے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمیں اسکول میں بتایا جاتا تھا کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں لیکن دیکھو، کچھ لوگ بہت خوبصورت، اسارٹ اور امیر ہوتے ہیں اور کیونکہ ان کے پاس دولت ہوتی ہے، اس لیے وہ خوب صورت لڑکیوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔“

شہزادہ صرف خوبصورت اور اسارٹ ہی نہیں بلکہ مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک بھی تھا۔ اس نے جبکہ ہمارے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اطالوی زبان میں چند خوب صورت جملے ادا کیے جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئے لیکن بین لوپ نے ان کا ترجمہ کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بین لوپ کتنی خوش قسمت ہے کہ اسے اتنی خوبصورت سہیلیاں ملیں۔“

گوکہ ہم سب اتنے خوبصورت یا اچھے نہیں تھے لیکن ہم نے محسوس کیا کہ اس نے ہم سے ہر ایک میں کوئی قابل قدر خوبی دیکھی ہوگی، سچی وہ ہمیں دیر تک اپنی سیاہ چمکدار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

پھر اس نے ایک گلاس پر کانٹا مار کر خاموشی اختیار کرنے کے لیے کہا اور ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اب وہ ہمارے سامنے کھڑا منکر رہا تھا۔ اس نے اپنی جب سے ایک سرخ ویلٹ کی ڈیٹا نکالی پھر اس نے اسے ہوا میں یوں اٹھرایا جیسے کوئی جادوگر ہیٹ میں سے رومال نکالتا ہے پھر اس نے وہ ڈیٹا بین لوپ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”محبت کے ساتھ اور ایک بار پھر شلا کے آنسو بہنے لگے۔

بین لوپ نے وہ ڈیٹا کھول کر اس میں سے ایک شاندار پوکر..... زبرد کی انگوٹھی نکالی۔ شہزادے نے اطالوی زبان میں بتایا کہ یہ ان کی خاندانی انگوٹھی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی اس کی دادی تک پہنچی اور اب وہ اسے اپنی منگیت کو پہنا رہا ہے۔ ایک بار پھر بین لوپ نے ہمیں سمجھانے کے لیے اس کا ترجمہ کیا اور ہمیں یوں لگا کہ یہ کارروائی کچھ زیادہ ہی طویل چک رہی ہے جس کی طرف بعد میں میری نے بھی اشارہ کیا لیکن اس وقت ہم نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ ایک..... وہ اطالوی بول رہا تھا جس کا ترجمہ کرنے میں بھی کچھ وقت لگا اور پھر اس میں تھوڑا

ساؤرامائی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس پر شیلہ نے تہمیرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بالکل کسی اعلیٰ اور اجیرا کا منظر لگ رہا تھا جب بین لوپ نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اس کا بوسہ لیا۔“

ہم سب اپنی گردنیں اٹھا کر اس انگوٹھی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بین لوپ کی ماں نے قریب آ کر اس کی تعریف کی اور اسے میز پر رکھ دیا تاکہ ہر کوئی باری باری اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اسے اچھی طرح دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی جام صحت پینے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

کئی لوگ باری بین لوپ کے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے لگے تو ہمیں جیسا کہ جام صحت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ گوکہ اس مرحلے پر کچھ باتیں تو ہڈی ہی عجیب نظر آئیں۔ ہم نے دیکھا کہ شہزادہ ایک میز سے دوسری میز پر جا رہا تھا، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم سب کے گلاسوں میں شراب موجود ہے۔ کئی برس بعد جب ہم نے اس بارے میں بات کی تو کسی کو یاد نہیں تھا کہ کتنے شراب کے گلاس نوش کیے گئے۔ شہزادہ تقریب سے سب گیا اور انگوٹھی کس کے ہاتھ میں تھی۔

البتہ ہمیں اتنا ضرور یاد تھا کہ اس روز سب لوگوں نے شراب کے کئی گلاس حلق میں اٹھ لیے اور خوب ڈنک کر کھایا۔ جب بین لوپ نے ہمارے لائے ہوئے حقے کھولے تو میز پر گلابی اور سفید نشو پھڑ زکاؤں کا ڈھیر لگا گیا۔ جب بھی کوئی پیٹٹ کھولا جاتا تو اس پر تہمیرہ کے لیے جاتے اور قہقہہ لگنا شروع ہو جاتے۔ سب سے زیادہ مذاق جولیا کا بنا جو اس کے لیے اٹھ بے چینی کی مشین لائی تھی جو موقع کی مناسبت سے ایک نامعقول خفہ تھا۔

اس کے بعد بین لوپ نے کھڑے ہو کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور دفتر یا روتے ہوئے کہا کہ اس کی زندگی میں ہماری کتنی اہمیت ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے بازو پھیلا دیے جس طرح وہ گلاس روم میں گتے ہوئے کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ سب اس سے ملنے کے لیے اٹنی ضرور آئیں اور جتنا عرصہ چاہیں اس کے پاس قیام کریں۔ اس کے دلا میں ہمارے لیے بہت کمرے تھے اور ہمارے آنے کی اسے بہت خوشی ہوگی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اسکول نے اس کی زندگی بنا دی اور باپ کے مرنے کے بعد وہی اس کا گھر بن گیا۔ اگر اسکول نہ ہوتا تو اس کی زندگی عذاب بنا دیتی۔ یہ سن کر اس کی ماں نے قہقہہ لگا دیا اور بولی کہ یہ سچ ہے۔

پھر اسے اچانک یاد آ گیا اور وہ بولی۔ ”میری انگوٹھی کہاں ہے؟ میرا خیال ہے کہ سب لوگ اسے اچھی طرح دیکھ چکے ہیں، اس لیے اب میں اسے واپس لیتا چاہوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک ایک کر کے تمام میز پر دیکھ ڈالیں لیکن اسے وہ انگوٹھی کہیں نظر نہیں آئی۔ ہم نے بھی اس کی تعریف کی اور ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ کیا وہ انگوٹھی تمہارے پاس ہے؟ جب سب لوگوں نے اعلیٰ ظاہر کی تو ہمارا اضطراب بڑھنے لگا۔ ہم نے میزوں پر سے میز پوش ہٹا دیے۔ تمام پلیٹیں اور گلاس دیکھ ڈالے۔ میزوں کے پیچھے فرش پر نگاہ دوڑائی۔ یہاں تک کہ کھلے بھی دیکھ لیے لیکن وہ زمرہ کی انگوٹھی ایسے غائب ہوئی جیسے اچانک نیند سے بیدار ہونے پر خواب بکھر جاتے ہیں۔

ایک تکلیف دہ خاموشی نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر بین لوپ کی آواز آئی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اسے یہیں ہونا چاہیے۔ میں یقین نہیں کر سکتی کہ اسے کسی نے اٹھا یا ہوگا۔“

میری نے تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ہر کوئی کھڑے ہو کر حلقہ اتر کر دیکھ کر دیکھ کر انگوٹھی اس کے پاس نہیں ہے اور اگر کسی نے وہ انگوٹھی اٹھا لی ہے تو وہ جیکے سے یہاں رکھ دے جیسا کہ ہم اسکول میں کیا کرتے تھے۔ شاید کسی نے مذاق میں یہ حرکت کی ہو۔

اس نے ہم سب سے اجیل کی اور یاد دلایا کہ ہم کس طرح ان اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ اگر کوئی غلط حرکت کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ اپنا جرم تسلیم کر لیتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ ایمان داری اور سچائی کی تعلیم دی تھی۔ یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی بھی خواب گاہ کی روئشیاں گل ہونے کے بعد باہر نہیں نکلتا تھا کہ کہیں کسی دوسرے کی نیند خراب ہو اور نہ ہم نے بھی کسی کے کام کی قتل کی۔

اس کے کہنے پر ہم سب باری باری کھڑے ہوئے اور حلقہ کیا کہ ہم نے وہ انگوٹھی نہیں اٹھا لی۔ بین لوپ نے ہم پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگی۔ ”اب میں کیا کروں؟ فیئر یزو سے کیا کہوں گی؟“ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

بین لوپ کی ماں نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے شراب کا سہارا لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”وہ انگوٹھی اموں ہے اور اگر واپس نہ لی تو مجبوراً

پولیس کو بلانا پڑے گا پھر سب کی سلامتی ہوگی اور اس وقت تک کوئی یہاں سے نہیں جائے گا۔“

میری نے چاروں طرف مایوسی سے دیکھا اور بولی۔ ”ہم بھی یقیناً اس واقعے کی تفسیر نہیں چاہیں گے اور اگر پولیس نے پوچھ چکے یا ہماری سلامتی کی تو یہ نہ صرف ہمارے بلکہ ہمارے پرانے اسکول کے لیے بھی باعث شرم ہوگا۔ ہم سب بین لوپ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہماری بہت ہی پیاری دوست ہے۔“ اس نے تجویز پیش کی کہ ہم سب ایک نئی انگوٹھی خریدنے کے لیے چندہ کر کے رقم اکٹھی کریں کیونکہ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ ہم اس کے لیے نیکے تحائف کا بندوبست تو نہ کر سکے لیکن ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق اسے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کی اموں انگوٹھی چرائی ہے اور ہمیں مل کر اس نقصان کی تلافی کرنی چاہیے۔ اگر بین لوپ اور اس کی ماں آزار و اکرم ہماری یہ پیشکش قبول کر لیں۔ بین لوپ نے اپنی ماں سے التجا کی کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کرے۔ وہ یہی کہتی رہی کہ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر سارے میز پوش اٹھا کر دیکھے۔ میزوں کے نیچے جھانکا جبکہ میری ہم لوگوں سے چپک دھول کر رہی اور اس نے جمع ہونے والی رقم کا اعلان بھی کر دیا جس میں اس کا اپنا حصہ بھی شامل تھا۔ اس نے سب لوگوں اور ان کی جانب سے عطیہ کی جانے والی رقم کی تفصیل ایک کاغذ پر لکھی۔

ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ جین کی مالی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس نے سب سے زیادہ رقم عطیے کے طور پر دی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ ممکن ہے، اسی نے انگوٹھی چرائی ہو جبکہ دوسرے لوگ میری پر خفہ کر رہے تھے کیونکہ اس نے پولیس کی پوچھ چھ اور سلامتی سے بچنے کے لیے ہم سب کو اس نقصان کی تلافی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

دوسرے روز ہم میں سے کسی نے بھی شادی میں شرکت کرنے اور اس کا جشن منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم سب اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے جیسے ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو لہذا ہم بین لوپ کو سفید عروسی لباس پہنے اور ہاتھ میں نگہ بست پکڑے شادی کے چوپترے کی طرف جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ البتہ اس کی ایک ہلکے انداز و احتیاط تصویر اخبار میں ضرور دیکھی گئی بلکہ اس کے بعد ہم نے کئی سال تک اسے دوبارہ نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا جس پر ہمیں بہت دکھ ہوا اور یہ شک

کنزینیں

☆ ہم معیبت انسان کو پریشان کرنے کے لیے نہیں بلکہ انسان کو بیدار کرنے کے لیے آتی ہے تاکہ انسان کا رابطہ اپنے رب سے بحال رہے۔

☆ زندگی میں ”اموئل“ چیز بھی نہ توڑنا۔ دل، دوستی، بھروسہ، رشتہ، پیار، وعدہ کیونکہ یہ جب ٹوٹتے ہیں تو آواز نہیں آتی لیکن درد بہت ہوتا ہے۔

☆ عزت، احساس، پیار، شفقت اور محبت ایسے ادھار ہیں جو ضرور واپس ملتے ہیں۔

☆ جس طرح لوگ مُردے کو کوندا دینا افضل سمجھتے ہیں، اسی طرح اگر زندہ کو سہارا دینا افضل سمجھ لیں تو زندگی حقیقی آسان ہو جائے۔

☆ خوف خدا ایک ایسا چراغ ہے جس کی روشنی میں نیکی اور بدی کی صاف نظر آتی ہے۔

☆ جب بھوک دروازے پر دنگ دیتی ہے تو عقیدے کھڑکیوں سے بھاگ جاتے ہیں۔

☆ حسد دراصل ایک اعلان ہے، اس بات کا کہ میں اللہ کی تعظیم پر راضی نہیں۔

☆ صبر کے بغیر زندگی میں سکون آئی نہیں سکتا اور صبر کے لیے اس بات کا ادراک بہت ضروری ہے کہ مجھ تک پہنچنے والی ہر آزمائش مناجاتِ رب ہے۔

☆ سب سے بہترین مددگار تمہارے اپنے دونوں ہاتھ ہیں جب تم اپنی مشکلات کا حل تلاش نہ کر سکو تو اپنے دونوں ہاتھ اکٹھے جوڑ کر اللہ کے آگے پھیلاؤ۔ اللہ آپ کے ہاتھوں کو بھی خالی نہیں لوٹائے گا۔

☆ دنیا میں سب سے وزنی چیز خالی جیب ہے جسے لے کر چلنا بہت مشکل کام ہے۔

☆ سلسلہ: راحیلہ شفیق، سندھی ہوئی، نیو کراچی

”حکمت اسی میں ہے کہ تم ادویوں سے بنا کر رکھو گے۔ تمہیں تعاقب کرنے والوں سے خطرہ ہے۔ اگر ادوی بھی تم سے نالاں ہو کر تم سے لڑنے کے لیے نکل آئے تو سوچو دو دو طاقتوں سے کیسے لڑو گے۔“
یہ دیکھی ایسی تھی کہ بنی اسرائیل کو خاموش ہونا پڑا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ لوٹ مار نہیں کریں گے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو شاہِ ادوم کے پاس بھیجا۔

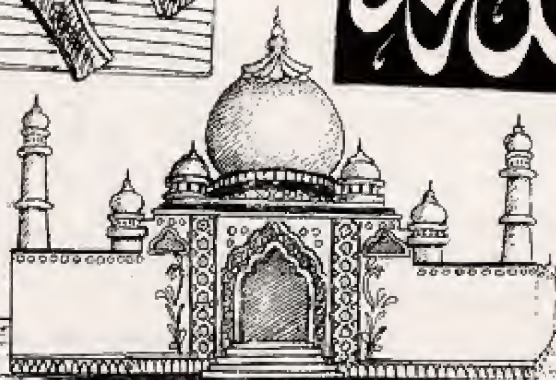
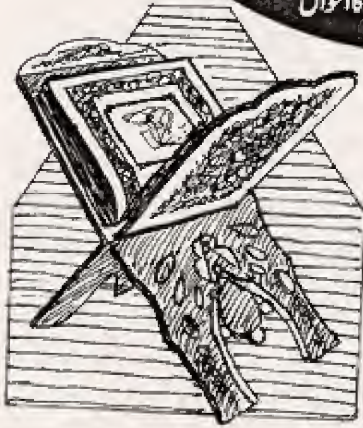
حضرت موسیٰ

رضوانہ صاحبہ

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔۔۔ یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا۔۔۔ ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے۔۔۔ حیرت ہے قدرت نہیں کیسے کیسے نظارہ دکھائی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہوئے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے۔۔۔ جسے اللہ نے فرعون کی پلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا۔۔۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر سرعونی سازشیں اور
پیغمبر کے معجزات کا احوال

رسوالِ حصہ



جولیانے بتایا کہ وہ اطالوی زبان پڑھا رہی ہے۔
ہم سب کھانے کے دوران ایک میز کے گرد اترے
کی شکل میں بیٹھے بین لوپ کے بولنے کا انتظار کر رہے
تھے۔ ہمارا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ گنگنا رہی تھی
جیسے اسے کوئی روک رہا ہو پھر اس نے رک رک کر بولنا
شروع کیا۔

اس کی ماں اپنا تمام اثاثہ گنوا چکی تھی اور شہزادے
کے پاس بھی اس حستہ حال ولا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے
صرف اس لالچ میں بین لوپ سے شادی کی تھی کہ وہ اسے
ایک امیر زادی بھگتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اپنے باپ کی
بے تحاشا دولت لے کر آئے گی کیونکہ وہ اس کی انگوٹھی
وارث تھی اور یہ کہ اس کے قدیم دلا کی اچھی طرح دیکھ بھال
کر سکے گی۔

بین لوپ نے ہچکیاں لیے ہوئے بتایا کہ اس تقریب
میں جس اصول انگوٹھی کے چوری ہوئے پر ہنگامہ ہوا، اس کا
کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ مگر وہ منگنی کی انگوٹھی پہننا چاہ رہی تھی
لیکن شہزادے کے پاس اسے خریدنے کے لیے پیسے نہیں
تھے۔ اس کا تمام اثاثہ بہت پہلے کر دی رکھا جا چکا تھا۔ ہم
نے جس انگوٹھی کو دیکھا کہ اس کی ٹرینیں کی تھیں، وہ ٹنگی تھی اور
وہ بھی کم نہیں ہوئی بلکہ خفیہ طریقے سے شہزادے کی جیب
میں چلی گئی تھی۔

”اطالوی..... چیزیں چرانے میں ماہر ہیں۔“ اس
نے ایک مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے جو انگوٹھی پہن رکھی
تھی، وہ ہمارے پیسوں سے خریدی گئی تھی۔ اس نے وہ
انگوٹھی انگلی سے اٹاری اور اپنی ہتھکڑی پر رکھتے ہوئے بولی۔
”اب یہ تمہاری ہے۔ میں یہ انگوٹھی تم لوگوں کو واپس کرنا
چاہتی ہوں۔ غالباً اتنے سالوں بعد اس کی قیمت میں خاصا
اضافہ ہو گیا ہوگا۔ تم اسے فروخت کر کے اس کا منافع آپس
میں بانٹ سکتی ہو۔“

ہم سب نے وہ انگوٹھی لینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں
بین لوپ سے ہمدردی ہو رہی تھی اور ہم سوچنے لگے کہ اس
کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب کتنا دہیات تھا۔ اسے
بعد ازاں قیاس ہی کہا جاسکتا ہے۔ رخصت ہوتے وقت اس کی
آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہمیں شک ہے
بتایا گیا تھا۔ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں۔ ہم دونوں
فلذائی میں مبتلا تھے۔ میں اسے شہزادہ اور وہ مجھے امیر زادی
سمجھتا رہا جس کا یہی نتیجہ نکلا تھا۔“

ہوئے لگا کہ شاید اس نے ہمیں معاف نہیں کیا۔ یہاں تک
کہ میری کے پاس بھی اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔
اس دوران دنوں اس نے ہمیں مدعو کیا اور نہ ہی ہم نے اپنے
طور پر اٹلی جانے اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔
تقریباً تیس سال بعد وہ اٹلی سے جنوبی افریقا واپس
آئی اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے اسے
اسکول کی تقریب میں اپنے درمیان دیکھا۔ ہم سب اس
سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ وہ اب بھی سلیٹی رنگ کے
اسکرٹ میں پہلے کی طرح وہیلی اور اساتیر نظر آرہی تھی۔
مگر اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور چہلہ پر چاہتا
سیاہ وہ بچہ نمودار ہو گئے تھے۔

کھانے کے دوران جب میری نے اس سے اس کی
موجودہ زندگی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس
کی ماں جو کبھی برس تک اس کے ساتھ دلا میں مقیم رہی، عرصہ
ہوا انتقال کر چکی تھی لیکن وہ صرف ہم لوگوں سے ملنے اور
ایک اہم بات بتانے کے لیے یہاں واپس آئی ہے جو وہ کئی
سالوں سے ہمیں بتانا چاہ رہی تھی۔

”ایسی کیا خاص بات ہے جسے بتانے کے لیے تمہیں
اتنا لمبا سفر کرنا پڑا؟“ میری نے پوچھا، وہ کچھ پریشان نظر
آ رہی تھی۔

ہم سب ایک عرصے بعد ملے تھے اس لیے فطری طور
پر ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے خواہش مند
تھے۔ چین نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اکاؤنٹ ہے
اور اس کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے۔ وہ نیوی یلو
سوٹ میں کافی صحت مند اور خوش حال نظر آرہی تھی۔ اس
نے کنٹیکٹ لینس لگا لیے تھے اور غریبوں کی بھلائی کے لیے
کام کر رہی تھی۔ اس نے شیا کو بتایا کہ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ
یہاں کے سیاہ فام اتنے ناراض اور تنگ ہو سکتے ہیں۔ وہ جب
مجھے گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس پر آواز سے کسنا شروع
کر دیتے ہیں۔

میری کا ایک بچہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا
تھا۔ وہ بالکل خاموش اور الگ تھلگ تھی اور اسے انتظار تھا
کہ بین لوپ اپنے بارے میں بتائے۔ وہ جانتا چاہ رہی تھی
کہ آخر ایسی کون سی اہم بات ہے جسے بتانے کے لیے بین
لوپ یہاں آئی ہے۔

شیلا پبلشر کی اور کئی کتابیں شائع کر چکی تھی۔ اس نے
بتایا کہ اس نے پہلے شوہر سے طلاق لینے کے بعد دوسری
شادی کر لی ہے اور اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہے۔

اس کا بھیجا چیخنے چلانے لگا کہ یہی لوگ اس کے قاتل ہیں۔ قہیلے کے بزرگوں نے ان سب کو اپنے پاس روک لیا۔ وہ لوگ سخت پریشان ہوئے کہ ہم نے تو نیکی کی تھی۔ ہم اس کے قاتل ہرگز نہیں ہیں۔
لو جو ان بھیجے نے انہیں بتایا کہ تمہارے قہیلے کے کچھ لوگوں نے میرے بچے سے قرض لیا ہوا تھا اور اب قرض لوٹانے سے انکار کر رہے تھے۔ حرکت ان ہی میں سے کچھ لوگوں کی ہوگی۔ مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا جس دروازے پر لاش ملی ہے، وہ واقعی اس کے بچے کا قرض دار تھا۔ اسے بھی بلوایا گیا۔ اس نے بھی کہا کہ لاش میرے دروازے پر ضرور پڑی تھی لیکن میں نے اسے نہیں لیا۔ اس نے جو دلیل دی، وہ سب کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بتایا کہ اگر وہ قتل کرتا تو لاش اپنے دروازے پر ہی کیوں پھینکتا۔ کہیں دور جا کر پھینکتا۔

اس سے لوگوں نے یہ مطلب نکالا کہ اسی قہیلے کے کسی دوسرے قرض دار نے قتل کیا ہے اور لاش کسی دوسرے قرض دار کے دروازے پر پھینک دی۔
پوری رات گزر گئی لیکن کوئی کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ دوسرے دن دوسرے قرض داروں کو بھی بلایا گیا۔ انہوں نے بھی لاشی کا اظہار کیا۔

ان کے انکار کے بعد معاملہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ نتیجے کا اصرار تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے مل کر میرے بچے کو قتل کیا ہے اور اب انکار کر رہے ہیں۔
دوسرے قہیلے والوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے تو وہ ہتھیار بند ہو کر آگئے۔ ادھر کے لوگ بھی لڑنے کو تیار ہو گئے۔

معاملہ آپس کی لڑائی تک پہنچ گیا تھا کہ چند معززین درمیان میں آ گئے۔
”فسوس کی بات ہے کہ ہم کسی ثبوت پر پہنچے بغیر آپس میں لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ ہمارے درمیان موسیٰ موجود ہیں۔ ہمیں ان کے پاس مقدمہ لے کر جانا چاہیے۔ شاید ان کے پاس کوئی حل موجود ہو۔“
سب لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ ابتدائی بیانات سے وہ بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ پہلے تو انہوں نے بھی یہ رائے دی کہ اس معاملے کو ہمیں رفع دفع کر دیا جائے لیکن معززین نے زور دیا کہ اس معاملے کی شہادت پہنچ جائے ورنہ دلوں میں شک باقی رہ جائے گا اور دونوں قہیلے آپس میں لڑتے رہیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے رجوع کیا۔
”اس واقعے نے قوم میں سخت اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ تو علیم و حکیم ہے، میری مدد فرما۔“
اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان سے کہہ دے کہ ایک ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے ایک حصے کو مقتول کے جسم سے مس کریں۔ پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندہ کی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے قوم! تم ایک ایک گائے ذبح کرو۔“
معاملہ حل کا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم دے رہے تھے کہ گائے ذبح کرو۔
بنی اسرائیل نے کہا۔ ”موسیٰ..... کیا تم ہم سے کسی مذاق کرتے ہو۔“
”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کسی مذاق کی باتوں سے۔“

”پھر تم یہ کیا حکم دے رہے ہو کہ ہم قاتل کا سراغ لگانے کے بجائے ایک گائے ذبح کریں۔“
”تم گائے ذبح کرو گے اور اس کے جسم کا ایک حصہ مقتول کے جسم سے مس کرو گے تو مقتول زندہ ہو کر خود بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔“

بنی اسرائیل کے نزدیک یہ اس سے بھی زیادہ ہنسی کی بات تھی۔ ہنسنے والوں میں مقتول کے بھتیجے کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی ایسا حل نکال رہے ہیں جس سے قاتل کا پتا بھی نہ چل سکے۔ یا ہو سکتا ہے مقتول واقعی زندہ ہو جائے اس لیے کسی بھی طرح انہیں ”ذبح بقرہ“ سے روکا جائے۔

”موسیٰ، میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ میرے بچے کے قتل کا معاملہ ہو لیکن شاید تو نہیں چاہتا کہ قاتل کا سراغ لگے۔ پھر ہم گائے بھی کیوں ذبح کریں۔ میں اپنے بچے کے قتل کو تیرے خدا پر چھوڑتا ہوں۔ مرنے والا تو مر گیا، اب زیادہ تنگ دو کرنے سے کیا فائدہ۔“

”تیرا بھائی اسرائیل یہ عرض کرتا ہے کہ تو ہماری سب مصیبتوں سے جو ہم پر آئیں، اچھی طرح واقف ہے۔ ہمارے باپ دادا مصر میں گئے اور ہم بہت مدت تک مصر میں رہے اور مصریوں نے ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے برابر تالا دیا اور جب ہم نے خداوند سے فریاد کی تو اس نے ہماری سنی اور ایک فرشتہ بھیج کر ہم کو مصر سے نکال لے آیا اور اب ہم قاتل شہر میں ہیں جو تیری سرحد کے آخر میں واقع ہے۔ سو ہم کو اپنے ملک میں سے ہو کر جانے کی اجازت دے۔“
شاہ اودم نے ان انہیوں کو بائیس لوٹا دیا۔

”میں تجھے اپنے ملک سے ہو کر نہیں گزرنے دوں گا۔ اگر تیرے لاکھوں آدمی میرے ملک میں فساد پھیلا دیں گے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اس لیے اگر تو ادھر سے گزرا تو میں تیرا مقابلہ کروں گا۔“
بنی اسرائیل نے دوسری سفارت بھیجی اور کہلوا یا۔

”ہم کھیتوں اور تاکستانوں سے ہو کر نہیں گزریں گے۔ سڑک ہی سڑک جا رہیں گے۔ پانی نہیں پئیں گے۔ اگر ہم یا ہمارے چوپائے پانی پئیں گے تو ہم اس کی قیمت ادا کریں گے۔ دائیں یا بائیں ہاتھ نہیں مڑیں گے جب تک تیری سرحد سے باہر نہ نکل جائیں۔“

شاہ اودم نے پھر انکار کر دیا اور ہتھیار بند آدمیوں کو لے کر باہر نکل آیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ یہ ہمارے بھائی ہندوں کی سرزمین ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہوگی۔ زور بردستی نہیں کر سکتے۔ بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ شاہ اودم سے لڑائی کریں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں روک دیا۔
”مجھے خداوند نے کہا ہے کہ میں کوہ طور پر پہنچوں۔ وہ علاقہ بہت محفوظ ہے، ہمیں دشمنوں سے پناہ دے گا۔“ بنی اسرائیل اس وقت تعاقب کرنے والوں سے بہت خوفزدہ تھے لہذا فوراً حکم مان لیا اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔
یہ علاقہ اودم کی سرحد کے قریب تھا۔

☆☆☆

اسی صحرانوردی کے دنوں میں کسی مقام پر ”ذبح بقرہ“ کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس واقعے سے بنی اسرائیل کی ذہنیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی تک کن خرافات میں گمراہ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے معجزات اس قوم کو دکھائے، ان میں سے یہ بھی ایک تھا۔ اس واقعے سے بھی اللہ تعالیٰ کو بہت سی باتیں ان پر ظاہر کرنا چاہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک بالدار شخص تھا۔ روایات کے مطابق اس کا نام کاہیل بتایا جاتا ہے۔ اس کا ایک بھیجا نہایت حریص تھا اور بچا کی دولت پر آنکھ کے بیٹھا تھا۔ بچے کے کوئی اولاد نہ تھی، وہ اگر مرنا تو ساری دولت خود بخود بچے کو مل جاتی لیکن بچے کو مہر نہ ہوتا تھا۔ چاہتا تھا بوڑھا جلد مرے تو وہ اس کی دولت پر قبضہ کرے لیکن بوڑھے کا حال یہ تھا کہ اس کی صحت سے ہرگز ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ مقرب مرنے والا ہے۔ نتیجہ اسے قتل کرنے کے رہے تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں راز نہ کھل جائے۔ پھر ایک دن اسے ایک ترکیب سوچی۔ اس بوڑھے بالدار سے کئی لوگوں نے قرض لیا ہوا تھا۔ نتیجے نے سوچا، چچا کو قتل کر کے کسی ایسے ہی قرض دار کے دروازے پر ڈال دے۔ اس طرح لوگوں کو یہی شک ہوگا کہ بچے نے بچہ بچہ اہوا ہوگا، قرض دار نے اسے مار دیا۔ اب اسے یہ طے کرنا تھا کہ کس دروازے کا انتخاب کیا جائے۔ اس نے ایک ایسے قہیلے کا انتخاب کیا جس سے اس کے قہیلے کی دشمنی نہ تھی۔

ایک رات جب اس کا چچا گہری نیند سو رہا ہوا تھا، اس نے اسے قتل کر دیا اور رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بوڑھے کی لاش کو اٹھا یا اور بڑی دورے لے کر مخالف قہیلے کے اس شخص کے دروازے پر لاش پھینک دیا۔ گھبراتے کے بعد خاموشی سے اپنے بستر میں دیک گیا اور صبح ہونے کے انتظار میں جاگتا رہا۔ صبح ہوئے ہی وہ گھر سے باہر آیا اور شور مچا دیا کہ اس کا چچا رات کو بستر پر سو رہا تھا لیکن اب بستر پر نہیں ہے۔ شاید کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔

”اسے کون اغوا کرے گا اور کیوں کرے گا؟“
”اس نے بہت سے لوگوں کو قرض دیا ہوا تھا۔ وہ لوگ اسے دھمکیاں بھی دیتے رہے تھے۔ انہی میں سے کسی نے اسے اغوا کیا ہوگا۔“ قہیلے کے دوسرے لوگوں نے بھی اس کے ساتھ مل کر تلاش شروع کر دی۔
جب پورا دن گزر گیا تو مخالف قہیلے کے کچھ لوگ بچا کی لاش اٹھا کر آئے اور انہوں نے بتایا کہ کسی نے ہمیں لڑوانے کے لیے اسے قتل کر کے ہمارے دروازے پر پھینک دیا تھا۔

کے ہاتھ بھی گائے بیچنے سے انکار کر دیا اور یہی کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگ آئیں گے، یہ گائے میں ان کے ہاتھ فروخت کروں گا۔ جب نوجوان نے بتایا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف سے آیا ہے تو وہ تیار ہو گیا لیکن قیمت اتنی زیادہ بتائی کہ اسرائیلی نوجوان یہ قیمت ادا کرنے سے قاصر رہا۔

”میں جب تک اس کی قیمت ادا کرنے کے قائل نہ ہو جاؤں اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کرنا۔“

”مجھے معلوم ہے فرشتے کی بات غلط نہیں ہو سکتی اس لیے تم ہی آؤ گے اور اسے خریدو گے۔“

”بس دو چار دن کی بات ہے۔ میں جلد تمہارے پاس آؤں گا۔“

اس نوجوان نے فیصلے میں آکر سب کو بتایا کہ اس نے ایسی گائے دیکھ لی ہے اور وہ منقریب اسے خریدنے جائے گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ میں اسے خرید نہیں سکتا۔ ہم سب مل کر اسے خریدیں تو خریدیں۔

”ہم کیوں خریدیں۔ جس کا بچا چھرا ہے وہی اسے خریدے۔ اس کے پاس اب دولت بھی بہت ہو گئی ہے۔ وہ اپنے چچا کے قاتلوں کو پکڑوانے کے لیے ضرور اسے خرید لے گا۔“

سب مل کر اس کے پاس گئے تو وہ پہلو بٹنی کرنے لگا۔

”میرے پاس دولت ہے لیکن اس لیے نہیں ہے کہ گائے خریدوں اور پھر اس پیش قیمت گائے کو کاٹ دوں۔“

”موسیٰ کہتے ہیں اس گائے کے ذریعے تمہارے چچا کے قاتل پکڑ لیے جائیں گے۔ کیا تم یہ نہیں چاہو گے؟“

”جو قاتل پکڑے جائیں گے انہیں تو تم لوگ سزا دے دو گے۔ گائے پر خرچ کی گئی میری دولت کا کیا ہوگا۔“

”تم عجیب بیچے ہو۔ اپنے بچا کی دولت پر قابض بھی ہو اور اس کے قاتل کو بھی پکڑنا نہیں چاہتے۔“

لوگوں نے اسے خوب لعنت ملامت کی لیکن وہ نہیں مانا۔ معاملہ ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی مشورہ دیا کہ یہ گائے مقتول کے بیچے ہی کو خریدنی چاہیے۔

اس وقت تک بہت سے یوزرے لوگ مرتبے تھے۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیروی کرتے تھے اور یہ معاملہ تو تھا ہی ایسا دلچسپ کہ ہر شخص دیکھنا چاہتا تھا کہ مقتول کیسے زندہ ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی اجازت مل گئی تو ان نوجوانوں نے چند اپنے سے بڑوں کو ساتھ لیا اور مقتول کے بیچے کے گھر کا گھیراؤ کر لیا اور اسے بچہ کر لیا کہ وہ گائے کی قیمت ادا کرے۔

وہ فیصلے سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا، انہیں بھاگ جائے یہ بھی اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دروازے پر سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔

اس نے مجبور ہو کر گائے کی خریداری کا دم بھریا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ گیا اور گائے خرید کر لے آیا۔ اس گائے کو کچھ کر بعض یوزرے لوگوں نے شہادت دی کہ ایسی ہی زرد گائے انہوں نے فرعون کے پاس دیکھی تھی۔ وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔

یہ سن کر پوری قوم افسوس کرنے لگی بلکہ بعض کے منہ سے تو یہ نکل گیا کہ کاش! ایسی زرد گائے کی پرستش ہم کرتے۔ موسیٰ نے اسے کاٹنے کا حکم کیوں دے دیا۔ مقتول کے بیچے نے ایک مرتبہ پھر قوم کو درغلانی کی کوشش کی۔

”تم کو تو ایسی ہی ایک گائے اور خرید کر دوں۔ تم اس کی پرستش کیا کرنا۔“

بہت سے لوگ اس کے ہنوا ہو بھی گئے تھے لیکن باقیوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔

”اگر ہمیں پرستش کرنی ہے تو دوسری گائے لاوے۔ اسے تو ہم کٹ کر رہیں گے تاکہ حقیقت کھلے مگر پھر بھی قاتل کا پتا نہ چلا تو ہمارے راستے الگ، موسیٰ کا راستہ جدا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ گائے لے جاتی گئی۔ انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کے بیٹے کو آگے کیا۔

”آگے بڑھو اور اس گائے کو ذبح کر دو۔“

حضرت ہارون کے بیٹے نے گائے کو ذبح کر دیا اور اس کے جسم کے ایک حصے کو مقتول کے بدن سے مٹا کیا۔

”گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو میرا جسم پرس کیا گیا۔ سو وہ کوئی بھی حصہ ہو، واقعے میں جس قدر ذکر ہے، مجھے ہونے کے لیے یہی کافی ہے۔ اگر اس حصے کا تعین بھی ہمارے دینی یا دنیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرمادے مگر اس کو ہم رکھا گیا۔“

قرآن عزیز میں اس واقعے کو اجالا یوں بیان کیا گیا ہے۔

”تو کیسا بھیجتا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تو کیوں نہیں چاہتا کہ تیرے چچا کا قاتل سامنے آئے۔ اگر میری تجویز سے اختلاف کرنا ہی تھا تو میرے پاس کیوں آئے تھے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غور بدلنے ہوئے دیکھے تو دوسرے لوگوں نے مداخلت کی اور اپنے لوگوں سے کہا کہ ہمیں ایک گائے ضرور ذبح کرنی چاہیے تاکہ موسیٰ کی بات رد نہ جائے۔

ان لوگوں کے دلوں میں مصر کی بودی پاش کی وجہ سے گائے کی تقدیس ابھی تک رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گائے کاٹیں۔ کچھ لوگوں نے ہائی بھری تھی کہ وہ گائے کاٹیں گے لیکن بیشتر لوگ اس سے بچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کج بحثی شروع کر دی تاکہ یہ معاملہ ہمیں ختم ہو جائے۔

”موسیٰ! اپنے خدا سے پوچھ کر بتاؤ کہ وہ گائے کسی ہو سکتی اس کی عمر کتنی ہو؟“

”وہ ایسی گائے ہو کہ تو بڑھیا ہو اور نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

”تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔“

”وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو۔“

”یہ تو سب ہو گیا۔“ بنی اسرائیل نے کہا۔ ”ہم تو اب بھی اس گائے کی کیفیت سے آگاہی نہیں ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ اور بتائیے تاکہ ہمیں معلوم ہو۔“

”تم لوگ اپنے لیے خود مشکلات کھڑی کرتے جا رہے ہو۔ بہر حال سن لو کہ وہ ایسی گائے ہو کہ اس نے کبھی کبھتوں میں گناہ نہ چلایا ہو اور نہ کبھتوں کو سیراب کرتی ہو۔“

”کچھ اور بتاؤ۔“

”وہ بے داغ ہو۔ اس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو۔“

بنی اسرائیل نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ گائے درمیانی عمر کی جوان ہو۔ رنگ گہرا زرد ہو۔ محنت کی ماری نہ ہو اور اس کے جسم پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

انہیں پوری طرح یقین تھا کہ نہ ایسی گائے ملے گی اور نہ اسے ذبح کرنے کا موقع آئے گا۔ سب سے زیادہ مقتول کا بیچنا خوش ہو رہا تھا کہ جان بچوئی۔ یہ قتل ہمیشہ معائنہ رہا ہے گا۔

اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ مقتول بچا کی دولت کا وہ تباہ وارث ہو گیا۔ اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ اس کے بچانے وصیت کی تھی کہ میں ہی اس کی دولت کا وارث بنوں گا۔

بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ ان خصوصیات کی حامل گائے کی تلاش کرنے لگے لیکن ایسی گائے کہاں ملتی جس میں یہ تمام خصوصیات ایک جگہ جمع ہو سکی ہوں۔ ہر مرتبہ کی ناکامی انہیں شاد کام کر دیتی تھی۔ وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ گائے کی تقدیس متاثر ہو اور وہ اسے کاٹنے پر مجبور ہوں۔ گویا سالہ پرستی کے واقعے کو برسوں بیت گئے تھے لیکن گائے کی محبت ابھی تک ان کے دلوں سے مٹی نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جا رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ایسی گائے کا ملنا مشکل ہے۔ آپ اس تھکے کو جانے دیں، کیوں ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں امید دلارہے تھے کہ جس قسم کی گائے تم نے اپنے لیے مقرر کی ہے، ڈھونڈتے رہو مل جائے گی۔ ایسی گائے قرب و جوار میں موجود ضرور ہے ورنہ خدا یہ نشانیاں بتاتا ہی نہیں۔ تم ادھر ادھر تلاش کرو۔ یہ گائے تمہیں ضرور ملے گی۔

اس فیصلے میں ایک نوجوان تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت عقیدت مند تھا اور جی جان سے چاہتا تھا کہ جس قسم کی گائے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب کی ہے، وہ نہیں سے فراہم کر دے۔

وہ قریب کی بستیوں میں جا کر ایسی گائے تلاش کرنے لگا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ چکے تھے کہ ادھر ادھر تلاش کرو۔ اس کی محنت ضائع نہیں گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ فلاں گاؤں میں ایک غریب نوجوان کے پاس ایسی گائے موجود ہے اور وہ اسے بیچنے کا خواہاں بھی ہے۔ وہ اسرائیلی نوجوان یہ سن کر اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس گائے کی بہت بھاری قیمت لگ چکی ہے لیکن گائے کا مالک اسے بیچنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ ایک فرشتہ اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اسے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگ اسے خریدیں گے۔ تم منہ مانی قیمت بتا کر ان کے ہاتھ بچنا۔ کسی اور کے ہاتھ فروخت مت کرنا۔ اس اسرائیلی نوجوان نے گائے کے مالک کا پتا پوچھا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ گائے کے مالک نے اس

السلام کے پاس پہنچ گئے۔

”میرے بھائی کیسے ہو؟“

”میری صحت جواب دے گی۔“

”تم ابھی سے تھک گئے۔ ابھی تو ہمیں باب دادا کی سرزمین پر جانا ہے جسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اسرائیلیوں کی سزا مکمل ہونے والی ہے۔ چالیس سال گزرنے کو ہیں۔ ہمیں ان کی ہدایت کے لیے ان کے ساتھ رہنے کو کہا گیا تھا۔ جب وہ بیت المقدس میں داخل ہوں گے تو کیا تم ان کے ساتھ نہ ہو گے؟“

”شاید نہیں۔ مجھے اپنی صحت کی طرف سے فکر ہے۔“

”تم اس حال کو پہنچ گئے اور مجھے خیر تک نہ ہونے دی۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ تم فکر مند ہو۔“

”میں تمہارے لیے خدا سے دعا کر رہا ہوں۔“

یہ دعا قبول ہونے والی نہیں تھی اور خدا انہیں چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کریں اور وہ ان کی دعا کو رد کر دے اس لیے دعا سے پہلے احکام الہی آ گئے۔

”ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے، جانے نہیں پائے گا۔ سو تو ہارون اور اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر کوہ ہور کے اوپر آ جا اور ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے کو پہنا دینا کیونکہ ہارون وہیں وفات پا کر اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کا ماضی گھومنے لگا۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا لیکن رخصائے الہی کے سامنے دم مارنے کا یار نہیں تھا۔

”اچھے بھائی، آپ کو میرے ساتھ کوہ ہور پر چڑھنا ہوگا۔“

”میں نے کہا کہ میں اب چل بھر بھی نہیں سکتا۔“

”خدا نے مجھ سے یہی کہا ہے۔“

”تو پھر وہ یقیناً مجھے پہاڑ تک لے جائے گا۔“

”تم اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لو۔“

یہ دونوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ پر گئے۔ کچھ روز عبادت میں مصروف رہے۔

”تم اپنا لباس اتار دو تاکہ میں اسے تمہارے بیٹے کو پہناؤں کہ یہی حکم خداوندی ہے۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنا لباس اتار کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو پہنا دیا۔ اسی پہاڑ پر حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوئی اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بیٹے انہیں دفن کرنے کے بعد پہاڑ سے اترے اور قوم کو یہ خبر دی۔

حضرت ہارون کی عمر اس وقت 123 سال تھی۔

اسرائیلیوں کی سزا کی مدت اب بہت کم رہ گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہیں اس ملک تک پہنچانا تھا جسے خدا نے انہیں دینے کا وعدہ کیا تھا لہذا انہیں ہور سے کوچ کروا دیا۔ انہوں نے قوم کو حکم دیا کہ یہاں سے کوچ کرو۔

حضرت ہارون کی وفات کو تیس دن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نے کوچ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر بحر قلزم کی طرف چلے تاکہ ملک اودم کے باہر باہر گھوم کر جائیں۔

اب وہ ایک ایسے لختی وادی صحرا سے گزر رہے تھے جہاں دور دور تک... پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ جتنا پانی ساتھ لائے تھے اسی پر ہونہ ہونہ کر کے گزارہ ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کی جان عاجز آ گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر موسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام انہیں سمجھا رہے تھے کہ ابھی بائیس منہ سے نہ نکالیں جو خدا کو نا پسند ہوں۔ تم ان احسانات کو بھول گئے جو اللہ نے اب تک تم پر کیے اور ذرا سی تکلیف پر چیخ اٹھے۔

”اور کب تک صبر کریں۔ تیرے خدا نے ہمیں ان بیابانوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہمارے تو ماں باپ بھی مرکب گئے جنہیں تو نکال کر لایا تھا۔ چالیس سال تو ہونے کو آئے۔ تیرا خدا ہمیں نیا ملک کب دے گا۔ ہمیں تو لگتا ہے ان

”جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ بلاشبہ تم کو خدا یہ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو۔“ وہ کہنے لگے۔ ”کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جابلوں میں شمار ہوں۔“ (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انہوں نے کہا۔ ”تو اپنے پروردگار سے دریافت کر کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو نہ بچھا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو۔ پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو۔“ وہ کہنے لگے۔ ”اپنے خدا سے پوچھ کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔“ حضرت موسیٰ نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ گھر سے زرد رنگ کی ہو کہ وہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو۔“ کہنے لگے۔ ”ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کا میاب ہو جائیں گے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ صحت کی باری ہو کہ نہ زمین میں مل چلائی ہو اور نہ کھیت کو سیراب کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو۔ کہنے لگے۔ ”اب تو جی بات لایا۔“ پس انہوں نے اسے حاصل کر کے ذبح کیا اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور یہ جب وہ اب جہنم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس بات کو جس کو چھپائے ہوئے ہو۔ پس ہم نے کہا اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کر دو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ تم سمجھو۔“ (بقروہ)

حکمت ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اے شخص! تو خود بتا مجھے کس نے قتل کیا۔“

اس شخص نے ایک کراہیت بھری نظر اپنے بیٹے پر ڈالی اور ساری رد و ادبیان کر دی۔ اس کے مطابق اس کا قتل اس کے بیٹے نے کیا تھا۔ مقتول یہ سب بتانے کے بعد دوبارہ لیٹ گیا۔ گویا اب وہ پھر بے جان لاش تھا۔

یہ دیکھ کر بیٹے کے ہوش اڑ گئے اور اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے بھاگنے نہیں دیا۔ اسے پکڑ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقرر کردہ قاضیوں نے فیصلہ سنایا کہ مقتول کے بیٹے کو اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح اس نے اپنے چچا کو قتل کیا تھا۔ اس کی لاش دو پہر تک اسی طرح کھلے میدان میں پڑی رہے جیسے اس کے چچا کی لاش پڑی رہی تھی۔

اس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا اور پھر دونوں کو (چچا اور بیٹے) قریب قریب دفن کر دیا گیا۔

یہ مجرہ دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی غمراہی کو کسی ایسے عمل سے دور کیا جائے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر رہی ہوں۔ ان کے دلوں میں اب تک گائے کی تقدیس رہ چکی تھی لہذا بتا دیا گیا کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں اس کو قتل کر لیا اور وہ تمہارا ہی بیٹا نہ کر سکی اور اگر تم یہ سمجھو کہ یہ گائے کی تقدیس کا اثر تھا کہ اس کے گوشت کے مس کرنے سے مرده زندہ ہو گیا کیونکہ اگر ایسا تھا تو گائے خود زندہ کیوں نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے زندہ کرنے والا کوئی اور ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اسی طرح مرنے کے بعد خدا تمہیں دوسری زندگی دینے پر قادر ہے اور تم جب زندہ کیے جاؤ گے تو اپنے گناہوں کا خود اقرار کرو گے۔

کہتے ہیں اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل میں مکمل نئے معنی تھے۔ وہ اب بھی چھپ چھپ کر گائے کی پرستش کرتے تھے۔ انہوں نے تو پہ کی اور بتوں کو توڑ دیا۔

☆☆☆

قادر کے مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن مریم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب وہ کوہ ہور میں اودم کی سرحد کے قریب تھیں۔ یہاں آپ کو ایک اور صدمہ کا سامنا ہونے والا تھا۔

کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہے تھے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے کاموں میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ وعظ و نصیحت کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔ کوششیں سے ہو کر وہ گئے ہیں۔ کچھ دنوں تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ کثرت عبادت ان کے گھر سے نکلنے میں مانع ہے لیکن ایک روز ہارون علیہ السلام کے بیٹے کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بیمار ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اب اس دنیا میں ان کے علاوہ کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ ابتدائے نبوت سے دونوں بھائی

تھے۔ آخر غم اور غم کی لہر کھانے تھے۔ اب جو یہ سنا تو بے چین ہو گئے۔ خیریت دریافت کرنے حضرت ہارون علیہ

حبیبون مشرقی فلسطین کا ایک کلیدی مقام تھا اور اپنے چشموں کے لیے مشہور تھا۔ اسے ہر حکمران حاصل کرنے کی جستجو کیا کرتا تھا۔ ایک وقت میں یہ موائیوں کے تحت تھا پھر اسے اموریوں کے بادشاہ ”سیون“ نے فتح کر لیا۔
اموری کنعان کی اولاد تھے۔ اسرائیلیوں سے پیشتر یہ لوگ بہت مشہور و معروف تھے۔ جب شمال کے لوگوں نے ان کو نکال دیا تو یہ باہل میں بس گئے۔ ان کا دور حکومت تاریخ کا سب سے خوشحال دور تھا۔ یہ صدیوں بعد جب ایک اور قوم ”عیسویوں“ نے انہیں شکست دی تو وہ کنعان کے ایک بڑے حصے میں آکر بس گئے۔ کنعان میں اپنے عروج کے زمانے میں انہوں نے مواب کی طرف پیش قدمی کی اور اس ملک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ حبیبون ان میں سے ایک تھا۔
جس وقت اسرائیلی یہاں پہنچے، سیون یہاں بادشاہت کرتا تھا۔
یہ نہایت بدکار قوم تھی۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا تھا کہ ان (حضرت ابراہیم) کی اولاد آکر اس قوم کی عدالت کرے گی۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی میں یہ عدالت ”حبیبون“ کے بادشاہ سیون پر قائم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون کی سربراہی میں حبیبون کے بادشاہ سیون کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے اس کے ملک سے ہو کر گزر جانے کی اجازت چاہی۔
”ہم حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر کی جانب سے تیری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور یہ التجا لے کر آئے ہیں کہ تو ہمیں اپنے ملک سے ہو کر گزر جانے دے اور ہماری تعداد کی طرف سے مکر مند نہ ہو۔“
”تم مجھ سے اجازت مانگتے آئے ہو یا مجھے دھمکانے۔ تمہاری تعداد کتنی بھی ہو، میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔“
”ہم تجھے ڈرانے نہیں آئے۔ ہم کوئی خون خرابا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنے آپاؤ اور ادائیگیوں تک جانے کے لیے مصر چھوڑا ہے۔ تم سے ہماری قربت داری بھی ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے ہمیں گزرنے دے۔“
”اگر تم نے لوٹ مار کی تو لازم یہ دھرو گے کہ ہم نے تمہیں کمزور دیکھ کر مارا۔ بہتر یہ ہے کہ تم کسی اور طرف سے ہو کر گزرو۔“
”جو تمہیں مصر چھوڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ اتنی بڑی تعداد کو کون آباد ہونے دے گا۔“
”ہمارے پیغمبر نے اپنی مرضی سے مصر نہیں چھوڑا۔ اس میں خدا کی رضا شامل تھی۔ اس لیے وہی ہمیں راستہ بھی دے گا ورنہ ہم یہ ذروت گزریں گے۔“

اس دم موسیٰ کے بعد سیون کچھ نرم پڑا اور اس نے وفد کے ارکان سے پوچھا۔

”میرے ملک سے گزرنے کے لیے تم لوگ کس راستے سے گزرو گے؟“

”اسی راستے سے جو عام گزرگاہ ہے اور جس پر تو عام قافلوں کو گزرنے کی اجازت دیتا ہے۔“

”وہ قافلہ لاکھوں کی تعداد میں نہیں ہوتے۔ تم بے گھر لوگ ہو یقیناً گزرنے کے بہانے آباد ہونے کی کوشش کرو گے۔“

”ہمیں تیرے ملک سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم تو دریائے اردن کے اس پار تک سفر کریں گے کیونکہ وہی علاقہ ہمارے آباد ہوجانے کے لیے منتخب ہوا ہے۔ ہم تیرے کھیتوں اور تارکستانوں میں نہیں گھسینگے حتیٰ کہ تمہارے کنوؤں کا پانی بھی نہیں پئیں گے اور اگر پئیں گے تو قیمت ادا کریں گے۔ اب تو ہمیں گزر جانے دے۔ ہمیں بتا ہم اپنے پیغمبر سے جا کر کیا نہیں۔“
حبیبون کے بادشاہ یوہا، ایک دل نرم ہو گیا تھا۔ وہ اجازت دینے ہی والا تھا کہ اس کے ایک وزیر نے اسے اس کے برعکس مشورہ دیا۔

”یہ لوگ یہاں سے گزرنے کا تو بہانہ کر رہے ہیں۔ ان کا اصل مقصد ہماری زمینوں پر قبضہ کرنا ہے۔ اگر یہ لوگ ایک مرتبہ یہاں گھس آئے تو انہیں یہاں سے نکالنا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں ہرگز اجازت نہیں دی جائے اور اگر یہ لوگ زبردستی کریں تو ان سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔“

یہ بات سیون کی سمجھ میں آگئی اس کے تیور بدل گئے۔ اس نے وفد کی طرف تحفہ دے دیکھا اور انہیں اپنے دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔

”تم لوگ جہاں بھی جانا چاہتے ہو، کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو۔ میں تمہیں اپنے علاقوں سے گزرنے کی اجازت نہیں دوں گا اور اب تم زیادہ بحث بھی مت کرو۔ یہی بہتر ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اپنے پیغمبر سے جا کر کہہ دو۔“

”اے سیون! ہم تجھے پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اگر تو نے اجازت نہیں دی تو ہم زبردستی کریں گے۔ ہمارا جی جو حکم دیتا ہے

بیابانوں میں پھٹکتے پھٹکتے ہم بھی سر جامیں گے۔“
”تمہیں اس مصیبت میں خدا نے نہیں ڈالا ہے۔ تمہارے بزرگوں نے جہاد سے انکار کیا تھا۔ یہ اس کی سزا ہے لیکن فکر مت کرو، اللہ ہمیں بہت سی جنگوں تو مومنوں پر غالب کرنے والا ہے۔“

”تم ہمیں پھر کسی جنگ میں ڈالنا چاہتے ہو۔“

”یہی تمہارے باپ دادا نے کہا تھا اور وہ عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی عذاب آئے۔“

”ان سختیوں سے تو اچھا ہے، ہم کسی عذاب ہی سے مر جاتیں۔“

یہ اللہ کا عذاب ہی تو تھا کہ وہ جس جگہ پڑاؤ کیے ہوئے تھے وہاں دوسرے دن سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے۔ ایک ہی دن میں بہت سے اسرائیلیوں کو ڈس لیا۔ یہ نئی آفت تھی جو اس راستے میں انہیں ملی تھی۔ اس آفت پر ان کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کوئی سانپ انہیں ڈس نہ لے۔

انہیں اپنا کیا یاد آیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درشت باتیں کی تھیں۔ ایک دو دن انہوں نے انتظار کیا کہ شاید سانپ خود ہی ادھر ادھر ہو جائیں لیکن جب اموات کی تعداد بڑھنے لگی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔

”ہم سے بے شک گناہ ہو گیا کہ ہم نے خداوند اور تیری شکایت کی۔ اب ہمیں سانپ پریشان کر رہے ہیں۔ ہمارے بہت سے بھائیوں کو ان سانپوں نے ڈس لیا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہم میں سے کوئی بھی جینا نہ بچے گا۔ تو جن لوگوں کو تو باپ دادا کی زمینوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے، ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچے گا۔“

”اے میرے لوگو! تم خداوند کی شکایت کرنا چھوڑ دو اور ایسا کرو کہ پتیل کا ایک سانپ بنا کر ایک گھڑی پر ٹانگ دو۔ جو سانپ کا ڈسا ہو اس پر نظر کرے گا، وہ اللہ کے حکم سے جینا نہ بچے گا۔“

لاکھوں لوگوں کے درمیان ایک پتیل کا سانپ کس طرح کام آسکتا تھا۔ ان لوگوں نے بہت سے سانپ بنائے اور جگہ جگہ لٹکا دیے اور جب یہاں سے آگے بڑھنے لگے تو بھی ان سانپوں کو ساتھ لیے گئے کہ اگر راستے میں سانپوں سے سامنا ہوا تو وہ مرنے سے محفوظ رہیں گے۔

اب اس قوم کا گزر ان دور دراز علاقوں کی طرف تھا کہ جس پر تاریخ آج بھی حیران ہے۔ کسی دنیاوی راہنما کی سربراہی میں یہ سفر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک پیغمبر ہی انہیں ان بیابانوں سے صحیح سلامت گزار سکتا تھا کیونکہ اسے خدا کی ہدایت اور ہدایت تھی۔

اب وہ ”مواب“ کے میدانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ علاقہ بحیرہ مردار کے جنوبی علاقے کے مشرق میں تھا اور یہاں حضرت لوط علیہ السلام کی نسل آباد تھی۔

کوہ ہور سے نکل کر اس قافلے نے ”ادبوت“ کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہ جگہ ”مواب“ کے مشرق میں تھی پھر یہاں سے بھی کوچ کیا اور مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں سے ہوتے ہوئے ”اردون“ پہنچ گئے۔ یہ مواب کے ایک دریا کے نام سے موسوم تھا۔ یہ دریا ایک گہری گھاٹی سے ہوتا ہوا بحیرہ مردار میں گرتا تھا۔ یہ ”لبردان“ کے مشرق میں تین اہم دریاؤں میں سے ایک تھا اور اموریوں اور موابیوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا۔

مواب کی سرحد یعنی ”اردون“ پر بنی اسرائیل نے ڈیرے ڈال دیے پھر اللہ نے انہیں ایک کنوئیں کے پاس بھیجا جو ”بیر کا کنواں“ کہلاتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور وہ کنواں دکھایا۔

مصر میں کسی کنوئیں کا مل جانا نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے اور خوشی سے ناچنے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مناجات پڑھی۔

”اے کنوئیں تو اعلیٰ آ

تم اس کنوئیں کی تحریف گاؤ

یہ وہی کنواں ہے جسے رئیسوں نے بنایا

اور قوم کے لوگوں نے

اپنے عصا اور لائیمیں سے کھودا

اب انہیں مواب کی طرف اور آگے بڑھنا تھا۔

ایک خوفناک معرکہ شروع ہوا۔ حیون کے لوگ نہایت جنگجو اور زور آور تھے۔ ان کے پاس لشکر بھی بہت تھا۔ بادشاہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خود اس جنگ میں شامل تھا اور اپنے لوگوں کی بہت بڑھاپا تھا۔

اسرائیلی تعداد میں زیادہ ضرور تھے لیکن یہ سب عام لوگ تھے۔ ان میں باقاعدہ لڑنے والے بہت کم تھے اور پھر اس سے پہلے انہیں کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ مال غنیمت کا لالچ تھا جو انہیں یہاں تک لے آیا تھا۔ اب مصر کو یاد کرنے والے پرانے لوگ ان میں نہیں رہے تھے۔ ان جو انہوں کو یہ امید بھی تھی کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو یہاں انوں میں رہنے کے بجائے شہروں میں رہنے کے قابل ہو جائیں گے۔ بس یہی آسرا تھا جو انہیں لڑنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن جلد ہی انہیں یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ انہوں نے لڑنا آسان کام نہیں۔ حیون کا پلہ بھاری تھا۔ وہ بار بار اسرائیلیوں کو پیچھے ہٹاتا تھا۔ اسرائیلی پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔ دوپہر تک یہی کشمکش جاری رہی لیکن دوپہر کے بعد اچانک ایسا ہوجیسے امور یوں پر ٹھکن طاری ہوئی ہے۔ اسرائیلیوں کا ہر حملہ کامیاب ہو رہا تھا۔ حیون کے تمام بھائی اور بیٹے مارے جا چکے تو حیون کو یقین ہو گیا کہ اسے شکست ہو جائے گی۔ وہ فرار ہونے ہی والا تھا کہ ایک اسرائیلی کی تلوار نے اس کا کام تمام کر دیا۔

خدا نے وعدہ کیا تھا، دیکھ میں حیون اور اس کے ملک کو تیرے حوالے کرنے کو ہوں۔ خدا کا وعدہ پورا ہوا۔ بادشاہ کے مرتے ہی امور یوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسرائیلیوں نے بھاگتے ہوئے امور یوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ ”بعض“ کا میدان لاشوں سے بھر گیا۔

اسرائیلیوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ انہوں نے مانی ہوئی جنگجو قوم کو اتنی بڑی تعداد میں کیسے ہلاک کر دیا۔ یہ سب اتنی آسانی سے ہو گیا تھا کہ حیرت کے سوا وہ کچھ اور کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

اموری جہاں جہاں بھی بھاگے، اسرائیلیوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے سب شہروں میں ٹھس گئے۔ ہر آباد شہر کو عورتوں اور بچوں سمیت بالکل نابود کر دیا۔ چوپایوں اور مال و زر کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

بنی یسود اور بنی روبین کو حکم دیا گیا کہ وہ اس علاقے میں آباد ہو جائیں۔ غرض یہ کہ بنی اسرائیل نے یہاں کے سب شہروں کو لے لیا۔ حیون اور اس کے آس پاس کے قصبوں میں یہ لوگ آباد ہو گئے۔

حیون نے یہ ملک مومابیوں سے چھینا تھا اور اب اسرائیلیوں نے اس کی بادشاہت ختم کر دی۔

گلیل جمیل کے مشرق کی طرف ایک زرخیز ترین علاقہ ”ہسن“ تھا۔ یہاں کا اموری بادشاہ عوج بن عنق تھا اور ساٹھ فیصلہ دار شہروں کا حاکم تھا۔ یہاں کے لوگ غیر معمولی طویل القامت اور زور آور تھے۔ اتنے درواز قامت کہ عام آدمی ان کی پٹلی تک پہنچتا تھا۔ عوج کا بیٹا گلیو اور چار ہاتھ چوڑا تھا۔ اس سے اس کی قامت کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔

ان کے شہر مضبوط، فیصلہ دار اور اونچے تھے۔ اسی لیے لوگوں کا خیال تھا کہ عوج بادشاہ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ”اب آگے بڑھ اور “ہسن“ میں جا کیونکہ میں نے اس ملک کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ عوج سے مت ڈر۔ جیسا تو نے حیون کے ساتھ کیا، وہ یہی اس امور ی بادشاہ کے ساتھ بھی کرنا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سبہ سالار حضرت یوشع کو بلوایا اور انہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ ”پس تو تیاری کر اور گلیل جمیل کی طرف چل اور “ہسن“ کو اپنے قبضے میں کر لے کہ وہ بھی اموری ہے اور اس کا ملک خدا نے ہماری میراث میں لکھ دیا ہے۔“

بنی اسرائیل کو جب معلوم ہوا کہ اب بسن پر حملے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں تو وہ سخت خوفزدہ ہوئے۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ وہاں کے لوگ نہایت طویل القامت ہیں۔ وہ گھبرا کر کہنے لگے کہ ہماری تو تلواریں بھی ان کی گردلوں تک نہیں جائیں گی۔ ہم ان سے جنگ نہیں کر سکتے۔ حیون اور امور یوں کے دوسرے شہر جن پر ہم قبضہ کر چکے، ہمارے لیے بہت ہیں۔

”تو کیا تم خدا کا حکم نالے کی غلطی ایک مرتبہ پھر کر دے گے؟“ حضرت یوشع نے ان سے کہا۔

”موسیٰ سے کہو وہ اپنے خدا سے ہماری طرف سے معذرت کر لے۔“

”کیا تم اس سے پہلے حیون بادشاہ کو شکست نہیں دے چکے؟“

”ان کی بات اور تمھی۔ عوج بن عنق کا مقابلہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہلاک ہو جائیں۔“

”تم لوگ اتنی ہی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اب چالیس سال کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ تمہارے باپ دادا جنہوں نے

ہم اس پر عمل ضرور کرتے ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے۔“ حضرت یوشع بن نون نے کہا۔

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“ حیون نے کہا۔ ”اگر تم لوگ اسے بہادر ہوتے تو یوں عرصہ دراز سے بھٹکتے نہ مگر رہے ہوتے۔ خدا تمہارے ساتھ ہوتا تو اب تک کہیں آباد ہو چکے ہوتے۔ تمہارا ہی تمہیں بے وقوف بنانا ہے اور تم بے وقوف بن رہے ہو۔ کیوں اپنی جانوں کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ تم میرے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جاؤ اپنے ہی سے جا کر کہہ دو کہ وہ ارادہ ترک کر دے ورنہ اسرائیلیوں کے خون سے زمین کو رنگین کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں تم سب کو یہیں موت کے گھاٹ اتار دوں، یہاں سے چلے جاؤ اور میرا پیغام اپنے ہی تک پہنچا دو۔“

”تو کیا ہم سمجھ لیں کہ تو جنگ کے بغیر ہمیں یہاں سے نہیں گزرنے دے گا؟“ یوشع بن نون نے کہا۔

”یہی سمجھ لو اور مجھ سے جنگ کرنے کی غلطی بھی مت کرنا۔“

”ہم وہی کریں گے جو ہمارا ہی ہم سے کہے گا۔“ یوشع بن نون نے کہا اور وفد کے ارکان کے ساتھ واپس چلے آئے۔

وفد نے واپس جا کر وہ تمام باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیں جو ان کے اور حیون کے درمیان ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر یوشع بن نون کو قریب بلا کر فرمایا۔

”یوشع! میں نے تو یہی چاہا تھا کہ جنگ سے گریز کروں لیکن مشیت ایزدی یہی ہے کہ ہم حیون سے جنگ کریں لیکن حیون نے غرور کیا ہے۔ مجھے خدا نے بتایا ہے کہ وہ حیون کو ہمارے حوالے کر دے گا۔ اے یوشع! تم جنگ کی تیاری کرو۔“

حضرت یوشع فوراً عرصہ دراز سے کہہ رہے تھے کہ مقامی لوگوں سے جنگ کر کے اپنے آباد ہونے کا انتظام کریں لیکن خدا کا حکم یہی تھا کہ اگر وہ سب تمہارے قریب آباد ہوں گی، ان سے پیچھے چھاڑ مت کرو۔ اب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجازت دی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ حکم خداوندی ہے۔

جنگ کا اعلان ہوتے ہی بنی اسرائیل کو اپنی آرام طلبی میں غفلت پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی اور راست اختیار کر لیں تاکہ حیون سے آمناسا مانا ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے یوشع بن نون سے ملاقات کی۔

”اے یوشع! تم جنگ کی تیاری کر تو رہے ہو لیکن کیا تم ان درواز قامت کو ہستانی لوگوں کا مقابلہ کر سکو گے جن کے پاس ہتھیاروں سے تیس تربیت یافتہ لشکر موجود ہے؟ ہمیں جنگوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ ہمارے تو ہتھیار بھی کند ہو چکے ہیں۔“

”ظاہری اسباب میں ہم کمزور ہیں لیکن ہم خدا کے حکم سے لڑ رہے ہیں۔ وہ ضرور ہمیں غلبہ دے گا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے زمین کے بغیر ہمیں زندہ رکھا ہے۔ زمین کا سینہ چر کر ہمیں پانی دیا ہے۔ ہمارے لیے آسمان سے غذا اتاری ہے۔ تو کیا اس وقت وہ ہمیں تنہا چھوڑ دے گا؟ تم بہت بکڑو۔ اللہ ہماری ضرورت دے کرے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حکم آیا۔ ”کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا۔ جو مقابلے پر آئے اسے ہلاک کر دینا۔ شہروں اور آبادیوں کو نیست و نابود کر دینا۔ ان کا مال و زر اور چوپائے تمہاری ملکیت ہوں گے۔“

بنی اسرائیل یوں گھومتے رہنے سے عاجز آ چکے تھے۔ وہ کوئی مستقل ٹھکانا ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں اب یقین ہو چکا تھا کہ بغیر جدوجہد کے کوئی حصہ زمین انہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ لالچ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا کہ فتح کی صورت میں حیون کے چوپائے اور بے پناہ مال و دولت ان کے ہاتھ لگے گا۔ وہ حیون کے بجائے غلوں میں رہیں گے۔ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

حیون کے جاسوس ”دشت قدیمات“ میں یہ دیکھنے کے لیے آ جا رہے تھے کہ بنی اسرائیل کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے حیون کو بتا دیا کہ بنی اسرائیل جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں، اردن پار جانے کے لیے ہمارے ہی ملک سے ہو کر گزریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حیون پر قبضہ جاکر بیٹھ جائیں۔

یہ سن کر حیون نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کا راستہ رد کرنے کے لیے تیار رہیں۔

جب اسے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنے خیمے اٹھا لیے ہیں اور ہتھیار بند ہو کر کوچ کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آ کر مل گیا۔

ایک مقام پر دونوں قوموں یعنی امور یوں اور بنی اسرائیل کا آمناسا مانا ہوا۔ اس مقام کا نام توریت میں ”بعض“ بتایا گیا ہے۔

جہاد سے انکار کیا تھا اور سزا کے مستحق ٹھہرے تھے، وہ مر چکے۔ اب ہمارے آباد ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تم جس قوم سے بھی لڑو گے فتح یاب ہو گے۔ اس طویل جہاد میں قوم سے خوفزدہ مت ہو اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ بنی اسرائیل کا علاقہ اپنے سوبشیوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ نایاب مویشی تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ جو اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا اور مفتوحہ شہروں کو تباہ و برباد کرنے میں پیش قدمی کرے گا، اسے یہ علاقہ میراث کے طور پر دیا جائے گا۔

یوشع بن نون جانتے تھے کہ طویل مدت تک بیابانوں میں پھرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل بہت سی دنیاوی نعمتوں سے محروم رہے ہیں۔ انہیں سب چیزیں اپنی طرف منجھتی ہیں لہذا انہوں نے یمن کی فتح کی صورت میں ان چیزوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور یمن کی طرف چلے۔

”یمن“ کے امور یوں کو جب علم ہوا کہ اسرائیلی ان پر حملہ آور ہونے کے لیے آ رہے ہیں تو انہیں ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ انہیں تو اس وقت بھی تعجب ہوا تھا جب حبشوں کو اسرائیلیوں نے لے لیا تھا کہ غاند بدوشی کی زندگی گزارنے والی یہ قوم کس طرح اس قابل ہو گئی کہ حبشوں اور اس کے دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا اور اب تو سخت تعجب ہو رہا تھا کہ ان کی اتنی ہمت ہو گئی کہ ہماری فصیلوں سے سرنگھرانے چلے آ رہے ہیں۔

”آؤ ان بڑا اٹھا انسانوں کا قاتل شاد کیجئے باہر نکلتے ہیں۔“ عروج بن عقیق نے اپنے جنگجوؤں سے کہا۔ ”ان لوگوں کو تم لوگ اپنے پیروں تلے روند کر ہی ختم کر دو گے۔ جنگ کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

دونوں فریق جب آمنے سامنے ہوئے تو یہ معلوم ہوتا تھا ایک طرف دیو کھڑے ہیں، دوسری جانب انسان ہیں۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

منظر دیکھ کر بنی اسرائیل پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ان میں سے بہت سے پلٹ کر پچھلی صفوں میں آ گئے۔

یوشع بن نون بار بار یمنیوں کو آگے بڑھنے کے لیے شہرت دلا رہے تھے کہ خدا نے فتح تمہارے نام کر دی ہے۔ ان سے خوفزدہ مت ہو۔ آگے بڑھو۔ انہیں شکست دے دو اور ان کی زمینوں پر آباد ہو جاؤ۔ تم یمنیوں کو تمہاری کوتاہ قاصی تمہاری راہ میں قطعی مزاحمت نہیں ہوگی۔

جب ”یمن“ کے لوگوں نے دیکھا کہ اسرائیلی پہل کر رہے ہیں بلکہ ہم سے خوفزدہ ہیں تو آگے بڑھے تاکہ ان کو تباہی و تاراج کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے انہیں یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ جنہیں وہ روندنے جا رہے ہیں، وہ شیر سب نہیں ہیں۔

جی جب چاروں طرف سے گھر جائے، راہ فرار کوئی نہ ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے شیر پر بھی حملہ آور ہو جاتی ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا بھی ہوا۔ شک آمد جنگ آمد کے مصداق انہوں نے بھی اپنی ہتھیاروں سے ان امور یوں کی پٹ لیاں

دھمکی کرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کلکھاڑی مار لی۔ جب ٹانگیں ہی زخمی ہو جائیں یا کٹ کر بدن سے الگ ہو جائیں تو آدمی کھڑا کیسے رہ سکتا ہے۔ یہی حال ان امور یوں کا ہوا تھا۔ بہت سوں کی ٹانگیں کٹ گئیں، لاقعد آدمی ہوئے اور لڑنے کے قابل نہ رہے۔ باقیوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد لڑائی سے ہاتھ اٹھالیا اور فرار ہونے میں عافیت بھی۔

یوشع بن نون نے حکم دیا کہ فرار ہونے والوں کا پیچھا کیا جائے۔ کوئی بھی زندہ نہ بچے پائے۔ اس پیکلہ زمین ”عروج“ کو موقع مل گیا اور وہ بھی فرار ہو گیا۔

یہ فتح اس وقت تک نامکمل رہتی جب تک عروج کل نہیں ہو جاتا اور وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ یہ سخت خطرے کی بات تھی۔ اس کے بچ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو کہیں بھی جگہ سے نہیں رہنے دے گا۔

اس کی قوم کے جو افراد گرفتار ہو کر آئے تھے، ان سے معلوم کیا گیا کہ ان کا بادشاہ بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے نہایت مضبوط اور مہلکی فصیلوں والے ساتھ شہر ہیں۔ وہ ان میں سے کہیں گیا ہوگا۔ اب وہ تمہارے ہاتھ آئے والا نہیں کیونکہ جب تم ایک شہر میں جاؤ گے تو وہ دوسرے شہر میں چلا جائے گا۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن، قصص الانبیاء، ابن کثیر، توریث،، ارض القرآن، سلیمان ندوی، ترجمان القرآن، ابو الکلاہ آزاد، انبیائے قرآن، جمیل احمد،

جین کو وہ گڑیا میل یا کس میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ یہ کہاں سے اور کس نے بھیجی ہے کیونکہ اس پر کوئی نام و پتا موجود نہیں تھا۔ گڑیا بہت خوبصورت تھی۔ اس کا قد تین فٹ اور بال گہرے سمورے رنگ کے تھے۔ گڑیا کی نیلی آنکھیں بالکل حقیقت کا گمان دے رہی تھیں۔ اس گڑیا کو بنانے والے نے بہت ہی مہارت اور نفاست سے بنایا تھا۔

اس نے گڑیا کو پاس سے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اسے باہر نکالا جین نے دیکھا کہ اس کے نیچے ایک ہندو لٹافٹ مشین تھا۔

اس نے گڑیا کو پاس سے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اسے باہر نکالا جین نے دیکھا کہ اس کے نیچے ایک ہندو لٹافٹ مشین تھا۔

اس نے گڑیا کو پاس سے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اسے باہر نکالا جین نے دیکھا کہ اس کے نیچے ایک ہندو لٹافٹ مشین تھا۔

اس نے گڑیا کو پاس سے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اسے باہر نکالا جین نے دیکھا کہ اس کے نیچے ایک ہندو لٹافٹ مشین تھا۔

گریا

محمد سجاد حنان

کچھ لوگوں کا تخیل اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ انہیں اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہ بھی تصوراتی دنیا کی شیدائی تھی اور ہر عکس میں اپنی منشا کے مطابق جھلک دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ بس یہی عادت اس کی جان کا روگ بن گئی۔

شادی جہادوں سے بچنے والی ایک گڑیا کا انجام



رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ جب اس نے گڑیا کو باکس سے نکالا تھا تو اس کا سر نیچے کی جانب تھا۔ اس سے زیادہ خوف کی بات یہ تھی کہ گڑیا کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ ایسی مسکراہٹ جس میں کوئی گہرا درد نہ تھا۔

جین نے وہ خط میز پر رکھا اور گڑیا کو اٹھا کر اپنے رہائشی کمرے میں داخل ہو گئی اور گڑیا کو ایک کونے میں رکھ دیا۔ اگلے دس منٹ تک وہ اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھتی رہی تاکہ وہ اپنے آپ کو خوف کے اس احساس سے باہر نکال سکے جو اسے گڑیا کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا۔

دو پہر کے تقریباً دو بجے اس نے اپارٹمنٹ سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تاکہ ٹھوڑا فریش ہو سکے۔ اس کے لیے اس نے اپنی بہن کے پاں جانے کا سوچا۔ اس کے خاندان میں اس کی بڑی بہن بیگن بیگن کے علاوہ کوئی نہیں بچا تھا۔ بیگن سے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔ اپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہی جین نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ پندرہ منٹ بعد ڈرائیور نے اسے بیگن کی بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔ جین نے ٹیکسی ڈرائیور کو دس ڈالر دیے اور ٹیکسی سے باہر آ گئی۔

جین بلڈنگ کے انٹرکام کی جانب بڑھی اور اپنی بہن کو کال کی۔

”ہیلو کون؟“ بیگن نے پوچھا۔

”ہیلو بیگن! یہ میں ہوں۔“

دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا اور جین لفٹ میں داخل ہوئی اور چوتھی منزل کا مین و بار دیا۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا اس کی بڑی بہن اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تمہارے دروازے تک آئی رہی تھی۔“ جین نے بہن کو گلے ملنے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں..... میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“ بیگن نے کہا۔

”اور سناؤ کیا حال چال ہیں؟ سب کیسا چل رہا ہے؟“ اس نے اپارٹمنٹ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں فی الحال تو سب بڑھا ہے۔“ جین نے کہا۔ چلتے چلتے وہ اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ بیگن نے چائے بنائی اور دونوں گپ شپ مارنے بیٹھ گئیں۔

”میں کب سے اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ جین نے کہا۔

”جو کچھ بھی ہوا تھا تم اس کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھو۔“

سمجھو۔ تم جانتی ہو وہ سب تمہاری غلطی نہیں تھی۔“ بیگن نے شدیدگی سے کہا۔

وہ اس مشکل وقت کے بارے میں سوچے بٹھا رہا تھا۔

سکتی تھی جس سے وہ دو سال سے گزر رہی تھی۔ اپنی شیزوفرینیا کا شکار ماں کی دلچسپی بھال کرتے ہوئے اس کی ماں اسے اس حال تک لے آئی تھی جہاں وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جین نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کی ماں کی بہتر دلچسپی بھال کسی ذہنی امراض کے اسپتال میں ہو سکتی ہے جس پر بیگن بھی متفق تھی۔ دونوں لڑکیاں مسلسل کئی مہینے تک اسپتال میں ماں سے ملتی رہی تھیں مگر آخر کار ان کی ماں بہت متحدد ہو گئی اور ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ ایک سال بعد ان لڑکیوں کی ماں پوائنٹ ویو دماغی اسپتال میں اپنے کمرے میں اکیلی مر گئی۔ جین کے لیے یہ بہت سخت اور مشکل وقت تھا۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی تھی مگر پچھلے چند سالوں میں وہ بالکل بدل چکی تھی۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی مضبوط نہیں تھی۔

”اب تمہیں زندگی میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ہماری ماں بھی یہی چاہتی تھی۔“ بیگن نے کہا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ جین نے سوگوار انداز میں کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے مزید بولی۔ ”آج مجھے سیل باکس میں ایک گڑیا پڑی ہوئی ملی۔“

”اچھا.....“ بیگن کو اسے کسی اور موضوع پر بات کرتے ہوئے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ہاں۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ بالکل ایسی دیکھتی تھی جیسے.....“ جین بات کرتے کرتے رک گئی۔

”کیا ہوا؟“ بیگن نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”وہ بالکل ایسی دیکھتی تھی جیسے ہماری ماں ہمیں بچپن میں کھیلنے کے لیے دیتی تھی۔ بس یہ اس سے ٹھوڑی سی ہے۔“

”کس نے بھیجا ہے؟“ بیگن نے پوچھا۔ اس کے جسم میں ایک خوف کی لہری دوڑ گئی۔ یہ خوف کا احساس اسے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بہن کے لیے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب بکواس ہے مگر وہ پھر بھی خود کو خوف کے اس حصار سے باہر نہ نکال پائی۔

”میں نہیں جانتی۔ اس پر سمجھنے والے کا نام دیتا سوچو نہیں تھا۔“ جین نے جواب دیا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔“ بیگن نے عجیب و غریب خیالات کو دماغ سے نکالتے ہوئے کہا۔

اگلے چند گھنٹے وہ چائے پی کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اس کے بعد بیگن نے ڈنگ روم کا دروازہ کھانے کے بعد

جین نے اپنے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔ اب اس کی طبیعت ٹھوڑی سنبھل چکی تھی۔

باہر جا کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ہیک سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ میں ڈرائیور نے اسے اپنی بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔ وہ دروازہ کھول کر اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ آج وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی اور کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور لائٹ جلائی۔ جیسے ہی اس کی نظر گڑیا پر پڑی اس کے قدم دبیں جم گئے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہاں گڑیا نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی لڑکی بیٹھی ہو۔

وہ بالکل اصل انسان کی طرح لگ رہی تھی اور جین کو کسی کی یاد دلا رہی تھی۔ اسے رنگوں میں خون ٹپھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنی انگلیاں تک نہیں ہلا پارہی تھی۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور کمرے سے نکل کر ہال وے کی جانب دوڑ پڑی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گڑیا کی آنکھیں ابھی تک اسے دیکھ رہی ہوں۔

وہ ہاتھ روم میں ٹھس گئی اور شاور کھول دیا۔ گرم پانی کے نیچے کھڑے ہوئے ہی اسے اپنی بہن کے ساتھ کی گئی گفتگو یاد آئی۔

..... کہ یہ گڑیا بالکل اس گڑیا کی طرح تھی جیسی ان کی ماں نے انہیں بچپن میں خرید کر دی تھی۔ یہ بالکل ایک عجیب و غریب اتفاق لگتا تھا۔ جیسے اس کی ماں نے ہی اس کو یہ گڑیا بھیجی ہو، تاہم اس پر سمجھنے والے کا نام دیتا بھی تو نہیں تھا۔ جین نے پانی بند کیا اور ایک تولیہ لپیٹ کر شاور سے باہر نکل آئی۔

اجانک اس کے قدم پھر جم گئے۔ اسے اپنے کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ہنسی بہت جانی پہچانی تھی۔ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی ہوئی ہال وے کی جانب بڑھ گئی۔ جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا اس کی نظر اس گڑیا سے ٹکرائیں۔ اس کی سانس رک گئی۔ خوف کی لہر اس کے دھڑکنے والے سینے میں سرایت کر گئی۔

گڑیا کے خدو خال بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل ایک اصل انسان کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی روشن اور چاندانی تھیں کہ جین کو ایسا لگا یہ وہ گڑیا نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے..... کچھ بہت ہی پر اسرار شیطانی قسم کی چیز۔

وہ گڑیا کو گھور رہی تھی۔ جتنے غور سے وہ اسے دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے یہ بالکل اس کے کسی جاننے والے سے

خواب

بچے نے پرجوش لہجے میں باپ کو بتایا ”پاپا!..... بس کس میں ایک آدمی گھوڑے پر بڑے بڑے حے کے کرب دکھاتا ہے..... وہ اچھل کر گھوڑے پر بیٹھتا ہے..... کبھی لٹک کر اس کے پیٹ کے نیچے آ جاتا ہے..... کبھی دم پکڑ کر لٹک جاتا ہے..... کبھی گھوڑے کی گردن سے چٹ جاتا ہے۔“

”یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹا؟“ باپ نے بے نیازی سے کہا۔ ”میں جب زندگی میں پہلی مرتبہ گھوڑے پر سوار ہوا تھا تو میں نے بھی یہی بھوکھا تھا۔“

ایک مریض گھبراہٹا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک بہت بڑا ترپو کھایا ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ مریض نے فوراً کہا۔

”جناب پریشانی کی بات یہ ہے کہ جب میں صبح سو کر اٹھا تو بستر سے میرا کچھ غائب تھا۔“

رضوان احمد خان، اورنگی ٹاؤن کراچی

مشاہیر ہو۔

وہ بالکل اسے اپنی ماں کی طرح لگ رہی تھی۔

جین نے گڑیا کو اٹھایا اور کباڑ والے کے کمرے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اسے اندر پھینکا اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

وہ بار بار اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ سب اس کا دماغ ہے۔ اسے بس کچھ دیر نیند کی ضرورت ہے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس خوفناک احساس سے باہر نہیں نکال پارہی تھی کہ اس کی ماں اب بھی اس کے آس پاس ہی ہے۔

جین اچانک جاگ گئی۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیوں جاگ گئی؟ آخر وہ کیا احساس تھا؟ یا تو اسے کوئی برا خواب آیا تھا یا اسے ہاتھ روم کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو اسے پتا چلا کہ آخر وہ کس وجہ

کیکر

ظفر اقبال ظفر

دنیا کا سب سے خوبصورت رشتہ قدرت نے ماں اور بچے کا بنایا اور ماں کے دل میں اپنی محبت کا کچھ حصہ رکھ دیا... اور پھر ایسی اولاد جو منت اور مرادوں سے ملی ہو لیکن وہ اچانک زندگی کے اندھیروں میں گم ہو جائے... پھر کیسے کسی کو چین آئے... اسے بھی صبر نہیں آ رہا تھا... باپ کو بھی یہی غم دھمک کی طرح لگ چکا تھا... جن کے طفیل بچے والدین سے جدا کر دیے جاتے ہیں ان سنگ دلوں سے قدرت بہت کر بناک انتقام لیتی ہے مگر وہ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں۔

کیکر کے درخت تلے بیٹھی ایک بے بس عورت کی آواز داری کا دل بکا رہا۔



اپنا ضبط بکھر گیا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔
”جا جا قیٹو تو جا کے چھوٹے خان کا دلائی گھوڑا
ڈھونڈ، اس کا ٹھونگ لگا۔ میرے نصیب میں میرا منی ہوا تو
وہ خود ہی لوٹ کے آجائے گا ایک دن۔“ اور پھر یہ کہہ کر

رو رو کر سکینہ کا گلا پٹھ گیا، آنکھیں سوچ گئیں۔ فیضو
کہہ رہا ہے آئندہ اس کی اوک بی بی کی اس کی وحاش بندھا
رہا تھا، تسلیاں دے رہا تھا۔ ”تو کیا بھتی ہے سکینہ، منی
صرف تیرا بیٹا ہے میرا کچھ نہیں لگا۔“ یہ کہتے ہوئے فیضو کا

نرس نے جواب دیا۔
ڈاکٹر نیل نے دروازے کو کھولا اور کمرے میں داخل
ہو گیا۔ جین وہاں کی گھٹنوں سے سوجھوٹی۔
”ہیلو جین! امیرا نام ڈاکٹر نیل ہے۔ تم اس وقت پوائنٹ
ویو سائیکلر اسپتال (نفسیاتی اسپتال) میں موجود ہو۔“
جین ایک تک ڈاکٹر کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
وہ منہ ہی منہ میں کچھ ان کی آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔
”کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“
ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔
کوئی رسپانس نہیں ملا۔ ڈاکٹر نے ایک نئی سمت میں
کوشش کی۔ ”تمہاری بہن نہیں موجود ہے۔ میں اسے بلاتا
ہوں اور تم اس سے بات کر سکتی ہو۔“

جب ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلا۔ جین تب بھی غلامیں
گھور رہی تھی مگر اس کی آواز گھونڈی بڑھ گئی۔
”اب چونکہ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا ہے۔ اب ہم بھی جدا
نہیں ہوں گے۔“
”بھی جی کوئی چیز تمہارے کمرے میں داخل ہوئی۔“
”میری پیاری بہن، تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“
جین نے افسردگی سے کہا۔ وہ ان سب حالات کے بارے
میں سوچ کر بہت پریشان ہی تھی اور اسے یہ حالات خامسے
جانے پھانے لگ رہے تھے۔

جین کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ وہ ان
آنسوؤں کی پٹری محسوس کر سکتی تھی۔
”ارے نہیں جین... تم رومت۔ دیکھو میں تمہارے
لیے کیا ہے کر آئی ہوں۔ یہ تمہیں اچھی پہنٹی فراہم کرے گی۔“
جین نے ایک چارچروں والی گڑیا اس کے سامنے کی۔
جین نے اپنی ماں کے چہرے والی گڑیا کو دیکھا اور ایک فلک
شکاف چیخ ماری۔ وہ اب سمجھ چکی تھی کہ وہ اب اپنی ماں سے بھی
بھی بچھا نہیں چھڑا سکی۔ ”بھی جی نہیں۔۔۔۔۔“
”کیا ہوا جین... کیا ہوا؟“ جین نے بڑی جرات سے
پوچھا۔ وہ کسی اپنی بہن کو دیکھتی اور کسی اس گڑیا کو۔
جین کو تو وہ ایک بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ دیکھنے
والی گڑیا دکھائی دے رہی تھی اور اسی لیے وہ بڑی تحیر مگی۔
”جی ڈاکٹر نیل کمرے میں داخل ہوا اور جین سے بولا۔
”میرے خیال میں اس وقت عمل کا تقاضا یہی ہے کہ
اسے ابھی ہم یہیں رکھیں کیونکہ اب اس میں شیر ذرخیا کی
علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔“

سے بیدار ہوئی تھی۔ ہال دے سے شور کی آواز آرہی تھی۔
یہ دروازہ کھلنے کی اور کسی کے قدموں کی چاپ کی آواز تھی۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر کوئی نبل رہا ہو۔ قدموں کی آہٹ
قریب آتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ
خود بخود کھولا سا کھل گیا۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو
بدن میں لہو نہیں۔ وہ بستر پر بالکل ساکن بیٹھی ہوئی تھی اور
اس نا دیدہ چیز کے قریب آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ قدم چلتے
رہے اور پھر وہ اس کے دروازے کے باہر دک گئے۔ جین
دروازے کے نیچے کے سوراخ سے دو نئے قدموں کا سایہ
داخل طور پر دیکھ سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور مکمل
گیا اور اچانک گڑیا نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر
چھاٹکا۔ اس کا کول اور خوبصورت چہرہ اب ایک شیطانی
بدروح کی طرح لگ رہا تھا۔

”اب میں کیا کروں؟“ جین نے سوچا۔
گڑیا دروازے والی جگہ پر کھڑی اسے گھور رہی تھی۔
وہ آنکھیں جو پہلے بالکل زندہ اور اصلی لگتی تھیں، اب ان کی جگہ
تار بکی اور مردہ تھا مگر اب بھی ان میں ویسی ہی نیکی تھی جیسے
اس نے پہلی بار اسے پاس سے باہر نکالتے ہوئے دیکھی تھی۔
وہ گڑیا کچھ بول رہی تھی مگر جین کو اس کی آواز سنائی نہیں
دے رہی تھی لیکن وہ گڑیا کے ہونٹوں کی زبان سمجھ پارہی تھی۔
جیسے وہ کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔

”تمہیں پتا ہے تم نے کیا کیا ہے؟“
”مگر تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟“ جین اچانک چلائی۔
وہ خوف سے ٹھک رہ گئی جب اس نے گڑیا کو اپنی
جانب چل کر آتے ہوئے دیکھا اور جین کو پہلی بار اس کی آواز
سنائی دی۔
”اب میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ ہم اب بھی بھی
جدا نہیں ہوں گے۔“

جین زور زور سے چلائے لگی۔ اسے ایسا محسوس
..... ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گڑیا سے نہیں بلکہ اپنی ماں سے
بات کر رہی ہو۔
اس کی آنکھوں کے آگے اندر چھا گیا اور وہ بلا مزاحمت
اندھیرے کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆☆

”اس کی یہ حالت کتنی دیر سے ہے؟“ ڈاکٹر نیل نے
دروازے کے باہر سے اس کا معائنہ کرتے ہوئے نرس سے پوچھا۔
”اس کی یہ حالت کتنی گھٹنوں سے ہے۔ وہ بس خاموش
سے بنا کوئی آواز نکالے سامنے والی دیوار کو گھورتی رہی ہے۔“

سکینہ نے سینے پر ہاتھ مارا اور ہچکچاہٹیں کھانے لگی۔
اگلے ہی لمحے برابر والی ہمسائی بختو دیوار سے آدمی
لٹک کر اسے سمجھا رہی تھی۔ ”سکینہ مرے کی کیا درد و کر۔ اپنی
جان دے گی۔۔۔۔۔؟“ ارے دعا کر اللہ سامع ہے۔ مصلّا بچا
کے بیٹے جانا۔۔۔۔۔ اکیلی تو نہیں سارا وسیع حیرے حسنی کے لیے
ترپ رہا ہے۔ ہائے اللہ کہاں کیا ہوتا کھیل چا! بختو کی
آواز بھرا گئی۔ پھر سکینہ نے ایک دلزدہ چیخ ماری اور پہلو
کے بل لٹکتی چلی گئی۔ فیضو نے جلدی سے اس کا سر اپنی گود
میں رکھا اور بچوں کی طرح چھوٹ چھوٹ کر رو دیا۔ بختو
دیوار چاند کر آگن میں کود گئی اور سکینہ کے گمے ملنے لگی۔
حسنی کو کم ہوئے آج پانچواں دن تھا۔

شادی کے تیسرے سال بھی جب سکینہ کی گود ہری نہ
ہوئی تو فیضو سکینہ کو لے کر کہاں کہاں نہ پھرا۔ احمد و کھار یہ کیا
جھوپڑا اور چھ گدھے اپنے ترکے میں چھوڑ کر مرا تھا جن میں
سے ایک گدھے کا کھر گل گیا اور وہ دو مہینے کے اندر اندر مر
گیا۔ دو گدھے فیضو نے سکینہ کے دوا داروں کی خاطر بچ
دیے۔ جس نے جو لٹا تا یا وہ کیا۔ جس پر فقیر کا نام سنا، فیضو
سکینہ کو لے کر وہاں پہنچا۔ سکینہ کی کھچ بھر بھی سوچی رہی۔
سات برس تک فیضو کے کھر میں دھک اور اداسی کی رتی رتی
رہی۔ آٹھویں برس کے تیسرے مہینے کی وہ ٹھنڈی میٹھی سی
رات تھی جب سکینہ فیضو کی طرف کروٹ لے کر بولی۔
”فیضو!۔۔۔۔۔“

”کیا ہے سکینہ؟“ فیضو نے سکینہ کی طرف سے ہٹکا ہٹکا
جواب دیا۔ آج سارا دن وہ رمضان کے مہینے سے اٹھیں
لاؤ لاؤ کر بڑے خان کی حویلی میں ڈال رہا تھا۔ کوئی بیسیوں
پھر کیے ہوں گے اس نے مہینے سے حویلی تک۔ سولہویں پھر
میں تو ایک گدھا ڈھیر ہو گیا تھا۔ حویلی کا رستہ سامعیں فیضو
کے دربار کی چڑھائی سے ہو کر جاتا تھا۔ گدھا بھی کیا کرتا۔
مشقت کی انتہا ہو گئی تھی آج۔ دن ڈھلے بڑے خان نے
واپسی کی اجازت دی تو فیضو کو یوں لگا جیسے عرقید کی سزا
کاٹ کر جا رہا ہو۔ جاتے جاتے بڑے خان نے فیضو کھار کو
میں سیر گندم پٹ سن کی ایک پٹی میں بندھوا کر بخش دی جسے
اس نے ایک گدھے پر لاد لیا تھا اور حویلی سے نکلتے ہی اپنے
سر پر رکھ لیا تھا۔ فیضو کو اپنے دونوں جانوروں کی بچاؤ کی پر
تس آرہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ گھر پہنچا۔ اپنی ٹھکان اور
ٹوٹے ہوئے بدن کے باوجود اس نے ٹھکانا بھر دونوں
گدھوں کو کھیرا کیا پھر ان کے چارے پانی سے فارغ
ہو کر وہ رسوکی کے پاس پڑی چار پانی پڑو ڈھیر ہو گیا۔

اس کے سر ہانے کی طرف پٹی میں بندھی جس میں سیر گندم
دھری تھی۔ فیضو نے آج دن میں کتنی ہی بار اپنے سرے
ہوئے باپ احمد و کھار کو کوسا تھا جس نے اپنے ترکے میں
مشقت اور یہ گدھے چھوڑے تھے اس کے لیے۔۔۔۔۔ اب وہ
بے سادہ چار پانی پر پڑا آگن میں لگے ٹیکر کو گھور رہا تھا پھر
وہ سوچنے لگا، سکینہ بھی ٹیکر کا ایک درخت ہی ہے جس پر
کوئی چھل ہی نہیں آتا۔ یہ تو بس ایندھن ہے جسے جلائے رکھو
اور خود کو گرمائے رکھو۔ سکینہ بھی تو سات سال سے ایندھن کی
طرح ایک جلتا ہوا وجود ہی اس کے لیے۔۔۔۔۔ جس نے اسے
گرمائے ہوئے تھا، مگر ٹیکر میں تو تیز اور ٹیکلے کاٹنے ہوتے
ہیں۔ سکینہ کے وجود میں تو کوئی کاٹنا نہیں تھا، اس کے تو دل
میں ایک پھانس تھی، اولاد سے محرومی کی پھانس۔ یہ پھانس تو
خود فیضو کے دل میں بھی تھی۔۔۔۔۔ اور یہ پھانس اس وقت
زیادہ سرا بھاری تھی جب وہ پٹی میں بچوں کو کھیلنے، دوڑتے
دیکھتا تھا۔ تو کیا میں اس ٹیکر کو دیکھتے دیکھتے بوڑھا ہو جاؤں
گا؟ دکھ کی ایک بجلی فیضو کے سینے میں گونگنی اور اس کی
آنکھوں سے گرم گرم پانی سا بہنے لگا۔ ”فیضو!“ اس بار
سکینہ نے اس کا اندھا چھوڑ ڈالا۔
”ہاں کیا ہے سکینہ؟“ ایک دم فیضو نے اپنی نظریں
ٹیکر سے ہٹے اتار لیں۔

”آج تو نے ہاتھ نہ بھی نہیں دھویا۔ روٹی بھی نہیں
کھائی اور لگتا ہے تو تھکا ہوا بھی بہت ہے۔“ سکینہ اب فیضو
کے دھول سے اٹنے بالوں میں اگلیاں پھیرنے لگی۔
”بس یوں ہی پڑا رہے دے مجھے سکینہ۔ نہ ہاتھ نہ
دھوئے کو دل کر رہا ہے اور نہ روٹی کھانے کو۔۔۔۔۔“ فیضو کو تو
آج میں ٹیکر کے ساتھ اچھا اچھا لگ رہا تھا اور پھر اس نے
دوبارہ اپنی نظریں میں ٹیکر کے کانٹے پر دلے۔ آج سے
پہلے سکینہ نے فیضو کو کبھی اتنا چپ چاپ نہیں دیکھا تھا اور سکینہ
خود بھی اس سے بولتے رہنے کے لیے اتنی بے چین نہیں ہوئی
تھی۔ آج سکینہ کا دل بولنے رہنے کو چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔ اب کے
دن کسی اور طرح چڑھے تھے۔ جب سکینہ نے بازار جاتی
ہوئی بختو سے تیسری بار اہلی منگوائی تو بختو نے سکینہ کو اپنے
سینے سے لگا کر پیچھا لپکا اپنے دو سال کے بچے کو گود سے اتارا
اور بڑی کاٹھلا چپک کر کریم دانی کو بلانے چلی گئی۔

کریم دانی ساٹھ سال کی تجربہ کار عورت تھی۔ اس
نے سکینہ کو ایک نظر دیکھتے ہی اپنی چادر کا پلو پھیلا دیا۔ بختو
نے پہلے تو سکینہ کی پشت پر ایک چٹنی بھری پھر رسوئی سے سیر
بھرا ٹاٹا اور پاؤ بھر گڑ لاکر کریم دانی کے پلو میں باندھ دیا۔

اس بات کو آج ساتواں دن تھا۔ بختو نے سکینہ کو قسم دے
رکھی تھی کہ فیضو کو ابھی کچھ نہ بتائے مگر آج ساتویں دن سکینہ
کا پیٹ اولاد کے بوجھ سے کم اور بات کے بوجھ سے زیادہ
بھاری ہو رہا تھا اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر سکینہ نے
فیضو کے کان میں اپنے بھاری ہوتے ہوئے وجود کی ساری
خوشبو اڑیل دی۔

آگن میں تپتی ہوئی دکھ اور اداسی ٹوٹ چکی تھی۔ فیضو
نے خوب مسل مسل کر ہاتھ نہ دھویا اور پیٹ بھر کر روٹی
کھائی۔ اگلے دن بختو نے دیوار سے جھانک کر دیکھا تو فیضو
اپنے آگن میں لگا ٹیکر کا درخت کٹا رہا تھا۔ اس نے
شرارت بھری نظروں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور وہاں
پلٹ گئی۔

سردیوں کے شروع دنوں میں سکینہ کی گود ہری
ہو گئی۔ مٹکی کی ساری عورتیں ایک ایک کر کے سکینہ کے کھر
مبار کبا دیئے آئیں اور بختو نے سب کا منہ میٹھا کر لیا۔ حسن
بخش کی صورت میں بختو کے بچوں کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔
سارا سارا دن سکینہ کے آگن میں بچوں کے شور اور حسنی کی
فلقار یوں کی سرسوں پھونکی اور دن ڈھلے تک سکینہ اپنے حسنی
کو پتا سنوار دیتی جسے فیضو آتے ہی سینے کا تھوینہ بنا کر چوسنے
چاہنے لگ جاتا۔

حسنی اب چوتھے سال میں جا لگا تھا۔ کبھی کبھی خند
کر کے فیضو کے ساتھ گدھے پر سوار ہو کر گاؤں میں نکلتا۔
فیضو اسے سامعیں فٹلے کے دربار کی چڑھائی تک سیر کرانے
واپس گھر چھوڑ جاتا تھا۔ شام کو بختو کی پانچ سالہ فاطمہ اسے
اپنے ساتھ مائی جا جن کے گھر لے جاتی جہاں وہ دوسرے
بچوں کے ساتھ مل کر نورانی قاعدہ پڑھ رہی تھی۔ کبھی
فیضو کو کئی دن گھر سے باہر بھی گزرتا تھا۔ سکینہ جانتی تھی کہ
فیضو کا باپ احمد و کھار اس علاقے کا مشہور کھوٹی تھا اور فیضو
نے جیتے جی اپنے باپ سے یہ فن سیکھ لیا تھا۔ اب اس گاؤں
میں کہیں بھی کوئی چوری چکاری ہوئی تو فیضو کھار فیضو کھوٹی
بن کر کھرا تلاش کرنے کے لیے لوگوں کے ساتھ نکل کھڑا
ہوتا۔ اکثر چوریوں کا کھوج لگانے کے صلے میں انعام لے
کر گھر لوٹتا تھا۔ گاؤں کے کچھ بھندار اور محتاط طبیعت لوگوں
نے فیضو کو کئی بار بھایا کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے، جراثیم پھیل
لوگوں سے دشمنی مول لیتا پھر تا ہے مگر فیضو کو اس کا مراب
اسی رخ سے اچھا لگتا تھا کہ اس نے ساری زندگی مظلوم
لوگوں کے لیے کھرا تلاش کرنے میں گزار دی تھی۔ فیضو بھی
کسی لالچ کے بغیر لوگوں کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

سنہری باتیں

☆ مصیبت میں آرام کی تلاش مصیبت کو ترقی
دیتی ہے۔

☆ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے
موت۔

☆ جدوجہد نہ کرنا عثمائی کا باعث ہوتا ہے۔

☆ مطالعہ غم اور اداسی میں بہترین دوست
ہے۔

☆ بغیر کوشش کے کامیابی حاصل کرنا ایسے ہی
ہے جیسے بغیر پروں کے اڑانے کی کوشش کرنا۔

☆ سختی کے سامنے پہاڑ ٹکڑے ہیں اور سست کے
سامنے نگر پہاڑ ہیں۔

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا
تخصیص

جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں
ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے ٹک ہونے اور مرد
چار پانی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینہ
کرتے تھے۔ اس زمانے میں چار پانی صرف میزبان جسم
ہی نہیں بلکہ معیار اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو
کندھا دینے والے چار پانی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے
جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی
وہل بھی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دہلی آدی کی دنیا اور
مونے کے حقے عام طور سے خراب ہوتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

ایک دن نور کے ترکے حویلی سے فیضو کا بلاوا آ گیا۔
فیضو نے سمجھا کہ آج پھر دن بھر کی بیگار بھینٹیں پڑے گی اور
صلے میں وہی دس میں سیر گندم۔۔۔۔۔ بڑے خان کا بلاوا تھا اور
باہر کھڑا آدی آوازوں پر آوازیں دیے جارہا تھا۔ فیضو جلدی
سے اٹھا اور جاگتی ہوئی سکینہ کے پہلو میں لیے ہوئے حسنی کو
پیاد بھری نظروں سے دیکھتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔

”کیا ہے بھئی۔۔۔۔۔ سویرے سویرے خیر تو ہے؟“ فیضو
نے دروازے سے نکلتے ہی باہر کھڑے آدی سے پوچھا۔

”اؤئے تو نہیں کھڑا سوال کرتا رہے گا یا پلے گا بھی
سہی۔“ اس نے ترح کر جواب دیا تو فیضو اسے پہچان گیا۔

وہ حویلی کا وفادار ملازم اچھو سوچی تھا۔
”یار تو تو مجھے سے اکھڑا ہا ہے اچھو۔ میں تو یہ پوچھ رہا

”سکینہ..... اری او سکینہ! یہ قاعدہ لینا حسنی کا۔ آج

© 2019 年 5 月 2

49 سیمین ڈائجسٹ



معاشرے کے سب سے خطرناک اور پر لگڑ پھل کا جا کر کرنے والی تحریر... جنگ آمد جنگ آمد کی ملی نغمہ

جنگ آمد

طاہر جاوید منزل

مشرق ہو یا مغرب... انسانی معاشرہ اگر حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو... انسانیت اور حیوانیت میں فرق مٹ جاتا ہے... گویا قدرت نے جس کی جو حد مقرر کر دی اسے اس تک محدود رہنا چاہیے مگر... کیا کیا جائے جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور برداشت اپنی حد سے باہر ہو جائے تو انتقام کی چنگاری رفتہ رفتہ حالات کی تیز ہوا سے بھڑک کر ایک دن شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حال اس بد حال کا ہوا جو جوانی اور دولت کے نشے میں بدمست پاتھی کی طرح سرشار بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک دن اس مظلوم کی برداشت نے جواب نہ دیا... اس کے بعد قدرت نے ایسا طوفان اٹھایا کہ بھڑکتے شعلوں کے رقص نے معاشرے میں بلند مقام پانے والے ظالموں کے نشیمن کو جلا کر راکھ کر دیا... وہ بچیاں جو معصومیت کا پیکر... دلوں کا سکون... گھروں کی رونق تھیں... ان درندہ صفت بھیڑیوں کے خونیں چیزوں سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عزتوں کے جنازہ نکالنے کے لیے ہی شاید دھرتی کا بوجھ بنتے ہیں۔



وہ دوسری ایک چٹیلی اور خوشگوار سر پہنچی۔ سڑکوں پر رز بھی کچھ کم ہی تھا۔ عروہ کو اپنی چھوٹی سوز کی کارڈرائیو کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ آج اس کی جینی حرم کی ایکسویس سالگرہ تھی۔ وہ سالگرہ کی شاٹنگ کرنے ہی لگی ہوئی تھی اور اب جلد از جلد مہر بیچ جانا چاہی تھی کیونکہ عصر کی نماز کا وقت نکلتا جا رہا تھا۔

مہر بیچ کر اس نے خود ہی گیٹ کا لاک کھولا اور گاڑی اندر لے گئی۔ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا بار یال شاید کرکٹ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ کالج کے دوست ہی اسے گروانڈ جانے کی بہت جلدی ہوئی تھی۔ تنہا اور دیگر سامان عروہ نے گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور بس ایک دو شاہ پرزے لے کر اندر چلی گئی۔

”حرم! کہاں ہو بھئی؟“ عروہ نے بیٹی کو آواز دی اور پھر جواب نہ پا کر اس کے کمرے کی طرف ہی چلی گئی۔ حرم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ ”دروازہ کھولو حرم۔“

دوسری دستک پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس نے کان لگائے۔ واش روم میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ حرم واش روم میں تھی۔

عروہ نے وال کلاک دیکھا۔ عصر کی نماز کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے شاہ پرز ایک طرف رکھے اور جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ نماز پڑھ چکی، دعا مانگ چکی لیکن حرم کے کمرے کا دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ عروہ کو غصہ ہی سی تشویش ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ دروازہ ”ٹاک“ کیا۔ اس مرتبہ ذرا بلند آواز میں کہا۔ ”حرم! دروازہ کھولو، کیا کر رہی ہو؟“

اندر سے حرم کی کھانسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کمرے میں اندھیرا کر رکھا تھا اور چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ عروہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید بہن بھائی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے جس کا حرم نے کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے لیکن پھر جب عروہ نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا تو اس کی حالت زیادہ ابتر نظر آئی۔ رنگ بالکل زور ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا میرا بچہ؟“ عروہ جلدی سے اندر آگئی اور اس کے دونوں شانے تھام لیے۔ وہ لائٹ آن کرنا چاہ رہی تھی مگر حرم نے اسے روک دیا۔

”میرا سر درد سے پھنا جا رہا ہے مگی۔ پلیرز..... مجھے

ذرا..... لیٹے دیں۔“ حرم کی آواز جیسے تکلیف کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

عروہ نے غور سے بیٹی کو دیکھا اور پھر جیسے کانپ کر بولی۔ ”اوہ خدایا! اعتبار تو برا حال ہو رہا ہے۔ اگر زیادہ درد ہے تو چلو ڈاکٹر کو کھانا لے آؤ۔“

”ڈاکٹر اس وقت کہاں ہوں گی..... م..... میں نے میڈیسن لی ہے..... ٹک..... کچھ دیر آرام کروں، شاید ٹھیک ہو جاؤں۔“ وہ بھلائی۔

حرم کو بھی بھار سر کا درد ہوتا تھا..... خاص طور سے جب پڑھائی کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ تاہم یہ درد جب بھی ہوتا، شدید نوعیت کا ہوتا تھا۔ عروہ نے بیٹی سے پوچھا کہ اس نے کون سی دوا کتنی مقدار میں کھائی ہے پھر اس نے اسے ماتھے پر ”آکٹمنٹ“ لگانے کا مشورہ بھی دیا اور اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے باہر آگئی۔ بعد ازاں حرم نے درد ازہ پھر اندر سے بند کر لیا۔

عروہ نے بیٹی کے کمرے سے باہر تو آگئی تھی مگر اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ وہ ایک ماں کا دل رہتی تھی اور یہ دل کبہر ہاتھ کا معاملہ کچھ اور ہے شاید..... لیکن زیادہ سنگین نوعیت کا۔ وہ بے قرار ہو کر کمرے میں چلی گئی۔ ایک بار پھر حرم کے کمرے کی طرف گئی لیکن ”ٹاک“ کرتے کرتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا کہ سردی کے باوجود اس کے ہاتھ پر پینے کی مٹی تھی۔ وہ ایک مضبوط اور حوصلہ مند عورت تھی مگر جب سے شوہر امین کو دل کا عارضہ ہوا تھا، وہ خود پر کئی انسانی ذمے داریاں محسوس کرنے لگی تھی۔ کسی بھی مسئلے کی صورت میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس پر بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہے۔ اب بھی وہ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امین کو آفس میں فون کرے اور انہیں حرم کی تکلیف کے بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ارادہ منہ پٹی کر دیا اور شوہر کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ گھر میں بس وہ اور حرم تھے۔ بار یال سے چھوٹی بیٹی مایین چند روز کے لیے اپنی چھینٹ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ عروہ نے سوچا کہ ابھی بار یال کرکٹ کھیل کر واپس آتا ہے تو وہ حرم کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے۔ اس کا منہ خشک ہونے لگا تھا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا، پھر اسے گاڑی میں پڑے سامان کا خیال آیا۔ اس میں وہ تنہا بھی تھے جو امین، بار یال اور خود عروہ کی طرف سے حرم کو دیے جانے تھے۔ اس نے وہ چیزیں نکال

لیں اور انہیں اندرونی کمرے میں رکھنے کے لیے ٹی وی لائوچ میں آئی۔ ایک دم وہ ٹھکی۔ اسے قائلین پر مٹی کے نشان نظر آئے۔ جیسے کوئی کچھ زردہ جوتوں کے ساتھ یہاں سے گزرا ہو۔ وہ غور سے دیکھنے لگی۔ یہ بار یال کے جوتوں کے نشان تو ہرگز نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ اتنا بد تہذیب نہیں تھا کہ اس طرح کی بے پردائی کرتا۔

تو کون آیا تھا یہاں؟ اور اگر آیا تھا تو حرم نے ابھی تک بتایا کیوں نہیں تھا؟ ایک دم اس کا دل زیادہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ اس گھر میں کچھ ایسا ہو چکا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا منہ ایک بار پھر خشک ہونے لگا۔ اس نے سامان سینئر ٹیل پر رکھ دیا اور تحفوں کے تینوں آگے ایک الماری میں کپڑوں کے پیچھے رکھنے کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے الماری کھول کر اس کے بڑے خانے میں ڈھیر کی صورت پڑے کپڑوں کو پیچھے ہٹایا تاکہ تحفوں کے ڈبے ان کے پیچھے رکھ سکے۔ یکا یک ایک منظر دیکھ کر اس کا دل جیسے دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی نگاہ پر پھر وسوسہ نہیں ہوا۔ اس نے وہاں حرم کے کپڑے دیکھے۔ وہی کپڑے جو چند گھنٹے پہلے تک اس نے بہن رکھے تھے لیکن اب یہ کپڑے سلامت حالت میں نہیں تھے۔ کئی جگہ سے دھجیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ حرم نے ان کپڑوں کو بھائی اور ماں کی نظروں سے بچانے کے لیے اس بند الماری میں دیگر کپڑوں کے پیچھے چھپوڑ دیا ہے۔

گھٹ جیسے عروہ کے ہاتھوں سے گر گئے۔ ”حرم..... حرم!“ وہ چلائی اور حرم کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے ایک ہاتھ میں حرم کی پچنی ہوئی گلابی تھی، اس مرتبہ اس نے حرم کے کمرے کا دروازہ پیٹ دیا.....

”دروازہ کھولو حرم..... دروازہ کھولو۔“ وہ بیچانی انداز میں پکاری۔

اس کی تیسری بچتی زوردار دستک پر حرم نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور نیم تاریکی میں آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں۔

”یہ کیا ہے حرم؟“ عروہ دردناک انداز میں چلائی۔ ماں کے ہاتھوں میں اپنی دریدہ قمیص دیکھ کر حرم ماں سے لپٹ گئی اور دھانڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی آواز میں وہ درد و کرب تھا کہ گھر کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں۔ خود حرم کا سارا وجود بھی کانپ رہا تھا اور اس نے ماں کو اپنی ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔

”حرم! میری پتی..... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔ کیا

ہوا ہے؟“ عروہ نے زور لگا کر اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے ماں کے ساتھ لپٹ کر اس کے جسم کا حصہ ہی بن گئی تھی۔ اس کی آہوں میں ایسی شدت تھی کہ عروہ کا سینہ پھٹنے لگا۔ درود یوار اس کی نگاہوں میں محسوس رہے تھے۔ ہاں، وہ ایک ماں تھی اور بیٹی کے کچھ کیے بغیر ہی اس قیامت کو سمجھ رہی تھی جو اس ہنسنے پر ٹوٹ چکی تھی۔

اس نے خود کو بے مشکل بولنے کے قائل کیا اور دل بنگار آواز میں بولی۔ ”حرم! کون آیا تھا اس گھر میں..... مجھے بتاؤ کون آیا تھا؟“

حرم بدستور ماں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آہوں کا کر رہی تھی۔ عروہ نے بڑی دشواری سے خود کو بیٹی سے جدا کیا اور ٹی وی لائوچ کا ادھ کھلا دروازہ بند کر دیا کہیں ماں بیٹی کی آوازیں ساتھ والے گھر میں نہ سنی جائیں۔ اس نے حرم کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے لائٹ آن کی اور بیٹی کو پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ وہ بربادی کی تصویر تھی۔ اس کی گردن اور کلائیوں پر گہری خراشیں تھیں اور کئی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں روتی بھٹکتی ہوئی حرم نے آہوں و سسکیوں کے درمیان عروہ کو جو کچھ بتایا، وہ واقعی قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ گرد و پیش کی ہر شے جیسے عروہ کی نظروں میں گھومتی گئی۔ حرم نے بتایا کہ اس کے ساتھ ”زیادتی“ ہوئی ہے..... ہاں، وہی سب کچھ جو کسی بھی عورت کو زندہ درگور کر سکتا ہے۔

زیادتی کرنے والا مکمل کا ہی ایک نوجوان عدیل تھا۔ ڈور تیل ہونے پر حرم محسن میں گئی تھی تب تک بار یال کرکٹ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ حرم نے پوچھا کہ باہر کون ہے۔ جواب نہ پا کر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ عدیل نے کوئی بات کی اور پھر تیزی سے حرم کو دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ حرم کو چٹائی نہیں چلا کہ کب، کیا اور کیسے ہوا؟ کچھ کی مضبوط گرفت نے اس طرح اس کے منہ کو ڈھانپ لیا تھا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا، اسے سننے کے لیے پتھر کا کیچا چاہیے تھا۔

عروہ نے حرم کو اپنے سینے سے لگالیا اور ماں بیٹی دونوں ہی پیچھون سے رونے لگیں۔ ایک طوفان برپا تھا عروہ کے دل و دماغ میں..... عدیل عرف عادی نام کے اس اوباش کی صورت اس کی نگاہوں میں محسوس رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہوا اور وہ ابھی اسی وقت اس کی جان لے لے۔ کسی تیز دھار آ لے سے اس کے

نکڑے کر ڈالے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال ایک دیکھی ہوئی بیخ کی طرح اس کے دماغ میں گھٹنا چلا جا رہا تھا۔

کیا وہ ابھی اپنے شوہر امین کو بتائے؟
کیا وہ پولیس کو فون کرے؟
کیا فی الحال وہ خاموش رہے اور امین کے گھر آنے کا انتظار کرے؟

ایک ساتھ کئی سوچیں اس کے ذہن پر یلغار کر رہی تھیں۔ اور وہ کا پتہ چلی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں موٹر بائیک کا ہارن سنائی دے گیا۔ یہ امین ہی تھے۔ عروہ نے اپنی اشک بار آنکھوں سے وال کاٹھ کی طرف دیکھا۔ شاید حرم کی سالگرہ کی وجہ سے ہی آج امین ذرا جلدی گھر آ گئے تھے۔ تم کی شدت سے عروہ کے دل کی رگیں پیسے نوٹے لگیں۔ اس نے زیر لب قرآنی آیات کا ورد کیا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

امین اپنی بائیک اندر لے آئے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔ ”کیا بات ہے یہی؟ آج گھر میں سناٹا کیسا ہے؟ بار یال ابھی آیا نہیں؟“

عروہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ تب موٹر بائیک کو اسٹینڈ پر لگاتے ہوئے امین نے عروہ کی طرف دیکھا اور بے طرح چونک گئے۔ ”کیا ہوا عروہ؟“ وہ لپک کر عروہ کی طرف آئے اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔

”آ۔۔۔ آپ اندر چلیں۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔“ وہ پریشان بول پائی۔

امین کا چہرہ ایک دم ہلکی ہو گیا۔ ”عروہ! کیا ہوا؟ بار یال تو ٹھیک ہے؟ حرم کہاں ہے؟ حرم۔۔۔ حرم۔۔۔“ انہوں نے مضطرب ہو کر حرم کو آوازیں دیں۔ تب تک حرم خود کو کمرے میں بند کر چکی تھی۔

عروہ، شوہر کو اندر لے آئی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں انہیں کچھ ہو ہی نہ جائے۔ اس نے لڑناں آواز میں پوچھا۔ ”آپ نے شام والی میڈیسن لے لی ہے؟“ ”ہاں لے لی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ وہ تقریباً چلا اٹھے۔

عروہ نے واقعے کی شدت کم کرنے کے لیے پہلے صرف یہ بتایا کہ وکیل ریاض صاحب کا لڑکا عدیل زبردستی گھر میں گھسا ہے اور اس نے حرم سے ”دست برداری“ کی ہے۔ امین کا سارا وجود جیسے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ ”اوہ گاڈ! ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ بے دم سے ہو کر مرنے پر پہنچ گئے۔۔۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کھڑے

ہوئے۔ ”کہاں ہے حرم۔۔۔ حرم! کہاں ہو؟“ وہ بے حد زخمی لہجے میں پکارے۔

عروہ نے ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ ”میں بتاتی ہوں آپ کو سب کچھ۔۔۔ سب کچھ بتاتی ہوں۔“ وہ سسکی اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے امین کو ایمر چٹھی میں دی جانے والی میڈیسن نکالی اور پانی کے ساتھ کھلا دی۔

تب اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ سب کچھ امین کے گوش گزار کر دیا جو آج کے روز ایک بہت بڑی آفت کی طرح ان پر مسلط ہوا تھا۔ اگلا فریبا ایک گھٹنا بے حد اذیت ناک تھا۔ میاں بیوی اشک بار آنکھوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ بار یال بھی اب گھر واپس آ چکا تھا۔ ابھی اسے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ اس کی بہن کے سر میں شدید درد ہے۔ بہر حال وہ اتنا بھی نا بوجھ نہیں تھا کہ اس بات پر مکمل یقین کر لیتا۔ وہ بھی کم مہم اور حیران دکھائی دیتا تھا۔

بند کرے میں عروہ نے امین سے کہا۔ ”کچھ کہہ نہیں سکتے۔۔۔ اور چپ بھی نہیں رہ سکتے۔ آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟“

امین نے اپنے خشک ہوئے لبوں پر زبان پھیر دی۔ ”میرا تو خیال ہے پہلے حرم کے خالو جی سے بات کر لی جائے۔“ ”ہاں امین! میرے ذہن میں بھی یہی آ رہا ہے۔“

م۔۔۔ میں انہیں فون کرتی ہوں۔۔۔ اگر۔۔۔ وہ گھر آ چکے ہیں۔۔۔ تو انہیں یہیں بلا لیتے ہیں۔۔۔

”ہاں۔۔۔ کرو فون۔“ امین نے رد مال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

حرم کے خالو یاور حیات کو نسل پرہ چکے تھے اور ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت بھی کرتے تھے۔ وہ تھا نے بکھری کے معاملات کو سمجھتے تھے اور ان کا ایک حلقہ احباب تھا۔ وہ عروہ سے بہت انس بھی رکھتے تھے۔ عروہ یہ کچھ دیر تک سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔ آنسو نہ پ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر اُٹھی اور دوسرے کمرے میں رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ بار یال کا کال کاغذ میں ثبت تھا۔ عروہ نے کہہ کر اسے اوپر ٹیکری میں بھیج دیا تھا۔ وہ کچھ دیر لڑناں و ترساں، فون ہاتھ میں لیے کھڑی رہی پھر اس نے حرم کے خالو کا نمبر پریس کرنا چاہا۔ یہی وقت تھا جب اس نے کندھے پر ہاتھ کا ٹیس محسوس کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں امین کھڑے

تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی اور رخساروں پر زردی کھڑی تھی۔ بولے۔ ”عروہ! ابھی ٹھہر جاؤ۔ کچھ اور سوچ لیں۔ ادھر آؤ میرے ساتھ۔“

امین اور عروہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں آن بیٹھے۔ امین نے دلدوز لہجے میں کہا۔ ”ایک بار یہ بات محل کنی تو پھر بہت دور تک جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ ہم ان سارے حالات کا سامنا کر پائیں گے یا نہیں۔ پتا نہیں کر کیا کیا باتیں بنائی جائیں گی۔۔۔ اور۔۔۔ پھر۔۔۔“

بکھری۔۔۔ یا اللہ! ہم کس آفت میں پھنس گئے ہیں۔“ عروہ بھی جیسے بے دم ہی ہو گئی۔ حرم کی منگنی ہو چکی تھی۔ پر دگر ام یہی تھا کہ اگر بکھریشن کے نور ا بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھا یا جاتا تھا۔ عروہ نے ابھی سے اس کی شادی کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں انکشی کرنا شروع کر دی تھیں۔ حرم کے حوالے سے بڑے خوبصورت بیٹے بچا کر کے تھے اس نے اپنی آنکھوں میں اور آج۔۔۔ دسمبر کی سیاہ شام میں اس چار دیواری کے اندر کیا آفت بج گئی تھی۔

اس نے بے بسی سے اپنے سر کو دایم بائیں ہاتھ یا پھر سسک کر بولی۔ ”اتنا بڑا ظلم ہوا ہے ہمارے ساتھ۔۔۔ کیا ہم چپ رہیں، اپنے ہونٹ سی لیں؟ یہ تو۔۔۔ یہ تو ظلم کا ساتھ دینے والی بات ہے۔ ہمارا اسلام بھی یہی کہتا ہے جو ظالم کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا، وہ ظالم کا ساتھ دیتا ہے۔“

”لیکن عروہ! یہ ہماری بیٹی کی زندگی کا سوال بھی تو ہے بلکہ ہماری دونوں بیٹیوں کی زندگی کا سوال ہے۔ ہم کس کس کا منہ بند کریں گے۔ اوہ خدا یا۔۔۔ اوہ خدا یا۔“ عروہ نے شوہر کے سارے بدن پر لرزہ طاری دیکھا تو اپنے لرزے کو بھول کر امین کے دونوں ہاتھ تھام لیے، ان کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اگر ایک بار یہ بات محل کنی تو پھر کمان سے نکلنے تیری کی طرح ہوگی جو داہن نہیں آتا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس پہاڑ جیسے مدد سے کواپنے سینے کی گھرائی میں چھپا لیا جائے؟ اس قیامت منفری کو اس چار دیواری کے اندر دھن کرنے کی کوشش کی جائے؟ ایک بار پھر عدیل عرف عادی کا محسوس چہرہ عروہ کی نگاہوں میں گھوما اور اسے اپنے جسم میں چنگار یا اس کی چھوٹی محسوس ہوئیں۔

عدیل عرف عادی اپنے ماں باپ کا اگوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد ہائی کورٹ و سپریم کورٹ کے ایک نامی گرامی

دیکھتے تھے جبکہ والدہ ایک مشہور انکس میڈیم اسکول کی وائس پرنسپل تھیں۔ ان دونوں کو اپنے اپنے پروفیشن سے کچھ ایسی اہمیت تھی اور سروں پر مزید سے مزید ترقی کا کچھ ایسا بھوت سوار تھا جس نے انہیں اپنی اولاد کے ترقیبی تقاضوں اور اس سلسلے میں اپنے دیگر فرائض سے غافل کر رکھا تھا۔ اپنے بچے کی آوارہ گردی کو انہوں نے اولاد کے سماجی حقوق کا نام دے رکھا تھا۔ عدیل اب یونیورسٹی کا طالب علم تھا لیکن اس کو برائے نام طالب علم ہی کہنا چاہیے۔ اس کے آوارہ گرد اور اوباش دوست اسکول کے زمانے سے ہی اس کے ساتھ رہے تھے اور اب تو عدیل کے ماں باپ کو اس بات کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ یونیورسٹی میں امتحانات کی تیاری کا بھاند کر کے راتیں باہر بسر کرنے والا ان کا بیٹا درحقیقت کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ گھر کے لیے ایک اوجیز عمر بھل وقتی ملازم رکھ کر عدیل کی والدہ گھر کے کام کاج اور عدیل کی ذمہ داریوں سے ”سبکدوش“ ہو چکی تھیں۔ شریاں نامی یہ ملازمہ جب بھی عدیل کے کمرے کی صفائی کرتی، ڈسٹ بن سے کاغذ میں لپٹے ہوئے سکرپٹ کے ٹکڑے اور بھی بھی شیشے کی کوئی خالی بوتل بھی نکلتی جس میں سے عجیب طرح کی بدبو آ رہی ہوتی۔ ایسی بوتلوں کے ٹیکل پیسے ہوئے ہوتے اور صاف پتا چلتا تھا کہ ان کی اصل کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خوش فکروں کی سی ذریعہ بھی اکثر شریاں کو دکھائی دے جاتیں۔ ایک دودھ اس بے چاری ہمدرد کو کرائی نے دلی دلی زبان میں عدیل کی والدہ کو یہ سب کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن بدلے میں اسے اچھی خاصی ڈانٹ کھانا پڑی۔ اس سے یہ کہا گیا کہ اسے عدیل کے ذاتی معاملات میں دخل دینے اور اس کے کمرے کی تلاشیاں لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اب بالغ ہے اور اپنا بھلا برا جانتا ہے اور اگر واقعی ایسی کوئی بات ہوگی تو اسے سمجھانے کے لیے اس کے ماں باپ موجود ہیں۔

اس کے بعد سے ملازمہ شریاں نے اس حوالے سے بالکل چپ سا مدد کی تھی لیکن پچھلے چند ماہ سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ عدیل کی آوارہ گردی اس حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے اس لڑکے سے خوف سا آنے لگتا تھا۔ اس نے اسے گود میں کھلایا تھا، لیکن اب اسے یوں لگتا تھا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے جسے وہ دھو جاتی ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆
اتوار کا دن تھا۔ عروہ کے شوہر امین سرور پچھلی رات کافی دیر تک جاگتے رہے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

مہلکی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز
ہولڈرز
اجل زیدی
کے لیے پاکستان کے بہترین دواؤں کی



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9- اپریل 30۴ مئی
9- اگست 30۴ ستمبر
9- دسمبر 30۴ جنوری
بہار ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۲۰۰۱ء
سراہک دھیمہ پک ۱۹۸۴ء
فون (051) 32331725
سراہک 0300-8566188

لاہور

کلف سینٹر
۱۶ اگست ۱۹۸۶ء
فروری ۲۷ تا فروری ۱۴
۱۴ جون ۲۷ تا جون ۱۴
۱۴ اکتوبر ۲۷ تا اکتوبر ۱۴
موبائل نمبر 0300-8566188

پشاور

کیم فروری ۱۱ تا فروری ۱۴
کیم جون ۱۱ تا جون ۱۴
کیم اکتوبر ۱۱ تا اکتوبر ۱۴
فون 0300-8566188

ملتان

۱۲ مارچ ۲۷ تا اپریل ۱۲
۱۲ جولائی ۲۷ تا اگست ۱۲
۲۸ نومبر ۲۷ تا دسمبر ۲۸
۱۲ مارچ ۲۷ تا اپریل ۱۲
۱۲ جولائی ۲۷ تا اگست ۱۲
۲۸ نومبر ۲۷ تا دسمبر ۲۸
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی

۱۳ مارچ ۲۷ تا اپریل ۱۳
۱۳ جولائی ۲۷ تا اگست ۱۳
۱۳ نومبر ۲۷ تا دسمبر ۱۳
۱۳ مارچ ۲۷ تا اپریل ۱۳
۱۳ جولائی ۲۷ تا اگست ۱۳
۱۳ نومبر ۲۷ تا دسمبر ۱۳
فون 0300-8566188

دور رہی۔ رات چار بجے کے قریب انہوں نے سکون آور گولی لی اور پھر سوتے۔ اب صبح کھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ قدموں سے باہر لان میں آئے تو عروہ، کہیں کھوئی کھوئی سی، پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ آج اس قیامت کو گزرے جو قہار و زہر تھا محمد صمد کی شدت وہی تھی۔ عروہ کا چہرہ دیکھ کر امین سر دھکا پٹکا کیا ہوا محسوس ہوا۔ لان میں لگے پھول پودوں کے درمیان وہ خود ایک مرجھا ہوا پھول نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کا تھکا ہوا تھا کہ وہ بھی رات کو تھک سکتی ہے۔

امین سر دھکا پٹکا کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ”اگر آؤ، یہاں بیٹھے ہیں۔“ لان ٹیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیکل تک لے آئے۔ ”دیکھو عروہ! یہ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔“ امین ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عروہ رو ہنسی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر امین خاموش ہو گئے۔

عروہ بولی۔ ”لیکن امین! اتنی بڑی پریشانی، اتنا بڑا دکھ ہمارے لیے ہی کیوں؟ ہم سیدھے سادے، بے ضرر سے لوگ، نماز روزے کے پابند، بھی کسی سے کوئی اونچ نیچ نہیں کی اور نہ ہی ایسے ویسے لوگوں سے کوئی تعلق رکھا، اپنے بچوں کو بچا اور سلیقہ مند بنایا، پھر ایسی پریشانی ہم پر ہی کیوں آئی؟“ عروہ کی درم زہد آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ رات بھر انہی جاناہ خبیالات کی زد میں رہی ہے۔

امین نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی آواز بچوں تک نہ پہنچ جائے۔ امین نے کہا۔ ”دیکھو عروہ! اس دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ پاک سے اس بات کی سند لے کر نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کی پریشانیاں آئیں گی اور کس قسم کی تھیں۔ وہ ہمارا معبود ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہ بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ ہمیں آزماتا ہے، کبھی خوشی دے کر، کبھی تکلیف دے کر، کبھی تھوڑی دے کر، کبھی زیادہ دے کر۔۔۔۔۔ اور قدرت کا یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ امیر غریب، عقل مند یا بے وقوف، ٹیک یا بدیہی کو اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔“

امین کی بات سے عروہ کی بے پناہ بے قراری میں ذرا سی کمی واقع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے تم کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا۔ امین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے عروہ! اور حالات سے مقابلہ کرنے کی محنت بھی اللہ پاک نے انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہے۔“

”یہی بات تو میں بھی آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔“ عروہ نے جین ہو کر بولی۔ ”آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں یہ سب کچھ خاموشی سے نہیں سہنا چاہیے۔ ہمیں انصاف ملنا چاہیے۔ ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔“

”کون سا قانون؟“ امین نے زخمی لہجے میں عروہ کی بات کاٹ ڈالی۔ ”میں ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا ہوں عروہ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں لوگوں نے قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے۔ انصاف حاصل کرنا ہی تو اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسے کیسوں میں رتلے اور خوار ہوتے دیکھا ہے۔ بدنامی اور جگ بگاتی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ طاقتوروں کی دنیا ہے عروہ! یہاں سب کچھ اثر رسوخ اور تعلق ناتوں سے ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی بڑے آدمی کے چڑاؤ کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔۔۔ اور اس خبیث کا باپ تو خود ایک بڑا آدمی ہے۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ وپرم کورٹ ریاض احمد جاوید صاحب۔“ امین نے بڑے درو سے کہا اور پھر خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح کی گفتگو کل اور برسوں بھی میاں بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور نتیجہ یہی ایک کرناک خاموشی نکلا تھا۔ کچھ دیر بعد اس خاموشی کو امین نے ہی توڑا۔ ”ماہین اور باریال کی کیا پوزیشن ہے؟“ اس نے عروہ سے دریافت کیا۔

”دو دن اس دن سے چپ چپ ہیں۔ باریال ایک دو بار مجھ سے پوچھ چکا ہے کہ اگر آپ کو بخار ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹالا ہے کہ وہ پرانے نسخے کے مطابق خود ہی دوا کھا رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم حرم کو بھی اچھی طرح سمجھا دو کہ کوئی ایسی دینی بات منہ سے نہ نکالے۔“

عروہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو وہ کمینہ محلے سے غائب ہے لیکن آج نہیں توکل واپس تو آئے گا۔ انہی گلیوں میں گھومے پھرے گا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ جب اس سے آسنا سامنا ہوگا تو دل کی کیا حالت ہوگی۔۔۔۔۔ میں کچھ کر ہی نہ بیٹھوں۔“

”میں نے کل بھی تم سے کہا تھا عروہ! اسوچ بھار کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہی ہے کہ ہم دینی طور

دور رہی۔ رات چار بجے کے قریب انہوں نے سکون آور گولی لی اور پھر سوتے۔ اب صبح کھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ قدموں سے باہر لان میں آئے تو عروہ، کہیں کھوئی کھوئی سی، پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ آج اس قیامت کو گزرے جو قہار و زہر تھا محمد صمد کی شدت وہی تھی۔ عروہ کا چہرہ دیکھ کر امین سر دھکا پٹکا کیا ہوا محسوس ہوا۔ لان میں لگے پھول پودوں کے درمیان وہ خود ایک مرجھا ہوا پھول نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کا تھکا ہوا تھا کہ وہ بھی رات کو تھک سکتی ہے۔

امین سر دھکا پٹکا کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ”اگر آؤ، یہاں بیٹھے ہیں۔“ لان ٹیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیکل تک لے آئے۔ ”دیکھو عروہ! یہ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔“ امین ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عروہ رو ہنسی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر امین خاموش ہو گئے۔

عروہ بولی۔ ”لیکن امین! اتنی بڑی پریشانی، اتنا بڑا دکھ ہمارے لیے ہی کیوں؟ ہم سیدھے سادے، بے ضرر سے لوگ، نماز روزے کے پابند، بھی کسی سے کوئی اونچ نیچ نہیں کی اور نہ ہی ایسے ویسے لوگوں سے کوئی تعلق رکھا، اپنے بچوں کو بچا اور سلیقہ مند بنایا، پھر ایسی پریشانی ہم پر ہی کیوں آئی؟“ عروہ کی درم زہد آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ رات بھر انہی جاناہ خبیالات کی زد میں رہی ہے۔

امین نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی آواز بچوں تک نہ پہنچ جائے۔ امین نے کہا۔ ”دیکھو عروہ! اس دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ پاک سے اس بات کی سند لے کر نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کی پریشانیاں آئیں گی اور کس قسم کی تھیں۔ وہ ہمارا معبود ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہ بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ ہمیں آزماتا ہے، کبھی خوشی دے کر، کبھی تکلیف دے کر، کبھی تھوڑی دے کر، کبھی زیادہ دے کر۔۔۔۔۔ اور قدرت کا یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ امیر غریب، عقل مند یا بے وقوف، ٹیک یا بدیہی کو اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔“

امین کی بات سے عروہ کی بے پناہ بے قراری میں ذرا سی کمی واقع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے تم کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا۔ امین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے عروہ! اور حالات سے مقابلہ کرنے کی محنت بھی اللہ پاک نے انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہے۔“

”یہی بات تو میں بھی آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔“ عروہ نے جین ہو کر بولی۔ ”آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں یہ سب کچھ خاموشی سے نہیں سہنا چاہیے۔ ہمیں انصاف ملنا چاہیے۔ ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔“

”کون سا قانون؟“ امین نے زخمی لہجے میں عروہ کی بات کاٹ ڈالی۔ ”میں ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا ہوں عروہ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں لوگوں نے قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے۔ انصاف حاصل کرنا ہی تو اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسے کیسوں میں رتلے اور خوار ہوتے دیکھا ہے۔ بدنامی اور جگ بگاتی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ طاقتوروں کی دنیا ہے عروہ! یہاں سب کچھ اثر رسوخ اور تعلق ناتوں سے ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی بڑے آدمی کے چڑاؤ کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔۔۔ اور اس خبیث کا باپ تو خود ایک بڑا آدمی ہے۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ وپرم کورٹ ریاض احمد جاوید صاحب۔“ امین نے بڑے درو سے کہا اور پھر خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح کی گفتگو کل اور برسوں بھی میاں بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور نتیجہ یہی ایک کرناک خاموشی نکلا تھا۔ کچھ دیر بعد اس خاموشی کو امین نے ہی توڑا۔ ”ماہین اور باریال کی کیا پوزیشن ہے؟“ اس نے عروہ سے دریافت کیا۔

پر اس سارے منظر سے اوجھل ہو جائیں۔ خاموشی سے کہیں چلے جائیں اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ یہاں سے شفٹ ہو جائیں؟“ عروہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں عروہ! اس طرح کی بات جب پچھلتی ہے تو جنگل کی آگ بن جاتی ہے۔ ہمیں حرم کا ہی نہیں، ماہین کے مستقبل کا بھی سوچنا ہے بلکہ اپنے تینوں بچوں کا سوچنا ہے، ہمیں حکمت سے کام لینا پڑے گا عروہ۔“

عروہ نے کن انہیوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ امین بزدل نہیں ہیں۔ وہ جب صحت مند تھے تو مشکل ترین حالات میں بھی اپنے موقف کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن جب سے دل کا عارضہ لاحق ہوا تھا، ان کے مزاج میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ ان میں دھیمپا اور مصیبت پسندی آتی چلی گئی تھی اور یقیناً وہ ٹھیک ہی تھے۔ رنج و غم سے ان کے دل پر براہ راست اثر پڑتا تھا۔ ایسے کئی موقعوں پر انہیں سیدھا اسپتال جانا پڑا تھا۔ اب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں کمپیوٹر کے شعبے میں کام کر رہے تھے۔ آمدن محدود تھی، خدا کا شکر تھا کہ عروہ کو اپنے نانا کی پر اپنی میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہوا تھا۔ یہ تین دن کا نہیں تھیں جن کے کرائے سے ان کی گزر بسر برآسانی ہو جاتی تھی۔

ابھی ٹھہر چھوڑنے کی صرف بات ہی ہو رہی تھی، لیکن عروہ کو ایک دم سب کچھ اجنبی اجنبی سا لگنے لگا۔ اس نے گھر کے دروازے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے اپنے اس گھر سے اور جگہ سے محبت تھی۔ وہ بیاہ کر اسی گھر میں آئی تھی۔ ان کی شادی شدہ زندگی کے بائیس سال۔ تین بیٹے تھے۔ وہ آہ بھر کر رہ گئی۔

”دیکھو عروہ! اتم ہمت دکھاؤ اور خود کو مضبوط کرو۔ تم حرم کی ماں ہو۔ جو باتیں وہ تم سے کر سکتی ہے، مجھ سے نہیں کر سکتی۔ تم مضبوط ہوگی تو اس کو بھی سنبھال پاؤ گی۔ اس کو تمہاری جتنی ضرورت اب ہے، شاید جب بھی نہیں ہوگی جب تم نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین شاک میں ہے۔“

یہ سب کہتے ہوئے امین سرور کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کے دلوں کی طرح اس گھر کے تمام دروہام پر مردنی چھائی دکھائی دیتی تھی۔ یہی وہ لان تھا جہاں ان کی حرم کے ننھے ننھے قدموں کے نشان ثبت ہوئے تھے اور پھر اس کے بعد بدلے موسموں میں ان گنت سہائی یادوں کا سلسلہ تھا۔

امین سرور نے گہری سانس لیجے ہوئے کہا۔ ”آج اتوار ہے۔ میں ایک دو ”سوسائیز“ کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ لاہور بہت بڑا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی مناسب سا پارکسٹ یا پورشن کرائے پر مل ہی جائے گا۔“

”اور یہ گھر؟“ عروہ نے ادا سے پوچھا۔

”ابھی جوں کا توں رکھتے ہیں۔ آگے چل کر اگر اچھی قیمت ملے گی تو فروخت کر دیں گے۔“ پھر امین سرور نے ذرا توقف کیا اور عروہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم ذرا حرم کے کمرے کا چکر لگاؤ۔ اسے دیکھو، اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارو۔“ یہ کہہ کر امین سرور اٹھے اور گیراج میں کھڑی جہاز کا رخ کیا۔

عروہ نے اپنی رست وچ دیکھی اور بڑبڑائی۔ ”بارہ بیٹے والے ہیں، ابھی تک ناشتے کے لیے بھی نہیں اٹھی۔“

اس نے امین کوئی آف کیے بغیر ہی حرم کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

حرم اپنے کمرے میں تھی اور سوچوں میں گم تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ امین اور عروہ نے اسے بڑے ناز و خیر سے پالا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر بہ قرار ہو جاتے تھے۔ اپنے اپنے کام کے علاوہ جتنا وقت ان دونوں میاں بیوی کے پاس ہوتا، وہ اپنی نئی حرم کے ساتھ گزارتے۔ حرم کے بعد ان کے دو بیٹے اور پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا بابر یال اور بیٹی ماہین۔ ان دونوں سے بھی ان کو زیادتی پیدا تھا جیسا حرم سے تھا۔ لیکن اس سے بہت کر ایک کشش، ایک انسیت تھی جو وہ حرم کے لیے محسوس کرتے تھے اور یہ بات حرم بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔

حرم جب دراز بڑی ہوئی تو اس کے پاپائے اس کے لیے پینے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ حرم کی ماں سے کہتے۔ ”عروہ! میں اپنی حرم کو ذرا کٹر بناؤں گا۔ چاہے مجھے اس کو پرائیویٹ ہی کیوں نہ پڑ جانا پڑے۔“

انہوں نے ایک اچھی سوسائٹی میں پانچ مرلے کا پلاٹ اسی قیمت سے لیا ہوا تھا کہ وقت آنے پر وہ اسے بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے فروخت کر دیں گے۔ حرم میٹرک میں تھی جب اس کے تایا نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگا۔ آصف آکھنڑنگ کا طالب علم تھا۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور اچھے گزرتی حیثیت سے ملتے تھے۔ حرم کے والدین کو یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ والدین اور دیگر اہل خاندان کی

رضامندی حرم کی رضامندی بھی بن گئی اور اس طرح ان دونوں کی باقاعدہ منگنی ہو گئی۔ منگنی کے بعد بھتیجے میں ایک درباروں پر ان کی بات ہو جاتی تھی یا پھر کسی تہوار یا شادی بیاہ کے موقع پر آمانا سامنا ہوتا۔ آصف کے بقول وہ حرم کو ایک عرصے سے پسند کرتا تھا پر کسی یہ بات اس سے کہہ نہ پایا۔ اب وہ اکثر کہتا تھا کہ اس نے حرم کو پا کر سب کچھ پایا ہے۔ وہ اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے، اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی خاطر اپنی جان بھی دیے دینا اس کے لیے آسان ہے اور..... ایک نئی فرسٹ تھی عہدہ پیمان کی جو حرم کو اکثر سننا پڑتی تھی۔ ایسے میں وہ شش دیتی..... اور کبھی کبھی ڈر بھی جاتی۔ وہ سوچتی کہیں یہ آصف کا وقتی جوش اور اس کے سٹگی جذبہ بات تو نہیں؟ بہر حال اس کے لیے اس کی تعلیم، والدین اور بہن بھائی اولین ترجیح رہے اور اس کی ہر نئی خوشی انہی کے ساتھ جڑی رہی۔ بس اسی دھوپ چھاؤں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور پریشانیوں کے درمیان زندگی کا سفر جاری رہا تھا اور اب..... اب حرم کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا تھا جس نے اسے بنیادوں سے ہلا کر اس کی ساری ہستی کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ؟ کیوں ہو گیا تھا؟ کبھی بھی تو اسے اپنے جسم سے محبت آنے لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دو ٹاپاک ہاتھ ابھی تک اس کے جسم سے چپکے ہوئے ہیں اور بدبو دار سانس زہریلی پتھکروں کی طرح اس کی سماعت کو اور حس شامہ کو مجروح کر رہی ہیں۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی جلد کو اپنے جسم پر سے کھینچ کر پیچھ کر دے یا پھر آنکھیں بند کر کے کوئی ایسی چیز نگل لے جو اس کی جان کو اس کے داغ دار جسم کی قید سے آزاد کر ڈالے۔ اس وقت بھی وہ کسی ایسی ہی کیفیت میں بستر پر بے سجدہ پڑی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی، دوپہر ہو چکی تھی لیکن دروازہ کھولنے اور باہر نکلنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جب وہ دروازہ کھولے گی اور باہر نکلے گی تو بے شمار لگا ہیں اس کے چہرے پر جرجر جائیں گی۔ ان میں ایک نگاہ..... ہاں، ایک نگاہ آصف کی بھی ہوگی۔ یہ نگاہ اس سے پوچھے گی..... تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے حرم! تم وہ پہلے والی حرم تو نہیں ہو؟ تم نہیں ہووہ پہلے والی حرم۔

☆☆☆

”حرم بیٹا! دروازہ کھولو۔“ عروہ نے بے قراری سے بیٹی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

دوسری تیسری دستک پر حرم نے دروازہ کھولا۔ عروہ نے اندر آ کر فوراً لائٹ آن کی۔ حرم کو دیکھ کر عروہ کا دل ہول گیا۔ اس کے خوبصورت، شہرنگ بال اچڑے ہوئے، آنکھیں سوچی ہوئی اور چہرہ تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ”حرم! میری بیٹی.....“ عروہ نے تڑپ کر اسے گلے سے لگایا۔ اس کے جسم کی حرارت سے عروہ کو فوراً ہچک چکا کہ وہ بخار میں مبتلا رہی ہے۔ اس لمحے اپنے شوہر امین کی باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ اس نے آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنے حلق میں اندر لیا اور بولی۔ ”ادھر آؤ میری بیٹی! ادھر بیٹھو۔“ یہ کیا حالت بنا رہی ہے؟“ اس نے حرم کو بازوؤں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ گلے سے ٹپک لگوا کر اس کی آنکھیں سیدھی کیں اور مکمل اوڑھ لیا۔ تب اس نے بچن میں جا کر فریج کھولتے اور چائے بنا لی اور اپنے ہاتھ سے حرم کو ناشا کرایا۔ اسے بخاری دوا دے کر وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

وہ دوسری ایک سرد دوپہر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نکلنے والا سورج اب کہیں بادلوں کی دھیر سے تھپ چکا تھا۔ عروہ نے کمرے کی لائٹ کی طرف مٹھنے والی کھڑکی بند کی اور پردے درست کر کے اس کے پاس ہی کھل میں بیٹھ گئی۔ اس نے حرم کے سر کو ہولے ہولے دبا دے ہوئے وہ ساری باتیں اپنے انداز میں اسے سمجھائیں جو کچھ دیر پہلے امین نے اسے سمجھائی تھیں۔ آخر میں وہ بولی۔ ”دیکھو میری بیٹی! یہ ہم سب کا سانچا دکھ ہے..... اور اسے ہم سب نے مل کر جھیلنا ہے۔ خود کو بھی ایک لمحے کے لیے بھی اکیلاست سمجھنا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہو، ہم ہیں۔ جو لوگ حوصلے کے ساتھ دکھوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اللہ بھی ان کا ساتھ دیتا ہے اور دیکھنا اللہ ہمارا ساتھ دے گا، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا.....“

”کیا ٹھیک ہوگا ماما؟ مجھے لگتا ہے کہ میرا دل دھڑکتا ہے، سانس چلتی ہیں لیکن میری روح نے میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں ایک مردے کی طرح اپنے آپ کو کھینچتی پھرتی ہوں۔ میں کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتی ماما۔“ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

عروہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہنے لگا۔ ”چپ کر جا میری بیٹی! جو کچھ ہوا ہے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ ادھر والا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کی لائٹ سے آواز ہوتی ہے۔ تم دیکھ لینا، بہت جلد اس بد بخت کو اپنے گے کی سزا ملے گی۔ مل کر رہے گی۔ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے

خاموش ہو گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
 آصف بولا۔ ”آپ لوگوں کی اچانک شگفتگی نے مجھے حیران کر دیا تھا لیکن پھر ابوجان سے پتا چلا کہ آپ گھر کو ”ریٹوئٹ“ کر کے بیٹے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چلیں اچھی بات ہے۔ وہ علاقہ کافی تنجان ہو چکا ہے۔ طرح طرح کے لوگ آگئے ہیں۔“

”ہاں آصف! شفت ہونے کا ارادہ تو کافی دیر سے تھا لیکن پھر پچھلے مہینے اچانک پروگرام بھی بن گیا۔“
 ”چلیں جی۔ ہونے والا کام ہو گیا۔ ویسے ہم لوگ اگلے پختہ لاہور آ رہے ہیں۔ آپ کی طرف بھی پتھر لگے گا۔۔۔۔۔۔ ویسے چچی۔۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں آپ سے؟“

آصف نے ذرا دیر کے لیے سوچا۔
 دوسری طرف عربہ کو لوگ کدال اچھل کر گئے ہیں یا اس کے کھروالوں کو کوئی شک تو نہیں پڑ گیا؟ ”نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ عربہ نے خود کو سمجھا یا اور سمجھالا۔“
 ”ویلو چچی! اہیل۔۔۔۔۔۔ آپ سن رہی ہیں؟“

وہ ہنسنے چوٹ کر بولی۔ ”جی جی جی! میں سن رہی ہوں۔“ عربہ کی آواز میں لرزش تھی۔

”چچی! چھ سات روز پہلے فون پر آپ سے ای ای ابو کی بات ہوئی تھی۔ بقول ای، آپ کچھ پریشان لگتے تھے انہیں۔ اس دوران میں حرم سے بھی میری بس ایک دو دفعہ ہی بات ہو سکی ہے۔ یا تو اس کا فون بند ہوتا ہے یا پھر وہ خفک طرح سے بات ہی نہیں کرتی۔ کیا معاملہ ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

آصف کے لیے کے جس اور ذمہ داری انداز کو عربہ نے پوری طرح محسوس کیا۔ ایک لمحے میں کئی خدشات اس کے ذہن میں ابھرے۔ تاہم وہ اپنے لیے کو نابل رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں آصف! بالکل خیریت ہے۔ تم یونہی پریشان ہو رہے ہو۔ اصل میں امتحانات قریب ہیں۔ پڑھائی کا بوجھ ہے۔ اس وجہ سے ”اسٹریس“ لے رہی ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔ تم گھر نہ کرو۔“

ساتھ ہی ذورنیل کی آواز آئی۔ اس سے عربہ کو رابطہ منقطع کرنے کا جواز ملا۔ ”شاید کوئی دروازے پر ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”خفک ہے چچی! سب کو سلام دیجیے گا۔ ہم لوگ اس پختہ ضرور چکر لگائیں گے۔ خدا حافظ۔“
 فون بند ہوا تو عربہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی۔۔۔۔۔

اسے پانی پلایا۔ حرم اور ماجین کو آواز دی۔ آئی کے کنبے پر حرم اپنی ماں کے شانے دبانے لگی۔ ایک لمحے کے لیے عربہ کا دل چاہا کہ اپنا کتا بولنے لگتا ہو یا پھر اسے سانسے رکھ دے اور سچ سچ کر سارے محلے کو کٹھا کرے۔ ان سب کو اس سوال کا جواب دے جو وہ سب پوچھ رہے تھے۔ انہیں بتائے کہ وہ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ کیوں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے یا کھڑے ہیں؟ کیوں اس مٹی کو اور اس سے وابستہ ساری یادوں کو الوداع کہہ کر یہاں سے منہ موڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔

لیکن وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔ اگر وہ کبھی تو اس علاقے کی ہر دیوار پر اس کی اور اس کے اہل خانہ کی بدنامی کے اشتہار لگ جاتے۔ ایسے معاملوں میں یہ معاشرہ ایسا ہی سنگدل ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے سارے ہوشوں کو سلائی رہنے دیا۔

کچھ دن پہلے تک انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ حالات ان کی زندگی میں ایسی حیران کن تبدیلیاں لائیں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہیں اپنا وہ پیارا آگن چھوڑنا پڑا تھا جہاں ان کی زندگی کے کئی برس سنہری یادوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔ اب یہ ایک ناموس جگہ تھی۔ ارد گرد کے ناموس لوگ تھے۔ پانچ مرلے کا یہ پورشن سامان رکھنے اور رہنے کے لحاظ سے کافی تو نہیں تھا مگر گزارہ ہونے لگا تھا۔ روز و شب کے معمولات ترتیب پا کر شروع ہو گئے تھے۔

بچے کا دن تھا۔ صبح گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا جب عربہ سو سائیکل کی مارکیٹ سے گزری لے کر گھر پہنچی۔ کچھ سامان اس نے گاڑی میں ہی رہنے دیا جبکہ گوشت، سبزی اور انڈے وہ اپنے ساتھ لے آئی۔ آج وہ حرم کا پسندیدہ چکن کارن سوپ بنانے جا رہی تھی۔ حرم ابھی کالج میں تھی اور وہ اس کے آنے سے پہلے سوپ تیار کر لیتا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے چکن ابلانے کے لیے دھکی ہی تھی کہ اس کے سٹیل فون پر کال کے سٹائل آئے۔

”السلام علیکم چچی! میں آصف بول رہا ہوں۔“
 دوسری طرف سے آواز آئی۔
 ”علیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟“ عربہ نے رے رے کے لیے میں جواب دیا۔

”میں تو خفک ہوں چچی! آپ اور چچا تو خیریت سے ہیں نا۔ نئی جگہ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“
 ”نہیں بیٹا خدا کا شکر ہے، سب خفک ہے۔ اب تو ”سینگ“ وغیرہ بھی سب ہو گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر عربہ

یہ بھی چکی نکا ہوں والا انداز بہت بھاتا تھا۔ وہ اکثر عربہ کے سامنے عمر کی شریف انسی کی تعریف کرتی اور کہتی کہ عمر بھائی بالکل اپنے اپنے سگتے ہیں۔
 سامان لے جانے والا مرد اپنا دوسرا پھیرا لے کر چاچا تھا۔ اب عربہ اور بچے اپنی مہراں کار پر جانے کے لیے تیار تھے۔ آئی ٹھینڈ پریشان صورت بنائے ان کے پاس آئیں اور بولیں۔ ”عربہ! آنا فانا یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا پہلے سے کوئی پلان تھا؟ تم نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ مجھے ابھی چند روز منٹ پہلے پتا چلا ہے۔“

عربہ بولی۔ ”میں ناجانی! فٹلی میں ذرا پر اپنی کی تقسیم کی بات چل رہی تھی۔ امین نے سوچا ہے کہ اپنی زندگی میں ہی یہ کھینچ کر چھوٹے بھائی اور بہنوں کو ان کا حصہ دے کر فارغ ہو جاؤں۔ بعد میں اپنا گھر بھی بنائیں گے۔ ابھی تو شفت ہو رہے ہیں۔ یہاں رنگ روغن کراہیں گے۔ کوئی اچھی قیمت لی تو بیچ بھی دیں گے۔“ عربہ نے ٹھینڈ آئی سے آنکھیں چراتے ہوئے تھوڑی سی مزید وضاحت کی پھر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فون پر انہیں اپنی نئی رہائش کا ایڈریس send کریں گی اور رابطہ برقرار رہے گا۔

ابھی ٹھینڈ آئی کے ساتھ عربہ کی بات ہو رہی تھی کہ اچانک عربہ کی نگاہیں بیرونی کیٹ سے گزر کر سڑک کی طرف گئیں۔ اس کی رگوں میں جیسے خون جم گیا۔ اس نے اسی منٹوں میں عدیل کو دیکھا جس کو دیکھنے کے خوف نے اسے کئی دنوں سے ہلکا کر رکھا تھا۔ وہ غصہ اپنی موٹر بائیک کے پیچھے اپنے کسی اوباش دوست کو بٹھانے بڑی دھمکی رفتار سے ان کے گیٹ کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس کی شیطانی نگاہیں ان کے گھر پر ہی مرکوز تھیں۔ اس کے لیے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عربہ کو محسوس ہوا کہ چند لمحے رگوں میں جامد رہنے کے بعد اس کے جسم کا سارا خون چہرے اور سر کی طرف بٹھا کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے لگے۔ ایک چکر سا آیا اور اس نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

آئی ٹھینڈ نے اس کی کیفیت دیکھ کر ”ہائے اللہ“ کہا اور تیزی کے ساتھ اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ ”ارے عربہ کیا ہوا؟“
 عربہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولیں۔ ”چلو، اندر چل کر بیٹھو۔۔۔۔۔۔ لگتا ہے کہ کچھ کھائے ہے بغیر تم اندھا دھند کام کر رہی ہو۔“
 آئی ٹھینڈ اسے اس کے بیڈروم تک لے آئیں۔

”ہوگا۔“
 اس نے دیر تک بیٹنی کو اپنے ساتھ لگے رکھا۔ اس کا اپنا دل بھی درد رہا تھا لیکن انہیں خفک تھیں۔ کچھ دیر بعد حرم نے سسک کر کہا۔ ”ماما! کہیں باڑیاں اور ماجین کو کوئی شک تو نہیں ہوا؟“

”نہیں حرم! عربہ نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔“ انہیں صرف یہی پتا ہے کہ تہا باری طبیعت خفک نہیں ہے اور پڑھائی میں بھی وقت خوش آ رہی ہے۔ ایک دو ٹیسٹ اچھے نہیں ہوئے ہیں۔“

”اما! کسی وقت باڑیاں مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو مگر پوچھنا پارہا ہو۔۔۔۔۔۔ ماجین بھی بات کرتے کرتے ایک دم چپ ہو جاتی ہے۔“
 ”نہیں میری بیٹی! اس طرح کے واقعوں کو دماغ میں جگہ نہ دو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

عربہ دیر تک اسے تسلی دیتی رہی اور پرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے اشارے حرم سے یہ ذکر بھی کر دیا کہ اس کے پاپا اس گھر سے شفت کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

☆☆☆
 امین سرور نے شہر کے شمالی علاقے میں ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانچ مرلے کے مکان کا اپنا پورشن کرائے پر لے لیا اور دو دن بعد ہی انہوں نے ایک مردہ کروا کر اپنا سامان بھیجتا شروع کر دیا۔ ہمسائے اور آس پاس کے لوگ ان کی آنا فانا نقل مکانی پر حیران تھے۔ خاص طور پر ٹھینڈ آئی۔۔۔۔۔۔ ٹھینڈ آئی کو تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے ٹھینڈ آئی کہتے تھے۔ وہ اپنی ساس، دو بہنوں اور شوہر کے ساتھ امین صاحب کے گھر سے دائیں جانب دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں۔ چھوٹا بیٹا ملے، باڑیاں کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا جبکہ بڑا بیٹا عمر میں نیکل کر رہا تھا۔ اس کے والد مصافحہ کے بیٹے سے شگفتہ تھے۔

ٹھینڈ آئی اور عربہ کے درمیان اچھے تعلقات تھے اور یہ وہ واحد بڑی بڑی تھے جن کی طرف عربہ بھی کبھار پتھر لگایا کرتی تھی۔ ٹھینڈ آئی بھی کسی نہ کسی بہانے عربہ سے ملنے آ جاتی تھیں۔ دونوں کی مشترکہ پسندیدہ سندھی برائی کا تبادلہ بھی چلتا رہتا تھا جبکہ باڑیاں اور علی ایسے کرکٹ کے میدان میں نظر آتے تھے عربہ جب بھی سردار عمر کو دیکھتی، وہ بڑے ادب سے سر جھکا کر سلام کہتا ہوا گزرتا۔ اس کی یہ ادا عربہ کو بہت بھائی لگتی۔ حرم کو بھی اس کا

ان گنت اندیشے اس کے ذہن میں کبابار ہے تھے۔

☆☆☆

عروہ نے اپنے شوہر امین سرور کو رات والی دوا کھلائی۔ خود ہی ان کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر لائٹ آف کی۔ سائڈ لیپ آن کیے اور ان کے پاؤں کی جانب بیٹھے ہوئے یہ خزانہ گئے گوش گزار کی کہ آصف کا فون آیا تھا۔ اس نے مختصر ساری گفتگو کا ذکر بھی کیا۔

امین سرور نے سر دہا بھر کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہماری حریم ٹوٹ چھوٹ کر رہ گئی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ بھی نارمل ہوگئی یا بے یاسی؟“

”وقت سب سے بڑا مرہم ہے امین۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کے زخم مندمل ہونے لگیں گے لیکن اس میں پتا نہیں کتنی دیر لگے۔ دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ وہ آصف سے اپنا سابقہ رویہ اور تعلق برقرار نہیں رکھ پا رہی۔ وہ بے حد اپ سیٹ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے رویے کی وجہ سے آصف کے ای ابو بھی کچھ شکے ہوئے ہیں۔“

امین سرور کا رنگ زرد ہونے لگا۔ عروہ اب اسی لیے شوہر سے کسی نازک موضوع پر بات نہیں کرتی تھی۔ ان کے دل کا عارضہ ایک دم انہیں شدید تباہ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی ٹانگیں دبائے لگی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھے۔ ”قدرت انسان کو جب امتحانوں میں ڈالتی ہے۔ کبھی بھی انسان کھرا اور سچا ہونے کے باوجود چپ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل میں کوئی کھوکھلیاں، نہ ہی آصف کے لیے یا اس کے گھر والوں کے لیے کوئی دعا ہے، اس کے باوجود ہم مجبور ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس طرح کے معاملات انسان کو خاموشی سے اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ جہاں پر ہماری عقل اور ہمت جواب دے جاتی ہے، وہاں سے اس کی تدبیر شروع ہوتی ہے۔ تم بھی اسی سے مانگو۔“ امین سرور سیدھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ وہ نماز روزے کے پابند تو پہلے ہی تھے لیکن جب سے حریم والا سامنے ہوا تھا ان کا رجحان مذہب کی طرف اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے جیسے، اپنا اور اپنی لاڈلی بیٹی کا انصاف اللہ پر چھوڑ دیا تھا لیکن عروہ کے ذہن میں اکثر یہ سوال ابھرتا تھا کہ کیا بندہ جس طرح اپنے ہاتھ پاؤں بلائے بغیر اپنا رزق حاصل نہیں کر سکتا..... کیا انصاف حاصل کر سکتا ہے؟

کچھ دیر بعد امین سو گئے۔ عروہ نے ان کی ٹانگوں پر کنبل درست کیا اور بہت ہولے سے اپنے کنبے پر سر رکھ کر

نیم دروازہ ہو گئی۔ ان گنت وسوسے ذہن میں سر اٹھار ہے تھے اور دھندلا رہے تھے۔ اپنے تیار شوہر کو مزید پریشانیوں سے بچانے کے لیے عروہ نے ”تکراؤ“ کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا اور اپنے شوہر کا کہنا مان کر خاموشی سے اس نئی رہائش گاہ پر چلی آئی تھی لیکن اس بد بخت نے اس کی پھول سی بیٹی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ کسی طور عروہ کے ذہن سے نکلنا نہیں تھا۔ عدیل اور اس کے گرانڈ میل باپ ایڈوکیٹ ریاض کے منحوس چچرے عروہ کی نگاہوں میں گھومتے رہتے تھے۔

وہ کنبے سے ٹیک لگائے نیم خود کی کیفیت میں تھی جب اس کے تصور نے ایک بار پھر اسے وہی منظر دکھایا جو وہ بچپن سے چند برسوں میں درجنوں بار دیکھ چکی تھی۔ کھیت..... سرکنڈے..... گلاب کے سفید پھولوں پر خون کے سرخ چھینٹے..... گلاب ہی گلاب..... چھینٹے ہی چھینٹے..... وہ بھاگ رہی ہے۔ ایک دائرے میں گول گول پکڑا رہی ہے۔ کچھ خون آشام جانور اسے گھیر رہے ہیں۔ اسے چیر پھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کدھر جائے۔ کہاں سے راستہ پائے۔ جانوروں کا گھبراہٹ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا ہے پھر ایک دم وہ اپنے تصور سے باہر نکل آئی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ مقامی مسجد کے امام صاحب نے اسے ایک چھوٹا سا دروازہ بتایا تھا۔ وہ زیر لب پڑھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ مناظر ایک ہی ذہننگ سے کیوں بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟

وہ زیر لب پڑھتی رہی اور پھر اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹے لیٹے سو گئی۔

☆☆☆

بننے کا دن تھا اور فردوسی کی ایک چمکیلی دوپہر۔ حریم آج پہلی مرتبہ اپنی اس نئی رہائش گاہ کے ٹیرس میں آکر بیٹھی تھی۔ آج صبح سے ہوا کے ہلکے جھونکے دروازوں اور کھڑکیوں پر دم دستک دے رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر سڑک کے درختوں سے ہوا کرتی توجوں کے سازج اٹھتے۔ حریم ہوا میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی ایک موسم کا دوسرے موسم سے ملنے کا اشارہ تھا۔ موسم بدلنے والا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کے دل کا موسم جوں کا توں تھا۔ ایک بے نام خزاں جیسے اس کے اندر ٹھہری ہوئی تھی۔

ہوا کے جھونکے اس کے شہد رنگ رنگی بالوں کو لہرائے لگے۔ اس نے اپنی آواز دھنی درست کی اور ہاتھ بڑھا

بھنگ امد

”کیا کرتی ہو حریم۔“ عروہ نے اسے شہو کا دے کر کہا۔ ”مڑو آئے گا۔ تھوڑی آؤنگ ہو جائے گی۔ چلو اٹھو۔“ ”نہیں می! میں نہیں جاؤں گی۔ میں کچھ دیر ادھر ہی بیٹھوں گی۔“ پرسوں ایک ٹیسٹ ہے، اس کی تیاری بھی کرنی ہے۔“ حریم نے جلدی سے بہانہ کر ڈالا۔

کچھ ایسی ہی طبیعت ہو گئی تھی اس کی۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کالج بھی مجبوری کے تحت اور خوف کے سائے میں جانی تھی کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا اور یہ جو ٹیسٹ کے لیے پڑھنے کا بہانہ کیا تھا اس نے، یہ بالکل ہی ”بہانہ“ تھا۔ عروہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جب سے یہ حادثہ ہوا ہے، حریم نے شاید ایک دن کے لیے بھی توجہ اور دل جمعی سے نہیں پڑھا۔

وہ بیٹی کے کدموں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”بھئی! میں نے سوچا تھا کہ کچھ شایگ کر لیں گے اور کل کے ذرے کے لیے میں کچھ سامان بھی خرید لوں گی۔ تمہارے تانیا تانی آ رہے ہیں نا.....“ عروہ نے منع دیکھ کر آصف اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع بڑے ہلکے پھلکے انداز میں حریم کو دی۔ یہ اطلاع بار کر حریم کے صبح چہرے پر بے چینی کے سوا کوئی تار نہیں ابھرا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”نہیں می! آپ لوگ ہوا آئیں۔ میں اگلی دفعہ چلی جاؤں گی۔“

عروہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ہم..... ذریعہ دو گھنٹے میں واپس آجائیں گے، پھر مل کر چائے پئیں گے اور زیادہ دیر باہر مت بیٹھنا۔ جاتی سردی تیار کر دیتی ہے۔ دروازے ابھی طرح بند کر لیتا۔“

حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد آج حریم پہلی مرتبہ گھر میں تھا تھی۔ عروہ نے اسے بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ حریم ٹیرس میں بیٹھی رہی۔ باقی قریب کی اس اندوہناک سہ پہر کے مناظر اس کے ذہن پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ کشت گرفت..... بدبودار سانسیں، سرخ انکارہ آنکھیں۔ اس نے اپنی سوچوں کو ان اذیت ناک مناظر سے دور رکھنے کے لیے اپنی توجہ ارد گرد کے مناظر پر مرکوز کر دی۔ ٹیرس کے خوبصورت پھول، سڑک کی دوسری جانب لہلہاتے پودے، کھڑکیوں پر دستک دیتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ اب آہستہ آہستہ اسے اپنی سوچوں اور اپنے

کر اپنا سیل فون آف کر دیا۔ فون آف کر کے اسے ایک عجیب ماسکون ملتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ آصف اور اس کے سوا لوگوں سے بہت دور چلی گئی ہے۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ اس سے بات کرنا حریم کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا لیکن اب اس کے برعکس تھا۔ اسکرین پر اس کا نمبر دیکھ کر حریم کا دل بول جاتا تھا۔ وہ فرار کے راستے سوچتی تھی۔ کبھی چار جنگ ختم ہونے کا بہانہ، کبھی فون دوسرے کمرے میں ہونے کا عذر اور کبھی اس طرح کا کوئی اور ایسی کج..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ ایک دو بار تو اس کے دل میں آئی تھی کہ وہ بیٹے پر بہت بڑا پتھر رکھ کر سب کچھ آصف کو بتا دالے۔ اس سے کہہ دے کہ اس پر کیا گزری ہے، پھر سب کچھ اس پر چھوڑ دے کہ وہ کیا کرتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتی تھی۔

جب عروہ نے بیٹن کی کمزری سے حریم کو ٹیرس میں بیٹھے دیکھا تو اسے تھوڑی سی خوش محسوس ہوئی۔ وہ فوراً گاڑی اور سوئی کاٹ کر اور اس پر تھوڑا سا چاٹ مسالا چمڑک کر باہر ٹیرس میں لے آئی اور حریم کے پاس جا بیٹھی۔ حریم کچھ دیر ماں کو دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”ممی! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے آپ کو اور پاپا کو اتنی پریشانی ملی ہے۔“

وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عروہ نے اسے وہیں روک دیا۔ ”حریم! ابے ذوق مت بنو۔ اب ان باتوں سے آگے نکلو۔ یہ دیکھو، میں تمہارے لیے بنا کر لائی ہوں۔ کھاؤ اسے۔“ عروہ نے گار جا کر ایک ٹکڑا چڑ کر زبردستی حریم کے منہ میں ڈالا۔

اسی دور ان میں بار پال اور ماہین بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماہین نے عروہ کی گردن میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ممی! آپ نے کہا تھا کہ گراسری کرنے چلتا ہے۔ وہاں سے جو اے لینڈ بھی چلیں گے۔“ ماہین ابھی سڑک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔

بار پال بولا۔ ”ممی! مجھے بھی اپنے لیے نیا کمرٹ بیٹ دیکھنا ہے۔“ وہ حریم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آئی! آپ بھی ساتھ چلیں گی؟“ بار پال کو حریم دالے سامنے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر بھی اتنا تو وہ جانتا تھا کہ کسی وجہ سے اس کی آئی اومری، پاپا بہت ڈسٹرب ہیں۔ وہ اکثر حریم کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔

بار پال کی بات کے جواب میں حریم نے کہا۔ ”نہیں بار پال! میں نہیں جاسکوں گی۔“

کے پل سے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتے لگیں۔
عروہ کو لگ رہا تھا کہ ارد گرد کی ہر شے اس کی نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ چند ہفتے پہلے جو کچھ اس کی معصوم حرم کے ساتھ ہوا تھا، وہی کچھ اب، اسی محلے میں مسز فرحت کی بے گناہ بیٹی زویا کے ساتھ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ چند ہفتے یا چند مہینے بعد کسی اور جگہ کوئی اور زویا کوئی اور حرم اسی بد بخت عدیل کا نشانہ بن جاتی۔

ایک دم آپا تک ہی ایک بلند ہالا آواز عروہ کے سینے میں گونگی، اس چلاتی ہوئی آواز نے کہا۔ ”عروہ! ہفتے کے روز وہ گڑیا یا زویا اس لیے ظلم کا شکار ہوئی ہے کہ وہ ماہ پہلے تم نے اور تمہارے شوہر نے اپنی حرم پر ہونے والی زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔“ عروہ کو اپنا کلیقا شش ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بھائی انداز میں بڑبڑائی۔ ”مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا عروہ؟ کیا کہہ رہی ہو؟“ آئی شمیم نے چہرے پر تشویش کے آقا رنگاں ہوتے۔
عروہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایک خوفناک کشش جاری تھی۔ وہ سمجھتے تھے لیکن اپنے اندر صدیوں کی تاثیر رکھتے تھے۔ آخر عروہ نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے آئی شمیم کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”بھائی! میں۔۔۔۔۔ آپ نے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ آج میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

عروہ کے تاثرات دیکھ کر شمیم نے آئی شمیم کی طرح چونک گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عروہ کوئی بہت خاص بات کہنے جا رہی ہے۔ بند کمرے میں اور وہی آواز میں بولنے ہوئے، اگلے آدھ گھنٹے میں عروہ نے وہ سب کچھ آئی شمیم کے گوش گزار کر دیا جو کچھ عروہ پہلے اس پر اور اس کی بیٹی پر بلکہ پورے گھرانے پر کر رہا تھا۔ آئی شمیم ہکا بکا سنی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی، ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گھٹے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ چاروں پہلے جو کچھ زویا کے ساتھ ہوا ہے، وہی وہ ڈھائی ماہ پہلے حرم کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اور یہی وہ واقعہ ہے جس کے سبب ان لوگوں کو آغا قانا وہ گھر اور محلہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔

یہ ذکر اتنا سمجھ گیا کہ اس روز آئی شمیم زیادہ ویران کے گھر تک سکیں اور نہایت بوچھل دل کے ساتھ واپس لوٹ گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی کہا۔ ”تم

کہا کر سوئی پڑی تھی، بیٹی وی لاؤنگ میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بدحاش دیوار پھر پھر اندر چلا گیا۔ پہلے میں سوچا سے پورے گھر کی لائٹ بند کی پھر زویا کو پکڑ لیا۔ یہ بات بھی سنی ہے کہ شاید اس خبیث کا کوئی ساتھی بھی تھا لیکن ابھی یہ کفر نہیں ہوا ہے۔ مگر سے بھاگتے ہوئے بس اسی محسوس عدیل کو دیکھا گیا ہے۔“

شمیم کی آنکھوں میں نمی چپکے لگی تھی۔ عروہ کا یہ حال تھا کہ کاتو تو بدن میں لہو کا قطرہ نہیں۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ جسم کے ہر سام سے پینا بہہ نکلا تھا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر یہ مشکل کہا۔
”اور۔۔۔۔۔ اس ملازمہ کو کچھ پتا نہیں چلا؟“

”وہ حرن جو کئی مہینے میری طرح پڑی رہی۔ وہ تو جب فرحت اور اس کامیاب گھر پہنچے اور انہوں نے دھڑا دھڑکٹ ٹھٹھکانا شروع کیا تو اندر سے چلانے کی مدد آوازیں آئیں۔ اڑوس پڑوس والے بھی آگئے۔ محلے کا ایک لڑکا دیوار پھر پھر اندر گیا اور اس نے میں سوچا آن کیا۔ یہی وقت تھا جب وہ حرامزادہ پھیلی دیوار کو دھک بھاگا۔ وہ بندوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی پر وہ نکل گیا۔“

عروہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اس کی نگاہوں میں معصوم صورت، نرم و نازک زویا کی شبیہ گھوم رہی تھی۔ وہ کالج جاتے ہوئے باقاعدہ حجاب لیتی تھی۔ انتہائی بااخلاق اور ریشہ کش۔ بھی بھی حرم سے ملنے ان کے گھر بھی آتی تھی۔ یہ کسی قیامت گزرنے کی تھی اس پر۔

شمیم کہہ رہی تھی۔ ”اگلے روز بے چاری نے منہ می بھر کر گولیاں کھائیں۔ اسی وقت اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا دو اشک رکھ لی ہے۔ پتہ حال ہے، انہوں نے معذہ داش کیا اور ہر طرح کی طبی امداد پہنچائی۔ 48 گھنٹے تک تو یہی لگتا رہا کہ ابھی اسپتال سے کوئی بری خبر آجائے گی لیکن پھر اتنا تو ہوا کہ اس کی جان بچ گئی۔“

”پپ۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ رپورٹ دھیرہ درج ہوئی؟“ عروہ نے پوچھا۔

”وہ تو ہوا ہی تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو رہی نہیں تھی۔ اللہ کرے کسی کی آئی ہوئی اس خبیث کو آجائے۔ وہ تو اس دن سے غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اس کے چھوٹے بھائی کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس کا بے شرم باپ اپنی دکالت کا زور چلانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ زور چلے گا نہیں۔۔۔۔۔ پڑھیں بیٹی کی بددعا میں اس کے گلے کا پھندا ضرور بنیں گی۔ انشاء اللہ۔“ شمیم کی آواز بھرائی اور وہ اپنی چادر

امین کی وفات کے بعد ایک دو ہفتے تک تو عزیزوں اور دیگر پرسردے والوں کا آنا جانا لگا رہا تھا پھر بتدریج سناٹا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ قتل شمیم آئی تھی جو پرانے محلے سے آٹھ سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہر دوسرے تیسرے روز ان کے پاس پہنچی آئی تھیں اور ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی تھیں۔ یقیناً وہ اس گھرانے کی جی بھر دو اور ٹھکانا تھیں۔ ان کی موجودگی میں عروہ اور حرم کو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔ اتنی بات تو شمیم آئی کو بھی معلوم ہو چکی تھی کہ امین کی وفات سے دو تین روز پہلے حرم کی منگنی ٹوٹ گئی تھی اور ممکن ہے کہ امین کو جو شدید ہارٹ ایک ہوا، اس میں اس واقعے کا بھی عمل دخل ہو۔

وہ آتیں تو دیر تک بیٹھتیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے عروہ اور بچوں کا دھیان پانے کی کوشش کرتیں لیکن ایک دن جب وہ عروہ سے ملنے آئیں تو اپنے ساتھ پراٹھے محفلے کی ایک اندوہناک خبر بھی لائیں۔ اس خبر کا تعلق ایک سنگین واردات سے تھا اور یہ ویسی ہی واردات تھی جو کچھ عروہ پہلے عروہ پر اور امین کے گھرانے کی زندگی کو تباہی دلا کر چلی گئی۔

شمیم نے آئی کو مسلسل خاموش دیکھ کر عروہ نے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ جب سے آئی ہیں، کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“ شمیم نے دائیں بائیں دیکھا۔ بچے آس پاس موجود نہیں تھے۔ حرم کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ شمیم نے دل نکال لکھے میں کہا۔ ”عروہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا ماحول اور معاشرہ کس سمت میں جا رہے ہیں۔ تم زویا کو جاتی ہو نا۔۔۔۔۔ فرحت باقی کی چھوٹی بیٹی؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں جانوں گی۔ میری حرم کی ہم عمر ہے۔ اللہ فیر کرے، کیا ہوا اس؟“

شمیم نے پھر محتاط نظر سے ارد گرد دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”عروہ! بڑا ظلم ہوا ہے اس بے چاری کے ساتھ، ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اخباروں میں خبر تک چھپ گئی ہے، شاید تمہاری نظر سے نہیں گزری۔“

”ہائے میں سرکئی، ہوا کیا ہے؟“ عروہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے تابگی سے پوچھا۔

”وہی حرامزادہ عدیل۔۔۔۔۔ وکیل ریاض جاوا کا بیٹا۔ اللہ کرے شام سے پہلے جنازہ اٹھے اس کا۔ اس نے پھول جھنکی پٹی کو کھینک کر انہیں چھوڑا۔ پچھلے ہفتے کی رات کی بات ہے۔ فرحت اور اس کا سہارا محلے میں ہی ایک ہندو پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بیٹی بھی یا ایک ملازمہ تھی۔ ملازمہ دو

لاغر دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ عروہ اور حرم نے پنجاب کا رڈ یا لوٹی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ امین سرور کو بیڑیاں اتار کر گیارہ بجے لے جانے کی تدبیر سوچ رہے تھے جب عروہ کو محسوس ہوا کہ اس کے شوہر کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ وہ امیر جی والی میڈیسن لینے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف دوڑی۔ لیکن اس کے لیے بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے واپس لوٹنے سے پہلے ہی امین سرور دنیا اور اس کے دکھوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ حرم کی منگنی کے بعد ان کی زندگی کی ذرہ بھر ٹوٹ گئی تھی۔

”امین۔۔۔۔۔ امین!“ عروہ ولد دوا انداز میں پکاری۔
بچے بھی دوڑے ہوئے آئے پھر پورا گھر دھاڑوں سے گونجنے لگا۔ حرم اپنے پیارے پاپا کی چھاتی پر گر گئی۔ یہ قیامت کا سال تھا۔۔۔۔۔

☆☆☆

عروہ کے گھر کا ماحول جو بتدریج بھڑکی کی طرف جارہا تھا، امین سرور کے چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر سراپکیلی اور اندوہ کی لپیٹ میں آگیا۔ بیماری سے پہلے اور بیماری کے بعد بھی امین سرور نے اپنی ہمت طاقت کے مطابق اس گھر کے سربراہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اپنے شوہر کی موجودگی میں عروہ کو ہمیشہ ایک احساس تحفظ رہا تھا لیکن اب اسے یوں لگا کہ وہ زمانے کے گرم سرد کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تنہا ہو گئی ہے۔ باپ کی بددلی نے سب بچوں کو بری طرح متاثر کیا تھا لیکن سب سے زیادہ اثر حرم پر ہوا تھا۔ عروہ کو یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو براہ راست اپنے پیارے پاپا کی موت کا ڈسے دار سمجھتی ہے۔ اس نے خود کو اپنے گھر کے میں بند کر لیا تھا اور روز روز کڑا بھان بھنی رہتی تھی۔ کالج اور ایڈمیڈی جانا بالکل چھوٹ چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں مشکل دو چار لقمے لیتی تھی۔ اس کی صحت روز بروز گری رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ان سارے دکھوں کی بنیاد سمجھتی تھی۔

عروہ نے اپنی دکھش حرم کو ہمیشہ ہر احتیاج اور بلند حوصلہ پایا تھا لیکن اب وہ اس کی حالت دیکھتی تھی تو اندر سے ٹوٹ چھوٹ جاتی تھی، اور ایسے ہی لمحوں میں عدیل عرف عادی کا مکروہ چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ سوچی سوچی ہی بھوری آنکھیں۔ سر کے لیے بال، قدرے موٹی ناک اور کسی ساڈھ جیسا چوڑا چمکا جسم۔ اس کا دل چاہتا وہ اس کے سامنے ہو۔ وہ اس کا گریبان پکڑے، پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچے اور چلا کر بوچھے۔ شیطان باپ کے شیطان بنے، تجھے پتا ہے تو نے کتنی زندگیاں برباد کی ہیں؟

لاڈلی کے بارے میں پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا، اس سے بڑا غم کیا ہوگا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک حریم کے گھر لیو اور تقبلی مسائل کے بارے میں بات کرتے رہے، پھر عرکمانے کی ٹیبل پر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

رات کا نہانے کون سا پر تھا، عمر کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے امی ابو کے کمرے سے باتوں کی بدمعاش آواز سنائی دی۔

وہ ننگے پاؤں اودھ کھلے دروازے کے نزدیک گیا تو الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ گئے۔ اس کی امی اس کے ابو سے جو گفتگو کر رہی تھیں، اس کا موضوع حریم اور اس کی ٹیبل ہی تھی۔

..... اور پھر جو کچھ اس نے سنا اس نے اس کی روح تک کو قہقہہ کر دیا۔ اس پر جو لڑخیز انکشاف ہوا وہ جانکا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ جھک کر اٹھا اپنے سینے میں نہا گیا۔

حریم کا چہرہ وہ چہرہ تھا جو ایک دیے کی طرح برسوں سے اس کے سینے میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ بڑی خاموشی لیکن بڑے تسلسل کے ساتھ یہ روشنی اس کے جسم کے ہر مسام میں سرایت کر چکی تھی۔ خاموش غیبت جو کسی طوفان کی طرح

پُر شور نہیں بلکہ جھیل کی طرح گہری اور پُر سکون ہوتی ہے۔ یہ وہ محبت نہیں تھی جس کے تار من اور شادی بیاہ پر اثر کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہر قسم کے بندھن سے آزاد غیر مشروط محبت تھی، صرف محبت تھی۔

وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ عزت و کبریاں اس کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔ اس کا اچلا یو پیغام بہن کا اسکول جانا، گھر کے بیرونی دروازے پر نظر آنا، چھت پر گھومنا، کسی خسیں تہوار پر خوش رنگ کپڑوں میں لمبوں ایک بے روشن کبیر کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر جانا۔ بھی بھار اپنی امی کے ساتھ عمر، ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی ایک دو لمبوں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ڈھیروں باتیں کرنا جانتا تھا۔ اسے قریب سے اور قریب سے دیکھنا جانتا تھا، خاص طور سے اس کی آنکھوں کو۔ اس نے حریم سے بات کرنے کے

اور اس کو اپنے دل کا حال سننے کے ان گنت پلان بنائے تھے۔ مگر لڑکپن کے یہ سارے پلان صرف پلان ہی رہے تھے۔ اور وقت گزرتا چلا گیا تھا۔ دن بھٹے اور مینے خشک رہت کی طرح اس کی سچی سے پھسلنے پھسلنے گئے تھے۔ ایک آج پر جب اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا، اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا کہ وہ اپنی امی کو اپنے دل کے حال

دفتر بھی حریم کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے بارے میں سوچتا اور غور مند رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ حریم میں کوئی خاص جذبہ لی آچکا ہے۔ ایسی جذبہ لی جس کو ثبت نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اس کے سامنے آئے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکے۔ وہ حریم کے بارے میں اس انداز میں کیوں سوچتا تھا؟ وہ بھی خود بھی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا، بہتر یہ تھا کہ وہ جانے کے لیے منع نہ کرنا، شاید اسی بہانے سے اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا۔

”مئی! جانے بن چکی ہے، میں لا رہی ہوں۔“ لیکن کی جانب سے ایک نرم، ہلکتی ہوئی سی آواز آئی جو سیدھی اس کے دل پر لگی۔

دوست بعد حریم جانے کی ٹرائی دیکھتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس نے اپنے سوٹ سے بیجنگ شال کے بجائے ایک گرے رنگ کی کسی قدر سلوٹوں والی شال، اسکارف کی صورت میں لپیٹ رکھی تھی۔ عمر جو اکثر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نظریں جھکا لیتا تھا، آج ایسا نہ کر سکا۔ وہ بے ساختہ اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے دل پر جیسے کسی نے ایک مونسو مار دیا تھا۔ اواس چہرہ، زردی، بال رنگ، آنکھوں کے گرد حلقے..... کیا یہ حریم ہی تھی؟

ٹھیننے نے عمر کو بولے بے ساختہ حریم کو نکلتے پایا تو اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”بیٹا! اب جانے کی کر لگتے ہیں، جلی گھر میں، اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا۔“

”مئی امی!“ عمر نے فوراً اپنا کپ اٹھا لیا۔ حریم جس طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی اور عمر جانے حلقے سے نیچے اتارتے ہوئے یہی سوچنے لگا کہ اس پھول سی لڑکی کو کس موسم کی کرخت دھوپ نے ادھ موار کر دیا ہے۔

واپس اپنے گھر پہنچ کر بھی عمر، حریم کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ والد کی موت کا صدمہ بے شک اپنی جگہ موجود تھا لیکن پتا نہیں کیوں عمر کو لگتا تھا کہ بات اس صدمے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ اسی اس سے کھانے کا پوچھنے کے لیے اس کے کمرے میں آئیں تو وہ جیسے بے ساختہ بول اٹھا۔ ”مئی! حریم کو کیا مسئلہ ہے..... میرا مطلب ہے کہ اس کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟“

اسے محسوس ہوا کہ اس کی امی کچھ گڑبڑا گئی ہیں لیکن پھر خود کو سنبھال کر بولیں۔ ”ہاں بیٹا! ٹھیک ہے وہ۔ اپنے والد سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس بے چارے نے بھی اپنی

آئی تھیں۔ عروپہ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے چھوٹی ماہین کو ساتھ لایا۔ آلو کی ٹکیاں اور ایک دو سالن بنا کر فریز کر دیے۔ وہ کڑوا سا پانی کرتی تھیں۔

عروپہ نے کہا: ”باجی! آپ یہ سب کچھ نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ اتنی دور سے چل کر آ جاتی ہیں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”نہیں عروپہ! غیروں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارو۔ خاص طور سے حریم کو بہت زیادہ وقت دو۔ اس کو تمہاری توجہ کی حد ضرورت ہے۔ سچ پوچھو میری تو اس بات ہست نہیں ہوتی اس کا سامنا کرنے کی۔ پھول کی بیٹی کیسے مر جھا کر رہ گئی ہے۔“ آئی ٹھینے کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اس نمی کو چھپانے کے لیے انہوں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر دال کا کاک کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”عمر آئے ہی دالا ہوگا، چار بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے..... اور ہاں، میں تمہیں بتانا ہی بھولی گئی۔ عمر کا ہاؤس جاب ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ موبائی روڈ والے اسپتال میں آگیا ہے۔ مجھ کو کہہ تمہارے گھر کے پاس ہی۔ میرا خیال ہے ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔“

وہ اتنی دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اکثر وہ والدہ کو باہر سے ہی لے کر چلا جاتا تھا لیکن آج عروپہ نے اصرار کر کے اسے اندر لایا۔ وہ کچھ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر آکر وہ بیٹھا وہ عروپہ کو بہت تھیں اور بے حد شریف افسوس لگا۔ بھلی بھلی گئی تھیں، چہرے پر حشر دمیا کا کھس۔

عروپہ نے حریم کو آواز دی۔ ”حریم بیٹا! جانے پلاو۔“

”نہیں آئی! بالکل ضرورت نہیں۔ ابھی دس منٹ پہنچ رہی کر آیا ہوں۔“ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ”باریال اور ماہین نظر نہیں آ رہے؟“ اس نے پوچھا۔

باریال اور ماہین دونوں عمر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ عمر ہمیشہ باریال سے ایک بڑے بھائی کی طرح پیش آتا اور اس کی اسٹری کے حوالے سے سوال جواب کرتا رہتا۔ چھوٹی ماہین بھی اس سے کافی بے تکلف تھیں۔

عروپہ نے کہا: ”فائل ہو رہے ہیں ان دونوں کے۔ آج کل پڑھا کو بچے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھہر، میں بلائی ہوں۔“

”نہیں آئی! پھر رہے دیں، انہیں ڈسٹرب نہ کریں۔ ویسے بھی ذرا جلدی جاتا ہے۔“ اس نے یہ بات کہتے ہوئے ایک طائرانی نظر ارد گرد ڈالی۔

انگل امین سرور کی وفات کے بعد سے عمر نے ایک

ٹھیک ہی کہتی ہو عروپہ! ہم شریف لوگوں کی خاموشیاں ان بد معاشری کی طاقت بن جاتی ہیں۔ ان کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے ہیں لیکن میں یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ کم لوگوں کی مجبور یاں کیا تھیں۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ بخشے تمہارا شوہر امین ”بے ہمت“ شخص نہیں تھا۔ اگر وہ بیماری کے گھیرے میں نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ ساری مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیتا۔“

اگلے تین چار روز تک آئی ٹھینے ان کے گھر نہیں آئیں۔ شاید حریم والے صدمے سے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن وہ آئیں تو انہیں پھر تہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ عروپہ کے لب و لہجے میں ایک نیا غم اور ارادہ تھا..... بلکہ ایک طرح کی بغاوت بھی اپنی مجبوریوں کے خلاف۔ وہ بولی۔ ”باجی! اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ خاموش نہیں رہوں گی۔ یہ خاموشی مجھے ہمیشہ ایک گناہ کی طرح لگی ہے اور اب شاید یہ ثابت بھی ہو گیا ہے کہ وہ خاموشی ایک گناہ اور جرم تھی۔ اگر ہم اس وقت چپ نہ بنا دیتے تو شاید پچھلے نئے وہ معصوم زویا اس جانور کی زد میں نہ آتی۔ مجھے لگتا ہے باجی کہ اب میرے پاس صوفے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ امین دنیا سے چلے گئے۔ حریم ایک زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔ بچہ ڈری کبھی زندہ گیاں گزاردے ہیں۔ اب میں یوں کی باجی! اب میں آواز اٹھاؤں گی اور تب تک خاموش نہیں ہوں گی جب تک میں مر نہیں جاتی یا وہ عروپہ انسان کی فکر کر دار کو نہیں پہنچ جاتا۔“ عروپہ کے لہجے میں عجیب سی آگ تھی اور آنکھوں میں آنکھیں آنسو تھیں۔

آئی ٹھینے نے عروپہ کو گنگے سے لگایا۔ اس چھوٹے سے کنبے کے درد کا احساس ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ انہوں نے بس اتنا کہا۔ ”یہ بڑا مشکل راستہ ہے عروپہ..... اور تم تنہا عورت ہو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جنہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچ سمجھ لینا چاہیے۔“

”میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچ بچار کی ہے باجی! حریم سے بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے۔ لاہور ہی میں حریم کے ایک خالو یا ر حیات ہیں۔ وہ کونسلر وغیرہ وہ کچھ ہیں۔ ان کے لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں ان سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ابھی وہ فیصل آباؤ گئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی واپس آتے ہیں، ان سے ملتی ہوں پھر جو بات ہوگی آپ کو بتاؤں گی۔“

آئی ٹھینے نے اسے ساتھ کچھ پکچن اور سبزی وغیرہ لے کر

آئی تھیں۔ عروپہ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے چھوٹی ماہین کو ساتھ لایا۔ آلو کی ٹکیاں اور ایک دو سالن بنا کر فریز کر دیے۔ وہ کڑوا سا پانی کرتی تھیں۔

عروپہ نے کہا: ”باجی! آپ یہ سب کچھ نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ اتنی دور سے چل کر آ جاتی ہیں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”نہیں عروپہ! غیروں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارو۔ خاص طور سے حریم کو بہت زیادہ وقت دو۔ اس کو تمہاری توجہ کی حد ضرورت ہے۔ سچ پوچھو میری تو اس بات ہست نہیں ہوتی اس کا سامنا کرنے کی۔ پھول کی بیٹی کیسے مر جھا کر رہ گئی ہے۔“ آئی ٹھینے کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اس نمی کو چھپانے کے لیے انہوں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر دال کا کاک کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”عمر آئے ہی دالا ہوگا، چار بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے..... اور ہاں، میں تمہیں بتانا ہی بھولی گئی۔ عمر کا ہاؤس جاب ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ موبائی روڈ والے اسپتال میں آگیا ہے۔ مجھ کو کہہ تمہارے گھر کے پاس ہی۔ میرا خیال ہے ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔“

وہ اتنی دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اکثر وہ والدہ کو باہر سے ہی لے کر چلا جاتا تھا لیکن آج عروپہ نے اصرار کر کے اسے اندر لایا۔ وہ کچھ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر آکر وہ بیٹھا وہ عروپہ کو بہت تھیں اور بے حد شریف افسوس لگا۔ بھلی بھلی گئی تھیں، چہرے پر حشر دمیا کا کھس۔

عروپہ نے حریم کو آواز دی۔ ”حریم بیٹا! جانے پلاو۔“

”نہیں آئی! بالکل ضرورت نہیں۔ ابھی دس منٹ پہنچ رہی کر آیا ہوں۔“ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ”باریال اور ماہین نظر نہیں آ رہے؟“ اس نے پوچھا۔

باریال اور ماہین دونوں عمر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ عمر ہمیشہ باریال سے ایک بڑے بھائی کی طرح پیش آتا اور اس کی اسٹری کے حوالے سے سوال جواب کرتا رہتا۔ چھوٹی ماہین بھی اس سے کافی بے تکلف تھیں۔

عروپہ نے کہا: ”فائل ہو رہے ہیں ان دونوں کے۔ آج کل پڑھا کو بچے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھہر، میں بلائی ہوں۔“

”نہیں آئی! پھر رہے دیں، انہیں ڈسٹرب نہ کریں۔ ویسے بھی ذرا جلدی جاتا ہے۔“ اس نے یہ بات کہتے ہوئے ایک طائرانی نظر ارد گرد ڈالی۔

انگل امین سرور کی وفات کے بعد سے عمر نے ایک

ٹھیک ہی کہتی ہو عروپہ! ہم شریف لوگوں کی خاموشیاں ان بد معاشری کی طاقت بن جاتی ہیں۔ ان کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے ہیں لیکن میں یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ کم لوگوں کی مجبور یاں کیا تھیں۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ بخشے تمہارا شوہر امین ”بے ہمت“ شخص نہیں تھا۔ اگر وہ بیماری کے گھیرے میں نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ ساری مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیتا۔“

اگلے تین چار روز تک آئی ٹھینے ان کے گھر نہیں آئیں۔ شاید حریم والے صدمے سے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن وہ آئیں تو انہیں پھر تہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ عروپہ کے لب و لہجے میں ایک نیا غم اور ارادہ تھا..... بلکہ ایک طرح کی بغاوت بھی اپنی مجبوریوں کے خلاف۔ وہ بولی۔ ”باجی! اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ خاموش نہیں رہوں گی۔ یہ خاموشی مجھے ہمیشہ ایک گناہ کی طرح لگی ہے اور اب شاید یہ ثابت بھی ہو گیا ہے کہ وہ خاموشی ایک گناہ اور جرم تھی۔ اگر ہم اس وقت چپ نہ بنا دیتے تو شاید پچھلے نئے وہ معصوم زویا اس جانور کی زد میں نہ آتی۔ مجھے لگتا ہے باجی کہ اب میرے پاس صوفے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ امین دنیا سے چلے گئے۔ حریم ایک زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔ بچہ ڈری کبھی زندہ گیاں گزاردے ہیں۔ اب میں یوں کی باجی! اب میں آواز اٹھاؤں گی اور تب تک خاموش نہیں ہوں گی جب تک میں مر نہیں جاتی یا وہ عروپہ انسان کی فکر کر دار کو نہیں پہنچ جاتا۔“ عروپہ کے لہجے میں عجیب سی آگ تھی اور آنکھوں میں آنکھیں آنسو تھیں۔

آئی ٹھینے نے عروپہ کو گنگے سے لگایا۔ اس چھوٹے سے کنبے کے درد کا احساس ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ انہوں نے بس اتنا کہا۔ ”یہ بڑا مشکل راستہ ہے عروپہ..... اور تم تنہا عورت ہو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جنہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچ سمجھ لینا چاہیے۔“

”میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچ بچار کی ہے باجی! حریم سے بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے۔ لاہور ہی میں حریم کے ایک خالو یا ر حیات ہیں۔ وہ کونسلر وغیرہ وہ کچھ ہیں۔ ان کے لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں ان سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ابھی وہ فیصل آباؤ گئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی واپس آتے ہیں، ان سے ملتی ہوں پھر جو بات ہوگی آپ کو بتاؤں گی۔“

چاہیے پاپا۔۔۔۔۔

برداشت کا بند فو تا تو غم کا سلاب اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ حریم کی ذات اس میں ایک تنگے کی طرح بہہ گئی تھی۔ وہ جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں روتی ہوئی بستر سے اٹھتی اور اس الماری کی طرف جاتی جہاں اس کے پیارے پاپا کی ذاتی اشیا "پادگار" کے طور پر رکھی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ ان کی ہچکچاہٹیں، پگڑیوں کے ایک دو جوڑے،

ان کی دست و پاؤں، ان کا پرس جس میں حریم، بار یال اور ماہین کی تصویروں تھیں اور انکی کئی چیزیں۔ اسی الماری کی ایک دراز میں ابھی تک کچھ انکی دوا تھیں بھی پڑی تھیں جو اس کے پاپا کے زیر استعمال رہی تھیں۔ ان میں ایک ٹوکولا ٹر بھی تھی۔ یہ خاصی تیز دوا تھی۔ ایک بھائی کیفیت کے زیر اثر حریم نے دوا کی بوتل کھولی اور انھیں آٹھ دس گولیاں بھانک کر پانی کے چھوٹھٹ پی لیے۔ وہ ایک انکی خود فراموشی جا رہی تھی جس کا اختتام ابھی تک نہیں ہو رہا۔

یہ کام کر گزرنے کے میں تیس سیکنڈ بعد اس کے دل و دماغ کو ایک شدید دھچکا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ایک نہایت خطرناک بھاؤ میں بہہ گئی تھی اور اسی بھاؤ میں وہ ایک ایسا کام کر گزری ہے جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے مدہوشی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا۔ "حریم اتم اسے بڑے گناہ کی مرتکب کیسے ہو سکتی ہو؟ تم خود سے ہونے والی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لے رہی ہو، حرام موت کو گتے لگا رہی ہو؟ دنیا میں تو رسوائی ہونی ہی ہوتی ہے، تم تو اپنے رب کی بارگاہ میں بھی ذلیل و رسوا ہو گئی ہو۔"

پتا نہیں کہ کچھ دیر کے لیے یہ کیسا پردہ پڑ گیا تھا اس کی آنکھوں پر۔ اب اس کے حواس ایک جان لیوا تیرگی میں ڈوبے جا رہے تھے۔ اپنے پاپا کے پاس جانے کا یہ کون سا طریقہ سوچا تھا کہ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور کہہ اٹھی۔ ان لمحوں میں اپنے پیاروں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومتے اور ان میں سب سے نمایاں چہرہ اس کی مٹی کا تھا۔ اس نے بڑ زبان خاموشی خود سے کہا۔ "اپنی تنہا دکھائی دیاں کے ساتھ یہ کیسا ظلم کیا ہے تم نے؟ وہ کیسے جھیل پائیں گی یہ سب کچھ۔ ان کی تو کمر لٹ کر رہ جائے گی۔" وہ زور سے چلائی، پھر ڈرگتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کو اپنا جسم بے جان محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی دکھائی دیاں سے معافی مانگتا

کے ستم کا شکار ہوئی تھی۔ فون پر ہونے والی اس گفتگو نے حریم کو ایک دم بکھر سادیا۔ اس طویل گفتگو میں ایک موقع پر زویا نے ان سوال و جواب کا ذکر کیا تھا جو عدالتی کارروائی میں مکمل وغیرہ اس سے پوچھے رہے تھے۔ بے شک یہ سوال جواب قانون کے مطابق تھے مگر اسے شرمناک تھے کہ حریم سن کر ہی پیسے میں نہا گئی۔ مثلاً ظلم نے کہیں کہاں سکتی بار اور کیسے چھو۔ اس نے تمہارے لباس کا کیا کیا؟ وہ سکتی دیر تمہارے پاس رہا۔ دوران جرم اس نے کیا کیا الفاظ بولے وغیرہ وغیرہ۔

زویا سے اس غم ناک گفتگو کے بعد حریم رات آخری پہر تک سو نہیں سکی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگلے روز ایک بچہ عروبہ نے مکمل سلطان صاحب سے دوبارہ ملاقات کرنے جانا تھا۔ انہوں نے حریم کا باق فارم، آئی ڈی کارڈ اور کچھ دیگر کاغذات منگوائے تھے۔ ماں کے جانے کے بعد حریم نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور بستر پر ایک ٹھنڈی سی بن کر پھلوں کے ٹل لیت گئی۔ حریم اور اس کی مٹی نے ایک نہایت دشوار اور پرخطر راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن حریم سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ہی کی طرح دلیر نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کی رگوں میں مٹی کے ساتھ ساتھ پاپا کا خون بھی دوڑتا تھا۔ پاپا جو بہت اصول پسند ہونے کے باوجود نہایتا جیسے مزاج کے اور خاموش طبع شخص تھے۔ پاپا یاد آئے تو اس کی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہنے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہے اور اس کی آدھکا شے والا کوئی نہیں، اس لیے وہ بلند آواز سے روتے اور ہچکیاں لیتے تھی۔

"پاپا! مجھے نہیں جینا ہے ایسی زندگی۔ مجھے اپنے پیاروں کے لیے رکھوں کی بنیاد نہیں جتنا ہے، مجھے بھی آپ کے پاس آنا ہے۔ مجھے اپنے پاس بلا لیں پاپا۔"

اس کی گریہ و زاری بڑھتی گئی۔ سینے کے اندر غم سے جمع ہونے والے دکھ اور اٹک، آنکھوں کے بند تو ذکر آزادانہ بہہ نکلے۔

وہ مسک رہی تھی۔ "مجھے نہیں پڑھنا، مجھے نہیں شروع کرنی تھی زندگی۔ میں بہت تھک گئی ہوں پاپا۔ میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پہلو میں ایک قبر میری بھی بن جائے، میری بس یہی خواہش ہے۔ مٹی جو کچھ سوچ رہی ہیں، وہ بالکل درست ہے لیکن وہ کیسے کر پائیں گی یہ سب کچھ؟ بار یال اور ماہین کا کیا کریں گی۔ وہ کب تک میری زندہ لاش کو گود میں اٹھائے در در کی شوکرین کھا نہیں گی؟ اس لاش کو۔۔۔۔۔ اب دفن ہو جانا چاہیے۔ ہاں مجھے دفن ہو جانا

بار یال اور ماہین نے شدید دھچکا تو محسوس کیا تاہم وہ بہت جلد سنبھل گئے اور یہ جان کر عروبہ کو حیرت ہوئی کہ ان کے خیالات بھی تقریباً وہی تھے جو خود عروبہ اور اس کی حد تک حریم کے بھی تھے۔ خاص طور پر بار یال نے کم عمر ہونے کے باوجود ایک نوجوان کی طرح "ری ایکٹ" کیا۔ وہ غم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "اس بارے میں خاموش رہیں گے مٹی، تو مطلب یہی ہوگا کہ ہم ایک ظالم کی مدد کر رہے ہیں۔ آپ کی سخت ترین مزا ضرور ملتی چاہیے۔"

بیٹے اور بیٹی کو اس بارے میں بتاتے ہوئے عروبہ کو کوفت تو بہت ہوئی لیکن بتانے کے بعد اس نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے لگا کہ اس کے آگم میں جھوٹ کے جو سانسے لیے ہو رہے تھے اور ان کے باہمی اعتماد کو ٹکڑے کر دیتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے۔ اسی روز شام کے بعد اس نے حریم سے جو باتیں کی تھیں، وہ حریم کی سمجھ میں بھی آئی تھیں۔ وہ بھی اپنے جرم کو، زویا کے جرم کو اور نیانے لکھی لڑکیوں کے جرم کو بغیر کردار تک پہنچنے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک آگ تھی جو اسے مسلسل جلا رہی تھی اور جسم کر رہی تھی۔ وہ اس طرح ٹھٹھکتے کمرے میں چاہتی تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ صنف نازک سے تعلق رکھتی تھی، اس کے اندر کے خوف، اس کے چہرے پر زروئی بکھیر دیتے تھے۔

عروبہ نے اپنے پردہ گرام کے مطابق حریم کے خالو یا و حیات صاحب سے ملاقات کر لی تھی (حریم کی خالہ یعنی عروبہ کی بہن کی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں) یا و حیات نے بھی حریم والی خبر بے پناہ حیرت اور دکھ سے سنی تھی۔ بہر حال یا و بھائی کو اپنا مہراز اور معاون بنانے کے بعد عروبہ کو ایک بڑا سہارا ملا تھا۔ یا و بھائی کے ساتھ جا کر اس نے ایک وکیل سے بھی ابتدائی بات چیت کر لی تھی۔ جب اس نے یہ ساری باتیں حریم کو بتائیں تو وہ چپ ہو گئی۔ وہ اس شخص راستے پر چلنے کے لیے پر عزم تھی لیکن اس راستے کی دشواریاں بھی اس کے لیے ڈھل چکی نہیں تھیں۔ تھانے کے چکر، پگڑیوں کے پھیرے، جھیلے سوالات، بدنامی، چرے۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اس کی نگاہوں میں گھومتے لگا تھا۔ عروبہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔

اس روز رات کو حریم کی بات اپنی اس دیرینہ دوست زویا سے ہوئی جو چند روز پہلے اس کی طرح اس درندے

سے آگاہ کرے گا اور کہے گا کہ وہ اگلے اٹن کی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن پھر انہی دنوں اسے یہ گھٹال کر دینے والی اطلاع ملی تھی کہ حریم کا رشتہ اس کے خاندان میں ہی بنایا کے بیٹے سے ملے ہو گیا ہے۔ وہ کی بہنوں تک ایک بے گھر پرندے کی طرح رہا تھا مگر اپنی کم ہمتی کے پھیرے میں بند پرندہ پھڑ پھڑانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے خود کو سنبھال کر اپنی اسٹڈی میں غرق کر لیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا اسے، لیکن وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بھلانے سے لوگ بھولا نہیں کرتے۔ وہ دماغ کے ایک حصے سے نکل جاتے ہیں لیکن دل کے خاموش گوشوں میں زیادہ گہری جھگیں بنالیتے ہیں۔ حریم کی چاہت بھی اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں نہیں نہ گھس سوجھتی۔ چاندنی راتوں، سادوں کی جھڑپوں، سرمائی دھوپوں اور دوباروں کے رنگوں میں بیٹی ہوئی یہ چاہت اب بھی کی کوڑھونڈی تھی۔

"حریم! کیا ہوا؟" اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا اور اس کی آنکھوں کے کنارے پھلک گئے۔ وہ رات عمر کی غم ناک ترین راتوں میں سے ایک تھی۔

☆☆☆

رشتہ ٹوٹنے کا صدمہ بہت بڑا تھا، مگر اس صدمے میں سے عروبہ کے لیے بے خوفی اور جرأت کے نئے راستے نکلے تھے۔ اس نے تیر کر لیا تھا کہ وہ اب پیچھے نہیں بنے گی۔ اس کا پردہ گرام تھا کہ بار یال اور ماہین کو مستقل طور پر ان کی پیچیدگی کے پاس کوئی بھیج دے گی اور اپنی لٹی پٹی بیٹی حریم کے ساتھ قلم غوثیہ کرمیدان میں آجائے گی۔ اس نے تمام مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر براہ راست انصاف کے حصول کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے مروجہ نانا سے بہت سی باتیں بھی ختم اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حق سچ کے لیے آواز اٹھانا ایک جہاد ہے۔

عروبہ نے سب سے پہلے حریم کو اپنے اعتماد میں لیا۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد بڑا حوصلہ کر کے اور دل پر پتھر رکھ کر بار یال اور ماہین کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کی آبی پر غز رہا تھا۔ یہ سب کچھ بتانا اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بیٹے عجیب سی الجھن اور شکوک کا شکار نظر آتے تھے۔ وہ جانتے بھی تھے کہ ان کی بڑی بہن کے ساتھ سب اچھا نہیں ہے لیکن کوئی کمل کر انہیں بتانا بھی نہیں تھا اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ پردہ داری ان کے رویوں پر نفسیاتی طور پر منفی اثرات ڈال رہی تھی۔

رہی کہ آکا کا کارہ گھروں کے علاوہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔
حرم کو گھر سے اسپتال پہنچانے میں اسے دس منٹ سے
زیادہ نہیں لگے۔ وہ ہرگز اسے ”میڈیکو لیکل“ کہیں بنانا
چاہتا تھا۔ وہ حرم کو لے کر اپنے ایک سینئر دوست ڈاکٹر
رضوان شہزاد کے پرائیویٹ کلینک میں ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر
شہزاد کو اس نے راستے میں ہی آگاہ کر دیا تھا۔ کلینک پہنچتے
ہی حرم کی ٹرینٹ شروع ہوئی۔

ایسی دوران میں پھر..... عروبہ کا فون بھی آگیا۔
اب عمر نے کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ ”آئی! آپ
ریٹیکٹ ہو جائیں۔ میں حرم کو یہاں کلینک میں لے آیا
ہوں۔ اس نے کسی چیز کا زیادہ اسٹریس لیا ہے اور بے ہوش
ہو گئی ہے لیکن آپ فگر نڈ کریں۔ ٹرینٹ ہو رہی ہے.....
بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

کلینک میں معدے اور جگر کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر موجود
تھا، مگر سونوں پر بدامنی کی وجہ سے وہ بھی ابھی تک ڈیوٹی پر
نہیں پہنچ سکا تھا۔ عمر نے ڈاکٹر رضوان کے ساتھ مل کر معدہ
واش کرنے کا عمل مکمل کیا اور پھر حرم کو ڈرپس وغیرہ لگا
دیں۔ چند منٹ کے لیے اسے ”بر-تھنگ مشین“ پر بھی رکھنا
پڑا لیکن پھر اس کی ضرورت نہ رہی۔ اس کی حالت، بروقت
مٹی انداد کے سبب تیزی سے سنبھل رہی تھی۔

عمر نے بھی حرم کو چھوڑا لیکن اب ایک ڈاکٹر کی
حیثیت سے وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو سسٹل چھو رہا
تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔ کئی موقعوں پر تو ضرورت
کے باوجود اس نے حرم کو چھونے سے گریز کیا اور وہ کام
ڈاکٹر رضوان پر چھوڑ دیا۔ اس کا دل بار بار بے طرح
دھڑکنے لگ جاتا تھا۔ چندہ میں منٹ بعد حرم اپنی چٹکوں کو
ایک دم سی حرکت دینے لگی۔ اس کی سانس بھی ہموار ہو
رہی تھی۔ تب اس نے کن انھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ
اس کی کس میں آنکھیں لگانے میں مصروف تھا۔ عمر کو دیکھ کر
اس کی خنود کی بھری آنکھوں میں شدید حیرت نمودار ہوئی،
تاہم اس حیرت میں ایک طرح کا اطمینان بھی تھا۔

وہ کسمائی اور ہولے سے کچھ کہا۔ عمر نے اپنا کان
اس کے ہونٹوں کے پاس کیا۔ وہ ندھی ہوئی کمزور آواز میں
کہہ رہی تھی۔ ”میں کہاں ہوں..... جی کہاں ہیں؟“
”وہ کسی ٹریٹک جام میں پھنسی ہوئی ہیں..... اور
آپ بھی اب بالکل ٹھیک ہیں، بالکل پریشان نہ ہوں۔“
عمر نے چادر اس کے سینے تک پھینکی اور دوپٹے سے
اس کا سر ڈھانپ دیا۔ حرم کی آنکھوں کے گوشے نم

منٹ پہلے حرم کا فون آیا ہے۔ وہ..... وہ..... وہشت سے
عروبہ کی آواز ٹوٹنے لگی۔

عمر کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردہری دھڑکنی۔ وہ
جلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا اور آفس سے
نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آپ.....
پوری بات بتائیں! کیا ہوا حرم کو؟“

”بیٹا..... وہ فون پر کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... مگر بول
نہیں پاری تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی بھی شاید.....
”اب میں اسے فون کر رہی ہوں تو ریسیو نہیں کر رہی۔“ یہ کہہ
کر عروبہ نے سسکیوں سے روتا شروع کر دیا۔

”آئی! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا اسے۔
میں آپ کے گھر جا رہا ہوں۔ ابھی کال کرتا ہوں آپ کو۔“
اس کے اسپتال سے حرم کے گھر کا فاصلہ دس منٹ
سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس نے گاڑی، پارکنگ لاٹ سے
نکالی اور طوفانی رفتار سے حرم کے گھر کا رخ کیا۔

گھر پر پہنچ کر اس نے ڈرپل..... بجائی اور گیٹ
کھٹکنا یا پھر بچوں کے مل اچھل کر گیاراج میں جھانکا۔
بار بال کی موٹر بائیک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب
تھا کہ حرم ابھی تک گھر میں آئی ہے۔ مزید تاخیر کا فائدہ
نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے
باؤنڈری وال جئے بالکل ساتھ کھڑی کی۔ ادھر ادھر دیکھا اور
نچر بونٹ پر پاؤں رکھ کر بڑی تیزی سے باؤنڈری وال پار
کر گیا۔ وہ میڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی پورٹن کی طرف دوڑا۔
”حرم..... حرم! کہاں ہو؟“ اس نے دو تین بار اسے بلند
آواز سے پکارا..... تب وہ بلا توقف حرم کے کمرے میں
داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر دلخراش تھا۔ حرم کروت کے مل
تالین پر پڑی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ اس کے قریب ہی
ایک گھدانا ٹوٹا پڑا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے ہوش
ہو کر گر گئی ہے۔

”حرم..... حرم! آنکھیں کھولو۔“ عمر نے اسے
کندھوں سے قدام کر بھنجوڑا پھر اس کی نین چپک کی۔ ایک
ڈاکٹر کی حیثیت سے ساری صورت حال اس کی سمجھ میں
آ رہی تھی۔ بیسے کے قطرے اس کی ناک کی چونچ سے گر کر
حرم کے رینجی بالوں میں جذب ہوئے گئے۔ وہ غلٹ کے
ساتھ حرکت میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے سائڈ ٹیبل پر
پڑی نیند آور گولیوں کی ”ڈائل“ اٹھا کر اپنی پینٹ کی جیب
میں ڈال لی پھر حرم کو ایک اور دمٹی میں لپیٹ کر اپنے
بازوؤں میں اٹھایا اور نیچے گاڑی کی طرف لپکا۔ خوش قسمتی

فورا کال کی جو دوسری یا تیسری تیل پر عمر نے ریسیو کر لی۔

☆☆☆

عمر آج کل بہت ڈسٹرب تھا۔ حرم کا اجزا ہوا چہرہ اس
کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ عدیل
عرف عادی کا چہرہ بھی۔ وہ ایک ہی جگہ میں رہتے تھے۔ وہ
عادی کو ایک ادبش اور بدچلن جگہ دار کی حیثیت سے بخوبی
جانتا تھا لیکن اس نے بھی سوچا جس تھا کہ یہ ادبش ایک دن
اس ہستی کے ہی درپے ہو جائے گا جو ایک مدت سے اس کے
دل کے نہال خالوں میں ایک خوشبو اور ایک پاکیزہ روشنی کی
طرح موجود تھی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں آتے
جاتے عدیل عرف عادی سے اس کا سامنا ہو جائے۔ وہ سب
اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر ہل پڑے۔ اسے کسی گیند
کی طرح کھینچ کھینچ کر دیواروں سے مارے۔ خود مر جائے یا
اسے مار ڈالے لیکن وہ فیئر اور درو کہیں نہیں تھا۔ عمر کو پتا چل
گیا تھا کہ زیادہ اگلے کیس کے بعد سے وہ غائب ہے اور مبینہ
طور پر اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔

محسوس یہی ہوتا تھا کہ یہ عدیل عرف عادی واقعی ایک
عادی مجرم ہے..... یقیناً اس کا شکار صرف حرم اور ذوالی
نہیں تھیں۔ اس شیطان صفت کی زندگی کے کچھ اور ناپاک
گوشتے بھی ضرور موجود رہے ہوں گے۔ عمر نے ایک کام یہ
کیا تھا کہ اپنے ابو کے ایک صحافی معاون سے ملا۔ اس کا نام
محسن تھا اور اس نے گرائمر رپورٹنگ میں کافی نام کمایا تھا۔ عمر
نے اپنے ہم عمر محسن رشید سے مشاورت کی اور اس کے ذمے
یہ کام لگا دیا کہ وہ ایڈووکیٹ ریاض کے اس بدعاش بیٹے
کے روز و شب کا کھوج لگائے..... اور پتا چلانے کہ ماضی
قریب میں اس کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں؟

اب بھی وہ فون پر محسن رشید ہی سے بات کر رہا تھا۔
دونوں اس کام کے لیے لاکھ مل بنائے تھے۔ جونہی یہ گفتگو
ختم ہوئی، عمر کے فون پر پھر کال کے کٹنل آنے لگے۔ اس
مرتبہ کال عروبہ آئی کی طرف سے تھی۔ اس کا دھیان سیدھا
حرم کی طرف گیا اور دل دھک سے رہ گیا۔
”السلام علیکم آئی!“ عمر نے فون، کان سے لگاتے

ہوئے کہا۔
”عمر..... عروبہ کی گھبراہٹ ہوئی لڑاں آواز ٹریٹک
کے شور میں سے ابھری۔
”جی آئی! میں بول رہا ہوں، خیریت ہے نا؟“
”پتا نہیں چٹا۔ میں یہاں ٹریٹک میں پھنسی ہوئی
ہوں۔ بار بال اور ماہین بھی گھر میں نہیں ہیں۔ ابھی دو تین

چاہتی تھی۔ وہ بآواز بلند اپنے رب سے بھی معافی مانگ رہی
تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر رہی ہے۔ آنکھوں کے آگے
اندھیرا چھار ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے سلی فون تک پہنچنے اور اپنی
مٹی کا قبر پر بیٹھنے میں کامیاب ہوئی۔

☆☆☆

وکیل صاحب سے ملنے کے بعد جب عروبہ نے اپنی
مہران کار پر گھر کا رخ کیا تو اسے شدید ٹریٹک جام کا سامنا
کرنا پڑا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ ایک معروف سیاسی
شخصیت کا ”مرڈار“ ہو گیا ہے اور اس وجہ سے شہر بھر میں
ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے۔ اب بھی متعلق لوگوں کا ایک
تھجم، جلوس کی صورت میں گزر رہا تھا اور لاتعداد گاڑیاں
اپنی جگہ جام ہو کر رہ گئی تھیں۔ موسم اب تبدیل ہو رہا تھا اور
گاڑی کے اندر سورج کی تپش خاصی تیز محسوس ہوئی تھی۔
عروبہ نے گاڑی کا پچھلا آن کر دیا۔ اسی دوران میں اس
کے سلی فون کی تیل ہوئی۔ اسکرین پر حرم کا نام تھا۔ اس
نے فورا کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے بس تیز سانسوں
کی آواز آئی تھی۔

”بیٹا! بات کرو، چپ کیوں ہو؟“ عروبہ نے
پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

”میں..... میں..... آئی! آپ.....“ اس کی لڑکھاتی
ہوئی سی آواز گلے میں گھٹ گئی۔

”حرم..... عروبہ نے چیختے ہوئے کہا۔
عروبہ نے مزید دو تین دفعہ اس کا نام پکارا، پر اب
دوسری طرف سنا تھا۔ اس نے اپنا سر قدام لیا۔ اس کی سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے اور وہ کیا کرے؟ اس نے
کال منقطع کر کے اپنی لینڈ لڈی کا فون ملا یا مگر وہ بند جا رہا
تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ سے اٹھائے اور پھر اپنا
سر قدام لیا۔ نہایت گھبراہٹ میں اس نے حرم کا نمبر دوبارہ
پریس کیا۔ اب تیل تو جاری تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی
تھی۔ عروبہ کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر آگیا۔
”یا اللہ! میری بچی کی حفاظت فرما۔“ اس نے اپنے
ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں آیا کہ وہ اس جام
ٹریٹک میں گاڑی سے باہر نکل آئے اور پیدل چل کر کسی
سواری تک پہنچنے کی کوشش کرے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا، پھر
اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔
اس نے ”فون بک“ آن کر کے عمر کا نمبر تلاش کیا، جو کہ فون
کلیے ہی تھبتہا باقی نے اسے نکھوایا تھا۔ نمبر موجود تھا، اس نے

ہو گئے۔

اسی دوران میں آنٹی عروبہ کا فون بکرا گیا۔ ”بیٹا! حرم کیسی ہے اب؟“ ان کی آواز زندگی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہیں۔

”آنٹی! حرم بالکل ٹھیک ہے اب۔ ابھی تھوڑی دیر میں، میں اس سے آپ کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے گھر بھی فون کر دیا ہے۔ باریال اور مایاں گھر پہنچ چکے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”بیٹا! اب ٹریفک تھوڑا تھوڑا حرکت میں آنا شروع ہو گیا ہے۔ میں بھی یہاں سے نکلتی ہوں تو کلینک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”ارے نہیں آنٹی..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حرم کو اب اس کے کردیا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آدھ پون گھنٹے میں ہم ویسے ہی یہاں سے فارغ ہو جائیں گے۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ یہاں سے نکل کر سیدھا گھر ہی پہنچیں۔ ہم بھی بس پہنچ جاتے ہیں۔“ عمر نے صورت حال کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ آنٹی عروبہ کو اصل بات کا پتا چلے۔ اولاد کی طرف سے ”سوسائڈ ایسٹ“ کی معنی اذیت ناک ہوتی ہے، اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حرم اس قابل ہوئی کہ اسے کلینک سے گھر لے جایا جائے۔ آنٹی عروبہ اب بھی تنگ گھر نہیں پہنچ پائی تھیں۔ بڑا زبردست قسم کا ٹریفک جام ملا تھا انہیں۔ گاڑیاں چار چار گھنٹے سے پھنسی ہوئی تھیں۔ عمر نے گھر پہنچنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جس پر ”ٹریفک جام“ کا احتمال نہیں تھا۔ اس نے اپنے پہلو کی نشست اسٹریچ کر دی تھی اور حرم اس پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلکی ہو رہا تھا۔

عمر کے دل میں بہت رنج تھا اس واقعے کے حوالے سے..... لیکن حرم کی حالت فی الحال ایسی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کوئی سخت بات کی جاتی۔ ہاں، عمر نے اسے اس بات کی تاکید ضرور کی کہ وہ گولیاں نگھنے والی بات، اپنی کی کو اور دیگر گھر والوں کو ہرگز ہرگز نہیں بتائے گی۔ حرم نے آنکھیں بند کیے کیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

دو روز بعد حرم کی طبیعت مزید سنبھل گئی۔ عمر کی ہدایت کے مطابق اس نے گولیاں نگھنے والی بات کی سے بھی چھپائی تھی۔ عمر کو اس بات کی خوشی تھی کہ حرم نے اس کی بات کو اہمیت دی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے۔ تاہم جو حرکت حرم نے کی تھی، وہ اس کے حوالے سے حرم سے بات ضرور کرنا

چاہتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اسے اتفاقاً بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ حرم کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے جب کسی قریبی گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ سانسے والے گھر میں ایک خاتون دل کے دورے کے سبب انتقال کر گئی ہیں۔ آنٹی عروبہ اور عمر کی امی جلدی سے فوننگی والے گھر میں چلی گئیں۔

عمر صوفے پر بیٹھا تھا۔ حرم سانسے کر رہی پر سر جھکائے ہوئے تھی۔ عمر نے کہا۔ ”حرم! مجھے آپ سے اس طرح کی حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ آپ جیسی باشعور اور دین کی سمجھ رکھنے والی لڑکی سے ایسی مایوس کن حرکت کا سرزد ہونا بہت تکلیف دہ ہے۔“ حرم اپنی نظریں اٹھائیں پارہی تھی۔

”حرم! میں جانتا ہوں کہ اپنے پاپا کی جدائی آپ کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے حالات میں بہت سختی ہے لیکن سختیوں کا مقابلہ کرنے اور حالات سے لڑ کر انہیں سدھارنے کا نام ہی تو زندگی ہے۔“ وہ دھیمے لیکن پوچھل لہجے میں حرم کو سمجھاتا رہا۔ آخر میں وہ ایک گہری سانس بھر کر بولی۔ ”وہ کیسے ہوا، کیوں ہوا؟ مجھے خود بھی پتا نہیں۔ میں اس پر بہت خرمندہ ہوں لیکن اب بھی کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں مری جاتی تو اچھا تھا۔“

”ایسی باتیں منہ سے مت نکالیں۔“ وہ قدرے ترشی سے بولا۔ ”زندگی خدا کی نعمت ہے..... اور آپ کی زندگی آپ کے ارد گرد موجود لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔ بہت زیادہ اہم۔“ اس نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی تھی کہ حرم بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس لمحے میں ان دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک خیال بکلی کی ہی تجزی کے ساتھ ان دونوں کے ذہنوں سے گزرا۔ اس برقی لہر والے خیال نے خاموشی کی زبان میں حرم سے کہا۔ ”ہاں..... تم ٹھیک سمجھ رہی ہو حرم۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے نزدیک تمہاری زندگی کی بہت..... بہت زیادہ اہمیت ہے اور یہ اہمیت اب سے نہیں، بہت عرصے سے ہے۔ اس اہمیت کے پیچھے کئی موسموں، چاندنی راتوں، چٹکیلی مسموں اور خوش رنگ تہواروں کی چھوٹی چھوٹی یادیں ہیں۔“

حرم نے گزبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے ریشمی بالوں کی ٹانگیں اس کے چہرے کی طرف پھسل آئیں اور چہرے پر ایک چھوٹا سا گھونٹ بنادیا۔ وہ اسی گھونٹ کی اوٹ سے بولی۔ ”آپ میری مٹھکوں کے بارے میں جانتے ہوں گے لیکن زیادہ نہیں جانتے۔ جو..... قطعی مجھ

سے ہوئی، وہ ایسے ہی تو نہیں ہو جاتی نا؟“

”ہو سکتا ہے کہ میں جانتی ہوں۔“ وہ جیسے بے ساختہ کہہ گیا۔

حرم نے چونک کر عمر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر زبردستی لہر گیا۔ عمر نے جلدی سے بات بدلی اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو حرم! ہمیں ہر تکلیف اور پریشانی میں بھی اس رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک تکلیف اور پریشانی اس موجودہ تکلیف اور پریشانی سے بھی بڑی ہے جس کا سامنا ہمیں نہیں کرنا پڑا۔ اپنے آپ کو سمجھائیں حرم۔ خود کے لیے نہیں تو اپنے باقی گھر والوں کے لیے۔ آپ بڑی بہن ہیں۔ آپ پر اس عمر کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ ذرا سوچیں کہ آپ کی اس حرکت کا پتہ باریال اور مایاں وغیرہ کو چلے تو کیا اثرات پڑیں گے ان پر؟“ عمر کے لہجے میں ایک اپنایت بھرا غصہ تھا۔

وہ کئی منٹ تک بڑی دردمندی اور اپنایت کے ساتھ حرم کو تسلی دیتا رہا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ وہ اسے اسٹوڈیو بارہ شروع کرنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں ایک پُر غلوں خوشبو تھی اور یہ خوشبو خود عمر کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مناسب ترین الفاظ جیسے بے ساختہ اس کی زبان سے ادا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر میں اس نے بہت کر کے حرم سے بس اتنا کہا۔ ”اپنی مشکلات میں خود کو بھی جھانکنے کا۔“

وہ ایک بار پھر شک کر عمر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کا یہ انداز اتنا پیارا تھا کہ عمر کو اپنی روح میں اترتا ہو محسوس ہوا۔

☆☆☆

حرم کو پوری طرح ٹھیک ہونے میں کئی روز لگ گئے۔ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی مگر والدہ اور بہن بھائی کے سامنے تندرست اور خوش نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔

عمر کے علاوہ یہ حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی کہ پریشانی اور مایوسی کی انتہا کچھو کچھ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

اس دوران میں عمر دوبار ان کے گھر آیا۔ اس نے حرم کی والدہ کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ حرم پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس نے حرم کی والدہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس ظلم کے خلاف خاموش نہ رہیں لیکن اپنے اس مشورے پر وہ روزیادہ زور بھی نہیں دے سکا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ستر کشادہ اور کانٹوں بھرا ہے۔ گھر مگر جانتا نہیں تھا کہ ہونے والا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

بچک آمد

حرم کی امی اب جیسے کہ پہلی تھیں کہ انہوں نے اب آواز اٹھائی ہے۔ دونوں پہلے ماں بیٹی میں رات کو طویل گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے سارے معنی اور مثبت پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وکیل صاحب سے مزید بات بھی کر لی تھی..... اب حرم اور اس کی امی کو پہلا کام یہ کرنا تھا کہ حقانے جانا تھا اور اپنے مجرم کے خلاف ایف آئی آر درج کرنا تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ حرم ٹھیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔

اور آخر وہ تھک خیز دن آن پہنچا جب چادروں میں لپٹی دونوں ماں بیٹی تھانے پہنچیں۔ حرم کے خالو یا در حیات کو بھی ساتھ جانا تھا مگر ایک اور جنت کام کے سبب وہ آندہ پائے تھے۔ عروبہ کا حوصلہ جوان تھا، اس کے باوجود وہ اندر سے کانپ رہی تھی۔ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے حقانے کی دلیلیز پار کی تھی۔ حقانے میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی عروبہ کو اپنے خوف میں نمایاں کی محسوس ہوئی۔ اس کی کچکاہٹ کم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ ایک طرح کا طیش اور رنج دم اس کے گدگدے پسینے میں ڈھلنے لگا تھا۔

وہ مطلوبہ اہکار کے سامنے پہنچی اور مستحکم لہجے میں بولی۔ ”میں رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔“

مولے تازے عمر نے ماں بیٹی کو سرتاپا گھورا پھر انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اگھڑے سے لہجے میں بولا۔ ”کس بات کی رپورٹ لپٹی؟“

”بھرنانہ منے کی..... میری بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ عروبہ ایک ایک لفظ چپا کر مستحکم لہجے میں بولی۔ عمر نے حیران ہو کر دونوں کو دیکھا۔ وہ پردے میں تھیں۔ عروبہ کی طرح حرم کی بھی بس آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ عمر نے اپنا رجسٹر بند کیا اور ذرا تعجب سے بولا۔

”کس کے ساتھ ہوئی ہے زیادتی؟“

”میری اس بیٹی کے ساتھ۔“ وہ بے خوف اور بے جھجک لہجے میں گویا ہوئی۔

”آ..... آپ دونوں کے ساتھ بھی کوئی آیا ہے یا اکیلے آئی ہیں؟“

”ہمارے ساتھ کوئی نہیں۔ ہم اکیلے ہیں۔ آپ بس رپورٹ درج کریں۔“

بچے کے عمر نے معنی خیز نظر سے اپنے ساتھ بیٹھے اہکار کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شاید تھوڑا سا خستہ بھی شامل تھا پھر اس نے ٹھٹھکار کا گلا صاف کیا اور کرسی کی پشت سے ٹپک لگا کر بولا۔ ”آپ دونوں کا پی پریشان لگ رہی ہیں۔“

بہر حال کب ہوا ہے وقوعہ..... اور الزام کس پر ہے؟
 ”میں آپ کو بتاتی ہوں سب کچھ..... آپ رپورٹ لکھیں۔“ عروہ نے کہا۔
 محرر جیسے لہجے میں بولا۔ ”بی بی! رپورٹ ایسے درج نہیں ہوتی، آپ کسی سیانے بندے کو اپنے ساتھ.....“
 ”سیانے بندے نے کیا کرنا ہے یہاں؟“ عروہ ترخ کر بولی۔ ”جس بیگی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے وہ یہاں ہے..... اس کی ہاں یہاں ہے۔ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے یہاں آئی ہیں اور آپ کی ڈیوٹی ہے کہ آپ ان کی بات سنیں..... ان کی شکایت درج کریں۔“ عروہ کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔
 ”لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی مری شری چڑھ گئی ہے آپ کے دامخ کو۔ اے نیاز محمد، خطرناک پانی لے کر آ بھی دو گلاس۔“ محرر کا انداز مذاق اڑانے والا ہی تھا۔
 عروہ چپے چپے ٹیبل سے پھٹ پڑی، وہ بولی۔ ”آپ رپورٹ درج کرتے ہیں یا پھر میں ایس بی کے پاس جاؤں..... یا پھر اس سے اوپر؟“
 عروہ کا لب و لہجہ دیکھ کر نائب محرر نے بات کو مستحالا اور بولا۔ ”بی بی! ایف آئی آر اس طرح درج نہیں ہوتی۔ پہلے آپ ہم کو اپنا مسئلہ بتائیں۔ ہم اس کی جی رپورٹ لکھیں گے، پھر آپ کے بیان میں کوئی وزن ہوا تو بات آگے بڑھے گی۔“
 ”آپ نے جو بھی کرنا ہے کرو لیکن ایک بات اپنے دامخ میں رکھو۔ کوئی عورت جب اپنی زبان سے اتنی بڑی بات کہتی ہے تو پھر وہ بے وزن نہیں ہوتی..... اور اس کو مذاق میں لینے والا سخت بے وقوف شخص ہی ہو سکتا ہے۔“ محرر کا سالو لا چہرہ ایک بار پھر سرخی مائل ہوا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی نائب محرر بول اٹھا۔ ”جس وقوعہ کی آپ بات کر رہی ہیں، یہ کب ہوا ہے؟“
 ”یہ ممبر کی تین تاریخ کی بات ہے۔“
 محرر اور نائب محرر نے ایک بار پھر متحرک نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 محرر بولا۔ ”یعنی کوئی تین مہینے گزر چکے ہیں..... چلو خیر..... یہ کس قسم کا واقعہ تھا اور آپ کو کس پر شک ہے؟“
 ”شک نہیں ہے، یقیناً ہے..... پورا یقین ہے۔ یہ ایڈووکیٹ..... ریاض احمد کے بدعاش بیٹے عدیل عرف عادی کا کام ہے۔ اس شخصیت نے سب کچھ کھٹ لیا ہے..... سب کچھ.....“ عروہ سسکیوں سے رونے لگی۔ حریم

سرجھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی پلکوں سے دھمکتی جھلر اس کی جھولی میں گرے۔
 ”محرر نے ذرا حیرت سے کہا۔“ بی بی! تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایڈووکیٹ ریاض صاحب کے بیٹے عدیل احمد نے آپ کی بیٹی کے ساتھ بھی.....“ اس نے حیرت کے عالم میں فقرہ ادا چھوڑ دیا۔
 ”ہاں وہی ہے ظالم۔ نہ جانے اب تک کتنی عزتوں پر ڈاکا ڈال چکا ہے..... کاش ہم نے پہلے ہمت کر لی ہوتی۔ کاش ایک اور ”حریم“ اس کے ظلم کا شکار نہ ہوتی۔“ عروہ باپ بچہ کیوں سے رو رہی تھی۔
 اگلے دس پندرہ منٹ میں عروہ نے بلا جھجک پورا وقوعہ پولیس اہلکاروں کے سامنے کھول کر بیان کر دیا۔ پتا نہیں کہ اتنی توانائی اور دلیری کہاں سے آئی تھی اس کے اندر۔ اس نے جو کچھ بھی بتایا، پولیس والوں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھ لیا۔ آخر میں محرر نے کہا۔ ”بی بی! جی رپورٹ تو ہم نے لکھ لی ہے۔ پر یہ ایف آئی آر والا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے بھی ایس ایچ او صاحب اس وقت گشت پر ہیں۔ آپ کل دوپہر کے بعد کسی وقت آ جا سکیں پھر یہ بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“
 اگلے روز دوپہر تک کا وقت عروہ اور حریم نے بڑی مشکل سے گزارا..... اور جب ایک بار پھر تھانے جا پہنچیں۔ ایس ایچ او صاحب تو آج بھی نہیں تھے، تاہم چھوٹی چھوٹی ڈائری والے ایک اصرار پر سب انسپکٹر سے ان کی بات ہوئی۔ سب انسپکٹر کا نام عطا اللہ تھا اور وہ شکل و صورت سے کچھ شریف انسان ہی لگتا تھا۔ اس کو بھی پوری بات کا علم ہو چکا تھا۔
 اس نے عروہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بی بی! ایسے وقوعہ میں رپورٹ جلدی درج کرانا پڑتی ہے..... تب ہی کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ اب تو آپ نے لگ بھگ تین مہینے گزار دیے ہیں پھر بھی آپ زور دینے کی تو رپورٹ تو ہم درج کر رہے ہیں گے کیونکہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے لیکن آگے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔“
 ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“
 ”بی بی! ایس اب آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ بڑا دکھناستہ ہے۔ ایک تو جن لوگوں کے خلاف آپ کس کرنا چاہتی ہیں، وہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔ ایڈووکیٹ ریاض ایک دہنگ بندے کا نام ہے۔ ابھی جو پتلا کس درج ہے، اس پر بھی کوئی خاص کارروائی نہیں ہو سکی۔ ہم نے بڑا بھلا چالان عدالت میں بھیج دیا ہے۔ مضموم مفروضہ ہے، اس کے سونپنے

بھائی کو کچھ دن سسٹری میں رکھا گیا تھا بعد میں اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ یہ لوگ مضموم کو بھانے کے لیے سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں اور ابھی تک کامیاب ہیں۔“ لیکن بھائی صاحب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجرم طاقتور شخص ہے اس لیے ہم ممبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جائیں۔ ہم میں جتنی ہمت طاقت ہے، ہم آواز بلند کریں گے اور کر کے رہیں گے۔ ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اخباروں تک جائیں گے۔ الیٹراٹک میڈیا تک جائیں گے۔“ عروہ رہا کسی ہو رہی تھی۔
 ”یہ کوششیں اس دوسری پارٹی نے بھی کی ہیں۔ ایک دو اخباروں میں ایڈووکیٹ کے بیٹے کے بارے میں کوئی لمبے چوڑے آرٹیکل بھی چھپے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے بی بی کہ اس سے ہونا ہوا کچھ نہیں۔ اگر لڑکا پکڑا بھی گیا تو بہت ہوا دو ڈھائی سال کی سزا ہو جائے گی لیکن اس کے لیے بھی مدتی پارٹی کو بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔“
 ”جو بھگت چکے ہیں اس سے زیادہ اور کیا بھگتنا پڑے گا۔“ حریم جو اب تک خاموش بیٹھی تھی، جیسے سچ کر بولی۔
 ”آپ کی بہت مہربانی، آپ بس ہماری رپورٹ درج کریں۔“ نقاب کی اوٹ سے حریم کی بس آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں اور ان میں آتشیں آنسو تھے۔
 سب انسپکٹر عطا اللہ نے طویل سانس لے کر اپنی ڈائری کھولی اور بولا۔ ”چھوٹی بی بی! تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ یہ بڑا کاغذ بھرنا سہا ہے..... بلکہ درست ہی کیا ہے، بس کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ بڑے بڑے پاؤں نیچے پڑتے ہیں پر وہ دار پیسوں کو۔ پوچھ کچھ، طبی معائنے، آئے دن تھانے پھیری کے چکر..... اور پھر عدالت میں صفائی کے دیل جیسے جیسے سوال پوچھتے ہیں بیچوں ہے..... اللہ معاف کرے۔“
 عروہ نے سچ لہجے میں کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! لگتا ہے کہ آپ کی ڈیوٹی یہاں شکایت سننے کی نہیں، بلکہ ڈرانے کی ہے۔ آپ ہماری گھر نہ کریں۔ ہم نے اب اپنے آپ کو ہر صورت حال کے لیے تیار کر لیا ہے۔ آپ بس ایچ او صاحب سے ہماری ملاقات کراویں تاکہ ہماری رپورٹ درج ہو سکے۔“
 ”شک ہے بی بی، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ آپ ساتھ والے کمرے میں بیٹھ جاؤ۔“ وہ قدرے بے رحمی سے بولا۔
 کائی ویر انتظار کے بعد بھی ایس ایچ او سے ملاقات نہیں ہو پائی۔
 دوسرے روز وہ دونوں پھر تھانے پہنچیں۔ اس مرتبہ

بھنگ آمد

خانو یاور حیات بھی ساتھ تھے۔ پتا چلا کہ ایس ایچ او صاحب آئے تو تھوڑے گھر علاقے میں ایک ”وی آئی بی مودمنٹ“ تھی، اس وجہ سے فیلڈ میں چلے گئے ہیں۔
 یہ کام آغاز میں ہی اتنا دشوار ثابت ہو رہا تھا کہ عروہ کو دانتوں پیسنے آگئے۔ کس شروع ہونا تو دور کی بات، ابھی تک رپورٹ ہی درج نہیں ہو سکی تھی۔ معاملے کو ٹالنے اور لگانے کے، پولیس والوں کے پاس سیکڑوں ٹیبلے بھانے تھے۔ وہ درود کھینے پولیس اسٹیشن میں بیٹھی رہیں اور پولیس والے دزدیدہ لٹکاؤں سے انہیں گھورتے رہتے۔ ایک بار خانو یاور حیات کی اٹھاروں سے جھڑپ بھی ہوئی۔ آخر ایک روز عروہ اور یاور حیات رنج ہو کر مقامی ایم بی اے کے پاس جا پہنچے۔ اس کی منت ساجت کر کے اسے اپنے ساتھ لیا اور اس روز یہ مشکل ان کی رپورٹ درج ہو پائی۔
 * * *
 حریم اب صرف اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ خود کئی کی ناکام کوشش کو اب تقریباً تین مہینے گزر چکے تھے مگر کسی وقت اب بھی طبیعت خراب ہو جاتی تھی، ہر بری طرح پکڑنے لگتا تھا۔ یہ والدہ کی حوصلہ افزائی اور ان کی دلی ہوئی ہمت ہی تھی جس نے حریم میں پھر سے نہ صرف جینے کی امنگ پیدا کی تھی بلکہ اپنی زندگی برباد کرنے والے کے خلاف لڑنے کا حوصلہ بھی دیا تھا۔ والدہ کے بعد عروہ دوسرا شخص تھا جس کی ہمت افزائی نے حریم کو کھینچنے میں مدد دی تھی، وہ دو چار دن بعد ان کے گھر کا چکر لگاتا تھا، لیکن آتا ہی وقت تھا جب اسے یقین ہوتا تھا کہ حریم کی ادا بھی گھر پر ہوں گی اور ایک مرتبہ تو امی گھر پر نہیں تھیں، وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی سنجیدگی اور ایک بی بی معنی خاموشی تھی جو اس سے ملنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھی۔ شاید حریم بھی ان متاثر ہونے والوں میں شامل تھی۔ مگر کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حریم اور آئی عروہ نے کمال ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایف آئی آر درج کرائی ہے اور اس مفروضہ بدعاش ”عادی“ کے خلاف قانونی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عمر نے اس فیصلے کو بہت سراہا تھا اور ہر ممکن اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ عمر کے والد احسان سرمدی ایک معروف صفائی تھے، ماشی میں کرائمر پورٹ بھی رو پکے تھے۔ عمر نے ان سے بھی بات کی تھی اور انہوں نے بھی اپنی ہی کوشش کرنے کا یقین دلایا تھا۔
 اس روز حریم کی ادا بھی خراب تھا، وہ اٹھا کر سوئی ہوئی

سیپینس ڈائجسٹ

جن پر خون کے جھپٹے ہیں۔ یہ کس کا خون ہے، یہاں کون مرا ہے، کیا وہ اور حرم بھی اسی طرح مرجھا گیا؟ جانوروں کی ٹانوس آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کون سے جانور ہیں..... جب ان کے تھیلے دانتوں کی کٹ کٹ اس کے کانوں میں گونجتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ آج بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں مشین کی طرح چل رہا تھا۔ کام دلی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے سو گئی تھی۔ اس نے وال ٹھاک کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ اسے مایہ ناز کو اسکول سے لینے جانا تھا اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دھک ہوئی اور حرم اندر آئی (عروبہ حرم سے یہ کہہ کر سوتی تھی کہ وہ اسے وقت پر چگا دے) عروبہ نے فوراً اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن کا پینا پونچھا۔

”اما! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ حرم نے تشویش سے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! تپا نہیں، آج گرمی محسوس ہو رہی ہے..... چلو خیر میں مایہ ناز کو لینے جا رہی ہوں اور پکانے کے لیے چکن بھی لے آؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے عروبہ نے دوش روم کا رخ کیا۔ چہرے پر مسلسل پانی کے جھپٹے ڈالے تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ جب اس نے الماری سے اپنی بڑی چادر نکالی اور باہر کا رخ کیا۔ مایہ ناز انکس لینگوئیج کی کلاس لے رہی تھی اور آج کل اس کی جلدی پچھلی ہو رہی تھی۔ وہ اسے خود ہی لینے جاتی تھی۔ پچھلے تین چار روز سے گاڑی چونکہ مسئلہ کر رہی تھی اس لیے وہ پیدل ہی نکل جاتی تھی۔ ایک ٹیویٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔

مایہ ناز کو اسکول سے لے کر اس نے چکن شاپ کا رخ کیا جو سڑک کے پار مارکیٹ کی پچھلی طرف تھی۔ عروبہ اور مایہ ناز پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔ سڑک پر معمول کا ٹریفک تھا۔ آج ایک تیز رفتار کار عجب سے آئی اور اس نے بلند آواز میں بارن بجا دیا۔ عروبہ کو یہی لگا کہ وہ گاڑی ان کے بالکل عقب میں ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ واقعی عقب میں تھی اور تیز رفتار سے ان کی طرف آرہی تھی۔ عروبہ بے ساختہ چلائی اور مایہ ناز کو اپنے ساتھ دھکیلی ہوئی فٹ پاتھ سے نیچے اتر گئی۔

برقی رفتار گاڑی بس چند انچ کے فاصلے سے ان کے پہلو سے گزر گئی، اس کی اڑائی ہوئی گرد سے مایہ ناز برسی طرح کھانسنے لگی۔

اور گرد کے راہ گیروں نے بھی چونک کر یہ منظر دیکھا تھا۔ گاڑی اب موڑ کاٹ کر ایک قریبی سڑک پر داخل ہو چکی

تھی۔ چند افراد ہمدردانہ انداز میں ماں بیٹی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ ”کوئی چری گلتا ہے حیثیت..... یا شاید بپا رہ گئی تھی۔“

کوئی اور بولا۔ ”گاڑیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو پیدل چلنے والے کیڑے کوڑے نظر آتے ہیں۔ اس حرامزادے کا گھبروٹ کرنا چاہیے تھا۔“

عروبہ کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ مایہ ناز رنگ بھی ہلدی تھا۔ عروبہ نے نیم پختہ راستے سے شارٹ کٹ لیا اور چکن وغیرہ خریدے بغیر ہی پریشان حال گھر واپس آگئی ابھی وہ چابی سے گیٹ کا لاک کھول رہی تھی کہ اس کے سوبائٹ فون پر کال آئی نمبر اجنبی تھا۔ نگاہ نے کیوں اسے لگا کہ اس کال اور ابھی تھوڑی دیر پہلے نہیں آنے والے واقعے کا آپس میں تعلق ہے۔

”ہیلو۔“ عروبہ نے کہا۔

”جی جی، عروبہ میڈم! کیسے حال ہیں آپ کے؟“

”کون بول رہا ہے؟“ عروبہ نے بے حد تعجب اور

درشت لہجے میں کہا۔

”ارے، یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی جلدی بھول بھی گئے

خاکسار کو؟ اچھا ہاں..... یاد آیا۔ اس سے پہلے آپ کی بیٹی

حرم سے بات ہوئی تھی نا۔ میں آپ کا خیر اندیش، ہمدرد

ایڈووکیٹ انور شاہ عرض کر رہا ہوں۔“ اس نے تقریباً

لفظوں والے انداز میں کہا۔

”کیا تکلیف ہوئی ہے تمہیں اور تمہیں مع کیا گیا تھا

نا کہ اسب ادھر کال مت کرنا۔“ عروبہ نے سچے لہجے میں

کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”میں دھمکانا چھوڑ دو۔

ورنہ تکلیف میں آ جاؤ گے۔“

”ارے واہ کیا بات کہی آپ نے۔ اور میڈم.....

تکلیف تو ابھی ابھی آپ کو ہوئی ہے۔ بہت بڑا دل ہے آپ

کا۔ اپنی تکلیف کو بھول کر دوسروں کی تکلیف کا سوچتی ہیں۔“

”کیا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عروبہ نے تقریباً

چپختے ہوئے کہا۔

”میڈم! آپ سمجھ تو سب کچھ جانتی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر

پہلے آپ کا ایکسٹنٹ ہوتے ہوتے بچا ہے۔ پیاری سی بیٹی

ہوئی ہے آپ کے ساتھ۔ اسی طرح لوگ نقصان کر کے نکل

جاتے ہیں۔ کوئی پکانے پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ برا وقت

آ گیا ہے۔“ اس غیبت نے مضمونی آفسوں کا اظہار کیا۔ عروبہ

کو اپنی کشمکشیں سمجھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔ ”دیکھیں جی! اب آپ جس چکر میں پڑ رہی ہیں

نا..... اپنے گھر کی چادر پوری سے باہر بہت ہوشیار اور چونکا رہا کریں۔ جوان بچیاں ہوتی ہیں آپ کے ساتھ..... سوچیں سو

دھمن۔“ آخری الفاظ اس نے چہاچھا کر ادا کیے۔

”غیبت کی اولاد، ڈر پوک انسان! اتنا وقت ہے

کہاں پر؟ سامنے آ کر بات کر، تیری آنکھیں نہ نکال دیں

میں نے تو کہنا۔“ عروبہ نے چٹکھڑاتے ہوئے کہا۔

”ارے اتنا غصہ میڈم! میں آپ کے آس پاس

کہاں۔ میں تو اپنے آفس میں ہوں۔ بس ایک ہمدردی کا

جذبہ ہے جس کی وجہ سے دل کی آگھ آپ پر اور آپ کے

پیادوں پر لگی رہتی ہے۔ زمانہ خراب ہے اور بیٹیاں جوان

ہیں آپ کی..... ویسے تو آپ خود بھی اتنی ہی گزری نہیں۔

تھوڑی سی رعایت کے ساتھ آپ کو بھی جوان ہی کہا جاسکتا

ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا۔“

”کیا اس بند کر۔“ عروبہ نے سینے کی پوری قوت سے

دھاڑی۔ ”تو حرامزادہ ہے اور تیرا وہ پاس تجھ سے بڑا

حرامزادہ ہے۔ بتاؤ اسے اس سو کو بھی کہ ہم اس سے ڈرنے

والے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں ڈرنے والے..... پتا نہیں کہ

شوہر پیش کے عالم میں وہ کیا کچھ بولتی چلی گئی پھر اسی کیفیت

میں اس نے اپنا سیل فون کھینچ کر فرش پر مارا فون کے

پرے اور ادھر ادھر کھڑ گئے۔ جن میں ٹوٹی ہوئی اسکرین کی

گرچیاں بھی تھیں۔ اس کے مرحوم نانا ایک فوجی آفیسر

تھے۔ عروبہ کی رگوں میں ان کا خون تھا۔ کبھی کبھی جب غصے

کے عالم میں یہ خون اس کے اندر جوش مارتا تھا تو اس کا چہرہ

لال لال جھسکا ہو جاتا تھا۔

اسی دوران میں حرم گھبراہٹ ہوئی سیزیموں سے نیچے

اتری اور دروازہ کھولا..... پندرہ سولہ سالہ مایہ ناز نے

دھشت زدہ انداز میں ماں کا بازو دھام رکھا تھا۔

”اما! کیا ہوا؟“ حرم نے تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا

اور ماں کو بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ ”اما! آخر بات کیا

ہوئی ہے؟“

”اوپر چلو..... میں بتاتی ہوں۔“ عروبہ نے جیسے خود

کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ چند لمحے کی مہلت یہ

سوچنے کے لیے جاہ رہی تھی کہ حرم کو پوری بات بتانے یا

نہیں۔ اسے ڈر تھا کہ حرم زیادہ ہی نمکھرا جائے۔ ابھی اس

کے ندوں پر ایک ڈاؤن کا پہلا واقعہ بھی اسے بھولا نہیں تھا۔

عروبہ اپنی چادر ایک طرف رکھ کر صوفے پر ڈھیر

ہو گئی۔ حرم فوراً اس کے لیے پانی لے کر آئی اور خود بھی ماں

اور بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ مایہ ناز کا چہرہ بھی حالات کی سنگینی کی

چٹکی کھا رہا تھا۔

حرم بولی۔ ”اما! دیکھیں، مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔

اس مشکل میں جتنی ثابت قدم آپ ہیں اتنی ہی میں بھی

ہوں..... میرا خیال ہے کہ ریاض کے اس بچے دیکل کا پھر

فون آیا ہوگا۔“

عروبہ نے ایک گہری سانس لی اور حرم کو شروع سے

لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ ساتھ ساتھ وہ حرم کے

تاثرات بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ جان کر ایک اطمینان سا

ہوا کہ حرم کے چہرے پر پہلے کی طرح ہلدی نہیں بھری

ہے۔ وہ بتدریج خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال رہی تھی

اور مضبوط بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بولی۔ ”اما! آپ فکر نہ کریں۔ ہم ان کیڈز بھیکوں

سے نہیں ڈریں گے۔ اس کو نہ اس کا باپ بچا سکتا ہے اور نہ

ہی اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے آوارہ کتے۔ اب یہ

لوگ جو اوچھے پتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، یہ اس بات

کی دلیل ہیں کہ ہمارا کیس مضبوط ہے اور بہت جلد اس

غیبت انسان کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔“

عروبہ جب حرم کو اس انداز سے بات کرتے ہوئے

دیکھتی تھی تو اسے لگتا تھا کہ وہ اکلی نہیں ہے۔ اس کی جوان،

بہادر بیٹی اس کے کندھے سے کندھا ملانے کھڑی ہے۔

مایہ ناز دلی آواز میں بولی۔ ”اما! یہ کوئی معمولی بات نہیں

ہے کہ ہمیں گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ

خانوہاد کو فون کر کے بلائیں.....“

کچھ دیر تینوں ماں بیٹیوں میں اس موضوع پر بات

ہوئی، پھر فیصلہ ہوا کہ اس بارے میں تھوڑا سا اور سوچ

لیا جائے۔

حرم نے جیسے چوکتے ہوئے کہا۔ ”اما! مجھے یاد رہی

نہیں رہا، جب آپ باہر گئیں تھیں آئی کا فون آیا تھا، وہ کہہ

رہی تھیں کہ ہماری طرف آنے کے لیے گھر سے نکل رہی

ہیں۔ علی بھی ان کے ساتھ ہے۔“

”اوارہ پھر تو وہ کھینچنے والے ہوں گے۔ تم ایسا کرو

لاؤنچ کو دیکھو، میں چکن میں جاتی ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد مینہ آئی اور علی ان کے ٹی وی

لاؤنچ میں بیٹھے تھے۔ رکی انگٹھو ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں

باریال بھی ٹیوشن سے آ گیا اور علی کو اپنے ساتھ کرے میں

لے گیا۔ دونوں بڑے ڈوں سے کہیں اکٹھے جانے کا

پر وگرام بنا رہے تھے۔

مینہ آئی صبرِ معمول کچھ فردس بھی لے کر آئی

تھیں۔ حرم فرانس کے شاہزادہ جن میں رکھنے گئی تو حمیدہ آئی
نے عروہ سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”عروہ!
سب خیریت ہے؟“

عروہ ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔
وہ بولیں۔ ”دراصل..... دروازے کے پاس.....
تمہارا موبائل ٹوٹا ہوا پڑا تھا اسے دیکھ کریشان ہوئی تھی۔“
عروہ اندر سے ششپائی۔ پریشان میں ان تینوں کو یاد
نی نہیں رہا تھا کہ فونے ہوئے سوبائے باقیات دروازے پر
سے اٹھائی ہیں۔ پہلے عروہ نے سوچا کہ وہ اس بات پر پردہ
ڈال دے، کوئی بھی جواب پیش کر دے لیکن پھر اسے ایسا کرنا
اچھا نہیں لگا۔ آئی حمیدہ ایک ٹیگٹ ٹیگٹ خوار اور ہورمیں۔ عروہ
نے ہمیشہ ان کی جانب ایک حوصلہ بخش کھنکھارے کیا تھا۔ اس
نے مناسب الفاظ میں یہ ساری بات ان کے گوش گزار
کر دی۔ انہوں نے اس واقعے کی اپنی تفسیر لی کہ انہیں
بلند پریش کی کوئی کھانا پڑی۔ انہوں نے اپنی پیشانی کا پینا
اپنی اوڑھنی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ پاک تمہیں
اور تمہارے بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ یہ درو اصف کا
نہیں، طاقت کا ہے، کمزور کو بردہ راز دہندہ ہے اور طاقتور کو
دیواریں بھی راستہ دے دیتی ہیں۔ تم نے اور تمہارے بچوں
نے اصف کے لیے آواز بلند کر کے بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔
سب لوگ تمہارے فیصلے کو سراہ رہے ہیں۔ تعاون کی پیشکش
بھی کر رہے ہیں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے عروہ کہ بالآخر
یہ لڑائی تم کو اکیلے ہی لڑنی ہے۔“

”اس بات کا اندازہ تو مجھے ہے باقی۔“ عروہ نے
کھوئی کھوئے انداز میں کہا۔
آئی حمیدہ نے کہا۔ ”عمر اور اس کے ابو بھی تم لوگوں
کی اس جدوجہد کو بہت سراہتے ہیں۔ خاص طور پر عمر کا تو
سارا دھیان ہی تم لوگوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
اب ہمیں اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے بغیر چین
سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا، ڈیوٹی سے واپس
آنے کے بعد اس کا سارا وقت اسی سوچ بچار میں صرف
ہو رہا ہے۔ اب وہ اور اس کا دوست حسن رضا سوشل میڈیا پر
بھی اس معاملے کو اٹھارہ رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ سب چیزیں
ہمارے فائدے میں جائیں لیکن.....“ آئی حمیدہ کچھ کہتے
کہتے خاموش ہو گئیں۔

”باقی! آپ بات کریں میں سن رہی ہوں۔“
وہ ذرا توقف سے بولیں۔ ”بس عروہ! امیر اول بہت
دکھتا ہے۔ میری کوئی بیٹی نہیں، میں جب بھی حرم کو دیکھتی

ہوں مجھے ایسے لگتا ہے کہ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بالکل
ایسی ہی ہوتی، اتنی ہی پیاری، ایسی ہی معصوم۔ اس نازک سی
جان پر جو ظلم ٹوٹا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ پتا نہیں کہ وہ اس ظلم کو
کیسے سہہ رہی ہے۔ اور پھر جو تشویش ہو رہی ہے وہ تو.....“
حمیدہ آئی کی آواز بھرا گئی اور وہ بات جاری نہ کر سکیں۔
کچھ دیر تک انہوں نے اپنے آس پاس کی کوشش کی،
پھر عروہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور شہرے ہوئے لہجے میں
بولیں۔ ”اس ریا میں کوئی تو بہت بڑا دلیل کہا جاتا ہے لیکن
ایسے لوگ اس معتبر پیشے کے چہرے کا بد نما داغ ہیں۔ یہ
ضیافت تمہارا بہت سیاست میں بھی خلل ڈال رہا ہے۔ بڑے
لیجے ہاتھ پاؤں ہیں اس شیطان کے۔ بیٹے کو بچانے کے
لیے بڑی دیر تک جانے گا یہ۔ مجھے ان بچوں پر ترس آتا
ہے..... میں تو کہتی ہوں عروہ..... لعنت بیج دو اس شیطان
نولے پر اور تمہارے بچہ یوں کے چکر پر۔ کہتے ہیں کہ ایک
بدلہ تو وہ ہوتا ہے جو ہم انسان دوسرے انسانوں سے لیتے
ہیں اور ایک اللہ پاک کی لاشی ہوئی ہے اور یقیناً کرو جب
اللہ کی لاشی اٹھتی ہے تو ظالم اور مظلوم دونوں اپنی اپنی جگہ
حیران رہ جاتے ہیں۔“

عروہ سر ہٹا کر سن رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔
آئی حمیدہ نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے عروہ! تمہیں میری
بات سے دکھ ہوا ہو لیکن میں وہی کہہ رہی ہوں جو میرے
دل کی آواز ہے۔ عمر کا موقف بھی وہی ہے جو تمہارا اور حرم کا
ہے۔ میں نے اس موقف پر کسی کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن
جب میں ان بچوں کی طرف دیکھتی ہوں تو میرا دل ہونے لگتا
ہے عروہ! مجھے لگتا ہے کہ یہ بذات لوگ تمہاری پیش نہیں
چلتے دیں گے۔ ابھی تو یہ صرف اوچھی دھمکیاں دے رہے
ہیں پھر اوچھی کا رد وائیوں پر بھی اترا آئیں گے.....“
”آپ کیا چاہتی ہیں باقی؟“ عروہ نے شکیدہ آواز
میں پوچھا۔

”بس تمہاری اور تمہارے بچوں کی سلامتی اور ان
کے لیے ایک اچھی زندگی۔“ وہ اٹھک بار ہو کر بولیں اور پھر
جیسے بے ساختہ کہا۔ ”عروہ! ابھی بھی تو میرا دل کہتا ہے کہ تم
ان بچوں کو لے کر کہیں دور چلی جاؤ۔ کسی اور شہر..... کسی اور
جگہ۔ ان کو اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لو۔ ایک نئی زندگی
شروع کرو۔ جس میں ان کے لیے کوئی بدنامی نہ ہو، کوئی ان کی
طرف دیکھ کر دبی دبی سرگوشیاں نہ کرے۔ کوئی ان کی
طرف انگلی نہ اٹھائے۔ ایک نارمل زندگی.....“
عروہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ

جو کچھ کہہ رہی تھی اس کی پوری کی پوری کمرہ لہی لگتی
اب وہ اتنا آگے آگے گئی کہ وہ اپنی منہ انسان کے سوا اور
کچھ نہیں تھا۔
اس دوران میں بار پال اور ملی بھی باتیں کرتے لاؤنج
میں آگئے۔ حمیدہ اور عروہ کو آس پاس پونچھ کر موضوع بدلنا پڑا۔
☆☆☆☆

عمر کو اس کی امی نے وہ واقعہ تفصیل سے بتا دیا تھا
جس میں سربراہ عروہ اور باجین کو وہ ایک ہیڈ سے ڈرانے
کی کوشش کی گئی تھی اور پھر دھمکی آمیز فون بھی ملتا تھا۔ عمر کو
پہلے ہی ایسے حالات کی توقع تھی۔ بہر حال وہ اپنے محاذ پر
برکرم تھا۔ اس کے صفائی دوست حسن نے اہم پیش رفت کی
تھی اور خود کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف شاہدہ والی فلی
سے معلومات اکٹھی کی تھیں بلکہ لاہور ہی میں عدیل عرف
عادی کے ایک اور جرم کا سراغ لگا لیا تھا۔ یہ یس بھی ایک
تھانے میں رجسٹرڈ تھا اور منترہ لڑکی کے لواحقین کچھ نہ کچھ
بیرونی بھی کر رہے تھے۔ یہ لڑکی شادی شدہ تھی۔ اپنے
شرخوار بچے کے ساتھ سرگودھا سے شیخوپورہ آنے کے لیے
نکلے۔ غلطی سے لاہور والی بس میں بیٹھ کر لاہور با دای بارغ
بس اڈے پہنچ گئی۔ یہاں عادی اور اس کا دوست اسے
دھوکے سے ایک قلیت میں لے گئے۔ بچے کو چھین کر اسے
نشر آور دوایا دی اور لڑکی کو بیچ تک زیادتی کا نشانہ بنایا۔
اہم ثبوت ملنے کے بعد حسن نے باقاعدہ ایک تحقیقی
رپورٹ تیار کی تھی..... رپورٹ عادی کو ایک عادی مجرم
ثابت کرتی تھی اور اس کی بیٹی بے راہروی پر سر قہد حق
ثبت کرتی تھی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ عادی کے حوالے
سے اگر تین چار کیس آن دیں یا کارڈ موجود تھے تو پھر کچھ
ایسے واقعات بھی ہوں گے جو منظر عام پر نہیں آئے ہوں
گئے۔ جس اخبار میں عمر کے ڈیڈی کا مکرے تھے اس نے یہ
رپورٹ شائع کرنے میں پہلے تو کچھ چٹکا ہٹ دکھائی۔ اسے
بڑے قانون دان ریا میں جاوا کے بیٹے کا نام اس رپورٹ
میں آ رہا تھا۔ اس شخص کی جڑیں کافی دور تک تھیں۔ بہر حال
کچھ تاخیر اور کچھ صلاح مشورے کے بعد یہ رپورٹ شائع
کر دی گئی۔ اس نے اپنی عادی۔ الیکٹرونک میڈیا پر بھی
نیوز لگ گئیں۔ سماجی حلقوں کی طرف سے بااثر شخص کے بیٹے
کو جلد از جلد اصف کے کنہرے میں لانے پر زور دیا
جانے لگا۔ اطلاعات کے مطابق عدیل عادی ابھی تک
ردپوش تھا۔
عمر کو والدہ کی زبانی جب سڑک پر پیش آنے والے

دائے اور دھمکی آمیز فون کال کی خبر ملی تو اس کے سینے میں
دکھتے ہوئے انکار سے کچھ اور دھمکیاں مل گئیں۔ اس کی امی نے
کہا۔ ”ماں بیٹیاں بہت ڈری ہوئی ہیں عمر۔ تم اسپتال سے
فارغ ہو کر ان کے گھر کا ایک پتھر لگا آنا۔ انہیں سلی دینا.....
اور یہ بھی کہنا کہ وہ بلا ضرورت گھر سے نہ نکلا کریں۔“
”آپ فکر نہ کریں امی! میں تو چاہتا ہوں کہ ان کے
لیے ایک دو ماہ کے لیے پولیس گارڈ مینا ہو۔ میں اس سلسلے
میں ڈیڈی سے بات کروں گا۔“
”جیلو یہ بھی کر لینا، مگر آج جا کر ان کو تسلی ضرور دینا۔
تمہارا بڑا اسہارا ہے ان کو۔“
عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔
واپسی پر وہ عروہ آئی کی طرف تو نہیں گیا، وہ سیدھا
اپنے ڈیڈی کے پاس ان کے اخبار کے آفس میں چلا گیا۔
وہاں سے ڈیڈی کو لے کر وہ اس پولیس اسٹیشن آیا جہاں حرم
اور عروہ آئی نے عادی کے خلاف پرجہ روج کر دیا تھا۔
باپ بیٹا اس اچھ او سے ملے اور اس سے پوچھا کہ ایف آئی
آر پر اب تک کیا کارروائی ہوئی ہے؟ عمر اکیلا ہوتا تو شاید
ایس اچھ او سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا مگر عمر کے ڈیڈی
احسان سرمدی کی موجودگی میں اسے دو چار سوالوں کے
جواب تو دینا ہی پڑے۔
منہ بیکار اس اچھ او نے بتایا۔ ”اب تک جو کچھ پتا چلا
ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ظلم آزاد علاقے کی طرف
نکل گیا ہے۔ خیبر ایجنسی میں اس کا تھوڑا سا کونج تو ملا ہے۔“
”کونج نہیں چاہیے، ہمیں مجرم چاہیے۔“ عمر تقریباً
چلا کر بولا۔ ”آپ بتائیں اس خبیث کو پکڑنے کے لیے
آپ نے کہاں کہاں چھاپا مارا ہے، کب مارا ہے؟“
ایس اچھ او بھی ایک دم ہلکا گیا، پتھر مارا۔ ”دیکھو
کا کے اپنے تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں ہے، تمہانہ ہے،
یہاں اوہی آواز میں بولو کہ تو چھپتا پڑے گا۔“
”کیا چھپتا پڑے گا..... اس سے زیادہ اور کیا
چھپتا میں گے۔“ عمر چلا گیا۔ ”اس بے انصافی کے دور میں
پیدا ہوئے، تمہارے جیسے لوگوں کو اپنا محافظ بنایا، اختیار
دلوں کو خریدنے کے لیے لے پھڑے رہا..... نہ
بنائے۔ یہ کوئی چھوٹے چھپتے سے نہیں ہیں اور کیا
چھپتا میں گے..... تم جیسے افسروں.....“
”چپ ہو جاو عمر۔“ اس کے ڈیڈی نے اس کے منہ
پر ہاتھ رکھ دیا۔
ایس اچھ او سکندر کا چہرہ لال ہو کر ہوا تھا۔ چند لمحے

فلم نگری سے

جس کام نہ ہونا ہوتا ہے یا جس کو شہرت ملتی
ہوتی ہے، اس کا سبب خود بخود میں جانتا ہے
1948ء کے اوائل میں برصغیر میں ایک ایسی آواز
کونجی جس نے گیتوں کی دہائی میں ہلکے مارا۔ یہ آواز
انٹیکنیکل کی ہے لیکن بھلا تم لوگ یہ جانتے ہو کہ
اس کے گھر کی وجہ سے اس کی بہن آتش لے اس سے
بڑا وہ گیت گار (بلکہ بھول گئی کا بڑی کے) سب
بڑا وہ گیت گار چلتا نام اس عوانے سے گیت گار
میں وہ گیت گار۔ یہ وہ گیت گار۔ یہ وہ گیت گار۔
کر۔ موسیقار، اپنی لہر 1952ء میں اپنی لہر آواز
میں موسیقی دینے کا چانس ملا۔ جس کے گانوں کے
لیے ان کو کہہ کیا گیا تھا کہ وہ کہہ یہ چاہا کہ اس
لہر کی موسیقی بالکل نئے موسیقار اپنی لہر دے رہے
ہیں تو اس نے یہ کہہ کر گانے سے انکار کر دیا کہ نئے
موسیقار کے ساتھ میں گانا نہیں گا سکتی..... وہ خدا
معلوم کبھی دھن بنائے۔ اپنی لہر نے اس کے بعد
سے کوئی گیت نہ گویا بلکہ اس کی چھوٹی بہن آتش
گیت گوائے۔ بعد میں وہ اپنی لہر کے نام کا ڈاکو بنجا تو
ان کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے اپنی لہر سے معذرت
بھی کی لیکن وہ اپنی لہر راضی نہ ہوئے۔

تيا شاعر

ایک نیا شاعر مسمیٰ رسالے کے ایڈیٹر کے پاس
 غزل لے کر گیا۔
 ایڈیٹر نے پوچھا: ”کیا یہ غزل آپ کی ہے؟“
 شاعر نے کہا: ”جی شک۔“
 ایڈیٹر بولا: ”یہ غزل رسالے کے معیار پر پوری
 نہیں اترتی۔“
 شاعر صاحب آہستہ سے بڑبڑائے: ”یا اللہ اب
 غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہونے لگیں۔“
 مرسلہ: ریاضت، حسن ابدال

کی اسی چونکہ اہل انون محمد ہوں مگر میں اس لیے اسے خیال
آیا کہ شاید چہ ان کی کال ہو۔ دوسری طرف سے سنائی
دیے والی آواز نے اسے بھرا دیا۔ وہ یوں سکتے زدہ ہوئی
کہ کال کاٹ بھی نہ سکی۔ دوسری طرف وہی منحوس تھا۔ وہ
بولتا۔ "عدیل بول رہا ہوں۔ کال کاٹنے سے پہلے میری بس
ایک بات سن لینا۔ میں تم دونوں سے زیادہ دور نہیں ہوں۔
جب چاہوں سامنے آ کر تمہیں ویلو سویٹ ہارٹ بول سکتا
ہوں۔ اگر تمہیں نہیں ہے تو میری بات نہ مان کر آزاد مانو۔ میں
آج رات ساڑھے دس بجے دوبارہ فون کروں گا۔ اگر تمہارا
فون نہ بلدا تاہم نے ریسیو نہ کیا تو تمہاری "ہولی" کل کال
میں اپنی پہلی کال نہیں لے سکے گی اور اگر کوئی
روٹی ہوئی واپس آئے گی۔" غلڈا ہے۔"

کال ختم ہو گئی، مگر حریم اسی طرح کھڑے دو ٹھہری رہی۔
اس کے جسم کے ہر مسام نے پینا اگل دیا تھا۔ اس نے
جلدی کے ساتھ آجکل سے اپنا چہرہ ہونچا کیونکہ ماین کے
قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ حریم کو اپنی نئی یونیفارم اور
بکس وغیرہ دکھانے میں مصروف ہوئی۔ وہ چمک رہی تھی
اور حریم کے دل میں جیسے ماتم ہو رہا تھا۔
”کہاں گم ہیں آپ! کیا ہوا؟“ ماین نے اس کا چہرہ
دیکھ کر ہونچا۔ لہجہ میں انہماک سا خوف اتر آیا تھا۔
”خیر ماین کچھ بھی نہیں۔ یونہی بس کوئی بات یاد
آئی تھی.....“ حریم نے چھوٹی بہن کو تسکین کا
اس کے ذہن میں کھلبلی مچے ہوئے تھے لیکن وہ نہیں چاہتی
تھی کہ اس کے خوف و ہراس کی چمک بھی اس کے گھروالوں کو
ملے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی مائی کی طرح اپنا ہر صدمہ
اپنی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

رات تک اس نے بہت سوچا..... اور پھر جب سڑھے دس بجے کے قریب وہ منہوس کلا آئی تو اس کی ریشم کو کھلی۔ وہ اس وقت اس چھوٹے سے کمرے میں اپنی ننھی جیسے وہ لوگ اسٹڈی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

”ہیلو سویت ہارٹ! مجھے پوری امید کی کہ تم تقصدی کا ثبوت دو گی۔“ مکر وہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ حریم نے دھیمی مگر شعلہ بار آواز میں کہا۔ اس کا پورا جسم غم و غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”چاہتا تو بہت کچھ ہوں سویت ہارٹ، مگر فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ پرانی بات کو بھول جاؤ، جو ہو گیا سو ہو گیا، ایک دوسرے کی طرف دینی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔“

”اور اس دوستی کے لیے مجھے کہا کرنا ہو گا؟“ حریم

کھتے لوگ ذمہ کھائے بیٹھے ہوں گے۔ ایسے جانور کا آزاد پھر تاسی طور بھی خطرے سے خالی نہیں۔“

”تمہاری باتیں درست ہیں، مگر بات بھر طاقت اور کمزوری کی آجاتی ہے۔ اینڈ وکسٹ ریاض اور اس کے بھائیوں کی سیاسی دانستگی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو بچانے کے لیے ہر چھٹکانہ استعمال کرتے ہیں۔ اب بھی کر رہے ہیں۔ مگر ہم اس معاملے کو اپنی آسانی سے دیکھ نہیں دیں گے۔ ویسے عدالتی کارروائی ٹھیک ہی جارہی ہے۔ ایک دو بیٹیوں کے بعد عدلیہ کو اشتہاری قرار دے دیا جائے گا۔“

☆☆☆
 ماہین کے داخلے کا مسئلہ تھا۔ رزلٹ کارڈ میں چھوٹا سا
 نقص پریشان کر رہا تھا۔ تین دن سے عمر، ماہین کو ساتھ لیے
 لیے پھر رہا تھا اور آخر آج مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ماہین بہت
 خوش تھی۔

حرم سبزی کاٹ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آن
 بیٹھی۔ "آئی اُڑے اچھے میں عمر بھائی۔ کبھی بھی تو مجھے سکے
 بھانسنوں کی طرح لگتے ہیں۔ اتنا پیار، اتنا خلوص، آج کل
 کون کسی کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔"
 "ہاں..... آئی ٹھیکہ بھی تو کم اچھی نہیں ہیں۔ آخر ان
 ہی کے بیٹے ہیں۔" حرم نے بھی کبھی نظروں کے ساتھ کہا۔
 وہ عمر کے لطیف احساسات سے کافی حد تک آگاہ
 ہو چکی تھی..... مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ
 احساسات کبھی اس کی زبان تک نہیں آئیں گے۔ باقی رہی
 خود حرم کی بات..... تو وہ تو بس زندہ چل پھر رہی تھی، یہی
 بڑی بات تھی۔ زندگی کے سارے روشن اور خوشبودار پہلو
 اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اب اگر کوئی چیز

اے تھوڑی بہت خوشی دے سکتی تھی تو وہ یہی بھی کہ اس کا بھرم
کیفر کر دار کو پہنچے۔ ہاں بیٹی نے ایک دوسرے کو گلے سے لگا
کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ انصاف کے حصول کے لیے جہد تک
جائیں گی اور ہر خطرے کا سامنا کریں گی۔ اب بھی اس کی
اسی ایک غلطی سے بٹنے لاہور کے نواحی علاقے شاہدرہ میں
مہنی ہوئی تھیں۔ یہ ان فیملی میں سے ایک تھی جو بعد میں عرف
عادی کے خلاف زیادتی کا کیس درج کرانے کے بعد اور
تھوڑی بہت جرم و جہاد کرنے کے بعد ہمہ ہار چکی تھی اور کیس
واپس لیا ہوا تھا۔

..... نمبرز سے کال وصول کرنا چھوڑ دی تھی..... لیکن اس

کے لیے یوں لگا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر عمر کے بال مٹھی میں جکڑ لے گا اور اسے کھینچے ہو والا دک اپ کی طرف لے جائے گا تاہم عمر کے ڈیڑھ احسان صاحب نے عمر کو پیچھے دھکیلا اور ایسے راج او سے دور لے گئے۔

ایس ایچ او سکندر دھاڑا: ”لے جاؤ اپنے اس پیسے
خاں کو یہاں سے، ورنہ ابھی اس کی یوتیو بند کرادوں گا۔
رستم کہیں کا۔۔۔“

عمر بھی آگ بکولا ہو رہا تھا۔ دروازے پر سے کراہا۔
 ”تم اسکیے نہیں ہو یہاں کے کرتا دھرتا۔ اس شہر میں کچھ
 لوگوں کے ضمیر زندہ ہیں ابھی۔ وہ تمہاری طرح زور آوروں
 کے پتھر نہیں بنے ہوئے۔ ہم انصاف کے لیے نکلے ہیں اور
 انشاء اللہ انصاف لے کر رہیں گے۔ ہم آج ہی پریس کو غفر نس
 کریں گے، میڈیا کو بلا لیں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ کیا
 ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔“ عمر مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔
 اس کے ڈیڑی یا اسے یہ مشکل وہاں سے بچھ کر لے گئے۔

باہر گاڑی میں بیٹھ کر ڈیڑی نے اسے سمجھایا بچھایا اور دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کا مشورہ دیا۔ عمر پرئیں کانفرنس بلائے پر زور دے رہا تھا۔ ڈیڑی نے کہا۔ ”وقت آنے پر یہ بھی کر سکتی لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا ہے۔۔۔۔۔ میڈیا اور این جی اوز وغیرہ ایسے ایٹھوز کو ہائی لائٹ تو ضرور کرتے ہیں۔ کچھ دنوں تک بنگام بھی چتا ہے لیکن پھر اصل لڑائی بندے کو خود ہی لڑنا پڑتی ہے۔“

”ڈیڈ! وہ لوگ دھمکیاں دے رہے ہیں آنٹی
عروہ کو اور باقی گھر والوں کو..... ان کے لیے زمین خشک کر
رہے ہیں یہ لوگ۔“ مگر ان کے خلاف کھل کر بات نہ کی گئی
اور ان کو کوکام نہ ڈالی تو یہ لوگ سانس لینا مشکل کر دیں
گئے اس گھر آنے کے لیے۔“

ڈیڈی نے ذرا دھیان سے عمر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تجسس تھا اور جیسے ایک سوال سا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں عمر سے پوچھ رہے تھے۔۔۔۔۔ میرا چہنچہ! کچھ زیادہ ہی "انوالو" لگ رہا ہے اس معاملے میں۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے؟

عمر نے بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ”ڈیڈی! آپ یہ بات تقریباً ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ عادی صرف نام کا ہی نہیں حقیقتاً بھی عادی ہے اور مجرم ہے۔ آپ نے اخبار میں جو رپورٹ چھپوائی ہے اس کو تو باقاعدہ عدالتی کارروائی کا حصہ بننا چاہیے۔ یہ سیریل کرائم ہے۔ کم از کم چار کیسوں کا ذکر تو آپ کی رپورٹ میں بھی ہے، اس کے علاوہ بھی جاننے

زہر خند لہجے میں بولی۔

”کچھ زیادہ نہیں..... کچھ زیادہ نہیں..... بس اتنا کر دو سوینی! کہ اپنی بیماری ماما کو اور خود اپنے آپ کو تھوڑا سا سمجھا دو۔ آپ دونوں اس گندے مکمل میں ہاتھ نہ ڈالیں تو اچھا ہے..... ورنہ اس گندے جیسے دوردور تک جائیں گے۔“

..... اور اگر میں تھوکر دوں تو پر اور تمہاری اس بات پر تو.....

دوسری طرف چند سینکڑ خاموش رہی پھر وہ اطمینان سے بولا۔ ”پھر بھی کچھ نہیں ہوگا جان من۔ میں کوئی دھمکی بھی نہیں دوں گا۔ نہ یہ کہوں گا کہ میں دوبارہ تمہارے ٹھہر کر دیوار پر چاند سکتا ہوں، نہ یہ کہوں گا کہ کالج کے راستے میں تمہاری پھوٹی چڑیا کے پر جھڑکتے ہیں، نہ یہ کہوں گا کہ تمہاری ماما آج شام ٹھہر آتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرائیں گی۔ کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ آج تم نے نعمتی کا ثبوت دیا ہے اور میری کال ریسیو کی ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کبھی کبھار اس شکل مندی کا ثبوت دیتی رہو کیونکہ..... کیونکہ..... کیونکہ اگر کبھی میری کال آئی اور تم نے ریسیو نہ کی تو پھر وہ سب کچھ ہوگا جو میں نے تم سے کہا نہیں۔“

آخر میں الفاظ کہتے کہتے عادی کا لہجہ اتنا زہر ناک ہو گیا کہ پیش میں ہونے کے باوجود وہ اندر سے لرز گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

چند سینکڑ خاموش رہی، پھر اس کی نرم آواز ابھری۔

”معاف کرنا سوینی! شاید میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ اس لیے اجازت چاہتا ہوں۔ گڈ بائے..... اور..... ایک اور بات یاد آئی۔ وہ جہاں ایک پیارا سا باتو میاں ٹھو ہے تمہارا، وہ کل تمہارے میں جا کر بڑا نکلیں گے اب میں کر رہا تھا اور ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میرے خلاف اخبار میں جو گندہ اچھا لگایا ہے اس میں بھی تمہارے اسی میاں ٹھو کا ہاتھ ہے۔ اس کے کیلئے دوست مسن نے یہ سن گھڑت رپورٹ تیار کی ہے۔ میاں ٹھو کے لیے وارننگ ہے کہ وہ ایویس نہیں ضائع شائع نہ ہو جائے۔ تم لوگ بھی اس سے کچھ فاصلہ ہی رکھو تو اچھا ہے۔ اوکے گڈ بائے۔“ فون بند ہو گیا۔

حرم لرز رہی تھی اور اس کے پورے جسم کا خون اس کے سر میں جمع تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دل چاہا، کاش کہیں سے اس کے پاس کچھ بارودی مواد آجائے، وہ اس بارود کو اپنے بے وقعت جسم کے گرد باندھ لے۔ پھر فون کر کے اس کو کہہ دے کہ تم کو اپنے پاس بلائے اور اس کو دیو بچ کر اپنے ساتھ اسے بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر دے لیکن یہ صرف تہیائی

سوچیں تھیں۔ عملی طور پر ایسا کرنا اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔ اسی دوران میں مہران کا کارڈ ہارن سنائی دیا۔ اس کی آواز گھبراہٹ سے آگئی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا پینو پٹھا اور آنکھوں سے آنکھیں آنسو صاف کیے۔ وہ اس فون کال کے بارے میں ای کی کو بتا کر ان کی پریشانیوں کو مزید عروج دینا نہیں چاہتی تھی۔

ای بھی کچھ زیادہ امید افزا خیرے کر نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جس مشاعرہ فنی کی طرف مئی تھیں وہ لاہور سے باہر مئی ہوئی تھی، صرف لڑکی کے تپا اور تانی سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑی مشکل سے بچی کے رشتے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ کسی بھی طرح اس کیس کی پیروی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بہت تھک گئے ہیں.....

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ صبح ہوئی تھی، شام ہوئی تھی۔ کھٹنے ٹیٹوں میں، دن بھٹوں میں بدل رہے تھے۔ موسم بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ عروہ اور اس کی بیٹی نے سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر انصاف کے حصول کے لیے جہلم اٹھایا تھا وہ ابھی تک اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھک ضرور تھی تھیں لیکن ہادی نہیں تھیں، ان کے جسم شکستہ ضرور تھے، لیکن حوصلے ٹوٹے نہیں تھے۔ وہ اپنے جسم دھان پر وقت اور معاشرے کا ہر ادا سہہ رہی تھیں، جو لوگ ان کے ہمنواؤں میں شامل تھے، ان میں عمر اور اس کے والد احسان صاحب سرفہرست تھے۔ وہ اپنی ہی ہر کوشش کرنے میں مصروف تھے۔ عدیل عرف ہادی کا حال مفلح تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ پولیس کے کچھ کرپٹ آفیسر ریاض فیملی کا حق منک ادا کرتے ہوئے عدیل کو تحفظ دینے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اندیشوں سے بھجور ہو کر حرم نے اپنی ای کی فون کال کے بارے میں بتا دیا تھا جو اسے وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھیں۔ وہ عروہ شخص اسے تقریباً ہر بار ہی ”سم“ بدل کر فون کرتا تھا اور کبھی کبھی ایس ایم ایس بھی۔ ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ اس کی متوجہ کال کے خوف سے حرم نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ ایک بار اس کی والدہ کو ایک نہایت دھمکی آمیز کال موصول ہوئی تھی، دوسری مرتبہ عدیل ہوئی تھی۔ بار یاں مکمل کے میدان سے گھر واپس نہیں آئی تھا۔ اس کے نمبر سے ایک فون کال آئی تھی جس میں کسی گمنام شخص نے حرم اور اس کی والدہ کو بتایا تھا کہ بار یاں کو فوٹو کر لیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کی زندگی چاہتی ہیں تو 24 گھنٹے کے اندر اندر پچاس لاکھ روپے ”نیٹ

کیش“ کی صورت میں ادا کر لے گا انعام لیں۔ یہ اتنی خوفناک خبر تھی کہ حرم نے چلائے شروع کر دیا تھا اور اس کی ای بے ہوش ہوتے ہوئے پٹی تھیں لیکن پھر فوراً ہی ایک پر لطف قہقہہ سنائی دیا تھا اور دھمکانے والے نے کہا تھا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں، بار یاں اس وقت خبریت سے ان کے پاس موجود ہے اور بڑی کھار رہا ہے۔ ابھی آدھ پون گھنٹے میں بخیریت گھر پہنچ جائے گا، لیکن اگر ان ماں بیٹی نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ کال مذاق نہیں رہے گی، حقیقت بن جائے گی۔ بار یاں تو آدھ پون گھنٹے بعد واپس آ گیا تھا لیکن اس روز حرم اور اس کی ای کی جو اٹھا اور حوصلہ ان سے جدا ہوا تھا وہ اپنی اصل شکل میں واپس نہیں آیا۔ اگلے ہی روز ماہین کا کالج جانا بند کر دیا گیا تھا اور بار یاں کا کرکٹ کھیلنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ وہ کالج ضرور جاتا تھا لیکن اب اسے حرم کی ای کی گاڑی پر خود چھوڑنے جاتیں اور لاتی تھیں۔ اس فون کال نے انہیں اس قدر ہراساں کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہمدرد و تنگدست عروہ کو بھی اس سے بے خبر رکھا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنی جدوجہد ترک کر دی تھی۔ ماہین کو اس کی پچھو کے پاس کوئی بھیج دیا گیا اور وہ وہیں رہنے لگی۔ حرم کی تعلیم کا سلسلہ تو یہی ہی منقطع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتی تھی۔ کبھی تاریخ پر عدالت میں جانا ہوتا، یا کسی آفس وغیرہ کا چکر لگانا پڑتا تو وہ اپنی ای کے ساتھ ہوتی۔ وہ ایک عادی بھرم کے ساتھ قانونی لڑائی لڑ رہی تھیں اور اسے انجام تک پہنچانا چاہتی تھیں۔ اب تک اپنی ان کوششوں میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ تمہارے پچھری کے چکر، تاریخیں، گواہوں کی تلاش، ایسے ہائر لوگوں سے ملاقاتیں جو انہیں انصاف کے حصول میں مدد سے سکیں، وہ سب کچھ کر رہی تھیں۔ دوسری طرف عمر نے بڑی خاموشی سے اپنا کام ڈسٹنبل رکھا تھا۔ اس نے سوشل میڈیا پر ایڈ ووکیٹ ریاض اور اس کے بدقماش بیٹے کے خلاف باقاعدہ ایک مہم چلا دی تھی۔ وہ اپنے والد کے تعاون سے صحافتی محاذ پر بھی کردار ادا کر رہا تھا اور اس نے اس معاملے کو دبے نہیں دیا تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں جوں جوں وقت گزر رہا تھا ایک مایوسی ہی حرم اور عروہ پر طاری ہونے لگی تھی۔ انہیں لگتا تھا، جیسے ہر راستے پر کوئی رکاوٹ موجود ہے اور ہر دروازے پر عدیل اور اس کے باپ کا کوئی خفیہ ہمدرد بازو پھیلائے کھڑا ہے۔ انہیں ہر طرح سے ”ڈس ہارٹ“ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ عروہ کو لوگوں کی طرف سے حرم کے

علاوہ عروہ کے ماضی پر بھی کچھ اچھا لگتا تھا اور اب بھی اچھا جا رہا تھا۔ اس روز حرم اور عروہ کو سب سے بڑا دھچکا لگا جب انہیں عمر کی زبانی پتا چلا کہ عروہ اور اس کے گھر والے بڑی خاموشی سے پاکستان چھوڑ کر کنیڈا چلے گئے ہیں۔ عروہ اور حرم کی وہی شکل دار و دست تھی جسے حرم پیسے سامنے کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بد معاش نے حرم کو کٹھنہ بنانے کے چند ہفتے بعد ہی زویا کو بھی برادیا تھا۔ اب تک زویا کی فیملی ڈنٹر رہی تھی۔ حرم اور عروہ کی طرح وہ لوگ بھی اپنے کس کی پوری پیروی کر رہے تھے۔ دونوں مظلوم لڑکیوں کے والدین اور ان کے دیکھوں کے درمیان بھی اکثر صلاح مشورہ ہوتا رہتا تھا لیکن اب اچانک ہی یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان دنوں حرم، عروہ اور عمر نے بھی خود کو تنہا محسوس کیا۔ عمر نے اب تک کسی سرطلے پر بھی ہمت نہیں ہاری تھی، حرم اور عروہ کی ڈھارس ہی بندھالی تھی۔ اس نے ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا اور اپنے اس کردار کی وجہ سے بالکل چپکے چپکے حرم کے دل میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی تھی لیکن جس روز زویا اور اس کی فیملی کے ہیر وئی ملک جانے والا انکشاف ہوا، حرم کو پہلی بار عمر کا لہجہ نہ ہوا محسوس ہوا۔

جس روز حرم اور عروہ تک زویا واپس مایوس کن خبر پہنچی اس سے اگلے ہی روز حرم کو پھر ایک نئے نمبر سے عادی کا نخوس پیچ موصول ہوا۔ اس میں حسب معمول کہا گیا تھا کہ وہ پانچ منٹ بعد اس نمبر سے کال کر رہا ہے وہ ریسیو کرے۔ ہمیشہ کی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی حرم نے کال ریسیو کی۔ (ایک دم حرم فون کی مدد سے عادی کی لوکیشن ٹریس کرانے کی کوشش بھی کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی)

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”دیکھ لیا نا۔۔۔ جان من! کچھ لوگوں کا اگلا دھڑیر کار اور چھپا گید کا ہوتا ہے۔ زویا کے بابا جانی زمین چیرے اور آسمان پھاڑنے کی باتیں کرتے تھے اب کہاں گئیں ان کی دھمکیاں۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی پراپرٹی نوے لاکھ میں بیچ کر بھاگے ہیں۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں حرم سرور! غصہ تھوکر دو۔ روک لو اپنی جنوی والدہ محترمہ کو۔ اس بے کار کی پریشانی سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ کسی دن ہمت کر کے مجھ سے ملو۔ میں بتاؤں گا اب بھی میرے دل میں اتنی گنجائش ہے تمہارے لیے۔ پرانی باتوں کو بھول بھال کر ہم ایک نیا سفر شروع کر سکتے ہیں..... اور کیا پتا اس سفر میں جیون بھر کی رشتے داری ہی بن جائے یا اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سنی خیر تھا۔

”کچھ اور کہنا ہے تم نے یا میں فون بند کر دوں؟“ حرم

نے کرخت لہجہ میں کہا۔

وہ بگڑ کر بولا۔ ”جب اس طرح بولتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ دوستی کا ہاتھ کھینچ لوں اور دشمنی کا ہاتھ بڑھا دوں۔۔۔ اور تمہیں پتا ہی ہے میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ جب بگڑنے پر آگیا تو تم سات دیواروں کے پیچھے بھی چھپ نہیں سکو گی۔“

”تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہوں، میرے جسم تک نہیں پہنچ سکتے۔ میری لاش کو شاید چھو لیں۔“

”لاش بٹنے کی باتیں کرنا آسان ہوتا ہے لیکن لاش جتنا آسان نہیں ہوتا، تجربہ شرط ہے۔“

وہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”عادی! خدا کے لیے۔ ہمارا چچا چھوڑ دو۔۔۔ چھوڑ دو ہمارا چچا۔ سنا ہے تمہاری اپنی بھی کہیں ہیں۔ بھانجیاں ہیں، بھئی ان لڑکیوں کا خیال بھی کرو۔ اللہ کے غضب کو آواز مت دو۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ ایک حد ہوتی ہے۔“

”نبی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ صبر اور انتظار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ اس کا لہجہ پھر نرم اور مٹھا ہو گیا۔ حریم سسک رہی تھی۔ وہ چند لمحوں توقف کر کے بولا۔ ”اچھا پھر بات کریں گے۔ لگتا ہے کہ تمہاری طرف بارش شروع ہو گئی ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ بیٹھی، ڈیڈ بالی آنکھوں سے اپنے فون کو دیکھ رہی۔

وہ اس کے آس پاس موجود تھا۔ گاہے بگاہے اسے فون بھی کرتا تھا، لیکن کوئی اسے نہیں نہیں کر پار ہوتا تھا۔ شاید کوئی ٹریس کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ کسی وقت تو وہ یہ سوچ کر ڈر جاتی تھی کہ وہ ان کے گھر بھی آدھ کا تو شاید کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ اللہ سے مدد مانگنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آئی ٹیمینڈ سب پھر کے وقت عروبہ سے ملنے آئیں۔ حریم دوسرے کمرے میں تھی اور باریال کو ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی۔ آئی ٹیمینڈ نے کوئلڈ ٹریک کا ”سپ“ لینے کے بعد پڑسوچ انداز میں کہا۔ ”عروبہ! میری ایک بات مانو۔ بہت بھڑی آئے گی اس سے تم حریم کو اس کی بڑی پھپھو کے پاس دینی بھیج دو۔ وہاں کافی زیادہ پاکستانی کیونگی ہے۔ ہمارے لاہور کے بھی بے شمار لوگ وہاں آباد ہیں۔ وہیں پر کوئی مناسب سارشتہ دیکھ کر حریم کے ہاتھ پکے کر دیے جائیں۔“

عروبہ کے سینے پر ہلکی سی چوٹ لگی۔ اس نے باہمی ٹیمینڈ کی طرف دیکھا۔ بے شک وہ یہ بات غلوں اور ہمدردی سے کہہ رہی تھیں لیکن شاید وہ چاہتی تھیں جس کمرے کے حوالے سے ان کے بیٹے کے خیالات کیا ہیں یا شاید وہ چاہتی

ہوں مگر نظر انداز کر رہی ہوں۔

وہ بولی۔ ”آپ نے سو فیصد درست بات کہی ہے۔ باہمی سچ کہتی ہوں، کبھی کبھی تو میں بالکل مایوس ہو جاتی ہوں اپنے آپ سے اور اپنے ارادوں سے۔۔۔ یقین ہونے لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں کمزور آدمی کے لیے انصاف کا حصول دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ہم کب تک سر چھوڑتے رہیں گے اس دیوار سے۔“

”نبی تو میں تمہیں سمجھاتی ہوں عروبہ! جو کچھ تمہارے بس میں خاتمہ نہ کیا۔۔۔ اور کسی نہ کسی طور اب بھی کر رہی ہو۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کرتی رہو گی۔ مگر تمہارے بیٹے ہیں، ان کی زندگیاں ہیں۔ ان سب چیزوں کو کہاں تک داؤ پر لگا دیں گے ہم۔ ہم نے ایک آواز تو بلند کر دی ہے تا۔۔۔ اور یہ آواز کتنے لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچی ہے۔ اس آواز نے لوگوں کے دلوں کو چھوا ہے۔ یہ آواز کسی نہ کسی شکل میں اپنے اثرات پر رقرار رہی گئی۔“

اسی دوران میں ڈور بتل ہوئی۔ چار بج چکے تھے۔ عروبہ اپنی والدہ کو لینے آیا تھا۔ آج وہ کئی دنوں بعد آیا تھا۔ عروبہ نے دروازہ کھولا اور اسے چائے کے لیے اوپر لے آئی۔ وہ ہشنگل رضامند ہوا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ چائے کے ساتھ رکھنے کے لیے اتفاقاً گھر میں اسٹیکس نہیں تھے۔ عروبہ نے باریال کو بازار بھیجا۔ باریال واپس آیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ عروبہ چونک گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں پہنچی۔ ”کیا ہوا باریال؟“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔

باریال نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور ہولے سے کہا۔ ”وہ ادھر کھڑا ہے، سڑک کے پار۔“

”کون؟“

”وہی۔۔۔ عدیل۔۔۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ ساتھ میں اس کا کوئی فرینڈ بھی ہے، موٹی سی ناک والا۔“

عروبہ کی رنگوں میں لہوا چمک کر رہ گیا۔ تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی۔ اسے اپنے پورے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔ ابھی تک اسے باریال کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔۔۔ اچانک اسے لگا کہ کچن کے دروازے کے بالکل پاس کوئی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی، عمر سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر بیچانی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں آنکھارے سے دھنکے لگے تھے۔ وہ سمجھ آواز میں بولا۔ ”سواری آئی جان! لیکن میں نے باریال کی بات سن لی ہے۔ میں۔۔۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس

حریم اور اسے کو۔ اسے بتاؤں گا کہ کسی کے گھر کے سامنے بد معاشی کیسے دکھائی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔“

وہ تجزی سے ہنسنے لگا۔ ”مر۔۔۔ مر میری بات سنو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ عروبہ! پتا ہی کرو وہ عجیب کیفیت میں خند ہونے کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ اس کے پیچھے پکڑتی سیزھیوں تک پہنچ گئی۔ وہ آدمی سیزھیوں سے نکلار۔ ”آپ پولیس اسٹیشن فون کریں۔ اور وکیل اٹکل کو بھیجیں۔“

حریم اور آئی ٹیمینڈ بھی دوڑتی ہوئی سیزھیوں پر آ گئی تھیں۔ دونوں کے رنگ ہلکی ہو رہے تھے۔ ”کیا ہوا عروبہ؟“ آئی ٹیمینڈ نے پکار کر پوچھا۔

”مگر کون کہیں۔۔۔ وہ دیکھیں، وہ نیچے چلا گیا ہے۔ وہ لڑنے گیا ہے۔“

آئی ٹی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر تب تک حریم نیچے سڑک پر جھانک چکی تھی۔ اس نے سڑک کی دوسری طرف جنرل اسٹور کے قریب عدیل عرف عادی کا سٹوک چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ عروبہ نصف سیزھیاں نیچے اتر کر روک گئی تھی۔ اب تو وہ مگر پکار رہی تھیں کتنی ہی کیونکہ وہ سڑک پار چکا تھا۔

حریم اور عروبہ نے دیکھا۔۔۔ وہ لمبے بالوں والے منحوس صورت عدیل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں جوست تھیں۔ دونوں کے درمیان چند تند و تیز جھلس کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ موجود تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر ٹپ پڑے، دونوں نے ایک دوسرے پر گھونٹوں، لاتوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سڑک پر ایک دم پائل سی پکڑ گئی تھی۔ عروبہ نے دہشت زدہ ہو کر دم کاٹ کر کال کی اور مدد کے لیے کہا۔

اسی دوران میں باریال بھی سیزھیاں اتر کر نیچے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اس لڑائی میں اپنے عمر بھائی کا ساتھ دینا چاہتا ہو گا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں تک پہنچتا، عدیل عرف عادی کے ساتھ آتے والے اس کے خنڈا صورت سامنے نے دہلے پتلے باریال کا گریبان پکڑا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ جیسے اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس لڑائی سے الگ رہے اور بس تماشا ہی کا کردار ادا کرے اور واقعی یہ ایک سنگین لڑائی تھی۔ کچھ دیر تک تو پکڑا برابر دکھائی دیا لیکن پھر لمبے بالوں اور غلوں جسم والا عادی اپنے حریف عمر پر غالب آنے لگا۔ عمر کی در زنی جسم کا مالک تھا اور عادی ہی کی طرح دراز قد بھی تھا لیکن پھر بھی یہ ایک

آوارہ غنڈے اور شریف انٹس ڈاکٹر کا مقابلہ تھا۔ عادی دہشت میں چمکھانڈے لگا اور عمر کو کھم کھم کر دیواروں سے بٹھنے لگا۔ اپنی تمام تر جرأت اور حوصلے کے باوجود عمر اب عادی کا سامنا نہیں کر پار ہوا تھا۔ سیزھیوں میں کھڑی خواتین چلانے لگیں۔ باریال کو دو تین بندوں نے آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ عمر کے ناک منہ سے اب خون جاری تھا۔ اس کی شرٹ پھٹ چکی تھی۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر کچھ بھاد کرانے کی اور عمر کو عادی کی زد سے بچانے کی کوشش کی۔ عروبہ بھی سیزھیاں پھلانگی ہوئی، کچھ سڑک پر پہنچ گئی۔ تب تک عمر بولہاں ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے عادی کو سنبھال رکھا تھا۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر عمر کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تین چار افراد عمر کو بچانے کی کوشش میں تھے عروبہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ اس نے اپنے جسم کو عمر کے لیے آہل بنا دیا۔ عادی کی دو تین سخت ٹھوکریں اسے اپنی کمر پر کھاس پڑیں لیکن وہ جھپٹ نہیں ہٹی۔

لوگ پھر سے اسے عادی کو کھینچ کر دوڑنے لگے۔ وہ عمر کے لیے لڑا گا لہاں تک آیا تھا۔ ”اڑے ہاں ملو! تیری تو۔“

بہر حال یہ اسے وہی اگلی طرح جان کا تھاکہ عمر ڈاکٹر باہر ہی نہیں ہے۔ وہ ہلاکری زبان بول رہا تھا۔ دوسری طرف عمر بھی زخمی آواز میں اسے لالہ رہا تھا۔ پھر عادی اپنے دو دوستوں کے ساتھ سلور رنگ کی ایک ٹوی گاڑی میں بیٹھا اور پھنکارا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اب آئی ٹیمینڈ بھی چارواڑ سے متوجہ پہنچ گئی تھیں۔ عمر کا پتلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ناک سے بھی خون جاری تھا۔ اس کی ایک کھنٹی اس پر ہی طرح چمکی تھی کہ ہڈی نظر آ رہی تھی۔ ”اس کو اسپتال لے جائیں۔“ ایک شخص نے مشورہ دیا۔ عمر نے کھنٹی کا دھم دیکھنے کے بعد لنگی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“

باریال اور عمر دغیر و عروبہ کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے آئے۔ اوپر لاکر اسے کرسی پر بٹھا گیا۔ حریم جلدی سے ایک بڑا مال گیارا کر کے لائی۔ عروبہ نے عمر کا خون آلود چہرہ صاف کیا۔ پھر وہ بولی۔ ”خریم! دیکھنا ذرا۔ ہونٹ پر اسچنک کی ضرورت تو نہیں؟“

حریم نے عمر کا دھم دیکھا اور قدر سے مطمئن نظر آئی۔ پھر اس نے چھوٹا آئینہ لاکر عمر کو کھوا دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ اور ٹھوڑی پر آنے والے کٹ دیکھے۔ ”نہیں۔ یہ بیڑیج سے ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور کہنی؟“ آنٹی شمینہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

”یہاں بھی جینڈ تیج ہو جائے گی۔“ عمر نے کہا۔

عادی سے چوٹیں کھانے کے باوجود وہ مکمل حوصلے میں تھا اور اس کے کشادہ سینے میں اضطرابی زبردوم تھا۔

ایسے موقعوں پر پولیس کی پھرتیاں ہمیشہ سے زیر بحث رہی ہیں۔ پولیس یوں تو سڑکوں پر دندناتی نظر آتی ہے لیکن جب ضرورت ہوتی ہے، دور دور اس کا پتا نہیں ملتا۔ یہاں بھی پولیس آئی لیکن تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد۔ تب تک حریم کے خالو یا ور حیات اور وکیل سلطان صاحب بھی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر سے بات کی اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ پولیس کا یہ موقف بالکل غلط ثابت ہو گیا تھا کہ عادی آزاد علاقے میں کہیں روپوش ہے۔ وہ یہیں لاہور کی گلیوں میں دندناتا رہا تھا۔ تاہم اس کو پوری طرح ثابت کرنے کے لیے غیر جانبدار گواہی کی ضرورت تھی۔ یہ گواہی ارد گرد کے لوگ ہی دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر گواہی دینے کے لیے کون تیار ہوتا ہے اور یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اگلے دو تین روز میں پولیس نے کافی پھرتی دکھائی مگر نتیجہ وہی رہا ڈھاک کے تین پات۔ شاید وہ لوگ دل سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر وہ دروازہ بند کر رکھا ہے جو قانون کو عادی کی سمت لے جاسکتا ہے۔ خانہ پری کے طور پر عادی کے سوتیلے بھائی کو پھر حراست میں لیا گیا مگر ایک دو دن کی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

واقفے کے چوتھے پانچویں روز کی بات ہے، عروبہ اور حریم، عمر کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئیں۔ پرانے محلے میں جاتے ہوئے انہیں عجیب سی جھبک محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنی مہران کے بجائے رکشا پر گئیں۔ حریم نے چادر کا نقاب کر رکھا تھا۔ عمر نے اسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی اور گھر میں ہی تھا۔ اس کے بازو پر ابھی تک پٹی تھی اور ٹھوڑی پر بھی میڈیکل ٹیپ چسکی ہوئی تھی۔ سارے مایوس کن حالات کے باوجود عمر کی آنکھوں میں اب بھی عزم کی چمک لٹکارا مارتی تھی۔ باجی روز پہلے جو واقعہ ہوا تھا اس کی ایف آئی آر بھی عمر کی کوششوں سے ہی کٹی تھی۔

عروبہ کچھ پھل اور اسٹیکس وغیرہ لے کر گئی تھی۔ آنٹی شمینہ ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملیں تاہم حریم نے صاف محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ ہیں۔ وجہ کوئی ڈھکی چھپی تو تھی نہیں۔ حریم سے آنٹی کی انسیت اپنی جگہ تھی، مگر انہیں اپنا بیٹا

بھی عزیز تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا بتدریج ایک خطرناک رقابت اور دشمنی کی زد میں آ گیا تھا۔ آنٹی شمینہ اور عروبہ کوئی بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلیں تو عمر اور حریم کچھ دیر کے لیے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ عمر بستر پر نیم دراز تھا، حریم چند فٹ کے فاصلے پر سنگل صوفے پر بیٹھی تھی۔ بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ بولی۔ ”آپ کے چہرے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کو شاید بخار بھی ہے۔“

”ہاں کل کچھ ٹیپر چکر لگتا تھا لیکن اب تو ہلکی سی حرارت ہی ہے۔“

حریم نے سائڈ ٹیبل کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ دوا کی پڑی تھیں۔ ”اگر آپ کہیں تو ”پینا ڈول“ دوں آپ کو؟“ ”نہیں رہنے دیں۔“ اس نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اگر کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو یہ ٹھوڑی دالی جینڈ تیج ذرا اتار دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئسٹنٹ لگا کر اسے کھلا رکھوں۔“

حریم فوراً اٹھی۔ اس نے کاشن اور پائیڈین وغیرہ لی۔ پہلے میڈیکل ٹیپ اتاری پھر چسکی ہوئی پٹی اتارنے کے لیے اسے پائیڈین سے نم کرنے لگی۔ وہ نیم دراز عمر کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کے سلی بالوں کا ایک پورشن ڈھلکا اور عمر کے چہرے کو چھونے لگا۔ وہ پوری طرح اپنے کام کی طرف متوجہ تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کی ٹیپ عمر کی نرم اور محبت بھری گرفت میں ہیں۔ وہ بے طرح ٹھنک گئی لیکن اسی طرح جھکی کھڑی رہی۔

عمر کی آنکھیں بند تھیں اور آنکھوں کے گوشوں سے ہلکی سی نمی جھانک رہی تھی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہا تھا، آج خاموش نہیں رہا۔ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے اس نے اپنے ہونٹوں سے حریم کے بالوں کو چھوا اور سوئے سوئے سے لہجے میں بولا۔ ”حریم! مجھے تمہارا نہ چھوڑیے گا۔ آپ کے بغیر..... مجھ سے جیا نہیں جائے گا۔“ یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے دھونئی ڈھلک گئے۔

حریم کے پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رنگ گئی تھیں۔ یہ چند الفاظ تھے لیکن لگتا تھا کہ ان کے پیچھے برسوں کی کشمکش اور تڑپ شامل ہے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں اس کی حساس سماعت نے کچن کی طرف قدموں کی مدھم چاپ سنی۔ ماما یا آنٹی میں سے کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنے بال عمر کی محبت بھری گرفت سے چھڑائے اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

باقی حصہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں